The Drinched Book

text fiy book

UNIVERSAL
LIBRARY

بزمِ ہمایوں

یکم جنوری ۱۹۲۲ء تھی جب "ہمایوں" پیدا ہوا۔ آج ۱۹۳۰ء کا آغاز ہے۔ بقول دہلی والوں کے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش کیا جاتے دنیا کو دنیا والوں کو۔ آٹھ سال کے بچے میں جتنی طاقت ہوتی ہے اُتنی اِس میں ہوگی آٹھ سال کے بچے میں جو قابلیت ہو سکتی ہے بس کچھ اُتنی ہی اِس میں ہوگی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے کہ یہ بڑے بوڑھوں کو عقل کی باتیں سکھائے۔ خدا کرے اِس میں صرف اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ یہ اپنے سے بڑوں کی عزّت کرے اور اپنے سے چھوٹوں سے محبّت اور دونوں کے عمل و طرزِ عمل سے اُن کی وہبی و اکتسابی خوبیوں کے اخذ کرنے میں اِس طرح مصروف رہے جیسے کوئی ننھی دوشیزہ چمن چمن کے پھول چننے میں محو ہو!

مُدیرِ ہمایوں نے جو ایک سال کے بعد اپنی مصروف فراغت کے خول کے اندر سے منہ باہر نکالا تو کیا دیکھتا سنتا ہے کہ ادب کی دنیا ہے اور اُس میں ایک طوفانِ عظیم، علم کی محفل ہے اور اُس میں ایک دستِ شیخ روعمل، قول تو ہمایوں کا تھا کہ "دوڑو زمانہ چال [illegible] کی چل گیا" لیکن یہ چال چل اَور گئے اور ہمایوں راہ میں بیٹھا کا بیٹھا۔ سوچا کہ حضرت تم خوابیدہ نہ سہی لیکن اب نو[illegible]رد بیدار ترین کا زمانہ ہے ہر وقت اِک نئے کام کے سرانجام دینے کا عہد ہے نہ کہ اک جھوٹے سچے گذشتہ ایثار کے صوفے پر آرام کرنے کا۔ تمہارا قول تو ضرور ہی دوڑ دھاگو لیجیو والا رہا لیکن عمل اس پر صرف اِتنا کہ دوسروں کا منہ تو ضرور بند رہا لیکن اپنے دل میں اک کاوش کا باب کھل گیا دوسروں کی ظاہرا تسکین تو ضرور ہو گئی لیکن اپنی باطنی تحریک ہونی تھی نہ ہوئی۔

سچ یہ ہے کہ "اردو" کی "ادبیّت" "نگار" کی "نقادیّت" "معارف" کی "علمیّت" "نیرنگِ خیال" کی "تصوریّت" "عالمگیر" کی "غزلیّت" "مخزن" کی "رموزیّت" "ادبی دنیا" کی "ارزانیت" "کامیابی" کی "اشتہاریّت" اور "جامعہ" کی "متانت" سے ابھی ہمایوں کو بہت کچھ سیکھنا ہے اور "ہمایوں" کا ارادہ ہے کہ وہ اِن بڑے چھوٹے بھائیوں سے جو کچھ بھی ضروری ہے سیکھے اور سیکھتا رہے لیکن "ہمایوں" جہاں تتبع کا رضا کار ہے وہیں اپنے مخصوص انداز کا علم بردار بھی رہنا چاہتا ہے یعنی "اخلاقیّت" جو خواہ خاص ہمایوں کا مطمحِ نظر نہ ہو لیکن جو ہمایوں کا خاص مطمحِ نظر ضرور ہے اور رہے گا + اب حقیقت یہ ہے کہ آج کل اخلاق کے معنی اِس قدر وسیع ہوتے جا رہے ہیں کہ اخلاق کی تربیت میں صرف صحیح ضبط اور صحیح نیکی نہیں بلکہ صحیح حسن و محبت اور صحیح علم و آزادی سب کی کم و بیش ضرورت ہے لہٰذا حسنِ اخلاق نری خشک مزاجی سے وابستہ نہیں بلکہ آج اِس میں وہ چیز بھی شامل ہوتی جا رہی ہے جسے کل تک تقوے دشمنی کہتے تھے + وعظ و پند کی گفتار اخلاقی طور پر اتنی سودمند نہیں ہوتی جتنی شاید ایسے فطری حسن کی ایک جھلک جو بالغ ...

کو انسان کے دل میں اُبھارے یا ایسی آزادانہ کردار جس سے قوتِ شباب بوسیدہ بندشوں کو توڑ کر ایک نئی عمل کی دنیا میں قدم رکھے۔غرض تمام وہ چیزیں جو زندگی کو زندہ رکھتی ہیں زندہ تر تابندہ تر بناتی ہیں وہی سب کی سب صحیح اخلاق کی جان ہیں اور اُن سب کی طرف ہمیں برابر توجہ کرنی چاہیئے اگر ہم دنیا میں سچے اور قوی انسان بننا چاہتے ہیں!

ہمایوں کو زیادہ تر معاونینِ ہمایوں نے بنایا جو کچھ کہ وہ ہے اور اُسے زیادہ تر وہی بنا سکتے ہیں جو کچھ کہ اُسے ہونا چاہیئے لیکن مدت کے بعد مدیرِ ہمایوں کو اِس کا احساس پیدا ہوا ہے کہ معاونین کی اعانت کے ساتھ اپنی آپ مدد اور اپنی اور سب کی مساعی میں اک خاص نوع کا ربط و ضبط ضروری ہے اگر ادب کے اُس ہندوستان میں جہاں اب مونٹ ایورسٹ اور کنچن جنگا کا سر بلند ہو رہا ہے ہمیں بھی اپنے دھرم سالہ کے ادنیٰ لیکن انوکھے نظارے کو پیش کرنا ہے!

بزم و رزم میں ضرورت صرف بلیغ ترین مُقرّر یا مضبوط ترین دلاور کی نہیں ہوتی بلکہ ہر ایسے صاف گو اور ہر ایسے منچلے کی جو اک اپنے ہی انداز میں کوئی نئی بات کہے کوئی نیا کام کرے خواہ وہ بات ذراسی خواہ وہ کام چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو! اگر اِس بسیار گوئی کے زمانے میں حُسن نمائی کے ساتھ راست گوئی سے کام لیا جائے تو ہر ایسا کام آپ اپنا انعام ہو ——— مدیرِ ہمایوں کی تمنّا ہے کہ ہمایوں اب ایسا کام کرے۔ تمنّا ہے ارادہ ہے اُمّید ہے لیکن دعوے نہیں کیونکہ صرف سرانجام شدہ کام ہی صحیح ادّعا ہے اور یہ سرانجامی صرف مدیر کے ہاتھ میں نہیں بلکہ زیادہ تر معاونین کے ہاتھوں ہی سے ہو سکتی ہے!

کاش یہ معاونین کبھی ایک آل انڈیا ہمایوں کانفرنس میں اکٹھے ہو کر ہمارے افسانہ نگار عاشق بٹالوی کی اِس آرزوئے ہمایوں کو بر لائیں لیکن ہماری قوم کے کاموں میں اور پھر ادبی کاموں میں ایسی مستعدی کی امید عاشق کی افسانہ سنجی کو موزوں ہو ہمیں کچھ کم ہی ہے۔لیکن پھر بھی خیر اُتنا نہ سہی اِتنا ہی ہو جائے اور کیوں نہ ہو ہو سکتا ہے کہ کچھ میل جول سے، کچھ نامہ و پیام سے، کبھی پُوری کبھی آدھی ملاقات سے، اہلِ ہمایوں کبھی مدیرِ ہمایوں کی خلوت میں، کبھی صفحاتِ ہمایوں کی جلوت میں، اپنی تجویزوں تحریروں سے بزمِ ہمایوں کو فروغ دیں اور دیتے رہیں + ہمیں اپنے خریدارو اور مضمون نگاروں سے توقع ہے کہ وہ نہ صرف گاہے گاہے ہمایوں کی اصلاح و ترقی کے لئے اپنے خیالات کا اظہار کریں بلکہ عملاً اُس میں حصہ لیں۔سوچیں سمجھیں کہ اُن کے ہمایوں میں کیا کمیاں ہیں پھر دیکھ بھال کر کہیں کریں جو کچھ بھی لائقِ التفات اور قابلِ عمل ہے۔اس طرح ایک بزمِ ہمایوں صحیح معنوں میں قائم ہو سکتی ہے پھر کیا عجب ہے کہ کسی روز یہ کاغذی بزم زیادہ نہ سہی دو اک روز کے لئے اک اصلی بزم کی صُورت بھی اختیار کرلے!

اب تو یہ حالت ہے کہ سال کے بعد ہمایوں کے دو صفحوں میں بزمِ ہمایوں منعقد ہوتی ہے اور مدیر جیسا کہ اُس کا اِس دفعہ بھی ارادہ ہے دو ہی دو لفظوں میں دس بیس ارکان کا مختصر سا شکریہ ادا کر کے پھر اپنی بے نیاز خلوت میں سال بھر کا چلہ کاٹنے کے لئے غائب ہو جاتا ہے + ہمارے اِک قابل رکن نے پُر اثر شاید بجا شکایت کی ہے کہ اکثر اور رسالے تو اپنے مضمون نویسوں پر نوٹ بلکہ نوٹ در نوٹ لکھتے ہیں اُن پر "شذراتی" "ملاحظاتی" اور کیسے کیسے اور "تعریفاتی" پھول برساتے ہیں لیکن غنچہ دہن ہمایوں سال میں ایک دفعہ بھی اپنا منہ کھولتا ہے تو اظہارِ تشکّر میں محض بُخل سے کام لیتا ہے + اِس کے جواب میں گزارش ہے کہ مدیرِ ہمایوں کی رائے میں ہر مضمون کی آبجو پر تعریف کے پُل باندھنا اُس آبجو پر سے محض گذر جانے کا ایک بہانہ ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے بدبخت ملک میں اور ایک حد تک آج کل کی ساری کاروباری دنیا میں اعتبار اکثر اشتہار سے قائم ہوتا ہے اور عزّت کے معنی محض شہرت ہو کر رہ گئے ہیں لیکن اِسی ملک اور اِسی دنیا میں ... بھی ہیں جو اعتبار و عزت کے اور زیادہ سنجیدہ و متین رستوں کے مسافر ہیں۔ یہی ہیں جن کے ساتھ خدا کرے ... بھی اپنے تمام اہلِ قلم حضرات کی خدمت میں یہ معذرت خلوصِ دل سے پیش کی جاتی ہے کہ اُن کی مساعی اور احسانات کا حق تو یوں ہی کہ حق ادا نہ ہُوا" اور یہ حق رسمی لفظوں میں یا چند جملوں میں کیسے ادا ہو۔ اِن میں سے بعض صاحبوں کے متعلق اگر کوئی مضمون نگار کئی کئی صفحے کا مضمون لکھا جائے تو پھر کہیں جا کر اُن کی تصانیف کی خصوصیات پر کچھ روشنی پڑے اور پھر کہیں جا کر اُن کی محنتوں کی کچھ تھوڑی سی داد ملے لیکن در اصل نہ اُن کی محنت مدیرِ ہمایوں کے شکریے کے لئے صرف کی جاتی ہے نہ اُن کی قابلیت اُس کے چند تعریفی جُملوں کے لئے ظہور میں آتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اِن جواہر پاروں کی جگہ ناظرینِ ہمایوں کے دل میں ہے!

گذشتہ سال جس طرح میاں عبد العزیز نے فلک پیمائی پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے تاریخ نور الٰہی محمد عمر صاحبان نے ڈراما بیگم آغا حیدر حسن نے دہلوی روزمرہ حامد علی خاں و حمید احمد خاں نے تنقید سراج الدین احمد نظامی اور میاں عطاء الرحمٰن نے افسانہ خواجہ غلام السیدین اور مہر محمد خاں شہاب نے سیرت و اخلاق سیّد حسن صاحب برنی اور عبد الرحمٰن صاحب اعجاز نے علم و فن کے شعبوں میں جو کچھ پیش کیا اُسے ناظرینِ ہمایوں بھول نہیں سکتے اِسی طرح شعر و نظم میں جوش کی فطرت نگاری آزاد انصاری کی زبردست اخلاقی تعلیم حامد علی خاں کا فلسفیانہ تغزّل اثر صہبائی کا لاجواب رباعیانہ فلسفہ اور ... اکبر ذوقی و شیر ما عابد وحشت اور ح۔ ب صاحبہ کے شیریں نغموں کو سامعینِ ہمایوں کبھی فراموش نہیں کر سکتے!

ادا کرنے سے اگر شکریہ ادا ہو سکے تو اِن سب کا شکریہ سو بار ہمایوں اور اہلِ ہمایوں کی طرف سے!

جہاں نما

ہم ہندیوں کے لئے جو یُوں پُرانے ہوں لیکن جو ابھی اس نت نئی دنیا میں ننھے بچے ہی ہیں یہ دنیا کیا ہے؟ — محض اک جغرافی نقشہ جسے زمانے کے سیاست دان اُستاد نے ہماری پردہ دار چار دیواری کے اندر لٹکا رکھا ہے اور جس کی ملکی و قومی اور خشک و تر رنگینیوں سے ہماری بچپن کی فطرت کھیلتی رہتی ہے! اس نقشے پر ایک خونیں رنگیں رنگ ہے جس کے دھبے جا بجا پائے جاتے ہیں اور جس کی طرف اکثر ہمارے اُستاد کی چھڑی ہمیں متوجہ کرتی رہتی ہے لیکن ہم بزدل جن میں کچھ دلیری سی آتی جاتی ہے اب کچھ دنوں سے اپنی نظر کو اور رنگوں کی طرف بلکہ اپنی بے رنگی کی طرف بھی پھیرنے جاتے ہیں! یہ استاد کون ہے؟ ——؟

انگلستان! —— خونیں رنگیں رنگ والا سب "حق" پرستوں کا مجازی خدائے مالدار!

اِس کے بعد ہم کسے دیکھتے ہیں اور کیا دیکھتے ہیں؟ ——؟

امریکہ! —— سبھی نئی نویلی ترقیوں کا اجارہ دار

جرمنی! —— اپنے پُرانے غم و غصّہ کو نئے تعمیری کاموں میں تحلیل کرنے والا، عزیز نام و صاحب ایثار

فرانس! —— عیش پسند، حسن پرست، علم دوست، فن آرا، پُرکار

اطالیہ! —— خود نما رہبر کا مغرور رکاب دار

جاپان! —— مشرق کا خوددار پہرہ دار

رُوس! انسانی معاشرت کی تپتی ہوئی سفید و سیاہ دیگ میں اپنا سخت و کرخت چمچہ پھیرنے والا مزدوروں مسکینوں کا ظالم مددگار

چین! اپنے ہزاروں بکھیڑوں کو سمیٹ لپیٹ سکنے والا قدیمی تجربہ کار

ٹرکی! —— تہذیبِ جدید کے لئے سب بُری بھلی روایات کو دُور سے مغربی سلام کرنے والا نیم مشرقی فوجدار

مصر! —— اپنی ہی ایک نہر میں اپنی ساری آبرو ڈبو کر اب اُس سے باہر کود سکنے کے لئے بے قرار پر بے اختیار

ایران! —— خاموش و پُر اطمینان و بُردبار

افغانستان! —— حیران و پُر ہیجان و بے اعتبار

عراق! —— گرفتار بیدار و بیزار

فلسطین! —— انگریزی یہودیت کا شکار

ہسپانیہ! —— محض سُست رفتار

ہنگری! —— اقلیتوں کی اقلیم ننگ و تار

اور سب سے نیچے اور سب سے پیچھے اِسی ہٗ کی آخری تختی میں جس میں ہراور ہانے کی حکومت ہے؛

ہندوستان! ——— وحدت کو کثرت سے پس پا کرنے والا نوجوان پرستار

آؤ دیکھیں کہ ۱۹۲۹ء میں دنیا کے ان ملکوں میں کیا ہوا۔

انگلستان کو وہ نہیں سمجھتے جو کہتے ہیں کہ انگلستان کا دن ہو چکا۔ جس ملک نے ہندوستان کے موتی اور جواہر اپنے قبضے میں کر رکھے ہیں وہ پورا زمانہ شناس ہے وہ وقت پر بالڈون سے بے بال و پر شخص کے بے سود ہو جانے پر ریز سے میکڈانلڈ سا پر بہ ہوا آدمی پیدا کر دیتا ہے اور ہاتھ سے جاتی دنیا کو اپنے بائیں ہاتھ کے کرتب سے پھر اپنا بنا لیتا ہے۔ گذشتہ مزدور حکومت کے جانے کے بعد جب قدامت پسندوں نے پھر اپنا بوسیدہ ڈھول بجانا شروع کیا تو دنیا کے عقلمندوں نے سرگوشیاں کیں کہ دیکھا انگلستان وہی پرانی لغویت کی پوٹ مگر نہیں انگلستان نے اُن کے عقل کے ترازو کو باطل ثابت کر دیا۔ مزدور حکومت پھر آئی اور اس شان کے ساتھ کہ گویا وہ ایک "تبلیغی" حکومت تھی مگر اُس نے سب کٹیروں کے منصوبے مٹی میں مٹی کر دیئے۔ اُس یورپ میں مسئلہ تاوان جنگ امریکہ میں مسئلہ حرب مقابلہ مصر میں مسئلہ آزادی اور ہندوستان میں مسئلہ سوا راج کو اِس دلیری اور سچائی سے حل کرنے لی ٹھانی کہ دوست دشمن سب نے یک زبان ہو کر احسنت و مرحبا کہہ دیا۔ رُوس کے افغی کی طرف اس مداری سے [illegible] بے روزگاری کی گتھی کو سلجھانے کے لیئے اپنی تدبیر کا ناخن کام میں لگایا کہ زیادہ نہ ہو لیکن کچھ نہ کچھ تو ہو جائے۔

امریکہ گو ابھی انجمن اقوام سے بے نیاز اور بالا بالا رہتا ہے لیکن یہی وہ ملک ہے جہاں صلح و ترقی کی تازہ ترین ایجادیں ہوتی ہیں۔ یہیں معاہدہ کیلاگ تجویز ہو کر پختہ ہوا۔ انگریزی وزیر اعظم بحری مصالحت کا پیغام لئے ہوئے یہیں آیا اور یہاں سے خوش گیا۔ مادی خوشحالی کی یہ حالت ہے کہ اس وقت اس ملک میں ایک کروڑ نوے لاکھ ٹیلیفون ہیں اور ہر تیسرے گھر میں لاسلکی کا آلہ ہزاروں میل کی خبریں اور آوازیں صبح و شام سناتا رہتا ہے۔ یورپ کے نظریے باز کانپ رہے ہیں کہ امریکیت کا اژدہا منہ کھولے یورپ کی تہذیب پر پھنکار رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں امریکیت کے معنی "ناشخصیت" زندگی کی "مقداریت" "مشینیت" اور محض "معیاریت" ہیں۔ اپنی سیاسی یکتائیت اور معاشی فوقیت کی وجہ سے امریکہ یورپ پہ چھایا جا رہا ہے اور اس امریکی جانور کے بچے جا بجا دنیا میں اپنا سر نکال رہے ہیں ——— خیر اور کچھ نہ ہو پھر بھی بچے اک دل بہلاوا ضرور ہوتے ہیں۔

جرمنی سے انگریزی فوج نکل آئی اور فرانسیسی اور چھ ماہ میں گھر لوٹ آئیں گے۔ جرمنی آزاد ہو رہا ہے۔ وہاں کی شبابی تحریک میں اس وقت ۱۴ سے ۱۸ سال تک کی عمر کے ۷۴ فی صدی جرمن شریک ہیں جن میں سے اکثر شراب و تنباکو سے پرہیز کرتے ہیں اور سادگی جن کا شعار زندگی ہو گیا ہے۔ جرمنی نے اپنے اعلیٰ درجے کے قیدیوں کو سال میں ۱۴ روز رخصت کی اجازت دی ہے وہ کبھی کبھی بیرونی آجرین کا کام کر سکتے ہیں اور قیدیوں کے انتظام میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ گذشتہ جنگ کی یہ مغلوب قوم گئے سال اپنے فاتح انگلستان پر ساری کسرتی کھیلوں میں غالب رہی لیکن قوم اپنی گئی گزری ناکامیوں پر کب تک روئے اور کس لئے کہ دنیا کے مستقبل میں اُس کا حصہ بھی ہو گا اور وہ اک خاصہ حصہ ہو گا!

فرانس کو کوئی بیرونی کام نہ تھا سو وہ اپنی اندرونی حکومتیں بدلنے میں کچھ نہ کچھ مصروف رہا!

اطالیہ ابھی بدستور اپنے خدائے قہار کا پیروکار ہے وہاں آج کل جو نیکی ہے وہ بھی زبردستی کی ہم پیالہ و ہم نوالہ ہے۔ مسولینی حکم و تشدد کا گاندھی ابھی اپنے عقلمندانہ قہر کی آندھی بپا کئے ہوئے ہے اور اس عفونت سے کئی عفونتیں صاف ہوتی رہتی ہیں!

روس کے بڑے بڑے پرانے دشمن بھی اب مان گئے ہیں کہ وہ آج کل دنیا جہان کا سب سے بڑا معاشرتی تجربہ گاہ ہے۔ وہ حیرت انگیز ملک

جہاں اس وقت ۴۹ مختلف زبانیں ۱۸۲ جداگانہ قومیں اور ۴۸ بڑی ریاستیں مل جل رہی ہیں۔ وہاں امدادِ باہمی کی انجمنوں کے اس وقت تین کروڑ پچاس لاکھ ارکان ہیں اور دس بارہ سال کے عرصے میں وہاں پہلے کی بہ نسبت دگنے زیادہ مرد اور تگنی زیادہ عورتیں تعلیم یافتہ ہو گئی ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ روس جہنمی ہے؟

چین میں "کومن ٹانگ" جماعت نے اپنے سردار اعظم چیانگ کے شک کی "قومی ٹانگ" سے سوئے ہوئے چین کو بیدار کر دیا ہے اور وہاں دھڑا دھڑ ترقی کا کام ہو رہا ہے۔ سڑکیں پل جہاز بجلی ہوا بازی ہے اور امریکی اور جرمن استاد ہیں۔ مگر مچھ کنارے آ لگا ہے۔ اب دیکھئے کیا ہو!

ترکی ترقی کا امام بنا ہے۔ جہاں اپنا فائدہ ہے وہاں دشمن کا بھی بلا سے ہوا کرے لیکن جہاں اپنا نقصان ہو وہاں پر اپنے دوستوں کی دوستی بالائے طاق۔ ملکی صنعتوں پر زور ہے رسم الخط بدل گیا اور خلافت کا کیڑا اب فقط ہندی مولویوں کی ڈاڑھی کا آوارہ مسافر ہے اور اس کا ننھا کام ساردا ایکٹ کی مخالفت ہے اور بس۔ حق مغفرت کرے عجب ایمان دار ہیں!

مصر کے لئے اس کے توفیق اور عربی اور کامل اور زاغلول نے جو خاک و خون کی ندی بہائی تھی مزدور حکومت کے ہاتھوں اس کی آبیاری سے اس کا لالۂ صحرا خوب رنگین و شگفتہ ہونے والا ہے!

ایران نے جرمنی اور سویڈن سے معاہدے کئے اور خاموشی سے راضی برضا رہا۔

افغانستان کی جہالت امان اللہ کی جلد باز عقل سے زیادہ نادر الوجود نکلی۔ اب خدا نادر خاں کو اس کے پنجے سے بچائے رکھے!

عراق۔ کیا کہیے۔ کچھ دنوں خاموش رہے!

فلسطین میں ۷½ لاکھ عربوں کا پلہ ہلکا ہے کیونکہ اس کے مقابل میں ۱½ لاکھ یہودیوں کے ہاتھ میں لارڈ بالفور کے دستِ مبارک کا ایک مسودہ محفوظ ہے جس کا ایک ایک حرف لوہے کا ساختہ اور خون سے پرداختہ ہے۔ اے اہلِ کتاب عربوں کے عتاب سے بچنا!

ہسپانیہ میں ایک نئے جمہوری کش آئین کا آئینہ پیشِ نظر ہے۔

ہنگری نے ہندوستان کی سوراجی حکومت کا رستہ آسان کرنے کے لئے حکم دے دیا ہے کہ وہاں کے پانچ فی صدی یہودیوں کو مدارس میں پانچ فی صدی سے زیادہ تعلیم نہ دی جائے!

ہندوستان جو کبھی کنجِ امن و ایمان تھا آج ایک جائے شک و ہیجان ہے اور کیوں نہ ہو وہ جس کے ہاں گاندھی سے موتی اور جواہر سے لال اور ٹیگور سے اقبال جگمگ جگمگ کریں وہ کب تک سکون کو جو موت کی تاریکی ہے دل میں جگہ دیتے رہے وہ اسے کیوں علم و عمل سے جو زندگی کی روح ہے روشن و پُرنور نہ کرے۔ آرام ہو چکا اطمینان ہو چکا۔ اب کام ہوگا کام، بے چینی ہوگی بے چینی اور کیونکر نہ ہو؟ جب مزدور حکومت کا دل ہماری حالت دیکھ کر پسیج جائے تو کیا ہمارا اپنا دل ہی ایسا ہے کہ گداز و گداز تر نہ ہوتا جائے۔ ہاں ساتھ ہی ضرورت مصروفیت میں سوچ بچار کی ہے خواہش میں صبر کی اور کام میں استقلال کی۔ اگر آہستگی موت تھی تو جلدی بھی جہنم کو لے جا سکتی ہے۔ سو خبردار! ۱۹۲۹ء سائمن والی ہڑتال سے شروع ہوا پھر اس نے گاندھی اور وائسرائے کو بلا کر انہیں ٹیبل کے ہاں چائے پلائی پھر جواہر لال کو کانگرس کا صدر منتخب کیا جس پر انگلستان کی دور اندیش حکومت نے ہمیں نوآبادیوں کی سی حکومت

دینے کی جھلکی دکھائی پھر شلر کمیٹی کو ہندوستان کے مفروضہ اتحاد سے ڈرا کر ریاستی اور برطانوی ہند کی دوئی کا شاخسانہ کھڑا کرا دیا۔ پھر مزدور کمیشن کے پاؤں میں چکر ڈال دیا۔ اُدھر جتندر داس نے بھوک ہڑتالیوں کا قوی دل سردار بن کر عدم کی راہ لی اور اِدھر اسمبلی میں بم پھینکنے والوں نے عدالت میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کر کے چار دانگ عالم میں تہلکہ مچا دینے کی ٹھان لی یعنی یا مردہ بولے نہ اور یا کفن بھی پھاڑے۔ اچھا بھئی کفن کوئی مہنگی شئے نہیں تم مر گئے تو پھر بھی شاید مفت ہی مانچسٹر سے مل جائے!

ہندوستان میں اب قطعی بیداری کا زمانہ آ گیا ہے۔ اِس ملک نے اب سمجھ لیا ہے کہ نرے گاندھی کے چرخے اور قدیم ہند کے سے ٹونے ٹوٹکے سے موجودہ دنیا میں ترقی کی صورت نہیں۔ اپنی ہیئت کو بھی قائم رکھو لیکن دوسروں سے بھی سیکھو جو کچھ سیکھنے کے قابل ہے۔ نئی ہندی تہذیب مجموعہ ہو گا نئے پرانے علوم و فنون کا، عطر ہو گا وید اور قرآن اور انجیل اور گرنتھ اور زنداوستا کے پھولوں کا اور سست رفتار بھائیو اور نیز رو دوستو! یاد رکھو کہ سیاست کے طوفانی سمندر میں تمہاری کشتی کے لئے ضرورت ہے نہ صرف اُن کے بازوؤں کی جو چپّو چلانے والے ہیں بلکہ اُن کے ہاتھوں کی بھی جو پتوار تھامنے والے ہیں! اور خدا ترسو اور رسم پرستو! اگر تم خدا کے بندے ہو، وطن کے خادم ہو تو اپنے اعتقادات کو صیقل کر و اپنے بوسیدہ رسم و رواج کو جلا کر بھسم کر دو، تاریک دلوں میں علم کی روشنی پھیلاؤ اور سست عیش پسندوں کے رگ و پے میں کام کی بجلیاں دوڑا دو۔ اس کے بعد صبر کرو اور انتظار کہ قومیں اور طبیعتیں کہیں بنتے بنتے بنتی ہیں!

نقلی دنیا کے ملکوں میں تو یہ کچھ ہوا اب آؤ دیکھیں کہ اصلی دنیا کے لوگوں میں کیا ہو رہا ہے؟

انسانیت اور اُس کی تحریکات! یہ ہے دنیا کا حقیقی نقشہ!

اِس وقت دنیا میں تین زبردست تحریکیں عمل میں آ رہی ہیں۔ علوم و فنون کی تحریک، آزادیوں کی تحریک، وسعت و معاونت کی تحریک اور یہ تینوں تحریکیں زندگی کے ہر شعبے میں بیک وقت اثر انداز معلوم ہوتی ہیں+

یہ علوم کے کرشمے ہیں کہ ہوا باز گھنٹے میں ۳۵۵ میل چل سکتا ہے اور نیویارک سے فرانسسکو تک کے ۲۸۲۲ میل ۲۹ گھنٹوں میں اور انگلستان سے ہندوستان تک کی ۴۱۳۰ میل کی مسافت بلا توقف ۵۰½ گھنٹوں میں طے ہو جاتی ہے۔ یہ اُن لوگوں کے کارنامے ہیں جن کے ہاں ایک مسٹر ملر کیمبرج یونیورسٹی میں کیمیا وغیرہ کی ترقی کے لئے اپنی جیب سے دو لاکھ پونڈ کا عطیہ پیش کر سکتا ہے اور برطانوی حکومت قوم کے لئے تین تصویریں تقریباً ڈھائی لاکھ میں خرید کر خوش ہوتی ہے اور فرانسیسی اکادیمی کے ارکان "غیر فانی" پکارے جاتے ہیں!

یہ آزادیوں کے کرشمے ہیں کہ اِس وقت برطانوی دارالعوام میں ۱۴ عورتیں ارکان ہیں اور اُن میں سے ایک عہدۂ وزارت پر متمکن۔ جنوبی افریقہ کے قطعی کالے لوگوں کی قومی کانگرس اور افریقی حقوق کی لیگ اپنے مطالبات پیش کرتی ہیں۔ دولِ متحدۂ امریکہ میں اب "حبشی تاریخ" پڑھائی جاتی ہے اور وہاں کی یونیورسٹیوں سے ہر سال دس ہزار حبشی تعلیم پا کر نکلتے ہیں اور مغرور امریکیوں کی سفید کانگرس میں ایک حبشی رکن بھی ہے! چین میں عورتیں تعلیم اور طب اور سیاست کے

ملکوں میں حصہ لے رہی ہیں اور یہ کیا ہندوستان میں شریف ہندو عورتیں ہزاروں کی تعداد میں خوشنما لباس پہنے بیسیوں مفید کام کرنے کو نکل رہی ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے چند مسلمان خاتونیں بھی اپنی بھولی بھٹکی قوم کی چیخ و پکار کے باوجود کچھ نیم پردے میں کچھ پردے سے باہر نہ صرف خدا کی دی ہوئی ہوا اور روشنی سے حظ اٹھاتی ہیں بلکہ گاہے گاہے انسانیت کے لئے اپنی ننھی سی ناچیز خدمات بھی پیش کر رہی ہیں!

یہ وسعتِ معاونت کے کرشمے ہیں کہ انجمنِ اقوام ابھی قائم ہے اور کچھ کام کر رہی ہے۔ ڈاکٹر برنارڈو کے یتیم خانے میں سے جو دنیا کا سب سے بڑا کنبہ کہلاتا ہے ایک لاکھ سے زائد بچے مفید شہری بن کر نکلے ہیں اور اُس کے دروازے ہمیشہ ہر بچے کے لئے کھلے ہیں۔ لندن میں سکاوٹ لڑکوں کا پچاس ہزار کا مجمع منعقد ہوتا ہے جس میں ۴۲ ملکوں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے دوستی کے تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔ اسی طرح گائڈ لڑکیوں کی مل کر کام کرنے کی انجمنیں اپنا کام کرتی ہیں۔ لندن کا لارڈ میئر مصیبت زدہ کان کنوں کی امداد کے لئے جو فنڈ کھولتا ہے اُس میں پونے نو لاکھ پونڈ جمع ہو جاتے ہیں۔ اِس کے علاوہ ایک لندن کی خیراتی انجمنوں کی فہرست اٹھا کر دیکھئے کہ رعشہ زدوں کی انجمن اور غریب اندھوں کے خبر لینے والوں کی انجمن اور بچوں کو والدین کے مظالم سے بچانے والی انجمن اور پھر سپاہیوں کی اور جہازرانوں کی اور خدا اُن پر کیوں رحم نہ کرے اور رحم و تعلیم و مشورت کی سینکڑوں امدادی انجمنیں کہ جن کا بیان بھی ہم کچھ نہ کرنے والوں کے لئے سوہانِ روح ہے!

اِس کے بعد کون کہے گا کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دُنیا ترقی پر نہیں؟ کہا جاتا ہے کہ اِس وقت دنیا میں تین کروڑ مسلّح آدمی موجود ہیں پھر صُلح و آشتی کا ذکر لاحاصل ہے! بے شک یہ تین کروڑ نیزہ تفنگچی توپچی ہیں اور ضرور ہیں بلکہ اِن کے ساتھ ارب ڈیڑھ ارب جاہل و اجہل اور لوگ بھی ہیں۔ لیکن یہی نیزہ توپیں یہی جہل و تعصّب تو ہیں جن کے اندر سے، خود اِنہیں کے قلع قمع کرنے کے لئے اِن کے نامناسب جوش و خروش کو مناسب ہمت و شجاعت میں بدلنے کے لئے ہیگ اور ہوور اور ریمکڈانلڈ اور مصطفےٰ کمال اور ٹیگور اور گاندھی پیدا ہوئے! یہ کشمکش ہمیشہ سے جاری تھی اور ہے اور رہے گی اور خدا کرے زیادہ ہی زیادہ ہو۔ ہاں یہ ہو کہ جہاں یہ لڑائیاں ہاتھ پاؤں کی تھیں، خاک و خون کی تھیں، جسم و جان کی تھیں وہاں یہ لڑائیاں محض دل و دماغ کی ہوں، روح و اصول کی ہوں۔ جہاں یہ جھگڑے ملکیت کے تھے وہاں محض یہ اختلافات محبت و معاونت کے ہوں جس سے ہر ایک فرد چند قدم اور سب انسان مل جل کر ہزاروں کوس میدانِ زندگی میں بڑھیں اور بڑھتے چلے جائیں!!

ب ر

وطن کا راگ

اے ہندوو! پُرانے نام و نشان والو
اے مُسلمو! دلیرو! اے آن بان والو
سِکّھو! خُدا پرستو! تیر و کمان والو
عیسائیو! جوانو! اے عزّ و شان والو

بن جاؤ بھائی بھائی ہندوستان والو!

صد حیف ہے تم اب تک غفلت میں سو رہے ہو
جو وقت کام کا ہے وہ وقت کھو رہے ہو
کیوں آبرو کو اپنی آپ ہی ڈبو رہے ہو
اپنی ہی کھیتیوں میں کیوں پھُوٹ بو رہے ہو؟

اِک قہر ہے لڑائی ہندوستان والو!

اے ہندوو! کہاں ہے دریا دلی تمہاری؟
اے مسلمو! کہاں ہے حق آگہی تمہاری؟
کیا ہو گئی ہے سکّھو! اب جاں دہی تمہاری؟
عیسائیو! محبّت کیا مٹ گئی تمہاری؟

ہوتی ہے جگ ہنسائی ہندوستان والو!

چھوڑو یہ نیند اپنی اُٹّھو جو دم میں دم ہے
منزل بہت کٹھن ہے دوڑو کہ وقت کم ہے
غفلت تمہاری کیا ہی اپنے پہ اِک ستم ہے
عشرت تمہاری کیا ہے وجہِ ہزار غم ہے

ہے کاہلی بُرائی ہندوستان والو!

جکڑے ہوئے ہو جن سے اُن بندشوں کو توڑو
تم قید میں ہو اپنی اُٹّھو یہ قید چھوڑو
رشتے جو مدتوں سے ٹوٹے ہیں اُن کو جوڑو
کھانا الگ ہو جن میں اُن برتنوں کو توڑو

دل کی کرو صفائی ہندوستان والو!

وہ دن گئے تمہارا جگ میں تھا بول بالا — وہ دن گئے کہ تم سے دنیا میں تھا اُجالا
اب ایسی آفتوں سے آکر پڑا ہے پالا — بکھری ہے دانہ دانہ ہوکر تمہاری مالا

صدیوں کی وہ کمائی ہندوستان والو!

اُٹھو سمیٹو اُٹھ کر بکھرے ہوئے یہ دانے — اِک بار پھر دکھا دو دنیا کو وہ زمانے
دُنیا میں جب تھے یکتا ہندوستاں کے سیانے — جنّت بنا دیا تھا جب ہند کو خدا نے

جب سب تھے بھائی بھائی ہندوستان والو!

ہوتا نہیں ہے کیا کچھ دُنیا میں محنتوں سے — ممکن نہ ہو جو، وہ بھی ممکن ہے ہمّتوں سے
پالو مسرّتوں کو اپنی مشقّتوں سے — اپنا بنالو سب کو اپنی محبّتوں سے

خدمت میں ہے بھلائی ہندوستان والو!

دیکھو تمہاری حالت کیا کچھ دکھا رہی ہے — سیکھو تمہاری فطرت کیا کچھ سکھا رہی ہے
جاگو تمہاری قسمت تم کو جگا رہی ہے — دوڑو خدا کی قدرت تم کو بُلا رہی ہے

ہے جوش پر خدائی ہندوستان والو!

کام آئے گی نہ ہرگز دشمن کی اب شرارت — ہو گی نصیب سب کو اب دوست کی زیارت
علم و عمل کی دولت پائے گا اپنا بھارت — چمکے گی اپنی قسمت سُن لو مری بشارت

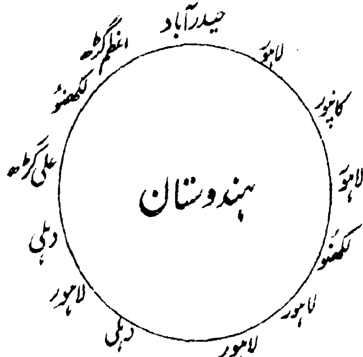
اب تم ہو اور رہائی ہندوستان والو!

ل ب

گول میز کانفرنس

کیا کہیں اس ہمہ گیر سیاست کے بے پناہ زمانے کو جب کہ بمصداق "ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد" ہر چیز اگر سیاسی نہیں تو نیم سیاسی ضرور ہے۔ اگر اُسے سیاسیات سے براہِ راست واسطہ نہیں تو کم از کم اُس کے طور طریقوں میں سیاسیانہ انداز ضرور ہے، سیاست کیا ہے اک دوسرا نام بے چینی اور ناشکری کا، اک بہانہ لڑنے جھگڑنے کے لئے، زندہ رہنے کی اِک ترکیب، بس یہی ہے سیاست۔ اب غور سے دیکھئے کہ علم و ادب میں بھی جن میں بمقابلہ سیاست کی گرمجوشی کے قابلیت کی سرد مہری ہونی چاہئے تھی آج کل کیا کچھ ہو رہا ہے؟ مناظرہ اور مباحثہ تک کا مقابلہ تو خیر یہاں جائز تھا بلکہ ضروری ہے لیکن اِس کے ساتھ اب کاروباری مسابقت علمی و ادبی مخاصمت اور مصورانہ مخالفت بھی خدا کے فضل سے شاملِ حال ہو گئی ہے۔ یہ کیا ہے سیاست کا اثر علم و ادب پر۔ اس کی وجہ محض یہ کہ چونکہ ہم "ادیبوں" کے لئے سیاسی محفل میں ادب سے تعظیماً کرسیاں نہیں چھوڑ دی جاتیں حلم و انکسار سے ہماری قابلیت کے آگے سر نہیں جھکا دیئے جاتے اِس لئے ہم چراغ پا ہو کر اپنی اک یوں کہنے کو ادبی لیکن کام کرنے کو اک ڈیڑھ اینٹ کی الگ سیاسی انجمن کھڑی کر دیتے ہیں اور اُس میں تازہ ترین سیاسی و تمدنی طریقے سے خوب لڑتے جھگڑتے ہیں! اجی خدا کا شکر ہے لڑتے ہیں جھگڑتے ہیں مگر کچھ کام تو کرتے ہیں۔ خدا بچائے ہمیں ایسے امن و امان سے، ایسے روح شکن سکون و اطمینان سے جو خون کو رگوں میں اور تمناؤں کو دل میں منجمد کر دے!

میں اِنہیں خیالوں میں غرق نہیں نہیں فقط ہاتھ پاؤں مار رہا تھا کہ کسی نے گویا لاسلکی کے ذریعے سے مجھے کسی فلک نما کوہستان میں پہنچا دیا۔ ذرا ہوش سنبھالا تو کیا دیکھتا ہوں کہ خدائے جبار کا نہیں یہ تو وہی مولانا محمد حسین آزاد والا دشوار گذار پہاڑ ہے جس کے اوپر سے بجائے نیرنگِ خیال والی شہنائی کے ڈھولک اور طبلے کی سی آواز سنائی دے رہی ہے اور جس کی چوٹی پر بجائے ایک بقائے دوام کے غالباً صرف اک شہرتِ عام کا (مگر) دربارِ خاص منعقد ہونے کو ہے، ایک ہلکی سی پکار میں ہمایوں کا نام بھی سنا گیا سو داخل ہو کر کیا دیکھتا ہوں کہ بجائے حضرتِ آزاد والے وسیع و شاندار ایوان کے اک تنگ و مختصر لیکن روشن و ہوادار کمرے میں ایک گول میز لگی ہے جس پر لکھا ہے ہندوستان اِس کے گرد کوئی ایک درجن منچلوں کا اجتماع ہے اور ہر ایک کے گلے میں ایک ایک گویا سیاسی ٹکٹ جس سے شاید اِن کا حسب نسب معلوم ہو سکتا ہے لٹک رہا ہے اور وہ یوں بیٹھے ہیں:



جب ہمایوں پہنچا تو کانفرنس شروع ہونے والی تھی اور میز پر پشمینے کی ایک چادر بچھی ہوئی تھی جسے کہیں کہیں کیڑا لگ چکا تھا اور جس کے وسط میں فارسی خط میں "اُردو" کاڑھا ہوا تھا! حاضرین آ آ کر ناظرین اور سامعین بن رہے تھے اور بھلا ہو کسی غیبی طاقت کا جس نے ان جیسی بے جبیں شکی مزاجوں میں ایک متین و مستند کو کرسیٔ صدارت پر بٹھا دیا تھا کہ ان کی متخاصم بغاوتوں کو امن و مصالحت کا سبق پڑھائے +

صدر اُٹھا اور ایک "حقانی" لہجے میں ارکان کی "حاضری لینی" شروع کی جنہوں نے اس طرح لبیک کہا:-

صدر	لاہور	نمائندہ	ملی جُلی چار آوازیں
"	عمر کے لحاظ سے جواب دو۔ اس میں پہلی زندگیاں بھی شامل ہیں!		
"	لاہور!	"	مخزن!
"	اعظم گڈھ!	"	معارف!
"	کانپور!	"	زمانہ!
"	لکھنؤ!	"	الناظر!
"	لاہور!	"	ہمایوں!
"	علی گڑھ!		علی گڑھ میگزین (اور اپنے کئی مردہ دوستوں کی طرف سے بھی)!
"	لکھنؤ!		نگار (اپنی عقل اور "نقاد" کی شکل کے ساتھ)!
"	دہلی!	"	جامعہ!
"	لاہور!	"	نیرنگ خیال!
"	لاہور!	"	عالمگیر!
"	لاہور		ادبی دنیا (اپنے نگران اور اپنے سارے محکمۂ ادارت کی طرف سے بھی)

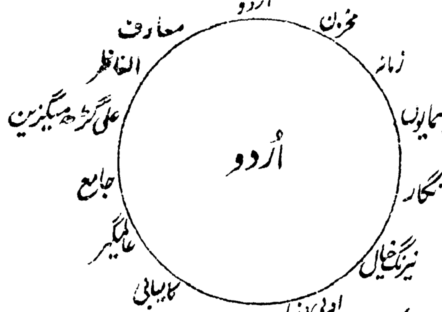
صدر   دہلی   نمائندہ   کامیابی! (ساری پرانی نظامیات کی طرف سے بھی کوسب سے نیا)"

"   حیدرآباد   صدر   اُردو!

باہر کے دروازے پر کھٹ کھٹ کھٹ! اور آوازیں "دروازہ کھولو دروازہ کھولو" ناظرین سامعین بن جاتے ہیں! اور بعض صدر کی طرف حیرت استعجاب سے دیکھتے ہیں!

صدر۔ فی الحال دروازہ کا غلافی پردہ چھوڑ دیا جائے لیکن اگر مسلسل کھٹ کھٹ کے ساتھ اور نعرے بھی مستقل طور پر سنائی دیں تو ہر مستقل مزاج کو اس قومی مجلس میں آنے کی اجازت دی جائے گی (بعض حاضرین ناک بھوں چڑھاتے ہیں) حضرات یاد رکھئے یہ ایک جمہوری مجلس ہی۔ آپ میں سے کوئی صاحب بلکہ سب کے سب میرے سمیت بھی کسی کو باہر کھڑا رہنے پر مجبور نہیں کر سکتے ناظمین کی طرف سے مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ میں آپ سب صاحبوں کو مطلع کردوں کہ اس گول میز میں مستطیل میز ہونے کی قابلیت موجود ہے۔ (اس "استیطال" پر سامعین میں "قیل وقال" ہونے لگتی ہے!) +

لہٰذا آج کے اجلاس کے بعد میں غور کروں گا کہ اور کسے اندر آنے کی اجازت دی جائے۔ ممکن ہے ہماری کوتاہی سے بعض ایسے اصحاب باہر رہ گئے ہوں جن میں "ہونہار برواکے چکنے چکنے پات" ہونے کی صلاحیت ہے، میں اس امر پر بھی غور کروں گا کہ "اندر آنے کی اجازت نہیں" کا تختہ باہر کے دروازے سے ہٹا لیا جائے اور ہم لوگ ایک عام ملکی لسانی کانفرنس منعقد کریں جس میں اُردو کی طرف سے ہندی پسند دوستوں کو بھی دعوت دی جائے!" (نعرہ ہائے تحسین وعلامات چیں بہ جبیں!) اتنے میں میں دیکھ رہا تھا کہ اب میز کی صورت یہ ہے:



اور ان میں کچھ ذرا پرانی مگر زیادہ تر نئی وضع کے لوگ ہیں بعض ہیں کہ عمامے پہنتے ہیں اور ریش دار بھی ہیں لیکن اس ریش کے اندر ہی اتنی صفاچٹ زبانیں سمجھنے بولنے کے مدعی ہیں کہ پتلون کوٹ والے تک شرمندہ ہوں! پھر جو صدر کی تقریر سے بے اعتنا ہو کر میں نے اپنے ہم میزوں کی وضع قطع کی طرف توجہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ

کوئی ہندوستان بھر کا نقشہ پہلو سے لٹکائے ہوئے ہے اور اس کے ایک کونے میں کچھ لکھا ہے جس میں صرف "صحیفہ" پڑھا گیا کسی کے عمامۂ معرفت کے پیچ وتاب میں ادھر پیچ فلسفہ ہے اور اُدھر تاب مذہب!

کسی کا اس قول پر عمل ہے کہ "زمانہ باتو نسازد تو بازمانہ بساز"

کوئی صرف اپنی "نظرے خوش گذرے" میں مست ہوکر "مسحرانہ نگاہوں" سے کسی کے خیال میں گم ہے

کسی کی کوئی سنے نہ سنے مگروہ خواہ مخواہ واعظ بن کر زبانِ حال ہی سے یوں سرگرمِ تقریر ہے کہ "دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا"

کوئی اپنے چھُپے میگزین سے "علیگی" کاغذ کی طالب علمانہ گولیاں برسا رہا ہے۔

کسی کے نقش و نگار میں ریاستِ تحریر اور جوابِ استفسار کا بھاری بھرکم وقار ہے۔

کوئی معنوی حیثیت سے تقریباً جامع معلوم ہوتا ہے اگرچہ صوری نقطۂ نظر سے مانع نہیں!

کسی کی ساری حکمت اسی میں صرف ہو رہی ہو کہ وہ اپنی نت نئی نیرنگیوں اور سالانہ فنّی دعوے داریوں سے ہر کہ ومہ کو حیران و مبہوت کر کے اپنے قابو میں کر لے!

کوئی حسنِ کامیابی کے پر لگائے کاروباری ہین سی ادب کی چوٹیوں اور ادب کی چوٹیوں سی علم کے آسمان تک پہنچ جانے کے لئے کوشاں ہے!

کسی نے نیرنگی کے مقابل میں عالمگیری کو اپنا مطمحِ نظر بنالیا ہے۔

کوئی ہندوستان سے گذر کر زمین کے دونوں کُرے ایک اس کان سے دوسرا اُس کان سے لٹکا رہا ہے کہ وہ دنیا کے ذریعے سے ادب کی اور ادب کے ذریعے سے دنیا کی خدمت خلوصِ وفا و حسنِ عبادت کے ساتھ کرنے کا تاج اپنے اور زبان و ملک کے سر پر رکھنے کا تمنائی ہے!

اور ان "کوئی" اور "کسی" کا صدر وہ ہے جسے اپنی "اردوئیت" کا دعویٰ نہیں لیکن جس کا خاموش و گویا عمل اُسے خود بخود اس انجمنِ ادب کا صدر بنائے ہوئے ہے اور یہ صدارت ہی اک ایسی شے ہے جس کا سب کو کم از کم دل میں متّفقہ اعتراف ضرور ہے!

میں اِس تاک جھانک میں مصروف تھا اور ان صورتوں پر دوبارہ سہ بارہ نظر دوڑانے کا آرزومند تھا کہ پھر باہر سے کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کی آوازیں آنی شروع ہوئیں یہ کہ سالانہ نمبر عید نمبر بقر عید نمبر افسانہ نمبر مستانہ نمبر بہار نمبر بے شمار نمبر!

حاضرین میں اک کھلبلی سی پڑ گئی۔ صدر نے پہلے تو اِس بے ہنگم شور و غل کی طرف ایک متینہ بے توجہی برتی لیکن جب دیکھا کہ اِس سے کام نہیں چلتا تو "خاموش خاموش" کا پُر زور جملہ کہا لیکن پھر بھی بعض بولا کئے اور بعض تو اَور زیادہ زور سے چیخنے چلّانے لگے یہاں تک کہ اِن فصحا میں سے مخزن نیرنگِ خیال عالمگیر ادبی دنیا اور آخیر میں ہمایوں بھی یہ کہہ کر اُٹھ بیٹھے اور اُٹھ کے دروازے کی طرف لپکے کہ اُردو ہمیں عزیز ہے لیکن اپنے "سالنامہ" بچّے کچھ کم عزیز نہیں ہیں! اور جب باقی ماندوں نے کچھ تشویش و اضطراب ظاہر کیا تو باہر سے صرف اتنی آواز سنائی دی کہ "پھر ملیں گے اگر خدا لایا"! ——— گھر پہنچ کر ہمایوں جی ہی جی میں کہتا ہے اے میرے خدا! اب تُو ہی ہم سب کے دلوں کو ملائیو!

ل ب

جذباتِ ہمایوں

وفائے عاشقانہ آزمودہ ہے
لطف [illegible] چکھا ہوا آزمودہ ہے
دنیا کی [illegible] کا یاد درس ہے
[illegible] زمانہ آزمودہ ہے

ہم نوا گلشن کے خوشبو سے ہیں
چمن میں زاغ کی [illegible]
[illegible] کا [illegible] دوست کا اب
[illegible] آرزو [illegible]

اور چمن میں بھی معبودوں میں اور
ملک سے آشنا ہے [illegible]
سیکھے [illegible] سہرا [illegible]
[illegible] اور [illegible]

تم سے بہار میں ہار گئے [illegible]
ناداں بہار [illegible] کا اثر
[illegible] دیوں کا اب [illegible]
عصیاں کی سزا [illegible]

زاہد [illegible] ہمیں بہا کا [illegible]
گرفتہ مضطر
[illegible] ونغماں لوٹ دیا ہے
[illegible] اور [illegible]

بن کے غنچہ ہم دل
[illegible] آشنا
[illegible] دنیا سے [illegible]
[illegible] کو دیکھ

ہمارے [illegible] میں بسے [illegible]
[illegible] وفا سے اور
سینہ [illegible] میں [illegible]
[illegible] بہانہ اور

حضرت اقبال [illegible] وہ [illegible]
[illegible] ہمایوں [illegible]
عالم میں [illegible]

اقبال منزل کی نشست گاہ میں داخل ہونے پر نگاہِ حسن تلاش کے لئے دو مقناطیس ہیں۔ دائیں طرف ایک قطعہ ہے جس میں خوشنویسِ ازل کا نام یعنی

اللہ

بڑی شان سے ہویدا ہے اور بائیں طرف ایک تصویر ہے

یعنی یہ ←――――― ۵

اللہ کی بندی

ان دو کو نہ دیکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ انہیں دیکھ کر دوبارہ نہ دیکھنا قطعی ناممکن ہے۔ اس بتِ ہندی کی ادنیٰ نخوت یہ ہے کہ انسان اللہ سے منہ موڑے تو پھر اسے دیکھے۔

یہ تو پتہ نہیں کہ یہ کسی کی تصویر ہے یا محض مصور کی ذہنیت میں صنفِ نازک کا خیالی معراجِ کمال ہے مگر بینا دیکھنے والوں کا دل یہ ضرور کہتا ہوگا ع

بہشت را چہ می کنم بنا بہشتِ من توئی

آکاش کے جوگی کی سُورگ اُس کے اپنے دل میں ہے مگر اس تصویر سے اتنا وہ ضرور کہے گا۔

"کہیں نہ کہیں تُو ضرور ہوگی! یہ ہو نہیں سکتا کہ خدا مصور سے پیچھے رہ گیا ہو!! تُو ہوگی اور ضرور اپنی اِس تصویر سے بڑھ چڑھ کر ہوگی۔ اے رخِ زیبا! اس تصویر میں تیری صرف ایک جھلک ہے۔ ہاتھ مالائیں، مالا گلے میں اور وہ دو میٹھے پڑوسی یعنی تیرے ہونٹ بس ہلا ہی چاہتے ہیں، قُم باذنی کہنے کو ہیں مگر کہاں تُو خود اور کہاں تیرے فردوسِ ناز کا یہ اختصار؟ اس میں تیری خوشبو کہاں تیری گفتگو کہاں؟ مصوّر نے ذرا سا کچھ دکھلا کر کیا کیا نہیں چھپایا! کس قدر تجھے ڈھانکا ہے؟ مگر مصوّر سچا تھا۔ ورنہ جو بجائے تیرے لباس کی نہ در نہ دلفریبیوں کے خود تیری گلعذاری کی شعریت کی داد دیتا، جو تیرے رنگ کی رونق کو، تیرے روپ کے فروغ کو یوں نہاں کرتا تو تُو اے برقِ مستور خدا جانے کہاں کہاں گرتی؟ اے ناز آفریں! تیرا حُسن بجائے خود ایک خدائی پیغام ہے مگر اس کی ترجمانی کا وقت نہیں ع خرابِ بادۂ لعلِ تو ہوشیار انند کا راگ کون شروع کرے اور اُس کے سننے والے کتنے ہیں؟ مگر ہاں یہ یقین رکھ کہ تو جہاں کہیں بھی ہے دنیا تیری غزل خواں ہے۔ اے اب لبِ پری رخسار خدا حافظ! ہمایوں میں یہ سفر تجھے مبارک ہو مگر اپنی سرخ تلک والی بہنوں کی طرف ایک پیغام لیتی جا! اُنہیں کہہ دے کہ گنگا والے تو مرنے کے بعد اپنی جلی راکھ گنگا میں ڈبوتے ہیں مگر اللہ والے جیتے جی اپنی آبرو گنگا میں بہا چکے ہیں، اب ان سے غصہ گلہ فضول ہے۔ انہیں کہہ دے کہ برسوں تُو خود دیکھ چکی ہے کہ ان کی آنکھیں اس شرم سے جھکی رہتی ہیں کہ ان کے دلوں کی امنگ کہ ہندوستان کی سیوا کریں پوری نہ ہوئی۔ کہہ دے کہ یہ شرمسار ہیں کہ چھوت مٹانے آئے تھے مگر خود اچھوت بن کر رہ گئے اور ان کی انتہائی ندامت یہ ہے کہ جو کام انہوں نے شروع کیا وہ پورا اب کسی اَور سے ہوگا۔ یہ سب کچھ کہنا اور پھر اپنی بہنوں سے پوچھنا کہ اپنوں کو غیر کب تک بناتی رہیں گی۔"

آکاش کا جوگی

---

۵ یہ لکیر کا تیر اللہ ہے۔ رنیر انداز وہ ہے۔ دائیں بائیں مقابل جس طرف سے دیکھو، کمرے کے جس حصّہ سے دیکھو پیرو مرشد غالب کے اس شعر کی مصداق ہے

دل سے تیری نگاہ جگر تک اتر گئی ۔۔۔ دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

جزائے ہمّت

کسی جوانمرد کا مقدّر بُری طرح اُس سے پیش آیا
وہ شر اُٹھایا کہ اُسکو بالکل تباہ و برباد کر کے چھوڑا
اگرچہ قسمت نے دشمنی کی مگر وہ خاطر میں بھی نہ لایا
اگرچہ بے حال ہو چکا تھا مگر وہ شاکی ہوا نہ بے دل
ہزار صدمے اٹھائے لیکن ذرا جبیں پر شکن نہ آئی

بُری طرح اور حد سے بڑھ کر بُری طرح اُس سے پیش آیا
وہ قہر ڈھایا کہ اُس کو بالکل تباہ و برباد کر کے چھوڑا
اگرچہ طالع نے زک پہ زک دی مگر وہ خاطر میں بھی نہ لایا
اگرچہ پامال ہو چکا تھا مگر وہ شاکی ہوا نہ بے دل
ہزار آزار پائے لیکن ذرا جبیں پر شکن نہ آئی

مگر جب اس پر بھی حسبِ سابق نصیب کو گرمِ جور دیکھا
تو وہ جوانمرد سر اٹھا کر یہ چند الفاظ لب پہ لایا
بلا سبب شر اٹھانے والے ستا لے اچھی طرح ستا لے
مگر تجھے او کمینہ پرور! خبر بھی ہے کس سے چھیڑ کی ہے
زمانہ بھر اس کو جانتا ہے کہ میں اپاہج نہ پست ہمّت
سما کی رفعت سے تا سمک میں کسی سے دب کر نہیں رہا ہوں
ہراس بالکل فضول جب تک دفاعِ بے داد کی سکت ہے
خدا نے چاہا تو وہ عوض لوں کہ خود ترا دل اُسے سراہے
جو ٹھان لوں آسمان سے بھی ستم کا پیشہ چھڑا کے دم لوں
یہ کہہ کے مردانہ وار فوراً وغا کے میدان میں در آیا
وغا کے میدان میں در آ کر عمل کی تیغِ دو دم سنبھالی

اُسی طرح اپنے ناموافق نصیب کو گرمِ جور دیکھا
نڈر نظر سے نظر ملا کر یہ چند الفاظ لب پہ لایا
بلا سبب قہر ڈھانے والے ستا لے اچھی طرح ستا لے
جفا کے عادی ستم کے خوگر! خبر بھی ہے کس سے چھیڑ کی ہے
یقین ہے تو بھی مانتا ہے کہ میں اپاہج نہ پست ہمّت
تمام عالم میں آج تک میں کسی سے دب کر نہیں رہا ہوں
مجھے خبر ہے کہ مجھ میں اب تک طویل تابِ مقاومت ہے
خدا نے چاہا تو وہ زک میں دوں کہ عاجز آ کے صلح چاہے
تری حقیقت ہی کیا، اُسے بھی غلامِ خدمت بنا کے دم لوں
بگڑ کے دیوانہ وار فوراً وغا کے میدان میں
وغا کی خاطر قدم جما کر عمل کی تیغ

عمل میں رنجِ شکست سہہ کر عمل کی رفتار تیز کر دی   عمل میں ناکامیاب رہ کر عمل کی رفتار تیز کر دی

یہ رنگ دیکھا تو خود مقدّر گزارشِ عفو لے کے لپکا   اور اُس کے ہمراہ لطفِ داور سفارشِ عفو لے کے لپکا
اِدھر سے دنیائے کامرانی نثار ہونے کی خاطر آئی   اُدھر سے توفیقِ آسمانی نثار ہونے کی خاطر آئی
اِدھر سے سچی مسرّت آئی سکونِ جاوید ساتھ لے کر   اُدھر سے غیبی حمایت آئی خدا کی تائید ساتھ لے کر
اِدھر سے اقبال کی نہایت ہدیۂ زاد لے کے پہنچی   اُدھر سے اللہ کی عنایت پیامِ امداد لے کے پہنچی
یہ طاقتیں مل ملا کے اُسکو مدد کا مژدہ سنانے دوڑیں   مدد کا حق دار پا کے اُس کو مدد کا مژدہ سنانے دوڑیں
تمام غیبی اعانتوں کے ہجوم نے اُس کو آن گھیرا   تمام عالم کی طاقتوں کے ہجوم نے اُس کو آن گھیرا

یہ بھیڑ دیکھی تو اُس نے ٹوکا فضول یہ اجتماع کیوں ہے   فضول حرکت سے کیا نتیجہ فضول یہ اجتماع کیوں ہے
احاطۂ کار میں در آنا صریح بے جا مداخلت ہے   خیالِ اہلِ عمل بٹانا صریح بے جا مداخلت ہے
کسی کا یوں ہرجِ کار کرنا کہاں روا ہے کہیں نہیں ہے   یہ کارِ جبر اختیار کرنا کہاں روا ہے کہیں نہیں ہے
ہجوم بے جا سے فائدہ کیا۔ اُدھر ہٹو۔ اپنی راہ پکڑو   یہاں نہ میلا نہ کچھ تماشا۔ بڑھو بڑھو۔ اپنی راہ پکڑو

یہ سن کے وہ سب ادب سے بولیں معاف کرنا معاف کرنا   بصد لجاجت زبانیں کھولیں، معاف کرنا معاف کرنا
تکدّرِ طبع تو بجا ہے، مگر ہمارا تو عذر سنئے   ملال بھی غصہ بھی روا ہے مگر ہمارا تو عذر سنئے
زمانے کے اتنے ظلم سہنا، یہ کام انسان کا نہیں ہے   اور اُس پہ اس طرح زندہ رہنا یہ کام انسان کا نہیں ہے
یقیں ہے ایسی کڑی مصیبت پہاڑ کو پاش پاش کر دے   ضعیف انساں کی کیا حقیقت پہاڑ کو پاش پاش کر دے

ہمیں فقط اِس قدر بتا دو کہ ”تم میں یہ بل کہاں سے آیا“
یہ غیر مفتوح جوشِ ہمّت یہ عزمِ فاتح کہاں سے پایا“

حکیم آزاد انصاری

اللہ میاں

اللہ میاں میں حاضر ہوں۔

کیا کہا کہ اب تک کہاں تھا؟ اللہ میاں یہ نہ پوچھئے۔ کیا ارشاد ہوا کہ ضرور کہوں؟ اللہ میاں کیوں مجھ سے کہلواتے ہو؟ کوئی مولوی غصے میں آ گیا تو مصیبت پڑ جائے گی۔ ہیں ہیں یہ کیا ہوا؟ اللہ میاں تم تو خفا ہو گئے، میری تو بسم اللہ ہی غلط ہو گئی۔ کیا کہا کہ مولوی کا لفظ سننا ناگوار ہے؟ مولویوں سے تنگ آ گئے ہو؟ مگر اللہ میاں انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اب تمہاری خاطر یہ لوگ چھوڑے تو نہیں جا سکتے! کیا کہا کہ کیوں؟ اللہ میاں تمہاری جانے بلا۔ نہ تمہارے کسی سے تعلقات، نہ باپ دادا کے وقت سے مراعات، تم اپنی بے نیازی میں مخمور ہماری کٹھن زندگی کو کیا سمجھو؟ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بدتر سے بدتر مسلمان بھی ایسا نااہل ہو جائے کہ لحاظ، وضع بالائے طاق اور قوم سے غداری؟ کیا کہا کہ اس میں کیا مشکل ہے؟ اللہ میاں بڑی بھاری مشکل ہے۔ اللہ میاں تم اپنی تنہائی میں کنبہ برادری، میل جول، شادی بیاہ، جلسوں اور جنازوں کا کیا اندازہ کر سکتے ہو؟ اللہ میاں سچ تو یہ ہے کہ خدا ہونا آسان ہے انسان بننا مشکل ہے۔ بازو جب ٹوٹے تو گلے سے بندھتا ہے۔ اب تو مارو یا چھوڑو ان مولویوں سے ہمیں محبت نباہنی ہی پڑے گی۔ کیا کہا کہ کوئی اور بات کروں؟ اچھا اللہ میاں تھینک یُو کہ تم نے اصرار نہیں کیا کہ بتاؤں کہ اب تک کہاں تھا اور ہاں اللہ میاں عقل کی باتیں، نیکی کی باتیں تو جو لوگ تم سے روزانہ ملتے ہیں وہ ضرور سناتے ہی ہونگے مجھ سے باتیں سننی ہیں تو میری لغویات سنو! کیا کہا کہ ہاں ضرور سنوگے؟ اچھا اللہ میاں! میں بھی کوئی بات چھپائے نہ رکھوں گا۔ اللہ میاں مسکراتے کیوں ہو؟ کیا یہ مطلب ہے کہ میں جھوٹ بولوں گا؟ کیا کہا کہ وقت ضائع نہ کروں اپنی داستان شروع کروں؟ اچھا اللہ میاں سنئے!۔ مجھ پر تو یہ تمہارا احسان کیا کم ہے کہ تم نے محض میری خوشی کے لئے کتنے لاکھوں جھوٹ بولنے والے انسان بنائے اور پھر انہیں کیا کیا رتبہ دیا؟ نہیں اللہ میاں ناول نویس نہیں! وہ بچارے تو پھر کچھ سچ بولتے ہیں میرا اشارہ شاعری کے اُن شاہنشاہوں کی طرف ہے جنہوں نے کہیں نروان کا قلعہ آراستہ کیا، کہیں تناسخ کی ندی جاری کی، کہیں یزدان اور اہرمن کو ایک دوسرے سے بھڑوا دیا اور اللہ میاں یہ جھوٹ ہیں کس قدر پیارے؟ اور اللہ میاں وہ بھی تم نے بنائے جو تمہارے نام پر ہر وقت سائنس اور مذہب کا عقد کرانے کو تیار ہیں۔ محض میری تفریح کے لئے؟ اللہ میاں کس قدر تم نے سوچا ہوگا؟ پہلے مجھے پڑھایا لکھایا۔۔۔

شوق دیا اور سوچنے کے قابل بنایا۔ اور پھر یہ سمجھ کے کہ میرا مطالعہ بے لطف رہے گا تم نے مجھ سے ہزاروں سال پہلے ہی وہ لوگ بھی بنا دیئے جن کی باتوں پر ہنستے ہنستے انسان لوٹ جائے۔ اللہ میاں کیا کہا کہ غنیمت ہے کہ کسی بات سے تو کوئی انسان تم سے خوش ہے؟ اللہ میاں۔ میں تو ضرور خوش ہوں! کیا کہا کہ اَور زیادہ خوش رہوں؟ اچھا اللہ میاں یہ بھی کوشش کروں گا مگر سچ تو یہ ہے کہ اَور لوگوں کی طرح مجھے خوشی کی طمع نہیں۔ اللہ میاں بات یہ ہے کہ خالی خوشی سے تو وقت نہیں کٹتا اور انسان خوشی کو ہضم کس چیز سے کرے؟ اچھے اللہ میاں یہ بات تو بتا دو! اللہ میاں بس یہ بات کچھ نہیں کہ مطلب جب آتا ہے تو تم خاموش ہو جاتے ہو۔ کچھ تو ہوں ہاں کرو۔ اچھا اللہ میاں! خوشی کو ہضم کرنے کی معجون نہیں بتلاتے تو ایک بات اَور بتا دو یعنی یہ کہ کونسا پوڈر ملوں کہ تم مجھے خوبصورت سمجھو! سجا رہے والا اٹھنا تو بہت پرانا ہو گیا۔ اللہ میاں! شرارت سے بھی تو چہرہ چمک اٹھتا ہے شرارت کا غازہ مل لوں؟ اللہ میاں! تم تو پھر چُپ ہو گئے! کیا کہا کہ کوئی اَور بات کروں؟ اچھا اللہ میاں کوئی اور بات کروں گا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ تمہاری کانفیڈنشل (Confidential) باتیں ہیں کہ انسان خوبصورت کیسے ہو اور خوشی کی غذا کو کس چُورن سے ہضم کرے؟ ہاں اللہ میاں خوب یاد آیا۔ ایک دن مَیں خواہ مخواہ اپنے آپ کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ مجھے خیال ہُوا کہ تم نے روک دیا کہ فضول وقت مت ضائع کرو یہ کھیل بڑے آدمیوں کا ہے۔ یاد ہے اللہ میاں، اُس دن بہت کوشش کی کہ اپنی روح کو بھی بدل ڈالوں، تم سے نئی اُجلی سی روح مانگ لوں مگر یہ بات حاصل نہ ہوئی۔ اللہ میاں یہ کیا بات ہے کہ گمراہوں کے لئے تم نے نبی بھیجے۔ لاکھوں اوروں کی اصلاح ہو گئی میری نہ ہوئی؟ کچھ نہیں بتاتے؟ کیا کہا کہ یہ باتیں چھوڑوں اپنی کج بحثی کے قصے سناؤں؟ اچھا اللہ میاں میری کج بحثی کے قصے سُن لو۔ ایک دفعہ مَیں دو معمولی سی باتیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک یہ کہ زیادہ نیک ہونا بڑا بھاری گناہ ہے۔ ٹھیک ہے نا اللہ میاں؟ یہ کیا بات ہے اللہ میاں کہ تم مشورہ نہیں دیتے؟ ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ زیادہ نیک ہونا گناہِ کبیرہ ہے اور مثال یہ دے رہا تھا کہ ایک نوجوان لڑکے کی دو بہنیں ہیں جو باوجود حسین اور فہیم ہونے کے نیکی کی معصیت میں گرفتار ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ اس لڑکے کی آنکھوں میں ان دو کا نمونہ کچھ ایسا سما گیا ہے کہ شاید اب تمام عمر وہ مختلف لڑکیوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینکتا رہے۔ یہ ہے ان دو لڑکیوں کی نیکی کی برائی اور میں اپنے سامعین پر یہ واضح کر رہا تھا کہ کسی شخص کا حق نہیں کہ وہ غیر معمولی طور پر نیک ہو کیونکہ غیر معمولی نیکی دنیا کے محدود راس المال پر ایک مذموم قسم کا غصب ہے۔ مگر میرے سامعین کے دل ختم اللہ علیٰ قلوبہم والے دل تھے! ایک نے میری بات نہ مانی۔ اللہ میاں کیا کہا کہ تم نے کسی کے دل پر مہر نہیں لگائی؟ اچھا اللہ میاں! یوں ہی ہو گا! اُنہوں نے خود لگا لی ہو گی! ہاں اللہ میاں دوسری سیدھی سی بات جو لوگوں کو مَیں سمجھانا چاہتا تھا

وہ یہ تھی کہ نیکی کو بدی میں بدلتے رہنا حقیقی مذہب ہے ۔ اللہ میاں کیا کہا کہ میں مضمون چور ہوں اور یہ خیال کسی اَور کا ہے ؟ اللہ میاں خفیف سا حصہ اس میں ایک اور شخص کا ہے ورنہ آج تک زبان سے وہ بات نہیں نکلی جو خود اپنی نہ ہو ۔ ہاں اللہ میاں اس شخص نے کہا تھا کہ ترقی یہ ہے کہ نیکی کو بدی بناتے رہو ۔ میرا خیال ترقی کا نہیں! سوسائٹی چاہے ترقی نہ بھی کرے مذہب کی محتاج ہے ۔ میں ایک اٹل قانونِ فطرت بیان کرتا ہوں وہ شخص ایک عارضی کیفیتِ ارتقا کا نقاش تھا ۔ اللہ میاں جب چیچک کا ٹیکا نہ تھا اور نالیاں صاف رکھنے کی تجاویز نے عملی جامہ نہ پہنا تھا تو یہ نیکی تھی کہ ہر قسم کی وبا کو تیرا قہر اور اپنے گناہوں کی سزا سمجھ کر تسلیم و حمد سے قبول کیا جائے ۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس نیکی کو بدی میں بدل دیا جائے یعنی جو شخص وبا کے معاملہ میں کہے "اللہ کی مرضی" اُسے کافر قرار دیا جائے اور جو شخص ٹیکے اور صفائی میں مدد نہ دے اُسے بدترین گنہگار قرار دیا جائے یعنی اللہ میاں پیشِ نظر ترقی نہ ہو بلکہ تمہاری خوشی یعنی یہ کہا جائے کہ اب تمہارا حکم ہے کہ وبا کو گناہ سے یا قہر سے کوئی واسطہ نہیں ۔ یعنی تمہارے نام سے یہ کہا جائے کہ جو صاف نہ رہیں گے، صاف ہمسایوں میں نہ رہیں گے، صاف شہر اور صاف ملکوں میں نہ رہیں گے وہ مریں گے بھی بُری طرح اور مر کر اٹھیں گے بھی بُری طرح ۔ یہی اللہ میاں تمہارا حکم ہے نا؟ ہاں تو اللہ میاں لوگوں کو میں یہ سمجھا رہا تھا کہ اپنی پرانی غلیظ نیکیوں کا منہ دھو ڈالو اور انہیں سوٹ بوٹ پہنا کر ایسی طرح بدل دو کہ وہ گناہ کی طرح دلفریب اور دلکش ہوں ۔ یہ ہے میرا خیال اللہ میاں! نہ اُس خشک مغز کا خیال کہ ترقی یہ ہے کہ نیکی کو گناہ بناتے رہو! میں تو چاہتا ہوں کہ پرانے گناہوں کی کشش کے عطر سے دنیا کو معطر کروں ورنہ اگلے زمانے کی نیکیاں اگلے زمانے کے گناہ میرے کس کام؟ جب کوئی بھوکا ننگا ہی نہ ہوگا تو خیرات خود بخود ایک فضول حرکت بن جائے گی ۔ جب ہر بچہ سنِ بلوغ سے پہلے ہی دس بیس دفعہ دنیا کے گرد چکر لگا لے گا تو حج کے سفر میں کیا صعوبت باقی رہ جائے گی اور بدو بیچارے کہاں حاجیوں کو پتھر مار رہیں گے؟ میرا نقطۂ خیال اللہ میاں بہت بلند ہے اور وہ یہ ہے کہ حقیقی نیکی صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ تجھے حاصل کر کے بھی محض ازراہِ محبت **اپنے آپ کو تیرا بندہ سمجھنا** یعنی جب تک تُو حاصل نہ ہو نیکی کا نام لینا بھی فضول ہے ۔ وہ ذرائع جن سے تُو حاصل ہوتا ہے اور جنہیں غلط العام میں نیکی بیان کیا جاتا ہے بدلتے ہیں اور بدلتے رہنے چاہئیں ۔ جو آج ٹھیک ہے وہ اسی صورت میں ٹھیک ہے کہ کل وہ غلط ثابت ہو اور انسان کی قسمت ہے کہ وہ جھوٹ پر پلے ۔ خیر یہ بات میں لوگوں کو سمجھا رہا تھا ۔ کسی نے کہا دہریہ ہے! کسی نے کہا بادلا ہے! اللہ میاں اس لفظ پر تو تم بہت ہنسے! اچھا اللہ میاں اب میں لوگوں سے کہوں گا کہ مجھے یہی کہیں کیونکہ اس سے تم خوش ہو مگر اللہ میاں اتنا ذمہ تم لے لو کہ یہ بات اُن کی سمجھ میں آ جائے، اسی وقت ایک صوف

کہنے لگے کہ "لوگو اس شخص پر کلام پلٹ پڑا ہے اسے کچھ نہ کہو۔" لوگوں نے اس صوفی کا پیچھا لے ڈالا کہ "بڑا آیا ہے وہاں سے خدا رسیدہ۔ ایسے کافر کی حمایت کرتا ہے!" اللہ میاں بڑا لطف آیا۔ اُس دن تیرا ایک نقلی دوست (یعنی وہ صوفی) ایک تیرے اصلی (دشمن کہوں کہ دوست اللہ میاں؟ کیا کہا کہ نادان دوست کہہ دوں؟ اچھا یوں ہی سہی!) نادان دوست کے کام آگیا۔ اللہ میاں اس غریب صوفی کو معاف کر دے اور اسے تصوف کی ذلت سے بچا کر معرفت کی وردی پہنا دے! کیا کہا کہ تمہارے کاموں میں دخل نہ دوں؟ اللہ میاں تو تم دخل دینے دیتے کب ہو؟ برسوں کے بعد تو یہ موقع ملا اور یہ بات بھی یونہی بے ساختہ زبان سے نکل گئی۔ پرانی کمبخت بھیک مانگنے کی عادت اب تک نہ گئی۔ کیا کہا کہ معاف کر دیا؟ اچھا، تھینک یُو۔ اللہ میاں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بھُولے کی لغزش تم کبھی کبھی فوراً معاف کر دیتے ہو! کیا کہا کہ اگر معافی مانگتا تو معاف نہ کرتے؟ ہاں ٹھیک تو ہے اللہ میاں! جس کمبخت کو تم پر اتنا بھی اعتبار نہ ہو کہ تم بن معافی مانگے بھی معاف کر دیتے ہو تو اسے تم معافی مانگنے پر کیوں معاف کرو؟ یہ تو اللہ میاں انصاف ہے۔ اس میں تمہیں کوئی برا نہیں کہہ سکتا۔

اللہ میاں میں سمجھا نہیں کہ کیا تم نے پوچھا؟ وہ بات! اللہ میاں تمہیں خوب وہ بات یاد رہی! اللہ میاں سچ تو یہ ہے کہ تمہارے نام پر کج بحثی میں مجھے بے انتہا لطف آتا ہے۔ میں دل ہی دل میں تمہیں یاد کر لیتا ہوں لوگ سمجھتے ہیں کہ بڑا دہریہ ہے۔ انہیں کیا پتہ کہ دیوانہ بکارِ خویش ہشیار! ہاں اللہ میاں تو بات یہ تھی کہ میں نے کہیں کہہ دیا کہ بھئی مجھے تو پرانا بوسیدہ صدیوں کی ذمہ داری تلے دبا ہوا خدا درکار نہیں بلکہ میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ سیکنڈ ہینڈ (Second-hand) کپڑا پہن لیں مگر سیکنڈ ہینڈ خدا ہرگز نہیں۔ تم تو بالکل نوجوان ہو نا اللہ میاں! کس قدر یہ لوگ باتیں بناتے ہیں کہ تم وہی ہو جو تھے! اتنا نہیں سوچتے کہ جس میں خدا ہو کر بھی شباب نہ ہو اُسے خدائی کا کیا مزہ۔ اللہ میاں کیا کہا کہ مجھے اس گستاخی کے بدلے پھُونک دو گے؟ اللہ میاں ہرگز نہیں تم خوب جانتے ہو کہ دنیا میں گنہ ضرور ہیں مگر گنہگار کوئی نہیں۔ اللہ میاں کیا کہا کہ اس بات کا چرچا کروں گا تو ضرور سزا پاؤنگا؟ اللہ میاں میں نہیں مانتا۔ اللہ میاں کیا کہا کہ شاباش؟ - اچھا اللہ میاں تھینک یو مگر تم تو بڑے استاد ہو اور جو میں سچ مچ ڈر جاتا؟ کیا کہا کہ جو میں ڈر جاتا تو مجھے سیدھا جہنم بھیج دیتے؟ اللہ میاں بات تو ٹھیک کہتے ہو! ڈرنے والوں کے لئے جہنم ہی ٹھیک ہے۔ اللہ میاں میں نے تو شروع سے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ دو مصیبتیں اکٹھی برداشت نہ ہونگی۔ یعنی ایک یہ کہ تجھ پر ایمان لائیں اور دوسری یہ کہ ڈریں۔ بندے نے تو پہلی مصیبت انتخاب کر لی۔ اب جس کا جی چاہے وہ ڈرے۔ ہم سے تو یہ نہیں ہوتا کہ تُو بھی ہو اور نیز ڈر بھی ہو۔ اللہ میاں تُو اکیلا ہی کافی ہے۔ اللہ میاں

ایک بات پوچھنی تھی ؟ کیا کہا کہ پوچھوں ؟ ہاں تو اللہ میاں گناہ تو تم معاف کر دو گے بشرطیکہ معافی مانگی نہ جائے مگر نیکی کون معاف کرے گا ؟ کیوں اللہ میاں جواب کیوں نہیں دیتے ؟ یا کہیں یہ مطلب تو نہیں کہ نیکی ایسی جو سمجھی نیکی ہے قطعی طور پر نا قابلِ تلافی ہے ؟ اچھا نہ بتاؤ کبھی نہ کبھی تو یہ عقدہ بھی کھل ہی جائے گا۔ اللہ میاں کیا بات پوچھی ؟ بتانے والی؟ اللہ میاں وہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔ کیا کہا کہ اب میرا کیا خیال ہے ؟ اللہ میاں بڑی دیر کی بات ہے کہ ایک دن یونہی میرے منہ سے شکر کا کلمہ نکلا کہ شکر ہے کہ خدا نے ہندوستان میں پیدا کر کے بھی مجھے بنیا نہیں بنایا۔ اس بات پر اللہ میاں تم بہت بگڑے۔ اِدھر میں بھی جل گیا کہ اللہ میاں کی جو بات ہے نرالی۔ سید کی جائداد بنیا اڑائے اور اللہ میاں بس دیکھا کرے۔ خیر اِدھر میں پیچ و تاب میں تھا اُدھر اللہ میاں تمہیں یہ ضد تھی کہ بنئے کو کوئی بُرا نہ کہے کہ مسٹر سمتھ آگئے۔ مجھے درہم برہم دیکھ کر کہنے لگے کہ کیا بات ہے ؟ اس انگریز کو اصل بات تو میں نے نہ بتائی مگر اس سے پوچھا کہ تم اس ملک میں اجنبی ہو تمہاری بنیوں کی نسبت کیا رائے ہے ؟ سوچ کر کہنے لگا "وہ بنیا بہت اچھا لوگ ہے۔ وہ دولت جمع کر کے کارخانے بناتا ہے۔ ہمارے ملک کی مشین خریدتا ہے۔ انکم ٹیکس دیتا ہے۔ بنک میں روپیہ رکھتا ہے۔ بنیا بہت کام کا آدمی ہے" یہ تھی اس کی رائے۔ جواب میں اسے میں نے یہ کہا کہ بنیا غریب کا خون چوستا ہے۔ اس پر اس انگریز نے کہا کہ غریب آدمی کو خدا اسی لئے بناتا ہے کہ ہشیار آدمی اُس کی محنت سے فائدہ اٹھائے۔ خیر اللہ میاں اُس سے تو بات ختم ہوئی مگر میں پھر سوچنے لگ گیا کہ اللہ میاں اس قدر غریب آدمی کیوں بناتا ہے ؟ کیا اسے غریب پیارے ہیں ؟ بہت دیر تو یہی میرا خیال رہا کہ تمہیں غریبوں سے محبت ہے مگر پھر مجھ پر واضح ہوا کہ نہیں در اصل تمہیں بنیوں سے محبت ہے اور غریب آدمی تم اپنے لئے نہیں بناتے بلکہ بنیوں کے لئے۔ خیر تمہارے کام میں مجھے کیا دخل ؟ ہاں مگر اللہ میاں اُس دن تمہاری ایک بات پر بہت تعجب ہوا۔ پوچھا تھا کہ تم نے مسلمانوں کو کیوں چھوڑ دیا ؟ تم نے جواب میں کہا کہ ہرگز نہیں۔ پھر جو میں نے پوچھا کہ اللہ میاں تم کن مسلمانوں کے ساتھ ہو تو اللہ میاں تم نے کہا جاپان میں۔ پھر جو پوچھا کہ وہاں کون مسلمان ہیں تو اللہ میاں تم نے کہا کہ مسلمان وہ ہے جو محنت سے کام کرے، تھوڑا کھائے بہت نہائے، ہر وقت مسکرائے اور میرا نام لے کر طارق کی طرح رخشِ عمر کو غلطی کے سمندر میں ڈال دے۔ پار لگانا میرا کام ہے۔ یہی بات پوچھتے تھے نہ اللہ میاں ؟ مگر اللہ میاں میں تو اس نئی تعریف سے ایسا ڈرا کہ اسے اب تک چھپائے رکھا۔ آج تمہارے پوچھنے پر ظاہر کرتا ہوں۔ مگر اللہ میاں سینکڑوں دفعہ جی میں آیا کہ لوگوں سے کہوں کہ کبھی نمازوں کو صدیوں ہم سب نے آزمایا۔ اللہ میاں بھی اکتا گیا ہو گا کہ یہ کمبخت فرصت ہی نہیں دیتے آؤ نمازوں کو چھوڑ کر دیکھیں !" اللہ میاں کیا کہا ؟

یہ بات کیوں نہ کہی؟ اللہ میاں میری کمزوری۔ کیا کہا کہ بنتا بہت ہوں؟ ہاں اللہ میاں یہ بھی کمزوری مجھ میں ہے مگر اللہ میاں مجھے بالکل ہی فیل تو نہ کرو۔ کیا کہا کہ نہیں یہ خیال نہیں ہے۔ اچھا تو اللہ میاں یہ کام کیسے ہو کہ مذاق مذاق میں مسلمان کام کے آدمی بن جائیں؟ کیا کہا کہ کوشش کروں! اللہ میاں کچھ تم بھی تو مدد کرو! تمہیں کیا پتہ کہ مسلمان کی کھوپڑی کیا آفت ہے؟ گولی سے یہ نہ پھٹے، علم سے یہ نہ پھوٹے عقل سے عاری اور دولت پر بھاری کچھ تم اسے قدرے نرم کردو!۔ کیا کہا کہ مسلمان بجائے تمہارے ہاتھ بکنے کے تمہیں خریدنا چاہتے ہیں اور یہ تمہیں ناگوار ہے؟ بچارے مسلمان خود بھی کچھ نہ بنے اور تم سے بھی گئے!

اچھا اللہ میاں ایک بات اور بتا دو! کیا کہا کہ پوچھوں؟ ہاں اللہ میاں میں کیا کروں؟ کیا کہا کہ جو جی میں آئے کروں؟ نہیں اللہ میاں یہ بات نہیں۔ میں چاہتا ہوں تم کچھ میرے جی میں ڈال دو۔ نہیں؟ اچھا یہ بھی نہیں تو پھر یہ کرو کہ میرے دل میں رہا کرو۔ کیا کہا کہ اچھا! اللہ میاں تم تو میرے ہونا؟ اللہ میاں میں تمہیں کسی کو اُگلا نہ دوں گا لوگوں کی طرح گلی کوچے میں تمہارا ذکر نہ کروں گا۔

اللہ میاں! اللہ میاں! اب کیوں نہیں سنتے؟ کہاں گئے؟

ارے ابھی تو مجھے کیا کچھ کہنا تھا۔ اللہ میاں تم سنتے تو تمہیں سناتا کہ کل رات تمہیں کس کس طرح یاد کیا۔

۲

اللہ میاں! وہ حقیقی بیداری کی زندگی جس میں تم اور میں رُو در رُو تھے کس قدر جلد ختم ہوئی؟ اب پھر وہ کمبخت خواب ہے جس میں زر کے زور سے عقل فرمانروائے کارہے، جس میں آج اور کل کا گورکھ دھندا ہے۔ اللہ میاں! اللہ میاں!! سنتا نہیں تو دیکھ! دیکھ!! عقل کس طرح میری گردن دبوچے ڈالتی ہے!۔ اللہ میاں اس خواب میں میرا ہونا اور تیرا نہ ہونا دونوں غضب ہیں۔

اللہ میاں! کاش ذرا تم اور ٹھہرتے! ایک بات تم سے کہتا۔ تمہیں بتلاتا کہ باوجود اس مساوات کے کہ تم میرا خواب ہو اور میں تمہارا خواب ہوں (اور یہ کون کہے کہ دونوں میں سے کس کا خواب بہتر ہے؟) میں تم سے معذرت کرتا۔ تم سے صرف ایک جملہ کہتا۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

اللہ میاں! تم خود سمجھ لیتے کہ کس کا حق کس نے ادا نہ کیا مگر میرا مطلب یہی ہوتا کہ قصور میرا تھا۔ اللہ میاں! اللہ میاں!! دیکھ! عقل کمبخت مجھے کھائے جارہی ہے، مجھے کہتی ہے کہ میرا جسم میرا اپنا نہیں۔ اس پر ملک کے،

شہر کے، ہمسایوں کے، ماں جایوں کے، حقوق ہیں۔ کہہ رہی ہے کہ میرے خیالات میرے اپنے نہیں کیونکہ وہ عکس ہیں اُن حالاتِ گذشتہ و حاضرہ کا جن کا ظہور میرے قربِ ذہنی میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ کہہ رہی ہے کہ ندی میں اگر ابر کی پرچھائیں ندی کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہیں تو میرے خیالات بھی میرے اپنے ہو سکتے ہیں ورنہ ہرگز نہیں۔ اللہ میاں جب نہ جسم نہ خیال کچھ بھی میرا اپنا نہیں تو دنیا مجھ سے چاہتی کیا ہے؟ میرے کچھ نہ ہوتے پر یہ دنیا مجھ پر کیوں اس قدر حاوی ہے؟ اللہ میاں! جلدی پہنچ نہیں تو عقل مجھے مٹا دے گی! اللہ میاں! تم نہیں آتے! اچھا وہ تو سُن لو کہ تمہیں کس طرح یاد کیا! اللہ میاں! میرا ایک بھائی ہے جو حاجی اور حافظ ہے اور تمہیں دوست بھی رکھتا ہے۔ اسے اپنا دوست بنا کر تمہیں میں یوں یاد کر رہا تھا۔

اے دوست!

سورج اور تاروں کا، چاند اور بادلوں کا ذکر تو کر دوں مگر زبان کہاں سے لاؤں؟ کس خلوص، کس تپاک سے فطرت کے یہ معجزے انسان کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں؟ ان کی ثقاہت میں کیا رعنائی ہے؟

اے دوست!

کیا تم نے سورج کی Courtesy پر کبھی غور کیا ہے؟ سورج میرا استاد ہے تو چاند میرا بھائی جسے گھٹنے بڑھنے کا گلہ نہیں، جیسے نور اور سایہ برابر ہیں۔ استاد کو یا بھائی کو ترقی کی فکر نہیں، تنزل کا غم نہیں اور ہو تو کیوں ہو؟ جو اپنے کام پر مستعد ہیں غمِ فردا اُن کی بلا کو۔

اے دوست!

مجھے لمبا سفر درپیش ہے۔ زادِ راہ کے لئے سورج اور چاند کی مثال کو اپنے دل میں سواحتیاط سے سنبھال لیا ہے۔ بادل مجھے پانی پلا دیں گے، تارے مجھے رستہ بتا دیں گے۔ نہ سہموں گا، نہ بھٹکوں گا سیدھا چلا جاؤں گا۔

اے دوست!

دل میں سب کچھ ہو گا مگر خالی ہاتھ جو وہاں جا نکلا تو میرا کیا حال ہو گا؟ کیا تمہیں پتہ ہے کہ وہاں کیا تحفہ قبول ہوتا ہے؟ اتنا مجھے معلوم ہے کہ وہاں پوچھا جاتا ہے

"کیا لائے ہو؟"

اے دوست!

میں کیا جواب دوں گا؟ اپنے استاد سورج سے پوچھ چکا ہوں وہ کچھ نہیں بتاتا۔ بادلوں سے پوچھو تو غائب ہو

جاتے ہیں، تاروں سے دریافت کرو تو ہنسنے لگتے ہیں۔ انسانوں سے بہت پوچھ گچھ لیا۔ یہی کہتے ہیں کہ کوئی دلفریب سا جھوٹ پیش کر دینا۔

اے بھائی اور دوست!

اس دنیا میں کہیں کہیں صداقت کی خوشبو ہے۔ تم تو اس کا عطر پیش کر دینا اور جب مجھ سے پُوچھا جائیگا کہ کیا لائے ہو؟ تو میں یہ کہہ دوں گا

"حضور میں تو کہیں گیا نہ تھا"

اور یہ سچ ہوگا۔ یہاں ہونے پر بھی وہیں ہوں۔

۳

اللہ میاں! یہ تھا تمہیں یاد کرنے کا ایک طریقہ مگر سچ پوچھو تو تصنّع چاہیے کتنا ہی لیاقت کے عمامے اور اعتقاد کے جُبّے میں ملبوس ہو پھر تصنّع ہے۔ اور تمہارے اور میرے درمیان تصنّع کیوں ہو؟ اللہ میاں کیا کہا کہ ٹھیک کہتا ہوں؟ اللہ میاں! تم آگئے؟ ہپ ہپ ہرّے۔ اللہ میاں! تم کہاں تھے؟ کیا کہا کہ یہیں کہیں؟ اللہ میاں تم چھپتے کیوں ہو؟ کیا کہا کہ چھپیں نہ تو اور کیا کریں؟

کس سے ملیں، کس سے نہ ملیں؟؟

عبدالعزیز

نظارہ تو تھا لیکن ابھی دیکھنے والی آنکھیں نہ تھیں، دیکھنے والی آنکھیں تو تھیں لیکن ابھی محسوس کرنے والا دل نہ تھا، محسوس کرنے والا دل تو تھا لیکن ابھی سوچنے والی روح نہ تھی۔ سوچنے والی روح تو ہے لیکن ابھی وہ پیدا کرنے والا خدا نہیں بنی!

شیرینیاں، رنگینیاں، گلچینیاں بیدینیاں ہوں لیکن اگر حسن بینیاں ہیں تو یقیناً حق آفرینیاں ہیں!

مکائدِ نفس

تسکیں کو، زندگی کا فنا نام رکھ دیا — جو درد تھا، اُسی کا دوا نام رکھ دیا

کیا شے ہے علم؟ حاصلِ اوہام رنگ رنگ — ترکیب دے کے جہل کو، کیا نام رکھ دیا

کہتے ہو جس کو حق، وہ ہے باطل کا ایک رُخ — کیا تم نے اُس کا نامِ خدا! نام رکھ دیا

فرسودگی میں جب کوئی لذّت نہ پا سکے — ہر کُہنہ شے کا ہم نے نیا نام رکھ دیا

کل تک جو کفر تھا اُسے ایماں بنا لیا — اپنی رضا کا حق کی رضا نام رکھ دیا

ایماں جو کل تھا آج اُسے الحاد کہہ دیا — اتنا سا فرق ہے کہ جُدا نام رکھ دیا

جس وضع سے ہو فطرتِ نو شیوہ کو ابا — یونہی اک اُس کا بے سروپا نام رکھ دیا

خالی سبُو میں شورشِ دریا، فریب ہے — دل کی صدا کا حق کی صدا نام رکھ دیا

نیکی وہی ہے اے متذبذب وہی بدی — تُو نے ہی اک سے اِک کا جُدا نام رکھ دیا

دل جس پہ خوش ہوا اُسے پہنچا کے عرش پر — مقبولِ خاصِ ربِّ علا نام رکھ دیا

دِل جس سے پھر گیا اُسے شیطاں بنا دیا　　مردُودِ بارگاہِ خدا نام رکھ دیا

ظلمت پہ نور، نُور پہ ظلمت ہے کامیاب　　غافل نے اِس کا صبح و مسا نام رکھ دیا

قِلّت ہمیشہ دب گئی کثرت کے سامنے　　ہر ناروا کا اُس نے روا نام رکھ دیا

تسکیں کہیں نہ جب دلِ مظلوم پا سکا　　حدِّ ابد کا روزِ جزا نام رکھ دیا

اے دل طلسم خانۂ وہم و خیال کا　　بھولے سے کس نے ارض و سما نام رکھ دیا

ہے ہر نفس پیامِ فنا باغِ زیست کو　　صرصر کا، آہ کس نے صبا نام رکھ دیا

سودا سے جب ہوا دلِ وحشی کنارہ گیر　　سودائیوں نے اِس کا فنا نام رکھ دیا

معراجِ آرزو کی یہ پروازِ فکر ہے　　ناکامیِٔ طلب کا خدا نام رکھ دیا

جو کچھ نہیں ہے کیا ہے وہ، آخر کہاں ہے وہ؟　　جب کھوج ذات کا نہ ملا نام رکھ دیا

کیا تُو بھی ہم سے ہے، عدمِ مطلق! اِس پہ خوش
تُو کچھ نہیں، یہ ہم نے ترا نام رکھ دیا!!

حامد علی خاں

اب پھر۔ کم ازکم مغرب میں۔ یہ زمانہ آتا ہے کہ پاکبازی و ذوقِ نظر کے اوصاف حاصل ہو جانے پر لباس ایک بارِ ناگوار قرار پاتا ہے اور حسنِ مادرزاد کا نظر فریب اظہار اس درجہ خوبی تصور کیا جاتا ہے کہ اُس کی عملی تلقین وتشہیر (Demonstration and advertisement) کی خاطر مس ہاڈ الین کو جاپانستان کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ فی الحقیقت، عُریانی، ایسے زمانہ میں جب کہ حسیاتِ حیوانی تعلیم رائج کے زیرِ سایہ معدوم ہونے کی حد تک پامال ہو چکی ہوں اور کپڑے کے دام ملکی درآمد و برآمد کے بدولت دو بالا ہو گئے ہوں، نسبتاً زیادہ مفید اور برائے نام مضرت رساں رہ جاتی ہے۔ عریانی کا ایک ادنیٰ کرشمہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ "یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا الٹا" اور اس میں شک نہیں کہ الٹے سیدھے کا امتیاز رفع ہو جانے پر اور کچھ نہیں تو یہی آسانی پیدا ہو جاتی ہے کہ ایسے جامہ کو آنکھیں بند کر کے چاہے جس رخ سے استعمال کیا جا سکتا ہے!

(۲) مفلسی پر غور کیجئے :۔

ایک زمانہ تھا کہ انسان کے کان سیم وزر کے نام تک سے نا آشنا تھے۔ ہر متنفس بے سیم وزر یعنی مفلس تھا اور مفلسی اُس زمانہ میں شانِ انسانیت تھی۔

پھر ایک زمانہ آیا کہ سیم وزر کا پتہ چل جانے پر، مال و دولت حاجت برآری کا ذریعہ قرار پا گئے اور مفلسی تکلیف دہ سمجھی جانے لگی، مگر پھر بھی اطمینانِ قلب کی خوبی افلاس ہی میں تسلیم کی جاتی تھی اور کہا جاتا تھا کہ ؎

دو قرصِ نان اگر گندم است یا از جوَ	دو تائے جامہ اگر کہنہ است یا خود نوَ
بچار گوشۂ دیوارِ خود بخاطرِ جمع	کہ کس نہ گوید ازیں جا بخیز و آں جا رو
ہزار بار فزوں تر بنزدِ ابنِ یمین	ز فرِ مملکتِ کیقباد و کیخسرو!

اب ایک زمانہ آتا ہے کہ دولت۔ اور محض دولت۔ جوہرِ شرافت و روحِ انسانیت قرار پاتی ہے سیم وزر کو "ستارِ عیوب و قاضی الحاجات" کا مرتبۂ خداوندی مل جاتا ہے اور مفلسی بدترینِ عیوب تصور کی جاتی ہے۔ مفلسی کے اسباب کے متعلق ایک دوسرے کو متہم کرنے لگتا ہے۔

ایک کہتا ہے کہ گوشت خوری سے اسراف پیدا ہوتا ہے اور اسراف سے مفلسی؛ دوسرا کہتا ہے کہ گوشت خوری انسان میں اُس وقت سے پیدا ہوئی جب وہ فلاکت زدہ ہونے کی وجہ سے جنگل کے جانوروں سے پیٹ بھرنے پر مائل ہوا۔ سبزی خور کا دعوےٰ ہے کہ گوشت خوری مفلسی کا پیش خیمہ ہے، اور۔ گوشت خور کا استدلال ہے کہ مفلسی گوشت خوری کی بنا ہے؛ واقعہ یہ ہے کہ مفلسی کو سبزی خوری سے لے کر گوشت خوری تک کسی "خوری" سے تعلق نہیں۔

البتہ چغل خوری اور حرام خوری خارج از بحث ہیں۔

فی الحقیقت مفلسی ایسی بُری چیز نہیں جیسی کہ سمجھی جاتی ہے۔ مفلسی کی موجودہ خوبی یہ ہے کہ وہ فاقہ مستی کا عادی بناتی ہے، اور فاقہ و فقر نفس کشی کی پہلی سیڑھی ہے۔ فاقہ مستی کے زیر سایہ قحط و وبا کے نتائج نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کئے جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ انسان کو خود فراموشی کا مرتبۂ اعلیٰ حاصل ہو جاتا ہے۔ فاقہ مست کا ہاتھ حسب حیثیت اپنے ہی منہ کی طرف جائے گا اور شکم سیر کا ہاتھ حسب حاجت گوش مدعی کی جانب، ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!

(۳) ملازمت پر نظر ڈالئے:-

ایک زمانہ تھا کہ انسان کسی دوسرے ہم جنس کا مطلق تابع فرماں نہ تھا؛ ہر شخص اپنی بھوک کھاتا اور اپنی نیند سوتا تھا۔ تمام عالم مساوات کا مکمل نمونہ تھا۔

پھر ایک زمانہ آیا کہ کھیتی اور بیوپار کے بعد چاکری بھی ایسا شیوۂ زندگی قرار پایا جو بھیک کے سوائے سب سے بدتر مانا گیا۔ اب بھی یہ ایک وطیرۂ مذموم ہی رہا۔ اس قدر مذموم کہ عمر خیام کی رائے میں دو دن میں ایک روٹی اور ایک کوزہ بھر ٹھنڈا پانی میسّر آجانا اپنے جیسے دوسرے انسان کی خدمت کرنے سے بدرجہا افضل تھا

یک ناں بدو روز گر شود حاصلِ مرد   وز کوزۂ بشکستہ دمے آبے سرد
مامورِ دگر کسے چرا باید بُود   یا۔ خدمتِ چوں خودے چرا باید کرد؟

اب زمانہ آتا ہے کہ غلامی آزادی سے بہتر اور ملازمت دنیا بھر کے مشاغل سے افضل قرار پاتی ہے؛ تجارت کمتر اور زراعت زیادہ تر محض جاہل یا نیم تعلیم یافتہ طبقہ کا شیوۂ حیات بن جاتے ہیں۔ ملازمت اس درجہ چوٹی کی خوبی مانی جاتی ہے کہ تعلیم کا مقصدِ انتہائی، تربیت کا مقصدِ آخری، بلکہ حیات کا مقصدِ واحد نظر آتی ہے۔ انسان پڑھتا ہے تو ملازمت کی خاطر، نیک اطوار بنتا ہے تو ملازمت کی خاطر، عبادت کرتا ہے تو ملازمت کی خاطر، اور جیتا ہے تو ملازمت کی خاطر۔ سُنتے آئے تھے کہ بھیروں کی راگنی ایک ایسی راگنی ہے جو صبح کے علاوہ اور اوقات میں بھی کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے؛ مگر اب دیکھتے ہیں کہ چاکری کی دُھن، سوہنی سے لے کر بھیروں تک اور ملہار سے لے کر کجری تک، ہر راگنی پر ہر وقت و موسم میں غالب آجاتی ہے۔

(۴) چند دیگر عادات کا تغیر مجملاً ملاحظہ کیجئے:-

انسان پہلے جینے کی خاطر کھاتا تھا؛ اب کھانے کی خاطر جیتا ہے؛ پہلے مذہب کی خاطر لڑتا تھا اب لڑنے

کی خاطر مذہب اختیار کرتا ہے؛ پہلے انسانی آبادی کی خاطر حیوانات کا استیصال کرتا تھا، اب حیوانات کی خاطر انسانی آبادی کا قلع قمع کرتا ہے۔

اس موقع پر احتمال پیدا ہوتا ہے کہ آپ امثالِ مذکورہ سے یہ نہ تصور کرلیں کہ ایک چیز کا نیک سے بد ہو جانا ایک عرصۂ دراز کے تغیر پر منحصر ہے ۔۔۔ دراصل ایسا نہیں ہے۔ انقلابِ احتیاج ۔یا۔ تغیرِ میلانِ طبع کسی مدت کا محتاج نہیں؛ یہ تدریج بھی صورت پذیر ہوتا ہے اور فی الفور بھی ۔۔۔ گردشِ ایام کے ساتھ ساتھ بھی پیدا ہوتا ہے اور حالاتِ گردوپیش کے اعتبار سے بھی۔

مثالاً:۔۔۔ راست گوئی ۔یا۔ دروغ بافی ایک ایسا فعل ہے جو ایک ہی زمانہ میں محض حالاتِ گردوپیش کے اعتبار سے عیب بھی ہے اور ثواب بھی۔ راستی اگر عبادت کی شان ہے تو دروغ فنونِ لطیفہ کی جان ہے۔ راستی دہقان کی جھونپڑی اور خدا کے گھر میں نیکی ہو، مگر محفلِ مشاعرہ اور مجلسِ مباحثہ میں بدی ہے؛ دروغ غلامی کی حالت اور نزع کی کیفیت میں عیب ہو، مگر ایوانِ سلطنت اور عدالت کے کمرے میں خوبی ہے۔

اسی طرح:۔۔۔ چہل قدمی ۔۔۔۔ جوان آدمی کے لئے حماقت ہے اور سن رسیدہ کے لئے ضرورت!

فاقہ ۔۔۔۔ مفلس کے لئے مصیبت آمیز ہے اور متمول کے لئے صحت انگیز!

کوششِ اتحاد ۔۔۔۔ شملہ کی بلندی پر عیب، جنوبی ہند کی سطح پر خوبی، اور پنجاب کی حدود میں گناہِ عظیم ہے!!

نظریۂ نیک و بد کی تشریح و توضیح کے بعد استدلال کی تکمیل محض اس جملہ سے ہو جاتی ہے کہ "خانہ جنگی" بھی گردشِ ایام کے تحت میں ۔یا۔ تغیرِ گردوپیش کے اعتبار سے، عیب کے بجائے خوبی بن جانے کی صلاحیت رکھتی ہے"

+ + + + + +

محض تجرباتِ انسانی کی بنا پر موازنہ کیجئے:۔

بظاہر اس استدلال میں اہمیت نظر آتی ہے کہ "خانہ جنگی" کو دنیا ہمیشہ سے نقصان رساں سمجھتی آتی ہے اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان نے ہمیشہ اس کو مضرت رساں ہی پایا ۔۔۔ مگر بباطن یہ استدلال محض نمائشی ہے

واقعہ یہ ہے کہ انسان کے تمام معقولات کی بنا اُس کے تجربہ پر نہیں ہوتی۔ اکثر کی بنیاد محض ہوا پر ہوتی ہے۔

وہ معقولات جو دراصل تجربہ کی بدولت وجود میں آتے ہیں ہمیشہ عمل کے موافق ہوتے ہیں۔ اور حیوانی ہوتے ہیں؛ جن کو تجربہ سے تعلق نہیں ہوتا وہ عمل سے متناقض ہوتے ہیں۔ اور انسانی ہوتے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل میں چند اقوال و افعال کا مقابلہ کیجیے:۔

انسان کہتا ہے کہ "زندگی کا دارمدار پانی پر ہے"۔ یا "آگ جلا دیتی ہے"۔ چنانچہ وہ ہمیشہ پانی کو استعمال کرتا ہے اور آگ سے بچتا ہے۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں بتایا جا سکتا جب انسان نے پانی کا استعمال ترک کر دیا ہو۔ یا۔ اپنے جسم کو آگ سے محفوظ نہ رکھا ہو۔ ایسے مقولات تجربہ کی بنا پر وجود میں آتے ہیں اس لئے انسان اُن کے خلاف کبھی عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔ غور کیجئے تو حیوان کو بھی آگ اور پانی کی بابت یہی علم ہے اور وہ بھی پانی کو استعمال میں لانے اور آگ سے محفوظ رہنے پر کاربند ہے۔ اس قسم کے مقولات کا علم انسان و حیوان میں مشترک نظر آتا ہے اس لیئے وہ کرشمۂ انسانیت نہیں مانے جا سکتے، بلکہ درصل حیوانی ہیں۔

دوسری قسم کے اقوال میں، انسان ہمیشہ سے کہتا آتا ہے کہ "جھوٹ بولنا بُرا فعل ہے"، مگر ہمیشہ سے خلوت و جلوت میں جھوٹ بولتا آتا ہے۔ یا۔ انسان ہمیشہ کہتا رہا ہے کہ شراب نوشی نہایت مضر حرکت ہے مگر ہمیشہ مے آشامی پر عامل رہا ہے۔ ایسے مقولات پر عمل نہ کر سکنے سے ترشح ہوتا ہے کہ اُن کی بنا تجربۂ انسانی پر نہیں ہے! اگر یہ تجربہ پر مبنی ہوتے تو انسان اُن کے برعکس عمل کرنے کی جرأت تک نہ کر سکتا۔ غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ایسے مقولات کو حیوان سے کوئی تعلق نہیں اور وہ محض انسان کا طرۂ امتیاز ہیں۔ لہذا انسانی ہیں۔

اسی طرح انسان ہمیشہ کہتا رہا ہے کہ "خانہ جنگی مضر ہے" مگر ہمیشہ خانہ جنگی پر عامل رہا ہے۔ گویا اس مقولہ کو فعل سے برعکس ہونے کی وجہ سے تجربہ پر مبنی نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ بھی ایک ایسا انسانی مقولہ ہے جس کو عمل سے بہت کم تعلق ہے۔ ایسے مقولات محض انسانی غلط فہمی و غلط بیانی پر روشنی ڈالتے ہیں:

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ   لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں!

✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣

انسانی غلط فہمی و غلط کاری کے لحاظ سے مجھے ایک واقعہ یاد آجاتا ہے جو بجائے خود و قیع نہ ہو مگر برمحل ضرور ہے۔ مضمون کی طوالت کا خیال بھی اُس کے بیان کر دینے کی خواہش پر غالب نہیں آتا اور میں اُس کو دُہرانے پر اتر آتا ہوں:۔

حدیثِ دلکش و افسانہ از افسانہ می خیزد
دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

ایک روز شام کے وقت، تمام دن قیصرِ ہند اور ملزم کے تنازعات میں سر مار چکنے کے بعد، میں اپنے بنگلہ

کے سامنے والے چبوترے پر، آرام کرسی پر دراز، حقہ سے لطف حاصل کرنے میں مصروف تھا اور سوچ رہا تھا کہ چاروں طرف نظر آنے والے بلند درخت بھی اگر جاندار سمجھ لئے جائیں تو یہ ایک ایسی مخلوق قرار پائے گی جو یک پا یہ ہے۔ کہ۔ ایک صاحب مع اپنے پنج سالہ صاحبزادہ کے دفعتاً نازل ہوئے اور ایک کرسی آگے بڑھا کر جلوہ افروز ہو گئے۔ مجھے اپنے مشغلۂ تخیل سے بادل ناخواستہ دست کش ہونا پڑا اور اُن کی مہمل گفتگو میں وقت ضائع کرنا پڑا۔ اُن کی گفتگو کا شباب تھا کہ آندھی آگئی اور ہم سب کو پوری عزت کے ساتھ برآمدہ میں پسپا ہونا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ بچہ اپنی بھول سی ٹوپی کو حملۂ باد سے بچانے میں مصروف تھا اور ہوا کا ہر جھکڑ ٹوپی اڑا لے جانے میں زور آزمائی کر رہا تھا۔ بالآخر اس کوشش مسلسل سے عاجز آکر بچے نے اپنے بزرگوار سے کہا "ابا یہ ہوا نہیں مانتی"

"لاؤ ٹوپی مجھے دے دو" بزرگوار نے جواب دیا

جس قدر سوال کا بھولا پن مزہ دار تھا اُسی قدر جواب کا خرانٹ پن قابل تنفر تھا۔ سادہ لوح بچے نے محض ہوا کی دست درازی کی شکایت کی تھی اور ٹوپی کے متعلق کسی امداد کی خواہش نہیں کی تھی۔ مگر۔ گرگ باراں دیدہ نے ہوا کا معاملہ قطعی نظر انداز کر دیا اور ٹوپی کو اپنی نگرانی میں لے لینے کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ مجھے اس سوال و جواب میں وہی لطف آرہا تھا جو ایک معاملہ فہم کو دو مختلف ممالک کے باہمی نامہ و پیام میں آتا ہے۔ بچے کا ننھا سا دل اپنی ٹوپی سے دست بردار ہونے پر مائل نہیں ہوا۔ تاہم۔ ہوا سے پریشان ہو کر اب اُس نے مجھ سے خطاب کیا "تم ہوا کو یہاں کیوں چلنے دیتے ہو؟"

"ہوا کو روکنا مجھے نہیں آتا" میں نے اُس کی بساط کے موافق جواب دیا۔

"ان درختوں کو ہٹا دو۔ پھر ہوا نہیں چلے گی۔" اُس نے بے ساختہ تدبیر بتائی۔

وہ آندھی اتر گئی، وہ صحبت گذر گئی۔ مگر۔ اُس معصوم ہستی کی بظاہر لائق تبسم تدبیر میرے حافظہ میں باقی رہ گئی۔ میں نے بارہا اُس پر غور کیا اور ہر مرتبہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا کے تمام ذی فہم مدبر اور طاقتور حکمران اسی تدبیر پر کاربند نظر آتے ہیں۔

ہوا اور درخت کے مسئلہ میں، درخت اُس جزو کو ظاہر کرتے ہیں جو مرئی ہے اور ہوا اُس کو جو غیر مرئی ہے۔ ہوا ایک نظر نہ آنے والی قوت ہے جو چلتی ہے اور درخت مادی شے ہے جس پر اس قوت کا اثر ہوتا ہے۔ ہوا بمنزلہ مذہب فلسفہ اور انقلاب کے ہے اور درخت بمنزلہ شہر، معاشرت اور انسان کے ہیں۔ ہوا کا اثر درختوں پر ہوتا ہے اور انقلاب کا اثر انسانوں پر۔ آپ نہ ہوا کو دیکھ سکتے ہیں نہ فی نفسہٖ انقلاب کو۔ درختوں کی جنبش، گرد و غبار کی سرگردانی

ابر کے ٹکڑوں کی دوڑ؛ یہ سب ہوا کے کرشمے ہیں، بذاتِ خود ہوا نہیں ہیں - اسی طرح - بازاروں کی ہڑتال، پولیٹیکل جلسوں کی بھرمار، اخباروں کی زبان درازی، اور شہروں کی شورش؛ سب انقلاب کے نتائج ہیں، فی نفسہٖ انقلاب نہیں ہیں۔ مشاہدہ کرنے والا نظر آنے والے نتائج سے نظر نہ آنے والے اسباب پر رائے لگا دیتا ہے۔

ہر انقلاب و شورش کے موقع پر ایسے بھاری بھرکم افراد کا استیصال کیا جاتا ہے جو انقلاب و شورش سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں - اور اس اعتماد پر کیا جاتا ہے کہ اُن کے استیصال سے انقلاب و شورش رفع ہو جائے گی - گویا - آندھی کے موقع پر بڑے بڑے درخت، جو زیادہ ہلتے ہوں، اس امید پر کاٹ ڈالے جائیں کہ آندھی جاتی رہے گی۔ ان دونوں تدابیر میں بظاہر کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا اور اس اعتبار سے میں اُس کم سن بچّے کی تدبیر اور مدبرینِ ملک کے عمل کو یکساں طور پر غلط فہمی پر مبنی پاتا ہوں۔

+ + + + + +

سب کے آخر میں، خانہ جنگی کی خوبیاں قابلِ غور ہیں:-

خانہ جنگی کی برکات کے لحاظ سے، چوٹی کی خوبی گھر کی رونق ہے جس گھر میں رونق نہ ہو اُس کو بقولِ مرزا مرحوم دشت سمجھنا چاہئے - فرماتے ہیں:-

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

گھر کا لازمی عنصر رونق ہے، اور رونق کا انحصار گھر کی سجاوٹ پر نہیں ہے بلکہ گھر والوں کی چہل پہل پر، بات بات پر شور و غوغا پر ہے۔ سچ فرمایا ہے کہ "ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق" اور ہنگامہ کے لئے خانہ جنگی اسی قدر ضروری ہے جس قدر اتحاد کے لئے سائمن کمیشن - یا - خوفِ عاقبت کے لئے طاعون!!

کبوتروں کی کابک والے خانہ سے لے کر انسان کے وسیع مسکن تک، ہر جگہ خانہ جنگی کا امکان ہے خانہ جنگی کی برکات بھی خانہ کے حدودِ اربعہ کی ماتحت ہیں - یعنی - جس قدر خانہ کی حدود وسیع ہونگی اُسی قدر خانہ جنگی کی برکات زیادہ ہونگی جس گھر کی چار دیواری محض میاں بیوی کے دو نفوس پر مبنی ہو اُس کی خانہ جنگی بھی چولہے اور پلنگ تک محدود ہوگی؛ اگر ان دو نفوس میں صرف ایک ساس کا وجود اضافہ کر دیا جائے تو خانہ جنگی کی لطافت بھی المضاعف ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر خانہ کے حدودِ اربعہ ایک صوبہ یا ملک تک وسیع کر دیئے جائیں تو اُس کی رونق کے اسباب بھی ہنگامہ سے متجاوز ہو کر بلوہ تک پہنچ جائیں گے۔

ملکی خانہ جنگی کے زیرِ فیض ہزاروں بیکاروں کو کار، فاقہ مستوں کو اُدھار، ایڈیٹروں کو موادِ اخبار، اور گرگھنٹالوں کو عقیدت مندوں کی فوجِ بے شمار میسّر آجائے گی؛ بلکہ راجہ سے پرجا تک، ہر ایک کو علیٰ قدرِ مراتب خانہ جنگی کی برکات سے مستفید ہونے کا موقع مل جائے گا۔

خانہ جنگی میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو سبزی خور کو دہی میں اور گوشت خور کو نمک مرچ میں نظر آتی ہیں تمام افرادِ کاربند سے مادۂ فاسدہ خارج ہو کر ہستی کا جوہر باقی رہ جاتا ہے اور خطرۂ اجل سے نجات مل جاتی ہے ـــــــ

تنم از ضعف چناں شد کہ اجل جست و نیافت
نالہ ہر چند نشاں داد کہ در پیرہن ست

+ + + + + +

کسی نقطۂ نظر سے غور کیجئے۔ خانہ جنگی سے زیادہ مفید، اقتدار انگیز، محکوم ملک کے لئے موزوں، اور موجودہ آب وہوا کے موافق، کوئی دوسرا فعل نظر نہیں آتا۔ اطمینان صرف اس سے ہوتا ہے کہ بفضلہ ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ نے عموماً اور ملازمت و وکالت پیشہ افراد نے خصوصاً، اس کی برکات کو پوری طرح ذہن نشین کر لیا ہے۔

یقین مانئے آپ ایک عدد حسین بیوی اپنے ساتھ نتھی کر کے عیش و آرام نہیں پا سکتے۔ البتہ عیش و آرام پاکر ایک درجن بیویاں وجود میں لا سکتے ہیں۔

اسی طرح

آپ اتحاد کے ذریعہ سے انقلاب تک نہیں پہنچ سکتے۔ البتہ۔ انقلاب کے توسل سے اتحاد پا سکتے ہیں!!

از یک حدیثِ لطف کہ آں ہم دروغ بود
امشب ز دفترِ گلہ صد باب شستہ ایم

سلطان حیدر
(جوش)



متین و شریر

لڑکے دو تھے عزیز اور شبیر | ایک اُن میں متین ایک شریر
جو متیں تھا شریر سے بولا | بات کو تُو نے کب کہیں تولا
جی میں جو آئی بس وہ کہہ ڈالی | بات کڑوی یا میٹھی سی گالی
گالیاں یوں ہیں تیری پھلجھڑیاں | باتیں بھی موتیوں کی ہیں لڑیاں
بزم میں جس گھڑی تُو جاتا ہے | نت نیا رنگ تُو دکھاتا ہے
تُو ہے شیدائی "نسائیت" | تُو ہے دلدادۂ "شبابیت"
بوڑھا ہونے کو آیا اور ہے جواں | تیری فطرت جواں تر از شیطاں
تُو وہ اضداد کا ہے مجموعہ | خاک میں رہ کے ہے فلک پیما
کھیلتا بھی ہے سوچتا بھی ہے | چھوڑتا بھی ہے دبوچتا بھی ہے
گھورتا بھی ہے مسکراتا بھی | چار سنتا بھی دو سناتا بھی
میں نے مانا تُو محفل آرا ہے | میں نے مانا تُو سب کو پیارا ہے
لیکن اتنا بھی لاڈ کیا کرنا | ہر بھلی شے پہ دو ہی دن مرنا
اُس کو دو دن میں بھول جانا پھر | اپنی خوشبو پہ پھول جانا پھر
پھر وہ ندرت طرازیاں اپنی | پھر وہ جدّت نوازیاں اپنی
باوفا چاہیئے رہے انساں | راہِ نیکی میں دُکھ سہے انساں

ہو چکی جب متین کی تقریر | پُر متانت ہوا وہ تھا جو شریر
اور کہنے لگا کہ بھائی جان | تم نے مجھ پر کیا بڑا احسان
مجھ کو گو سب برائیاں دے دیں | کلفتیں میری اپنے سر لے لیں
واہ قرباں تمہاری الفت کے | واہ احساں تمہاری الفت کے
عمر بالی یہ اور یہ فہمِ رسا | بڈھے کھوسٹ ابھی ہیں نامِ خدا

تم بلا ریب حق سے ہو آگاہ | واہ وا خوب ہے تمہاری آہ
تم جو روئے تو رو پڑا حق بھی | تم کو سنتا ہی لو کھڑا حق بھی
خود خدا کو سبق سکھایا ہے | نُور کیا ہے تمہارا سایہ ہے!
ڈھونڈتے ہو خوشی کو رو رو کر | میں تو پاؤں گا جو بھی کھو کھو کر
چھٹتے رہنا مجھے نہیں منظور | دُور سے دیکھتا ہوں کوہِ طور
ہے اگر بے نیاز اللہ میاں | کیوں نہ سر اپا نیاز ہو انساں!
خیر و دانش ہیں کیوں رہیں ناشاد | کیوں نہ ہر بند سے ہوں ہم آزاد!
کیوں نہ غم میں بھی مسکرائیں ہم | کیوں نہ ہر شے کو بھول جائیں ہم؟
مسکرانا ہی زندگانی ہے | بھول جانا ہی زندگانی ہے
خیر و شر پر غم و مشقت پر | غفلتوں پر خمارِ عشرت پر
پارسا ناک بھوں چڑھاتے ہیں | جو ہیں عاقل وہ مسکراتے ہیں
دنیا میدان ہے شرارت کا | حق یہ احسان ہے شرارت کا
گر شرارت نہ ہوتی شیطاں کی | دنیا بنتی کبھی نہ انساں کی
ہوتا باطل نہ آشکارا اگر | کارنامے نہ حق کے آتے نظر
کچھ برائی نہیں بُری اتنی | تم کو معلوم ہوتی ہے جتنی
نیک بننا ہے گر تو نیک بنو | نیک بن کر مگر نہ اتنے تنو
تم کو دینی ہے گر بشارت ہی | ہو بشارت میں کچھ شرارت بھی
کچھ مری بھی سنو تو بھائی متیں | نام کے باغباں ترے گلچیں
پھول اگاؤ نہ پھول توڑو تم | حق یہ پھولوں کو اپنے چھوڑو تم
باغِ دنیا کے باغباں نہ بنو | پھول پتّوں کے پاسباں نہ بنو
پھول سنگھنی کی طرح سونگھو سنگھاؤ | اپنے تن من کو خوشبوؤں سے بساؤ

ع ب

سمندر

سمندر، سمندر، شان دار، بیکراں سمندر! نمی، تری، خشکی سے دُور، خشک مزاجی سے دُور، گویا سمندر، دُنیا و مافیہا سے دُور کوئی اَور دُنیا!

دُھواں نہیں، گرد و غبار نہیں، پاکیزگی، لطافت، نزاکت — "اک نزہت گاہِ اُنس"! ایک کشتی بادبانی اور اُس میں دو صورتیں، دو انسانی صورتیں، سکون و محنت کی مورتیں! اُدھر، اُوپر، دائیں بائیں ہر طرف، سمندر کی چڑیاں لہروں سے کھیلتی ہوئی، پانی کی لہروں سے، ہوا کی لہروں سے، سمندر کی گوری گوری چڑیاں! لہریں ملتے جلتے پانیوں کی، ہلکی پھلکی ہواؤں کی، لہریں کھیلتی ہوئی سمندر کی اِنہیں گوری گوری چڑیوں سے!

چڑیاں ہواؤں سے اور ہوائیں لہروں سے، لہریں کشتی سے اور کشتی انسان سے اٹھکیلیاں کرتی، لجاتی شرماتی کتراتی پر ساتھ ہی ساتھ وہ اِس پر اور یہ اُس پر لپکتی اِتراتی پھڑ پھڑاتی! اِک دوسرے سے الگ تھلگ؟ اِک دوسرے سے دست و گریباں؟ نہیں نہیں! اِک دوسرے کا ساتھ چولی دامن کا جسم و جان کا روح و رواں کا! چڑیاں چاہتی ہیں ہوائیں ہو جائیں، ہوائیں چاہتی ہیں لہریں بن جائیں، بادبان ہواؤں کا دم بھرتے ہیں اور لہراتے ہیں، انسان نازک لہروں کے نرم تھپیڑے کھاتے ہیں اور اُٹھتی گرتی کشتی کے ابھار گراؤ میں زندگی کا اتار چڑھاؤ بھولے ہوئے ہیں!

ب ا

غریبوں کی سبیل

ساون کا مہینہ۔ بلا کا حبس۔ کلّو کو دھیانگی اٹھانے کی تلاتوپ پڑی۔ پندرہ دن کا میلا چُوہا کُرتا۔ پسینے میں شور بشور۔ گریبان کھلا۔ بازوؤں تک استینیں بتّی ہوئی چڑھیں۔ ننگے سر۔ جُوڑا بندھا۔ آڑا گلابی پیجامہ۔ مارے پسینے کے جگہ جگہ دھبے پڑے۔ موریاں کہیں۔ گھیر کہیں۔ پنڈلیوں پہ کی نیچے کی سیون گھوم کے اوپر آئی۔ کان میں کندلے کی ایک ایک بالی جس میں سوکھے پھول مولسری کے بھرے۔ خیلہ خطبنوں کی سی وضع۔ کارخانے پہ بیٹھی۔ سامنے بادلے کے تار تنے۔ جھپا جھپ جھپا جھپ ہاتھ چل رہا۔ اور دونوں پاؤں کے انگوٹھے باری باری سے اوپر نیچے ہوتے جاتے۔ جیسے بھی ہو چراغوں جلے تک ٹھپّے کا نفان اتار لے۔ کہ اِتّے میں کھڑکی والی ہمسائی نے کوٹھے پہ سے آواز لگائی دوئی بوا اسد رحمت! بھلا یہ بھی کوئی کام کا وَخت ہے! لے چنّو کی اماں! رجّو کی خالا! بوا آشیا! بھابی خدیجہ! بھوری! بنّو! بجّو! اے شادو! دوئی لڑکیوں تم کدھر سب کی سب گھس گیّاں؟ اے ذرا باہر نکلو دیکھو تو کیسی اندھیری دے کے آئی ہے۔ کیا دھواں دھار اُٹھی ہے جدھی تو یہ قیامت کی گھُمس تھی۔ پرسوں مُنّن۔ چُنّی۔ شجّی۔ مُغلو۔ بُندو۔ گھسیٹا۔ رکھّا۔ غنی مولبی ساب والا کالا منہ کالے ہاتھ کر کے "کالے ڈنڈے پیلے ڈنڈے برسیدگا برسادیگا۔ کوڑی سیر لگا دے گا۔ کوڑی گئی ریت میں پانی گیا کھیت میں" کہتے گھر گھر دیبے کی دیغ کے لئے دام اکٹھے کرتے پڑے پھرے۔ نانی حجّن۔ دادی شبّو۔ خالا خیرن۔ کنوئیں پہ جا کے روئیں۔ اللہ دی۔ جگنی۔ رحمت۔ فخری۔ بلّو نے پنالے لیپے۔ "اللہ میاں ہم لیپیں تم بہادو" اِن کنواری بالیوں کی بھی سنوائی نہ ہوئی۔ کیسی کالی بھونرالی گھٹا اٹھی۔ لیکن آندھی بھی وہ کالی آئی کہ بادلوں کو اڑا جانے کہاں کی کہاں لے گئی۔ بہتیر ابچیوں نے غل مچایا "آندھی بیوی کے دامن سے باندھی" سل تلے جھاڑو بھی دبائی لیکن بادل کائی کی طرح پھٹ گئے۔ آج ہیں نے دھوپ میں ساری دوپہر کھڑے رہ کے کاٹی۔ اے اللہ تیرے صدقے جاؤں میری منہ نہیں جو میاں میرے تیری تعریف کر سکوں۔ کیا اپنی بندی کی بات رکھی ہے۔ کھڑکی والی ہمسائی اپنے آپ ہی آپ باتیں کرتیں اور چیخیتی رہیں۔ محلے کی بڑی بوڑھیاں لڑکیاں بالیاں اُن کی آواز سُن دلانوں میں سے نکل انگنائیوں میں آ کھڑی ہوئیاں۔ کوئی جھپ سے چرپائی دیوار سے لگا۔ ادوان پہ ایک پیر ٹکا۔ جالی پر پنجے جما ہٹی

پکڑ۔ پائے پہ پاؤں رکھ۔ مُنڈیر پہ سے چڑھ۔ چھجے کو لٹک۔ جھٹ دینی چھت پہ جا پہنچی۔ کوئی بدھ بدھ کرتی سیڑھیوں پر سے چڑھ۔ دبی دبی کوٹھے پہ جا کودی۔ بچے بالے کُلبل کُلبل کر نکل پڑے۔ اُچھل رہے ہیں۔ کود رہے ہیں۔ غل ہے کہ اللہ میاں مینہ برسا دو کوڑی سیر لگا دو۔ گھٹا نے لٹیں بکھیر دیں۔ وہ پانی میں بھیگی بھیگی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آئی اور ایسی سوندھی سوندھی خوشبو کہ دل کے کنول کھل گئے۔ ساتھ ہی پٹ پٹ موٹی موٹی بوندیں پڑ۔ وہ تل دھاک اوپر دھار۔ دھوشالی مینہ برسا کہ اب برس کے پھر نہ برسے اور پڑ کے پھر نہ کھلے۔ پرنالے پڑے دھائیں دھائیں چھوٹیں۔ راہ چلتے جہاں فرا آسرا دیکھیں جا کھڑے ہوں۔ کہ بھیگنے سے بچ جائیں۔ چھتوں۔ پھاٹکوں میں ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ چھجوں کے نیچے غول کے غول کھڑے ہو گئے۔ باہر مردوؤں کے یہ حال۔ یہ گھروں میں مچھلی کی جائیاں انگنائیوں میں اور پرنالوں تلے۔ کھڑی ہو کے نہائیں اور ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالی۔ موریاں بند کر پانی روک خوب چھپک چھپیّا کی۔ ایک ایک کو پکڑ کے انگنائی میں خوب لٹایا۔ جب اس شہدپن اور دھینگا مشتی سے تھک کے بلکان ہو گئیں۔ شربت کے لوٹے ڈال پاک ہو۔ صاف ستھرے کپڑے پہن۔ دردن دالانوں میں جا بیٹھیں۔ چھت کی کڑکیوں تلیوں۔ قُلّابوں میں جھولے پڑے۔ کوئی تکیہ رکھ کوئی پٹڑی۔ انپہ جا ٹنگیں۔ ننھی نیدانوں نے گانا شروع کیا۔

"کوئی بندا چاولوں لائیوے دال ہے مسور کی"۔

گوری دھن کا بیجنا ہریالا ساون آیا رہی۔ گوری دھن کا بیجنا۔ میری بھابو پکاے پوریاں میرا بھیّا لے بھاگے رہی۔ گوری دھن کا بیجنا ہریالا ساون آیا رہی"

"[illegible] ساون کا دن آوے گا جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج منگاوے گا"

"ماں آڑو باسن گیلے دھرے۔ ماں میں [illegible] میری ماں۔ ماں کپڑوں کی بقچی کھلی دھری۔ ماں میں نئیں پہنتی میری ماں۔ ماں نتا پانی گرم دھرا۔ ماں میں نئیں نہاتی میری ماں۔ ماں مسّی کی ڈبیا کھلی [illegible] دھری۔ ماں میں نئیں ملتی میری ماں۔ ماں سرمے دانی کھلی دھری۔ ماں میں نئیں لگاتی میری ماں۔ ماں ساجن آئے لینے [illegible] ماں میں نئیں جاتی میری ماں"

"ماں ایک کریلا میں بویا۔ ماں بھابھو سے کہیو توڑے نا۔ جو توڑے چکّو چار کریلا میں بویا"

"جمنا پہ چھائے رہی کالی گھٹا۔ کالی گھٹا بھونرالی گھٹا۔ جمنا پہ چھائے رہی کالی گھٹا"

"اماں میرے بھائی کو بھیجو جی کہ ساون آیا۔ اے بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری کہ ساون آیا۔ اماں میرے باوا کو بھیجو ری کہ ساون آیا۔ بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری کہ ساون آیا۔ اماں میرے ماموں کو بھیجو ری کہ ساون آیا۔ بیٹی تیرا ماموں تو بانکا رے

کہ ساون آیا"۔

"ساون میں مَیں نئیں جاتیاں ۔ساون میں مَیں نئیں جاتیاں"۔

کسی نے پورا گیت گایا۔کسی نے ادھورا چھوڑا۔کسی نے چین کی۔کسی نے پیں۔غرض سب نے مل کر وہ چیاؤں پیاؤں مچائی کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے ۔انہیں دیکھ جان جوانوں کو بھی گانے کی سُرک اٹھی ۔بچیوں کو آ تا' خود جا بیٹھیں ۔چھوٹے چھوٹے جھونٹے لے لے گانا شروع کیا۔

"آئی اندھیری رات ۔رے میں بھیجی جاؤں ۔کہاں سکھاؤں سُرخ چنڈریا کہاں سکھاؤں لمبی پاگ رے میں بھیگی جاؤں ۔کو تجھے سکھاؤں سرخ چندریا چھپے سکھاؤں لمبی پاگ رے میں بھیگی جاؤں"۔

"ساونوں میں میندھی مورے سیّاں کن بوئی ۔اے کن بوئی رے مہاراج ۔ساونوں میں میندھی مورے سیّاں کن بوئی۔ ناگھر سیّاں ناگھر دیورا۔ ناگھر سیّاں ناگھر دیورا۔ کس پہ رچاؤں دونوں ہاتھ ۔ساونوں میں میندھی میرے سیّاں کن بوئی"۔

"مہاراجہ کیوڑیاں کھولو رس کی بوندیں پڑیں ۔تم کھولو کیوڑیاں میری جان رس کی بوندیں پڑیں۔ اونچی اٹریاں چندن کیوڑیاں ۔تیری ناجو کھڑی ہے ۔شرابور رس کی بوندیں پڑیں ۔ہری ہری چوڑیاں ۔گوری گوری بیّاں ۔توری بیّاں سجن کے ہاتھ رس کی بوندیں پڑیں ۔ مہاراجہ کیوڑیاں کھولو"۔

"سنو سکھی سیّاں جوگیا ہو گئے ۔سنو سکھی سیّاں جوگیا ہو گئے۔ میں جوگن نیرے ساتھ سنو سکھی سیّاں جوگیا ہو گئے جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی ۔جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی ۔اور جوگن نے چھایا ہے بدیس ۔سنو سکھی سیّاں جوگیا ہو گئے ۔جوگیا بجاوے بین اور بانسلی اور جوگن گاوے ہے ملار ۔سنو سکھی سیّاں جوگیا ہو گئے ۔جوگیا رنگائے لال لال کاپڑے اور جوگن کے لمبے کیس سنو سکھی سیّاں جوگیا ہو گئے ۔ندیوں نے چھوڑا ہے قرار ۔سنو سکھی سیّاں جوگیا ہو گئے ۔سنو سکھی سیّاں"۔

"جھولا کن ڈالو رے امریاں ۔جھولا کن ڈالو رے امریاں ۔ایک تو میں جھولوں دوجے مورا سیّاں ۔جھولا کن ڈالو رے امریاں"......

یہ گانا ہی شروع ہوا تھا کہ ایک بولی ووئی! یہ بھی کوئی برسات کا مزا ہے؟ گانا ہے تو قطب صاحب چلو واں لاٹھ ہے ۔پھسلنا پتھر ہے ۔بھیم کی چھٹنکی ہے ۔شمسی تالاب ہے ۔جھرنا ہے ۔امریاں ہیں ۔ پارے کا تلاب ہے ۔ اندھیریا باغ ہے ۔یاں سے واں تک جنگل ہی جنگل اور درخت ہی درخت ہیں ۔ رسیاں پٹڑیاں ساتھ لے چلیں گے ۔کھانے پینے کا سامان لے لیں گے ۔کڑھائی چڑھے گی ۔پکوان ہوگا ۔گرم گرم گلگلے پھلکیاں اترتے جائیں ۔گاتے جائیں کھاتے جائیں۔

پھر لطف آئے۔ آٹھ آٹھ آنے سب مل کے پتّی ڈالو۔ بھلی کرائے پہ کرو۔ بھائی شرفو کو ساتھ لیں گے۔ وہی اس گوں کے ہیں۔ بچارے اللہ کا جی۔ کچھ بھی کرو انہیں خبر نہیں۔ کہنے کو مرد کی صورت ساتھ ہونگے۔ ان سے رہا او بھی کھلا ہوا ہے۔ خالہ لطیفن کے میاں چلے۔ تو وہ بڑا تعبیہ بٹھاتے ہیں۔ انہیں پرچھائیں میں غیر مرد نظر آتے ہیں۔ یوں ہی رنگ میں بھنگ ہوگی۔ وہ کام کے نہیں۔ ایک بولی بوا کلّو کو پکڑ لاؤ۔ وہ آج خوب کارخانے پہ چپک کے بیٹھی ہیں۔ دوسری نے ایک آواز لگائی۔ خالہ ناآؤ تو اس بندی کا حلوا کھاؤ۔ کلّو نے جواب دیا۔ اُچھال چھکّاؤں! اچھے حلوے مانڈے کھلائے۔ مسّانیوں کو فکر ہی کیا ہے۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ جیسے نفاقڑیاں خود نقّاشی گھوڑیاں۔ بے نا تھ کے بیل ہیں۔ سب کو ویسا ہی سمجھ رکھا ہے۔" اچھا دیکھو خالا! اتّی باتیں سنا لیں۔ تمہارے صدقے جاؤں اب اٹھ آؤ۔ میری کلیجے کی ٹکڑی خالا! میں تیرے قربان گئی تھی۔ میٹھے دیدوں کی قسم جو تمہاری دھیانگی میں اٹھوا دوں گی۔" ایک نے اتنی باتیں ہی کی تھیں کہ دوسری جھٹ کھڑکی میں سے گھس کلّو کے گھر میں جا پہنچی اور پھر تو ایک کے پیچھے ایک ہو۔ دس پانچ مل۔ کلّو کو کارخانے پہ سے اٹھا ہی لائیں۔ اور کہا "خالا! تمہاری اٹھنّی برکت کی ہوگی۔ پہل تمہاری طرف سے ہو" کلّو نے کہا "چلو چھتّا ماؤں! باؤلیاں ہوئی ہو۔ اٹھنّیاں درختوں میں سے جھڑ رہی ہیں یا آج آسمان پہ سے برسی ہیں۔ یا فرنگیوں کی نیت درست ہوگئی۔ جو پیسے کی ریل پیل ہو۔ اٹھنّی تو اٹھنّی یاں آٹھ کوڑیاں بھی نہیں۔ نئیں بوا نئیں! میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں۔ نا میں کہیں آؤں جاؤں"

"اے خالا چلو پرے ہٹو۔ تم نے تو کنّا سں پنے کی حد کر دی۔ جوڑ جوڑ مر جائیں گے اور مال جنوائی کھائیں گے۔ تم تو ایسی نئیں تھیں۔ یہ کیا اللہ کی پھٹکار ہوئی ہے۔ کہ پیسا نہیں کھسکتا" سب کے کہنے سننے سے چونّی دینے پر راضی ہوئیں۔ کہنے لگیں۔ "چڑیلو! میں نے آٹھ آنے کُرتے کے لئے لگا رکھے ہیں۔ مرداریں پیچھے پڑ گئیں۔ بھلا مجھ بیاروں کی بلا کھائی کو گھسیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں بڈھا چرخا۔ تم جان جوانوں میں گھستی کیا اچھی معلوم ہونگی"۔ "واہ خالا اچھا کہا! یہ ساری برکت (تمہارے ہی) تمہارے ہی دم کی ہے۔ تم نئیں۔ تو سیل میں مزا نئیں۔ یہ سات روپے جمع ہوئے ہیں۔ تمہارے سُنداں ساڑھے سات ہونگے۔ یہ روپے ہیں۔ تم جانو۔ تمہارا کام۔ ہمیں سیل کرالاؤ"

"ووتی روپوں کا میں کیا کروں۔ شرفو کی خوشامد کرو۔ دو ڈھائی میں سارے دن کی بھلی ہوگی۔ چاہے بھارکس منگاؤ چاہے منجھولی۔ گنجائش کو دیکھ لو۔ روپے کا تیل بارہ آنے کا بیسن۔ سوا روپے کا گھی۔ سیر سیر بھر آٹا گھر سے باندھ لو۔ دو روپے اڑے ٹھڑے کو لگا رکھو۔ واں تندور پہ روغنی بیسنی روٹیاں پکوا لیں گے۔ آم کا اچار رہے گا۔ نیبو۔ پیاز۔ ہری مرچوں کی چٹنی بنا لیں گے۔ بیری پراٹھے پکائیں گے۔ تیل کے سلونے زیادہ ہوتے ہیں۔ بھرتا ساتھ لیتے چلیں گے۔ سارے

دن رہیں گے۔ شام تو ڑی آجائیں گے۔ کڑھائی تو بھول ہی گئی۔ اپنے وہیں پکوان ہوتا جائے گا۔ گرم گرم کھانے کا مزہ کہ" سب منصوبے باندھ۔ شرفو کی خوشامد کر مار و مار بزار بھیجا۔ وہ سب سامان لے آیا۔ گاڑی والے کو بھی سائی دے آیا۔ سب نے جلدی جلدی سب سامان چلنے کا لیس کیا۔ باندھا بوندھی میں لگ گئے۔ ایک بیبریاں لگا دو لڑا اچھالنے کو۔ ایک لوٹا ٹونٹی پچکی۔ گردن بیٹھی۔ پیندا دھسا۔ جگہ بجگہ گڑھے پڑے۔ قلعی اڑی تانبا جھلکتا ساتھ لیا۔ محلے کے حلوائی سے کڑھائی منگالی۔ ٹکے کرائے پہ ڈھولک بھی آگیا۔ مرغ نے اذان بھی نہ دی تھی کہ بہلی گلی میں آکھڑی ہوئی۔ ہرنا ہرنی لٹک چلے تھے کہ ہر ایک اپنے اپنے بچوں کو ہشیار کر۔ سوتوں کو گھسیٹ گھسیٹ لانے لگی۔ کسی نے پھٹی جازم اوڑھی کسی نے پیوند لگا برقعہ سر پڑ ڈالا کوئی ایک ایک کی منت سماجت کر کے مانگے کی چادر لینے لگی۔ گھروں سے نکلتے نکلتے ضرورت کی چیزیں یاد آتیں۔ دیوانوں کی طرح بھاگ بھاگ کے اندر جاتیں۔ اور پھر خالی ہاتھ واپس آتیں۔ بچوں کو بہلی میں ٹھونسنا شروع کیا۔ اور ایک پر ایک لدنے لگی۔ بہلی والے نے جو یہ طوفان بدتمیزی دیکھا لگا چلّانے "اری مائیوں پہیے کا دُھرا نکل جائے گا۔ بیل بیٹھ جائیں گے۔ اتنے تو گاڑی میں نہ بیٹھو" بھلا اس ہولا جولی میں اس کی سنتا کون؟ ایک پر ایک ٹھس ٹھس کے بیٹھ گئیں۔ چار پانچ تو سانگی میں جا بیٹھیں۔ جب بہلی والے نے دیکھا کہ یہ یورش کسی طرح کم ہی نہیں ہوتی تو خوب چلّایا۔ کہ ان سب کے کانوں میں آواز پڑی۔ اور ایک ان میں سے تنک کر بولی "چل جوانا مرگ کیوں اپنا دم نکالے جا رہا ہے۔ موئے تیری بہلی میں کون بیٹھا ہے۔ میں تو باجی کے گھٹنے پہ بیٹھی ہوں۔ اس نامراد نے اور چیخ چیخ کے بھیجا کھا لیا" جوں توں کر کے ایک بیس بائیس تو خدا جھوٹ نہ بلائے گھس ہی بیٹھے ہونگے۔ تو مجھ پر میں تجھ پر کا عالم تھا۔ بچے بھچنے کی شکایت کرتے۔ تو مائیں اتار پھینکنے کی دھمکی دیتیں۔ جانے کے شوق کے مارے دم نہ مارتے تھے۔ جب جان ہی پر بن جاتی تو پھر ایک آواز نکالتے۔ "ارے مر گئے مر گئے۔ بھچ گئے۔ تو مائیں کہتیں "مر جاؤ نگوڑو یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑو۔ کیا مجال جو ذرا یہاں چین سے گذر جائے۔ تھو تھو موئے بھوت ہو گئے جانوں کو" خدا خدا کر کے بھرتی کی مشکل آسان ہوئی۔ اور بہلی والا بڑبڑاتا برا بھلا کہتا۔ بیلوں کو ہانکتا۔ سانٹے مارتا۔ سڑی سڑی گالیاں دیتا سب کو بھر گلی کے باہر نکلا۔ اور یہ سب تاروں کی چھاؤں چل پڑے۔ اجمیری دروازے پہنچے تو موچیوں والی مسجد میں صبح کی جماعت کی تیاری ہو رہی تھی سب عورتوں نے جلدی جلدی وضو کر ایک طرف ہو نماز پڑھی اور جلدی سے پھر اسی طرح آ ٹھسے۔ جن کے سر کھلے تھے اُن کو بڑی بوڑھیوں نے ڈانٹا کہ بے ڈھنگیوں! صفیلیں آگئیں۔ شہر پناہ کے دروازے سے نکلنا ہے سر تو ذرا ڈھانکو۔ سب نے جلدی جلدی سر ڈھانک لئے اب بہلی شہر کے باہر ہولی پہاڑ گنج تک تو ان سب کا پردہ رہا۔ جیسے ہی پہاڑ گنج نکل گیا۔ تو جو اتنی دیر ٹھسی ہوئی بیٹھے رہنے سے شل ہو گئی تھیں۔ وہ جلدی سے بہلی رکوا باہر کود پڑیں۔ پھُدی چوتیا کسی کا کٹا چرا۔ کسی کی گھری گھسی۔ کسی کی ایڑی گئی۔ کسی کا پنجا دانت نکوسے۔ کسی کا پلکوان ندارد۔ کسی کی اُو گی

الگ۔ کسی کی ٹھاٹ باقی صفاچٹ۔ کوئی زری کی کوئی اَدھوڑی کی۔ کوئی کیمپٹ کی۔ کوئی وصلی کی۔ کسی پہ ڈیڑھ حاشیہ کسی پہ بیل کسی پہ پھول کوئی سادی۔ غرض عجیب عجیب ہیئت کی جوتیاں تھیں۔ اِنہیں اُتار بغلوں میں دبا۔ ننگے پاؤں بہلی کے پیچھے پیچھے ہولیں۔ بڑی کی دیکھا دیکھی بچے بھی اتر پڑے۔ اور پیدل ہو لئے۔ جو بہلی میں بیٹھی رہیں۔ انہیں پھیل کر بیٹھنے کا موقع ملا۔ ماچی میں سے ڈھولک کھلوایا۔ اندر لے۔ بجانا اور گانا شروع کیا "تیرے جھومرنے کھایا جھکولا رے۔ تیرے کھانے کو پاندان لے دوں گا رے"۔ "مدنا[1] گنڈیری والے۔ بالم گنڈیری والے۔ سونے کی تیری ڈنڈی۔ رُوپے کے تیرے پلڑے۔ نینوں کی جھونک ماری رے مدنا گنڈیری والے"۔ دُور سے کوئی مرد آتا نظر آتا۔ تو ودئی مردوا کر کے چیخیں مارتیں۔ بڑی بوڑھیاں ڈانٹتیں کہ اوہ مُوئی متابیوں امردوا ہے تو کیا کھا جائے گا؟ آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ۔ بلاؤں پہ مردوا ہے یا باہروالا ہے موا گنوار۔ اُدھلن ہار ہو بانس بلبیڈوں کو سانپ بتاتے۔ اُس کو نہ اپنے آپے کی خبر نہ جان کا ہوش + جہاں کوئی اُجلے پوش شہری دکھائی دیا۔ جلدی سے کترا کے بہلی کے پیچھے ہو جاتیں۔ جن کے پاس چادریں اور برقعے نہ تھے وہ دوسروں کے برقعوں اور چادروں میں گھس جاتیں۔ یا ذرا سی بھی آڑ پاتیں تو اُس کی اوٹ میں آجاتیں۔ گنواروں کو دیکھ کر خوب مذاق اڑاتیں۔ فقرے کستیں۔ پھبتیاں کہتیں۔ "گنوار نے گیہوں کھایا سیڑھی لے آسمان کو دھایا"۔ "گنوار بھیلی دے گنا نہ دے"۔ "گاؤں میں اونٹ آیا۔ لوگوں نے جانا پنمیشر آیا"۔ جس گنواری کی چُٹیا نظر نہ آتی تو آواز لگاتیں "لکھو بندریا چاب پان۔ اڑگئی چٹیا رہ گئے کان"۔ وہ بھی بے سمجھے اِن کے کھلو باولے پنے سے کھلے جاتے۔ دانت نکلے پڑتے۔ جو چلتے چلتے تھک جاتیں۔ وہ بہلی میں آبیٹھتیں اور بہلی والیاں اُتر کے چلنے لگتیں۔ اس طرح باری باری اترتے چڑھتے۔ تین پہر دن چڑھے تک منصور کے مدرسے آپہنچے۔ یہاں بیلوں نے دم لیا۔ سواریوں نے اتر کے سنگھتے۔ مٹر۔ چنے۔ چٹ پٹی دال۔ بوریاں۔ پرمل۔ بہادر شاہی سیوپیسے پیسے دھیلے دھیلے کے لئے۔ اب ان کے ساتھ کہاں کہاں مارا مارا پھرا جاتے۔ قطب صاحب گئیں۔ سارے دن رہیں۔ ساری رات رہیں۔ دوسرے دن تھک کے ہلکان ہو۔ کسی کا گلا بیٹھا۔ کسی کے کھر بنچیں لگیں۔ کسی کے کھونچیں گرتی پڑتی۔ لٹکتی لٹکاتی۔ اپنی جانوں کو گھسیٹتی گھٹاتی گھروں میں گھسیں۔ بچوں پہ خفا ہونے کا بھی دم نہ تھا۔ ڈھیر ہو پڑ رہیں۔ کماؤ میاؤں نے بھی ڈر کے مارے اُف نہ کی۔ اس لئے لڑائی کے ٹنٹگے نہ تنتے +

آغا حیدر حسن دہلوی

[1] یہ گیت حضرت ظفر بہادر شاہ بادشاہ غازی نے "مدنا" گنڈیری والے نیشکر فروش پر جوڑا تھا۔ شہر آبادی میں مدنا کا بڑا چرچا تھا اور یہ گیت میرے بچپن تک گایا جاتا تھا +

بچھڑی ہوئی جوانی

کچھ کسک سی دل میں، کچھ آنکھوں میں آنسو آبدار
گاہ دردِ بے نوائی، گاہ کربِ انتظار

ہجر کی کچھ خشمگیں تاریکیوں کا پیچ و تاب
وصل کی کچھ دل نشیں راتوں کا نورِ ماہتاب

چند وقفے خوش دلی کے، چند گھڑیاں جبر کی
کچھ تمنّائیں شبِ مہتاب و روزِ ابر کی

کچھ لگاوٹ، کچھ ستم، کچھ نرمیاں، کچھ گرمیاں
گاہے ماہے چند راتیں مہوشوں کے درمیاں

کچھ نسیمِ عیش کے جھونکے کنارِ آبِ جُو
زانوؤں کے چند تکیے، چند جامِ مشکبو

کچھ دنوں چھائی ہوئی شامِ بلا کی تیرگی
کچھ شبوں میں پھول سے چہروں کی میٹھی چاندنی

چند لمحے ظلمتِ ہول آفریں گرمِ عتاب
چار دن کو کچھ سنہری کنگنوں کی آب و تاب

دو گھڑی کے واسطے احباب سے راز و نیاز
چند لمحوں کے لئے رنگین باہوں کا گداز

کچھ دنوں بھیگی ہوئی راتوں کا لطفِ بے قیاس
دل نشیں باتوں کا رس، گلرنگ چہروں کی مٹھاس

ساعدوں کی چند شمعیں، عارضوں کے کچھ گلاب
کچھ رُخوں کی سرخیاں کچھ مست آنکھوں کی شراب

کچھ خنک لہجوں کی شبنم، کچھ ترانوں کی پھوار
کچھ لبوں کا شہد، کچھ زلفوں کا عطرِ مشکبار

لطف کے دو ایک دن، تفریح کی ایک آدھ رات
اے جوانی! تھی تری لے دے کے اتنی کائنات !!!

پھر بھی تیرا وہ سبک پرواز عہدِ مختصر
خندہ زن ہے آج تک عمرِ مسیح و خضر پر

داغ ہے تجھ سے حیاتِ جاودانی کا سراج
تُو ہے فانی زندگی کے سر پہ وہ انمول تاج

وقت کی سعیِ جفا پر بڑھ کے پانی پھیر دے
اُن دنوں کے چند لمحے اے جوانی پھیر دے !!

جوش
ملیح آبادی

غزل

ہم نے مانا کہ عمر فانی ہے
موت تمہیدِ زندگانی ہے

سوزِ عشق اصلِ زندگانی ہے
داغِ دل مُہرِ کامرانی ہے

کیوں ہے افسردہ اس قدر اے دل
ہم بھی فانی ہیں غم بھی فانی ہے

سبزہ و سایہ و نسیم و طیور
میری دنیائے شادمانی ہے

محو رہتا ہوں سیرِ دریا میں
کیا تجمّل ہے کیا روانی ہے

نغمۂ طائرانِ خوش الحاں
سازِ گلبانگِ دلستانی ہے

پرتوِ حُسنِ دوست ہیں ہم بھی
اپنی ہستی بھی جاودانی ہے

ہے نوائے سروشِ عشق سخن
شاعری دل کی ترجمانی ہے

جس سے پروانہ بنتا ہے شعلہ
وہ جگر آتشِ نہانی ہے

جگر بریلوی

خوبصورتی

خُوبصورتی، حُسن، رعنائی ——— زندگی! تواُس دنیامیں چل بس جس کی آبادی یہ پریاں ہیں!

*

وہ خوبصورت ہے ——— رسیلی خوبصورت آنکھیں، لمبی خوبصورت پلکیں، گول خوبصورت چہرہ موتی سے خوبصورت دانت، پنکھڑی سے خوبصورت لب ——— اور اسی پر بس نہیں بلکہ اس کے ساتھ اک دردبھرا خوبصورت دل، اک خوش خیال خوبصورت دماغ اور اک نیک روش خوبصورت رُوح!

*

میں خوبصورت ہوں ——— خوبصورت صورتوں کی تصویر دل میں لٹکائے ہوئے، خوبصورت خیالوں کی بساط دماغ میں بچھائے ہوئے، نفس کو خوبصورت جذبات کی مسلسل تلاش، روح میں خوبصورت حقیقتوں کی بے تاب محبت اور یہ اس طرح کہ میرے تصور میں بیک وقت ظہور میرے وجود میں بیک وقت لفوذ ایسی ایسی خوبصورتیوں کا کہ جھلمل جھلمل کرتے تارے، پھول اور پتیاں سیمیں زرّیں رنگین، جواہر ریزے اور دردانے اونچے پہاڑوں کے گہرے سمندروں کے، عرب کے صحراؤں کی خیال انگیز وسعت، اور ہند کے دریاؤں کی روح پرور روانی، اپنی ننھی بچّی کے لبوں کی اچھوتی مسکراہٹ، اپنی رفیق کی نگاہوں کا متین ومعصوم حُسن، انسان کی قوت کا پھیلا ہوُا زمینی نقشہ، اور حق وباطل کے تصادم سے پیدا ہونے والی روشنی اور اور ہزاروں بلکہ لاکھوں بلکہ کروڑوں خوبصورتیاں جن میں کسی کا ٹھیک ٹھیک عکس اور کسی کی محض دھندلی سی تصویر!!

*

نفیس ستھرا مکان، چیزیں قرینے سے رکھی ہوئی، پھولوں سے بچے بچوں سے پھول کھیل رہے آقا و بندہ کا تعلق سدھرا ہوُا، گفتار شائستگی کردار تمدن، رواداری، آزادی، غلطیاں لیکن نیک غلطیاں، زمین سبزہ وگل سے بھی صحن خوشبوؤں میں بسا ہوُا ——— یہ ہے میرے اَن دیکھے دوست کا مکان جہاں آنے جانے کا اذنِ عام مجھ کو ہے اے خوبصورتی!

باغبان

ایک خط اور ایک پارہ

خط

نیویارک، ۱۶۔ نومبر ۱۸۸۳ء

عزیز دوست!

امید تو نہیں کہ تمہیں یاد ہو مگر میری شادی کو آج پانچ سال ہوتے ہیں، اور کل ـــــ کہ یہ خط کل سے پہلے ہی بند ہو جائے گا ـــــ میری سالگرہ ہے ـــــ چالیسویں سالگرہ۔ میرا دماغ خیالات سے پُر ہے اور انہیں میری روزمرہ کی عادت صفحۂ قرطاس پر لانے کے لئے مجبور کر رہی ہے، جہاں میں اُن کا اظہار بہترین طریقے سے کرسکتا ہوں، اور وہ وہ خیالات ہیں جنہیں میں صرف شفیق ترین اور ہمدرد ترین آنکھوں کے لئے لکھنا چاہتا ہوں میری زندگی میں میرے لئے یہ امر کچھ کم مسرت کا باعث نہیں کہ میرا ایک دوست ہے جس کے سامنے میں اپنے دل کو کھول کر رکھ سکتا ہوں۔

میری بیوی اس وقت تمہارے ہم نام کو سُلا رہی ہے، اگر تم اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا کہ اس تقریب پر اُسے بھی اِس وقت تک کہ ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں، جاگنا پڑا ہے، نہیں، وہ ٹھیک آٹھ بجے ایک دو آنسو بہا کر سو گیا تھا، لیکن اب جب کہ اُس کی ماں اپنے معمول کے مطابق اُس کے کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے اُس کی نیند میں ڈوبی ہوئی ننھی سی مستفسرانہ آواز سنی، پھر میں بھی اُس کے پیچھے چل دیا اور دروازے کا پردہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ مگر میں کمرے میں داخل نہیں ہوا۔

سایہ دار شمع کی زرد زرد روشنی کا ایک دھبا سا پالنے کے سرہانے کے قریب چمک رہا تھا، جہاں میری بیوی میرے بیٹے کے قریب جُھکی ہوئی تھی۔ اُس کا ننھا سا چہرہ جو ہو بہو اپنی ماں کی تصویر ہے اُس کی طرف متوجہ تھا۔ بچے کے ہونٹوں پر ایک تبسّم تھا، اور میں جانتا ہوں کہ یہ بھی اُسی کے تبسّم کا عکس تھا۔ وہ بیدار رہنے کی نیم کوشش میں خوشی سے اپنی آنکھیں جھپک رہا تھا، مگر اُس سحر آفریں تبسّم کے اثر سے جسے میں نہیں دیکھ سکا، بیداری اُس سے اپنا دامن

چھڑا رہی تھی۔ اُس کی بھوری آنکھیں بند ہوگئیں، ایک لمحہ کے لئے کھلیں اور پھر بند ہوگئیں! نیند کی ہلکی پھلکی
چادر اُس پر تن گئی اور وہ وہاں پہنچ گیا جہاں ہم اپنی گہری نیندوں میں بھی اُس کا تعاقب نہیں کرسکتے۔ پھر قبل
اس کے کہ میں اپنی بیوی کا چہرہ دیکھوں جو اب جھک کر اُس کا منہ چُوم رہی تھی میں نے پردے کو چھوڑ دیا، اور
یہاں واپس چلا آیا۔ تاکہ اپنی زندگی کی آخری آگ کے سامنے بیٹھ کر اس مقدس نظارے کو اپنی روحانی آنکھوں
سے ایک مرتبہ اور دیکھوں، اور اُس ناقابلِ بیان مسرت کو حیران ہوکر سوچوں جو بلا استحقاق اور کسی پُراسرار
طریقے سے مجھ پر چھا گئی ہے۔

میں تمہیں بتاؤں، وہ لمحہ سوتے سے جاگ اُٹھنے کے اُن لمحوں کی طرح تھا جن کا احساس کبھی کبھی ہمیں
بچپن میں ہوتا ہے، جب ہم کسی لطیف و خوشگوار خواب کا دامن جاتے جاتے پکڑ لیتے ہیں ——— وہ خوشگوار
خواب جو ہماری آنکھیں اچھی طرح کھلنے سے پہلے ہی غائب ہوچکتا ہے؛ جس کی تصویر دنیاوی تصورات نہیں بنا سکتے
جو اپنی راہ میں ایک بلند و برتر مسرت چھوڑ جاتا ہے اور جس کی نسبت شاعر کہتے ہیں کہ وہ کسی جنت کی یاد ہے جس کی
تازگی ہماری نوخیز روحوں میں ابھی باقی ہوتی ہے۔

تم اندازہ کرسکتے ہو کہ میرے لئے اُن چیزوں کی واقعیت کا یقین کتنا تعجب خیز ہوگا جو اب میری زندگی میں
داخل ہوچکی ہیں؛ کیونکہ تم جانتے ہو کہ آج سے چند ہی سال پہلے میری زندگی کیا تھی۔ میں اُس آدمی کی طرح ہوں
جس نے اپنی عمر کے پہلے تیس سال کسی تاریک غار میں گزارے ہوں۔ کیا تم کسی ایسے شخص کو دس سال سے پہلے پہلے
آفتاب کے نور اور آسمان کے نیل کا یقین دلا سکتے ہو۔

میں ابھی ابھی آتش دان کے سامنے بیٹھا تھا اور میرے پاؤں اُس سمور میں لپٹے ہوئے تھے جو تم نے ہم دونوں
کو پچھلی کرسمس کے موقع پر بھیجی تھی۔ ہلکی ہلکی آگ کی روشنی کمرے کے سایوں پر، میری کتابوں پر اور تصویروں پر، اور اُس
تمام نادر و نفیس ساز و سامان پر رقص کر رہی تھی جو اب میری آنکھوں اور میرے دل کو مسرور کرتا ہے اور اُس مذاق کے لئے
تسکین کا باعث ہوتا ہے جو روٹی میسر آنے پر بڑھتا ہی جاتا ہے۔ سو کچھ اِس طرح میں اپنی شادکامی اور کامرانی کا جائزہ
لے رہا تھا ——— اپنی مادی دولت کا، اپنی اُس بہتر دولت کا جو مجھے دنیا کی طرف سے ملی ہے یعنی شہرت کا اور سب
سے بڑھ کر اُس دولتوں کی دولت کا جو ساتھ کے کمرے کی دہلیز کے پار ——— اُس کمرے میں؟ نہیں ———
وہاں، یہاں، ہر کمرے میں، گھر کے ہر کونے میں امن کی روح بن کر بسی ہوئی ہے، یہ محبت کی پاک و پاکیزہ روح ہے۔

جب میں بیٹھا اِن باتوں کو سوچ رہا تھا تو میرا خیال آج سے بائیس برس ——— ہاں آئندہ فروری میں

بائیس برس قبل کی دنیا میں پہنچ گیا جب ہم پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے ملے تھے۔ میں اُس ہیبت ناک دن کو ابھی اَور بائیس برس تک بھی نہ بھول سکوں گا جب میں "مارننگ ریکارڈ" کے دفتر میں داخل ہُوا۔ ایک بڑے سے تاریک اَور افسردہ کمرے میں گیس کی چھوٹی چھوٹی بتیاں جل رہی تھیں، جابجا زرد چہروں والے کلرک بیٹھے تھے اور دیواروں پر روشنائی کے بڑے بڑے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور باہر بارش ہو رہی تھی۔ گو ناصاف روشندانوں میں سے کچھ نظر نہ آتا تھا لیکن میں اُس کی نمی اور سردی کو محسوس کر رہا تھا۔ عقب کے کمرے سے سیاہی اور گھٹے کی بُو آ رہی تھی، اور چھاپے کی بڑی بڑی کلوں کا شور اور لرزش نیچے سے اوپر پہنچتا تھا۔ میں اپنے گیلے کپڑوں میں وہاں بیٹھا تھا اور اپنے پہلے تقرر کا انتظار کر رہا تھا۔ میری عمر اُس وقت اٹھارہ سال کی تھی اور میں بے حد غریب تھا۔ لڑکپن کی امید میرے دل میں تھی اور میرے سر میں کالج کے ایک واحد سال کی لاطینی اور یونانی کا سرمایۂ علم تھا۔ میری طبیعت بیٹھی جا رہی تھی۔ میرا دل ایڈیٹر کی ہر آواز پر جب وہ اپنے نئے رنگروٹوں کو ایک ایک کر کے بلاتا اور انہیں اُن کے فرائض تفویض کرتا تھا دھک دھک کرنے لگتا تھا۔ میں خاموش یہ دعا مانگ رہا تھا کہ وہ مجھے کوئی آسان سا کام دے اور مجھے اُس کے انجام دینے میں خفت نہ اٹھانی پڑے۔ الامان، ولیم، بوڑھا بالڈون نیک دل ہونے کے باوجود کتنا سخت گیر منتظم تھا! کیا تمہیں اُس کی تیز کڑکتی ہوئی آواز یاد ہے اور اُس کا "مختصر! مختصر!" کہنا جو انسان کے دماغ سے تفصیل کو اجمال کے ساتھ پیش کرنے کی تمام قابلیت سلب کر لیتا تھا اور اُس کی کہانی کے الفاظ کو منتشر کر کے اُسے ہکلاتے ہوئے چھوڑ دیتا تھا؟ بالڈون کا نام اب تک "مارننگ ریکارڈ" کی پیشانی پر موجود ہے۔ مَیں حیران ہوتا ہوں کہ کون بدبخت اس وقت اُس پریشان کن نکتہ چینی کے سامنے کھڑا لرز رہا ہوگا۔

وہ کیسا کم نصیب دن تھا! وقت کی رفتار غم کی طرح سست تھی۔ داغ دار، چھوٹی ننگی باہوں والے بھننے ہوا میں پھڑپھڑاتے ہوئے لمبے لمبے پروف ہاتھوں میں لئے پھر رہے تھے۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص مجھ پر تعجب اور حقارت کی ایک نظر ڈالتا ہے اور پھر مجھے اپنے خیالات سے نکال دیتا ہے۔ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ کام تھا مگر مجھے کوئی کام نہ تھا جو لوگ میرے ساتھ انتظار کر رہے تھے ایک ایک کر کے بلا لئے گئے اور انہیں کام بتا دیا گیا۔ میں اکیلا رہ گیا۔

تب ایک اَور خطرے نے میری کمزور و مصروف متخیلہ کو عذاب دینا شروع کیا۔ کیا میرا افسر اپنے نئے رنگروٹ کو بھول گیا؟ یا اُسے میری کم حیثیت کے مطابق کوئی کام ہی نہیں ملا؟ اس خیال نے پہلے تو مجھے شرم میں غرق کر دیا پھر یکایک غصے اور غلط کاری کے جذبے سے بھر دیا۔ آخر وہ کیوں میری یوں تحقیر کرے؟ کیا میں حق نہیں رکھتا کہ

مجھے آزمائش کے طور پر ہی کہیں لگا دیا جائے؟ کیا کوئی ایسا کام بھی تھا جس کے متعلق اُس نے سوچا ہو کہ میں اُسے سرانجام نہ دوں گا یا اُس کے لیئے اپنی جان دینے سے دریغ کروں گا؟ میں اُس کے پاس جاؤں گا اور اُس سے کہوں گا کہ میں یہاں کام کرنے آیا ہوں اور کام لے کر چھوڑوں گا۔ نہیں، مجھے جھڑک دیا جائے گا اور واپس اپنی جگہ پر بھیج دیا جائے گا، یا شاید اُسی وقت برطرف کر دیا جائے۔ مجھے اس تحقیر کو خاموشی کے ساتھ برداشت کر لینا چاہیئے۔

میں نے نظر اٹھائی تو تم داخل ہو رہے تھے۔ تمہارا روشن، سرخ، بھیگا ہوا چہرہ چمک رہا تھا۔ جب تم آئے تو سارا کمرہ جگمگا اُٹھا۔ تمہاری اِس زندہ دلی اور خود اعتمادی پر میں نے تمہیں بلا سوچے سمجھے خوب دل کھول کر کوسا۔ آہ جدوجہد اور کامیابی کا کتنا فاصلہ تمہیں مجھ پر فوقیت دیئے ہوئے تھا ——— تمہیں، جو رپورٹر تھے، مجھ پر، جو مبتدی تھا! اور میں اُس وقت یہ ہولناک آواز آئی ——— "بارکلے! بارکلے!" ——— یہ کرخت آواز اب بھی قیامت ہی کو سنوں گا۔ میں اندر گیا، مجھے اپنے متعلق حکم سنایا گیا جسے لے کر میں باہر آیا، مجھ پر کچھ ایسی پریشانی اور گھبراہٹ طاری تھی کہ یقیناً بالڈون نے مجھے ایک احمق سمجھا ہو گا۔ اور پھر تم میرے پاس آئے اور اپنے مدعا کو چھپاتے ہوئے ایک عجیب بے قاعدہ طور پر تم نے مجھ سے واقفیت حاصل کی اور میرے کام کے متعلق تم نے مجھے ایک دو باتیں بتا دیں۔ اُس وقت میں تمہارے لئے جان تک دینے کے لئے تیار تھا۔

یہ ایک معمولی سی بات تھی لیکن وہ دوستی جس کی ابتدا مردانہ دستگیری سے ہوئی تھی بائیس برس تک باہمی اعتماد اور وفاداری سے نبھی؛ اور نشو و نما بیج کو سرفراز کرتی ہے۔ یہ پودا اپنے ابتدائی دنوں میں خوب بڑھا۔ بہار گزر رہی تھی کہ ہم نے اپنے رہنے کے لئے ایک مشترکہ کمرہ کرائے پر لینے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا، ایک بھدا سا کمرہ، اور بارہ طویل سالوں تک یہی ہمارا اور ہماری امیدوں کا اور ہماری ناامیدیوں کا اور ہماری مصائب کا اور ہماری راحتوں کا مسکن رہا۔

میرا خیال ہے کہ میں اس کمرے کی ایک بات بھی نہیں بھولا۔ ہماری پہلی خرید وہ بڑی سی پرانی میز جس پر بیٹھ کر ہم زندگی کی جدوجہد سے بچے ہوئے مختصر وقفوں میں بقائے دوام کے لئے کام کیا کرتے تھے بالکل میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ تمہاری دراز جس میں تمہاری "علم المعیشت" کا مسودہ رہا کرتا تھا دائیں طرف ہے۔ میری دراز بائیں جانب ہے؛ اس میں میرا نا تمام ڈراما اور نظمیں پڑی ہیں۔ تمہاری چارپائی دروازے سے داخل ہونے پر بائیں طرف ہے اور میری دائیں طرف۔

کیسی عجیب بات ہے کہ میں یہ سب کچھ صاف طور پر دیکھ رہا ہوں اب جب کہ سب کچھ بدل چکا ہے۔

اب تک مجھے وہ رات کے ایک بجے نیند سے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ گھر آنا یاد ہے۔ میں نے دروازہ کھولا ۔۔۔۔ لو، مجھے اُس کی زنجیر اپنے ہاتھ سے چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔۔۔۔ اور میں بائیں طرف دیکھتا ہوں۔ آہ، تم گھر میں ہو اور سو رہے ہو۔ مجھے میز کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے مشترکہ "خزانے" میں کچھ نقدی ہے اور ہماری باضابطہ قرارداد کے مطابق مجھے معلوم ہے کہ میز پر دو روٹیاں اور کچھ پنیر رکھا ہے۔ تم بھوکے ہی سو گئے ہو، کیونکہ جب تک ایک نہ آئے دوسرا نہیں کھا سکتا۔ میں تمہیں جگاؤں گا اور ہم دونوں اکٹھے کھانا کھائیں گے اور پھر گزشتہ اور آئندہ دن کی باتیں کریں گے۔

کیا یہ تعجب خیز نہیں کہ میں اِس حقیقت کو کسی قدر تکلف کے ساتھ پا سکوں کہ یہ محض گزرے ہوئے زمانے کی ایک یاد ہے ۔۔۔۔ میں، جس کے پاؤں اِس وقت اُس سمور میں لپٹے ہوئے ہیں جسے اگر ہم اُس وقت خریدنا چاہتے تو ہم دونوں کو یا ہم جیسے ایک درجن آدمیوں کو فقیر بنا کر چھوڑتی۔ یقیناً تعجب خیز ہے یہ معاملہ کہ میرے خیالات لڑکپن اور جوانی کی خام کاریوں میں بھٹکتے پھریں۔ میں جس نے دنیا کی نظروں میں نام اور شہرت پیدا کر لیا ہے۔ میں جس کے پاس ایک پختہ کار کی حیثیت سے نوجوان مشورے اور حوصلہ افزائی کے لئے آتے ہیں۔ تعجب ہے کہ میں ایک ایسے زمانہ کا خیال کر رہا ہوں جب ابھی تمہاری سچی اور لازوال دوستی بھی میرے دل کی پیاس نہ بجھا سکی تھی، وہ پیاس جو ایک زیادہ محبوب اور زیادہ دلی رفاقت کے لئے تھی۔ میں، جسے ایک ہمدرد اور شفیق بیوی کی محبت حاصل ہے جو کسی وقت میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی؛ جو اپنی نیند میں بھی مجھ سے میری روح سے زیادہ دُور نہیں رہتی۔

پھر سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ رنج واندوہ کا وہ اضطراب اور تنہائی کا وہ زبردست احساس جو کبھی ہمارے اشتراک کے خاتمے پر مجھ پر چھا گیا تھا ایک بھولی بسری یاد ہے دوسری یادوں کی طرح جنہیں ہم دل کی آرامگاہ سے بُلا کر خیال کے پردے پر دیکھ سکتے ہیں اور پھر حسبِ دستور ایک آہ یا ایک تبسم کے ساتھ رخصت کر سکتے ہیں! آہ، دس ہی سال پہلے یہ کتنی واقعی بات تھی، کتنی درد انگیز بات! یقین کرو، دوست، ۔۔۔۔ ہاں میں چاہتا ہوں کہ تم اس پر یقین کرو ۔۔۔۔ کہ تنہائی کی ان اولین گھڑیوں میں مَیں بڑی خوشی سے موت کو قبول کر لینے کے لئے تیار تھا؛ موت کو جو اگر اُس وقت آتی تو اُسی سکون کے ساتھ مجھ پر چھا جاتی جس سکون کے ساتھ ابھی ابھی ساتھ کے کمرے میں نیند میرے بچے پر چھا گئی ہے۔

اُس وقت تمہیں اس کی مطلق خبر نہ تھی اور میرا خیال ہے کہ اب بھی تم پوری طرح اس کا یقین نہ کرو گے،

کیونکہ ہم مردانہ وار ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے۔ میرا اوپر کا ہونٹ بھی اُتنا ہی تنا ہُوا تھا جتنا کہ تمہارا، صرف اُس پر بال نسبتاً ذرا کم تھے۔ شاید یہ تمہیں مبالغہ معلوم ہو۔ لیکن تمہارے اور میرے حالات میں بڑا فرق تھا۔ جب محبت کے دیوتا نے تم پر نگاہ کی تو تم نے اپنے قلم کا رخ دولت کی طرف پھیر لیا؛ تم ایک جج کی بیٹی سے شادی کرنے جا رہے تھے اور ایک بہت بڑی جاگیر اور روپے کے مالک بننے والے تھے۔ اور اس کا بڑی حد تک تمہیں علم بھی ہو گیا تھا یا کم از کم تمہیں امید ضرور تھی۔ امید بڑی چیز ہے۔ لیکن میں؟ میں اسی کلبۂ احزان میں رہ گیا، اپنے بہترین دوست کو کھو کر، اور میرا دل ویران تھا، اُس میں نہ کسی کی یاد تھی نہ امید، اور میرا آخری افسانہ تمام رسالوں کے دفاتر سے گھوم کر میرے پاس واپس آ چکا تھا۔

مجھے پھر اپنے نفیس کتب خانہ میں پہنچ جانے دو، جہاں اچھی اچھی کتابیں ہیں اور روشن آگ ہے۔ اب میں پھر اپنے پاؤں تمہارے سمور میں ڈالے بیٹھا ہوں اور دوسرے کمرے میں اپنی بیوی کے قدموں کی آواز سُن رہا ہوں۔

چونکہ ہم ایک مدت تک اس درجہ متحد و متفق ہو کر رہے ہیں کہ ایک کی آواز کی ہلکی سے ہلکی لرزش بھی دوسرے کے لئے صریح الفاظ سے زیادہ معانی رکھتی ہے اس لئے جو کچھ میں نے ابھی ابھی کہا ہے اس میں تمہارے کانوں کے لئے میرا پُر افسوس لہجہ بھی شامل ہو گا ـــــ افسوس اُن دنوں کے لئے جو گزر چکے۔ اور اس میں تعجب کی کونسی بات ہے اگر میں اُن دنوں کے لئے متاسف ہوں؟ ایک غریب سپاہی جسے قسمت نے اپنے بے بساط لڑکپن میں بھی کام سے فرصت نہ دی ہو، جو صحافت کی آرام نہ لینے والی، اور دوسروں کے لئے راستہ صاف کرنے والی عظیم الشان محارب فوج میں ایک ادنیٰ درجہ سے ترقی کر کے اعلیٰ رتبہ پر پہنچا ہو، کیا وہی آدمی، یک لخت، اپنے تنے ہوئے سخت اعضا کو گھر کے آتشدان کے سامنے ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھ سکتا ہے؟ کیا اُس کی ٹانگیں سفر کے تصور میں خودبخود ہلنے نہ لگیں گی؟ کیا اس کا موسم زدہ چہرہ بارش کے چھینٹوں کی آرزو نہ کرے گا؟ کیا تمہیں اِس پر حیرت ہو گی اگر رات کے وقت وہ اپنا نرم سفید بستر چھوڑ کر ایک کمبل اوڑھے کھلے میدان میں پھرنا چاہے جہاں اُس کے سر کے اوپر رات کی نیلی وسعتوں کے پرے چمکتی دمکتی دنیاؤں کا جلوس گزر رہا ہو؟ اور اگرچہ ساتھ کے پلنگ پر وہ پیاری پیاری آنکھیں بیدار ہو کر سرزنش آمیز حیرت کے ساتھ اُس کی طرف دیکھنے لگیں؛ اور اگرچہ محبت آمیز باہیں کھینچ کر پھر اُسے اپنا مطیع کر لیں، لیکن اس پر بھی کیا اُس کا دل دھڑکتا ہُوا خوابوں میں اُس جگہ نہ پہنچ جائے گا جہاں سے ڈھول کی آواز آ رہی ہو یا کیمپ کے گیتوں کی موسیقی بلند ہو رہی ہو؟

پہلے سال کی بے قیاس مسرت میں میرا یہی حال تھا، بلکہ بچے کی پیدائش کے بعد تک یہی حال رہا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ کئی مہینوں تک میں اپنے لڑکے کے وجود کو ایک حقیقت تسلیم نہ کر سکا؟ اس عرصے میں اگر کسی وقت بھی وہ

اپنے کھٹولے سمیت میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوتا اب مجھے اُس وقت اس کا یقین آیا جب اُس کی آنکھوں میں اُس کی ماں کی آنکھوں کی جھلک نظر آنے لگی۔

ہاں، اُن دنوں میرے اندر کوئی پرانا جذبہ کام کرتا تھا بعض اوقات مجھ پر وہی وحشیانہ آزادی غالب آجاتی تھی جس کے نشہ سے سرشار ہو کر ہم دنیا کا لطف اٹھایا کرتے تھے ـــــ وہی جذبہ جس کے رُو سے ہم اپنی مرضی کے علاوہ دنیا کی کسی ہستی کے آگے جواب دہ نہیں تھے ـــــ وہی احساس جو ایک غیر پابند اور بے پروا طاقت تھا۔

کیا تمہیں وہ رات یاد ہے جب ہم طلوعِ آفتاب تک گھومتے رہے تھے؟ تمہیں یاد ہو گا کہ آدھی رات کے قریب جب ہم نے دفتر چھوڑا کتنی گرمی تھی، اور ایوانِ بلدیہ کے بالمقابل چھٹکی ہوئی چاندنی ہمیں کس طرح میدان کی طرف کھینچ رہی تھی جہاں نہ گیس کی روشنی کی چکا چوند تھی نہ کسی بتی کی جھلملاہٹ۔ ہم یوں ہی سکوت زدہ گلیوں، بے فراغ بازاروں اور پُرسکون راستوں سے گزرتے گئے۔ بند اور تاریک مکانات پیلی پیلی چاندنی کے اندر بڑے بڑے مقبروں کی طرح نظر آرہے تھے۔ ہم حوالیِ شہر سے گزر گئے؛ ہم بیرونِ شہر کی باغوں سے گھری ہوئی کوٹھیوں سے بھی گزر گئے اور ہم اُس وقت ایک پہاڑی پر پہنچ چکے تھے جب سورج کی کرنیں درختوں کی اونچی اونچی چوٹیوں کو چھونے لگیں۔

میں اُس وقت اِس آزاد سفر کی پاکیزہ مسرت کی خاطر ساری زمین کو طے کر جانے پر تُلا ہوا تھا۔ اُس وقت ہمیں روکنے والی کون سی چیز تھی؟ گھر بار کا کوئی رشتہ نہیں۔ دنیا کے لئے ہم پیچھے کیا چھوڑ رہے تھے؟ چند بے سروپا مہمل تحریریں اور یہ ایک ایسا سرمایہ تھا جس سے ہمارے سر خوب پُر تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہی وہ حقیقی موقع تھا کہ ہم اس سیر کو شروع کر کے رُک گئے جس سے اگر ہم جی بھر کر لطف اندوز ہوتے تو اپنی زندگیوں کو تباہ کر لیتے۔

ہاں تو آوارگی کا وہی گسستہ عنان جذبہ کبھی کبھی مجھ پر غلبہ پا لیا کرتا تھا۔ ایسے اوقات بھی آتے تھے کہ ایک لمحے کے لئے میں بھول جاتا تھا کہ میری ایک بیوی ہے اور ایک بچہ ہے۔ ایسے اوقات بھی آتے تھے جب میں انہیں اپنے لئے ایک بوجھ سمجھتا تھا۔ میں اسے کیوں نہ کہہ ڈالوں؟ یہ ہر شادی شدہ آدمی کی سرگزشت ہے ـــــ کم از کم ہر مرد آدمی کی ـــــ خواہ اُس کی شادی دنیا کی بہترین عورت ہی سے ہوئی ہو۔ اِس کے معنی محبت کا فقدان نہیں ہیں۔ یہ اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا نفیری کی آواز پر تمہارے خون کا اچھلنا ناگزیر ہے۔

پہلے پہل میں ڈر گیا اور اس جذبے کے خلاف جنگ کرنے لگا جیسے کسی بری عادت کے خلاف جنگ کی جاتی ہے میں عالمِ خیال میں غیر وفادار ہونے پر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔ آہ جنگ کرنے کی مجھے کیا ضرورت تھی؟ اپنے باغی تخیلات کا گلا گھونٹنے کی مجھے کیا ضرورت تھی جب میری بیوی کی محبت وہ معجزہ دکھا رہی تھی جس سے دو روحیں مل کر ایک ہو جاتی ہیں؟

آخر یہ اتحاد کیا ہے جو ہمارے لئے ایک حیرت بن کر آتا ہے اور تمام بیرونی دنیا کے لئے ایک ناقابلِ بیان راز بن کر رہتا ہے؟ یہ کیا ہے جو ہماری غیر ازدواجی محبت کو ہماری نظروں میں حقیر اور طفلانہ بنا دیتا ہے؟ تم اور میں، جو اس سے بہرہ ور ہیں جانتے ہیں کہ یہ محض ارتباط و اختلاط کا ثمر نہیں ہے، گو اس کی نشو و نما انہیں کے پہلو بہ پہلو ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک عجیب انداز سے مرد کو ملتا ہے کہ وہ عورت کی روح کو دیکھے جس طرح وہ اپنی روح کو دیکھتا ہے اور عورت کو کہ وہ مرد کے دل میں نگاہ ڈالے جیسے یہ اُس کا اپنا دل ہے۔ میرا کوئی دوست جب دیکھتا ہے کہ میری بیوی اور میں ایک دوسرے کی بات کو آنکھوں کے اک ذرا سے مل جانے ہی سے پا جاتے ہیں تو وہ اسے ذہانت کی اُس نگاہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا جو عموماً دو دلی دوستوں کے درمیان بات چیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اُسے اُس مسرت کا وہم و گمان تک نہیں ہوتا جو ہمیں اپنی اس گفتگو میں حاصل ہو جاتی ہے ۔۔۔۔ وہ گفتگو جس کی زبان کو وہ سمجھ نہیں سکتا، جسے وہ سُن نہیں سکتا ۔۔۔۔ وہ زبان جس کے باضابطہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ جس میں جذبات جذبات کا جواب دیتے ہیں۔

اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ میں اُس امتنان کا اظہار چاہوں جس کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کو یوں پھلتے پھولتے دیکھا ہے ۔۔۔۔ اپنی احسانمندی کا، محبت کے لئے، جس نے مجھے نہ صرف مسرور تر، بلکہ میں عاجزانہ اقرار کرتا ہوں کہ بہتر و بلند تر دل و دماغ عطا کیا ہے۔ مگر مجھے اس اظہار کے لئے اپنے عجزِ بیان کا اعتراف ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں شاعر ہوتا تو میرا بہترین شعر بھی پُوری صفائی سے اسے ادا نہ کر سکتا۔

میرا خیال ہے کہ ابھی ابھی میرے پیچھے کوئی سرسراہٹ سی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر میں میری بیوی آہستہ سے کمرے میں داخل ہو گی اور آہستہ سے میرے پاس آ کر کھڑی ہو جائے گی پھر ایک ہاتھ آہستہ سے میرے کندھے پر رکھے گی اور اُس کا دوسرا ہاتھ میرے اُس بازو تک بڑھ جائے گا جس سے میں یہ خط لکھ رہا ہوں، یہاں تک کہ وہ نرمی سے مگر اس نرمی میں محبت کی قوت ہو گی، میرے اُس ہاتھ کو پکڑ لے گی جس میں قلم ہے۔ اور میں کہوں گا "بس آخری الفاظ، ولیم اور اُس کی بیوی کے لئے، پیاری" اور وہ میرے ہاتھ کو چھوڑ دے گی اور اپنا ہاتھ اٹھا کر، میرا خیال ہے، کہ میری کنپٹی پر کے سفید بالوں کے گچھے کو چھوئے گی، یوں جیسے اُس کو اِن پر رحم آ رہا ہو کہ یہ بھی اُس کی ایک ادا ہے، اور وہ کہے گی، "میرا بھی اُن کو سلام لکھنا اور کہنا کہ اِس کرسمس پر وہ ضرور ہمارے ہاں آئیں۔ میں اُن کو دکھانا چاہتی ہوں کہ ہمارا وِلی کتنا بڑا ہو گیا ہے"۔ اور جب وہ "ہمارا وِلی" کہے گی تو اُس کا وہ ہاتھ جو میرے کندھے پر ہے بے اختیار ذرا سا بند ہو جائے گا؛ اور وہ اپنا سر جھکا دے گی اور میں مڑ کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دوں گا۔

پیارے دوست صبر کرو یہاں تک کہ میں تمہیں بتا چکوں کہ یہ خط میں نے کیوں لکھا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے۔ ایک بات میں نے تم سے گزشتہ چھ ماہ سے چھپائے رکھی ہے۔ مجھے دل کی بیماری ہے اور ڈاکٹر نے مجھے بتایا ہے کہ ہر لمحہ ہماری موت کا امکان ہے۔ مجھے خیال ہو رہا ہے ——— مجھے یقین ہو رہا ہے کہ وہ لمحہ اب قریب ہے۔ میں جلد ہی اپنے بستر پر چلا جاؤں گا جو دروازے کے دائیں طرف بچھا ہے، اور مجھے یقین نہیں کہ صبح میں بیدار ہوں گا۔ اور آفتاب کی کرنیں میری آنکھوں کو یہ دکھانے کے لئے روشن کریں گی کہ میرا رفیق مجھ سے جدا ہو چکا ہے۔

کیونکہ میں اُسی پرانے کمرے میں ہوں جیسا کہ تمہیں علم ہے، اور تمہیں یہاں سے گئے دس سال نہیں ہوئے بلکہ دو دن ہوئے ہیں۔ وہ تصویر جو ان صفحات کو لکھتے وقت مجھے حقیقی نظر آ رہی تھی اب آہستہ آہستہ ماند پڑتی جا رہی ہے، اور شمع کی لَو تھرتھرا تھرتھرا کر ڈوبی جاتی ہے۔ صبح قریب ہے اُس کے ہنگاموں کا آغاز ہے۔ ہوا بخاری میں داخل ہو کر ہانپ رہی ہے اور تڑپ رہی ہے اور نیچے آتشدان میں آکر سفید راکھ کو اُڑا رہی ہے۔ میں نے ابھی ابھی اپنی نظمیں اور ڈراما جلا دیا ہے۔ اب میز کی دونوں درازیں خالی ہیں، اور بہت جلد دونوں خالی کرسیاں میز کی دونوں اطراف سے ایک دوسری کی طرف تکتی رہ جائیں گی۔ اس عظیم خلو میں میرے تصور نے کتنا وحشت ناک خواب دیکھا ہے! ابھی ابھی میں اسے حقیقت سمجھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے اپنے پیچھے کسی عورت کے قدموں کی چاپ سنی ہے، اور اس لئے میں مڑ کر دیکھ رہا تھا۔

میرا پُر محبت سلام لو، میں اب سونے کے لئے جا رہا ہوں۔ شاید میں اس خواب کو ایک بار پھر دیکھوں، اور اُن دھیمے قدموں کی آواز کو ایک مرتبہ پھر سنوں، جب رات پلٹنے لگے جب پھٹے پُرانے پردوں میں سے پیلی پیلی روشنی نمودار ہونے لگے اور جب اس طویل تنہائی کا انجام آ پہنچے۔

جب میں مر جاؤں تو میں چاہتا ہوں کہ تمہارے خیال میں مَیں وہ نہ ہوں جو میں تھا بلکہ وہ ہوں جو میں بننا چاہتا تھا۔ میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ تمہاری رفاقت میں مَیں نے امید اور چاہت کی اُس سے ایک خوش تر اور محبوب تر زندگی بسر کی ہے جسے تم نے دیکھا ہے۔ مَیں نے تمہارے تصور کے لئے اپنی ایک ایسی تصویر چھوڑ جانے کی کوشش کی ہے کہ جب اُس دوست کی یاد کے لئے جسے تم اچھی طرح جانتے تھے اور جسے شاید اُس کے مرنے کے بعد تم بہتر طریق پر جاننے لگو تمہیں سکون اور تنہائی کی ایک ساعت میسّر آ جائے تو تمہیں اُس کو اپنی نظروں کے سامنے لانے میں کوئی تکلف نہ ہو۔

ریجی نلڈ بارکلے

پارہ

(۱۸-نومبر ۱۸۹۳ء کے "نیویارک ہیرلڈ" سے لیا گیا)

ریجی نلڈ بارکلے، ایک اخبار نویس، کل صبح اپنے بستر میں مردہ پایا گیا۔ موت کا باعث دریافت کرنے کے لئے کوئی طبّی تحقیقات نہیں کی گئی کیونکہ اُسے اختلاجِ قلب کا عارضہ تھا اور اُس کی موت غیر متوقع نہ تھی۔ مرحوم ایک ہونہار نوجوان اخبار نویس تھا۔ چند سال تک وہ "مارننگ ریکارڈ" کے شہری عملے میں کام کرتا رہا اور کئی ایک غیر مقامی اخبارات کا نامہ نگار بھی رہا۔ اُس کے مضامینِ نظم و نثر ماہوار رسالوں میں بھی چھپتے رہے ہیں جن سے کسی حد تک اُس کی دماغی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ بارکلے کی عمر تیس سال کے قریب تھی اور ابھی اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

منصور احمد

گزرتا ہوا لمحہ

ٹھہر ٹھہر او گزرنے والے لمحے، ذرا ٹھہر! دنیا سے یوں بے نصیب نہ جا! میں تجھے مالا مال کر دوں گا، تجھ میں معنی کا آبِ حیات بھر دوں گا، تجھے حسین بنا دونگا ذرا تو ٹھہر! کیا تیرے تجھ سے پہلے آنے والوں بھائیوں نے میری کوئی غیبت تو نہیں کی کہ تو یوں مجھ سے خائف ہے؟ ذرا ٹھہر! نہیں میں کسی کی یاد میں تجھے نہ ڈبوؤں گا۔ ہرگز تجھے حسن و عشق کی گلفروشیوں کی نذر نہ کروں گا! ذرا دم لے!

مجھے معلوم ہے کہ تو وہ "اچھا وقت" نہیں جس کا سب کو انتظار ہے مگر مجھے اس علم سے کوئی بے چینی نہیں۔ تجھے معلوم ہے کہ میں وہ استاد نہیں جو تجھے کوئی غیر فانی انا الحق کا سبق سکھلائے۔ تو بھی معمولی ایک لمحہ ہے، فانی، ان پڑھ، جلدی کا مارا میں بھی ایک معمولی انسان ہوں ظالم، جاہل، بے سمجھوں کا شکار مگر جو ہم دو مل بیٹھیں، مل کر کچھ کام کریں تو کیا ممکن نہیں کہ

گاہ باشد کہ کودکے ناداں   از غلط بر ہدف زند تیرے

آ، مجھ سے مل! مجھے یقین ہے اے گزرنے والے بھولے بھالے لمحے، کہ تیرا ستارہ چمکے گا۔ اس ستارے کو بہت آنکھیں دیکھیں گی بیٹھنا نہیں تو تھوڑی دیر کھڑا رہ! ہاں سُن مجھ سے میرے ایمان کی شرطیں سن۔ کہنے کو یہ شرطیں ہیں مگر جو تو انہیں اپنا لباس سمجھے اور راس نہ آئے تو خدا جانے تو کیا بن جائیگا۔

لے اب سن۔

اول میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کو ہر ذی روح یکساں عزیز ہے۔ دوم میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کو پتہ بھی نہیں کہ گناہ کیا چیز ہے۔ سوم میں شہادت دیتا ہوں کہ دکھ انسانوں میں مرتے رہتے ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ ہر انسان قسما قسم کے دکھ درد کا چلتا پھرتا قبرستان ہے۔ چہارم۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ دکھ انسان میں ہے مگر انسان دکھ میں نہیں۔ پنجم۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ سکھ انسانوں میں جنم لیتے رہتے ہیں مگر ہر انسان انہیں بغیر پالے پوسے اُن کے اپنے گھر سے نکالتا رہتا ہے۔ ششم۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا انسان کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

تو سُن چکا! جا سب کو سنا دے۔

فلک پیما

آئینۂ حیرت

وہ جس نے ڈال رکھا ہے زمانے کو تحیّر میں
وہ جو محبوس ہو سکتا نہیں قیدِ تصوّر میں

وہی ہے جس سے اے نُورِ نظر! حیران ہے تُو بھی!

مجھے حیرت پہ حیرت ہے کہ تُو ہو وقفِ حیرانی
یہ حیرانی تری ہے مجھ کو وجہِ صد پریشانی

اگر آئینہ بے حس ہے تو کیا بے جان ہے تُو بھی؟

کہوں کیا راگ کیسا کھیلتا ہے تیرے مکھڑے میں
کہ دُکھیارے کا جی لگتا نہیں اب اپنے دکھڑے میں

خدائی جس سے ہو مدہوش سی وہ تان ہے تُو بھی!

کرشمے سینکڑوں مُند رہے ہیں جس طرح فطرت میں
سُبک نازک حسیں نایاب بس اس طرح فطرت میں

قضا کی آن ہے تُو بھی خدا کی شان ہے تُو بھی!

جو کوئی غور سے دیکھے تو اک اک شے کو حیرت ہے
وہ حیرت جو دلِ کون و مکاں کو وجہِ غیرت ہے

میں سمجھا ہاں میں سمجھا کس لئے حیران ہے تُو بھی!

سمجھ ہی میں نہ آیا تجھ کو دل کی آرزو کیا ہے؟
خودی کی زندگی میں یہ کسی کی جستجو کیا ہے

جو سمجھے بھی تو کیا سمجھے کہ اک انسان ہے تُو بھی!

ل ب

منُ سُکھی اور سندر سنگھ کا قصّہ

کسی قوم کی ادبی زندگی میں اس سے زیادہ افسوس ناک بات کوئی نہیں کہ بلند پایہ تصانیف سے اُس کا سرمایہ خالی ہو۔ کسی قوم کی ادبی زندگی میں اس سے زیادہ شرمناک بات کوئی نہیں کہ نہایت بلندپایہ تصانیف اُس کے سرمائے میں موجود ہوں مگر اُن کی صحیح قدر وقیمت پہچاننے کی توفیق بھی اُسے میسّر نہ ہو۔ لولوئے شاہوار گھر میں نہیں ہے تو نہ سہی لیکن لولوئے شاہوار کا گھر میں ہونا اور پھر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں پڑے رہنا یقیناً اہلِ خانہ کی کور ذوقی کا ثبوت ہے۔ "منُ سکھی اور سندر سنگھ کا قصّہ" بھی ایک ایسا ہی موتی ہے جو ہماری غفلت اور ہنر ناشناسی کی خاک دُھول میں اَٹا ہوا آج تک کُنجِ گمنامی میں پڑا رہا ہے اور خدا جانے ابھی کب تک پڑا رہے گا۔

کچھ عرصہ گزرا راقم الحروف کو اپنے ایک عزیز کے مکان پر چند گھنٹے بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ وقت گزارنے کے لئے کسی اچھی کتاب کی تلاش ہوئی تو اُن کے ذخیرۂ کتب پر نگاہ دوڑانی شروع کی۔ اُن کتابوں کے پیچھے جو اس لئے اچھی سمجھی جاتی ہیں کہ نئی ہیں، سررشتۂ تعلیم پنجاب کی کچھ پرانی درسی کتابوں کا الٹا سیدھا انبار بھی لگا تھا۔ اس پہ ہاتھ مارا تو ایک فرسودہ سی کتاب نکل آئی جسے اس سے پہلے دیکھنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کتاب میں دوسری چیزوں کے علاوہ تین قصّے تھے۔ ایک نادیدہ مگر بظاہر معمولی چیز سے انسان کو جو معتدل سی دلچسپی ہو سکتی ہے اُسی کے ساتھ پہلا قصّہ پڑھنا شروع کیا۔ یہ قصّہ کتاب کے ساٹھ صفحوں پر پھیلا ہوا تھا۔ لیکن اس کے ابتدائی چند صفحے ہی چونکا دینے کے لئے کافی تھے۔ اور جوں جوں اُسے آگے پڑھا، استعجاب اور فریفتگی اور پھر استعجاب رہ رہ کر پیدا ہوتا گیا۔ یہ "منُ سکھی اور سندر سنگھ کا قصّہ" تھا۔ اس قصّے کے مطالعے سے راقم الحروف کو جو تجربہ ہوا وہ بلا مبالغہ ایک نئی دنیا کے انکشاف سے کم نہ تھا۔ اور اس کی کم سے کم تعریف جو کی جاسکتی ہے، یہ ہے کہ یہ قصّہ اپنی نوعیت میں بے نظیر ہے۔

کتاب کے تین قصّوں میں سے ایک ہندوستان کی اسلامی معاشرت اور باقی دو ہندوؤں کی معاشرت کے متعلق ہیں۔ ایک سرسری نظر سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ معاشرتی افسانوں کی یہ دوگانہ تقسیم دو مختلف قلموں کی شرمندۂ احسان ہے، اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ اسلامی معاشرت کے ترجمان کو وہ کمالِ فن عطا نہیں ہوا جو اُس کے ہم قلم

کے حصّے میں آیا ہے۔ معاشرتِ ہنود کے مصوّر کی قوتِ اظہار میں اِس بلا کی شدّت اور فراوانی و رجستگی ہے اور اُس کا موقلم تصویر کے پردے پر بغیر کسی کوشش کے اِس صفائی کے ساتھ جنبش کرتا ہے کہ اس خاص صنف میں اُس کا کمال انگلستان کے سب سے بڑے ڈراما نویس شیکسپیئر کی یاد دلاتا ہے۔

تینوں قصّوں کے نام علی الترتیب یہ ہیں:۔

(۱) من سکھی اور سندر سنگھ کا قصّہ۔

(۲) خوشحال چند اور ہیرا، دولت رام اور مونگا، کروڑی مل اور گنگی کا قصّہ۔

(۳) جہاں آرا بیگم اور محمد یوسف، گیتی آرا بیگم اور محمد جمیل الدین کا قصّہ۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ پہلے دو قصّے رائے بہادر لالہ پیارے لال دہلوی کی تصنیف ہیں جو مسٹر مدن گوپال ایم۔ اے جج ہائی کورٹ کے بڑے بھائی اور لالہ سری رام صاحب مؤلفِ "خمخانۂ جاوید" کے تایا تھے۔ تیسرا قصہ باعتبار فن سب میں فروتر ہے اور مولوی کریم الدین صاحب پانی پتی کا لکھا ہوا ہے۔

"رسومِ ہند" جس میں یہ قصے شامل ہیں اُردو نثر کے دورِ جدید کی بہت ابتدائی کتابوں میں سے ہے۔ اور یہ غالبًا اُسی زمانے میں لکھی گئی جب لاہور میں نئی شاعری کا آغاز ہوا۔ پنجاب کے مشہور ناظمِ سررشتۂ تعلیمات کرنل ہالرائڈ کا نام کئی حیثیتوں سے محسنانِ اردو کی فہرست میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے اور اردو زبان کے بہی خواہ اُن کو ہمیشہ محبت اور شکر گزاری سے یاد رکھیں گے۔ تاریخ ادبِ اردو میں یہ نیک نفس انگریز ایک زبردست مصلح بلکہ مجدّدِ اول کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اُسی کے مشورہ و ہدایت کے ماتحت پہلے پہل حالی اور آزاد نے اردو نظم میں ایک بالکل نئے طرز و فکر کی داغ بیل ڈالی جو آج ہماری شاعری کا عام انداز ہے اور غالبًا اِن معجزاتِ نثر کے لئے بھی جن کا ذکر اب ہو رہا ہے ہم اردو ادب کے اِسی مسیحا کے ممنونِ فیض ہیں۔ قیاس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کرنل ہالرائڈ نے جب اردو نظم و نثر میں افسانوں کا عام انداز دیکھا کہ وہ تقریبًا سب کے سب بے جان شہزادوں اور شہزادیوں کے بے رنگ عشق و محبّت کے بے لطف سوانگ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے تو انہوں نے مسٹر پیارے لال اور مولوی کریم الدین کو قصّہ نویسی کے فن میں اُسی طرح ایک نئی راہ نکالنے کی ہدایت کی جس طرح اُن کی رہنمائی میں حالی اور آزاد نے شاعری کی کایا پلٹ دی تھی۔

اِس بے مثل کتاب کو قلم بند ہوئے غالبًا نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ منقضی ہو چکا ہے۔ یہ ایک مدت تک محکمۂ تعلیم پنجاب کے نصاب میں داخل رہی مگر تعجب ہے، کہ ہزاروں پڑھنے والوں کے ہاتھوں سے گزرنے کے باوجود بھی

اِس کی حقیقی عظمت و اہمیت کا اندازہ قائم نہ ہو سکا اور اس کے کم از کم ایک قصّے کو ادبِ اردو میں وہ مستقل حیثیت نہ ملی جو یقیناً اُس کا جائز حق تھی یعنی سکھی اور سندر سنگھ کا قصّہ، ایک ایسا گراں مایہ اور نادر کارنامہ ہے کہ مغرب میں اِس صنفِ ادب کے بہترین استادانِ فن کے سامنے ہم اِسے فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔

کہانیوں کے اِس مجموعے کے نام ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ کرنل ہالرائڈ فنِ قصّہ نویسی کے کس پہلو پر سب سے زیادہ زور دینا چاہتے تھے جن ہندوستانی قصّوں کی فضا اور تمام متعلقات بطورِ تصنّع ایرانی کہانیوں کے مخصوص لوازم سے مستعار لئے گئے ہوں وہ محض بے حقیقت ہیں۔ اچھّا قصہ وہ ہے جو غیر ملکی حالات کی نقّالی پر مبنی نہ ہو بلکہ سچائی اور خلوص کے ساتھ اپنے ہی ملک کے حالات و واقعات رسم و رواج اور طرزِ معاشرت کا آئینہ دار ہو، کیونکہ یہ چیزیں قصے میں ایک عجیب روح پھونک دیتی ہیں جس کے بغیر وہ بالکل پھیکا اور بے جان رہ جاتا ہے۔ قصّہ نویس کو چاہئے کہ اپنے ملک کی رسم و تمدن کا غور سے مشاہدہ کرے اور یہی چیزیں اُس کی تحریروں سے خود بخود جھلک پڑیں۔

اِس مقصد کو لئے ہوئے مسٹر پیارے لال اور مولوی کریم الدین نے اپنا کام شروع کیا اور یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ اِن دونوں بزرگوں میں بلحاظِ کامیابی جو فرقِ مراتب ہے وہ بالکل اُس فرق کے متناسب ہے جو نظم کے میدان میں حالی اور آزاد کے درمیان قائم ہے۔ مسٹر پیارے لال ایک زبردست صنّاع کی طرح اپنے مقصد پر غالب آگئے ہیں لیکن مولوی کریم الدین پر خود اُن کا مقصد غالب آگیا ہے اور اُن کا قصّہ صحیح معنوں میں قصّہ نہیں رہا۔ مولوی کریم الدین کے قصّے میں واقعات اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ رسوم کا اظہار ہو۔ مسٹر پیارے لال کے دونوں قصّوں میں رسوم کا اظہار واقعات کے ضمن میں خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کا قصد محض ایک دل نشیں داستان سنا کر ہمارا دل بہلانا ہے نہ کہ کسی اور نیت سے ہم پر حملہ آور ہونا۔ مولوی کریم الدین کے واقعات میں ایک پریشانی و آشفتگی ہے کیونکہ قصّہ بجائے خود اُن کے لئے اتنا اہم نہیں ہے جتنا رسوم کا بیان۔ بخلاف اس کے مسٹر پیارے لال کے واقعات کا تسلسل بالکل قدرتی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایک استادِ فن کی طرح اول سے لے کر آخر تک قصّے کی تمام جزئیات اُن کے دماغ میں قائم اور روشن ہیں۔ اپنے قصّے کے افراد پر اُن کی گرفت غیر معمولی طور پر مضبوط ہے اور وہ اُسی قدر سلیقے سے اُنہیں حرکت میں لاتے ہیں۔ مولوی کریم الدین کے افراد بے جان لعبتیں ہیں جو مصنوعی کل پُرزوں کے بل پر متحرک ہوتی ہیں۔ مسٹر پیارے لال کے افراد زندہ ہیں۔ ہمیں اُن کی نبض کی تڑپ اور دل کی دھڑکن محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ جو الفاظ اُن کی زبان سے نکلتے ہیں اُن سے اُن کی کسی نہ کسی مخصوص طرزِ فکر و عمل کا اظہار ہوتا ہے یعنی وہ الفاظ ایسے نہیں ہوتے کہ اُن خاص حالات میں

ہر کسی کی زبان سے لازماً وہی ادا ہوں سیرت نگاری اسی کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ پورا قصّہ پڑھ چکنے کے بعد من سکھی، پاربتی، چندر کور، سندر سنگھ، گیان چند اور سجان سنگھ سب کی واضح تصویریں ہمارے ذہن میں رہ جاتی ہیں اور ہم اُن کے ساتھ الگ الگ اسی طرح واقف ہو جاتے ہیں جس طرح اپنی جان پہچان کے زندہ آدمیوں کے ساتھ۔ یہ اس لئے کہ مصنّف اپنے قصّے کے واقعات بیان کرتا ہوُا قلم کی ذرا ذرا سی جنبشوں میں اُن کے خدوخال نمایاں کرتا چلا گیا ہے۔

مولوی کریم الدین کا قصہ سیرت نگاری کے لحاظ سے بالکل ساقط الاعتبار ہے۔ مثلاً پوری داستان کو شروع سے لے کر اخیر تک پڑھ جانے کے بعد بھی اگر ہم یہ سوچنا چاہیں کہ جہاں آرا بیگم، گیتی آرا بیگم اور دل افروز بیگم میں بحیثیت مختلف انسانی افراد ہوئے کے کون کون سے امتیازی اوصاف ہیں تو کوئی مابہ الامتیاز ہمارے تصور میں نہیں آتا۔ یہ سب دھندلی سی شکلیں ہیں جن میں سب سے بڑی وجہ امتیاز یہی ہے کہ اُن کے نام مختلف ہیں۔ ان کاٹھ کی پتلیوں کی مسرت و غم سے ہمارا دل بالکل غیر متاثر رہتا ہے کیونکہ ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ سب ایک فریب، ایک کھیل ہے لیکن من سکھی اور سندر سنگھ کی قسمت کے ساتھ ہمیں اُتنی ہی دلچسپی ہے جتنی روز زندہ انسانوں کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ جو جو تفصیل ان دونوں کے متعلق مصنف کا قلم ہمیں دیتا ہے ہم اسے شکریے کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ رسوم کا بیان اِس قصّے میں ہمیں ناگوار نہیں ہوتا بلکہ ہم اُن کی تفصیلاتِ متعلقہ کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں اس لئے کہ خود من سکھی اور سندر سنگھ کے ساتھ ہمیں نہایت گہری دلچسپی ہے۔ ہندو تیوہاروں اور مندروں کی تصویریں بھی اسی ضمن میں آتی ہیں کیونکہ اِن کو جلا دینے کے لئے زندہ انسانوں کی صُورتیں اِن میں حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ بات آگے چل کر مثالوں کے ذریعے سے زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آسکے گی۔

مسٹر پیارے لال کا دوسرا قصّہ یعنی "قصّۂ خوشحال چند وغیرہ" بھی ادبی پائے کے لحاظ سے من سکھی اور سندر سنگھ کی کہانی کو نہیں پہنچتا۔ الگ الگ طور پر وہ سب خوبیاں اس میں بھی موجود ہیں جو من سکھی اور سندر سنگھ کے قصّے کا طغرائے امتیاز ہیں۔ یہاں بھی مصنف کا قلم ایک سیر حاصل دماغ کے اشاروں پر اُسی حیرت انگیز چابک دستی کے ساتھ سانس لیتی اور حرکت کرتی ہوئی زندگی کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا چلا جاتا ہے اور مصنّف کے تخیل کی تازگی اور پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لیکن باعتبارِ فن اس قصّے میں ایک نقص ہے اور یہ نقص قصے کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ یہ کہانی ایک کنبے کی تین مسلسل نسلوں کی داستان ہے اس کا اثر یہ ہوُا ہے کہ کہانی کی بنیاد جس نقشے پر قائم ہے اُس کے توازن میں خلل آگیا ہے۔ توازن میں خلل آجانے سے مراد یہ ہے کہ کہانی کے نقشے میں کوئی ایسی

وحدتِ مرکزی موجود نہیں رہ سکی جو قصے کے تمام منتشر اجزا کی شیرازہ بندہو جاتی۔ اِس وحدت کے بغیر قصّے اور روزنامچے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ یہ سچ ہے کہ ایک قسم کی وحدت کہانی کے نقشے کی موجودہ صورت میں بھی پائی جاتی ہے کیونکہ سب واقعات ایک ہی گھرانے کی تین نسلوں کو پیش آتے ہیں لیکن یہ وحدت محض مصنوعی ہے اور بہ لحاظِ فنِ قصے میں اس کا وجود و عدم تقریباً یکساں ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس کنبے کی تینوں نسلیں براہِ راست باہم ملی ہوئی ہیں لیکن بااین ہمہ کہانی کے نقشے میں اس سے جو وحدت پیدا ہوتی ہے اُس کی نوعیت محض خارجی ہے جو پوری کہانی کو کوئی ایک روح نہیں دے سکی۔ بخلاف اس کے من سکھی اور سندر سنگھ کے قصے میں وحدتِ معنوی کی وجہ سے ایک نئی شان پائی جاتی ہے۔ وہ بنیاد جس پر اِس لاجواب قصّے کی ادبی وحدت قائم ہے من سکھی اور سندر سنگھ کی محبت ہے۔ یہی وہ محور ہے جس کے گرد اول سے لے کر آخر تک قصّے کے تمام واقعات پھیلتے، چکر کھاتے اور سمٹتے ہیں۔ "رسومِ ہند" کے باقی دونوں قصّوں میں یہ بات نہیں۔ پس من سکھی اور سندر سنگھ کا قصّہ بہر حال اس مجموعے کا بہترین قصّہ ہے۔

اِس قصّے کو اردو افسانہ نویسی بلکہ اردو نثر میں ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ اردو ادب کا وہ نیا دَور جس کا زمانہ غالب کی وفات کے بعد سے شروع ہوا، قدیم ادبی روایات سے ہماری بغاوت کا دور ہے۔ "من سکھی اور سندر سنگھ کا قصّہ" اس بغاوت کا اولین نقیب نہیں تو اولین نقیبوں میں ضرور ہے۔ اس کو ایک نگاہ دیکھنا ہی یہ جان لینے کے لئے کافی تھا کہ ایک نئی نثر دفعتہً وجود میں آگئی ہے جس طرح اُسی زمانے میں حالی کے ہاتھوں ایک نئی نظم دفعتہً وجود میں آئی۔ "دفعتہً" کا لفظ یہاں اضافی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ حیاتِ انسانی کے کسی شعبے میں کوئی نئی ترقی ترقیاتِ ماسبق سے بالکل بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ بااین ہمہ یہ بہت بڑا انقلاب ہے کہ درباروں اور محلوں سے نکل کر افسانہ یک بیک دہاتیوں کے جھونپڑوں میں پہنچ جائے۔ عجائب و غرائب کی سحر کاریوں اور طلسم بندیوں کی ہوشربا داستانیں اور اُن کی ژولیدہ بیانیاں یہاں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ سیدھے سادھے لوگوں کی کہانی ہے جو سیدھی سادھی طرح لکھی گئی ہے۔ اس میں نہ مبالغے کو دخل ہے نہ بناوٹ کو۔ یہ ہندوستانی کسانوں اور اُن کی عورتوں اور بچوں کی زندگی کی سچی تصویر ہے۔ ایسی سیدھی سی حکایت کو ہنگامہ خیز اور سنسنی پیدا کرنے والے عناصر کی مدد کے بغیر دلچسپ بنا دینا مصنف کا اعجاز ہے۔ کہانی یوں ہے کہ ایک امیر کی لڑکی من سکھی جس نے بچپن ہی میں یتیم ہو جانے کے بعد اپنے چچا سجان سنگھ اور چچی چندر کور کے گھر میں پرورش پائی تھی جب پورے پندرہ برس کی ہو گئی تو سندر سنگھ نام ایک شریف اور صالح نوجوان سے اُس کی شادی ہو گئی۔ دونوں کی طبیعتیں ایک دوسرے کے لئے اِس قدر

موزوں تھیں کہ بہ حالاتِ ظاہر ایک لمبی اور پُر مسرت زندگی اِس نئے بیاہے جوڑے کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ لیکن تقدیر کی نیرنگی نے اِن سب امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ یہ ہے من سکھی اور سندر سنگھ کے قصے کا سیدھا سادھا خاکا۔ اور بہ ظاہر اس میں کوئی بات غیر معمولی معلوم نہیں ہوتی لیکن جس طریقے سے مصنّف نے یہ معمولی سے واقعات بیان کر دیئے ہیں اُس نے ان میں ایک روح پھونک دی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بہت بڑے بڑے ڈراما نگاروں اور شاعروں نے جن کی مغربی مثالوں میں ہومر، شکسپیر اور ملٹن اور مشرقی مثالوں میں کالی داس اور والمیک اور فردوسی جیسوں کے نام آتے ہیں کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ جس داستان کو وہ ہاتھ میں لے رہے ہیں طبع زاد ہے یا مستعار لی گئی ہے، یا اس میں حیران و ششدر کر دینے والے عجیب و غریب واقعات ہیں یا نہیں۔ کہانی بجائے خود اس قدر اہم نہیں ہوتی جس قدر وہ انداز جس میں کہانی بیان کی جائے[۱]۔

سب سے بڑی خوبی اِس کہانی میں یہ ہے کہ یہ ہندوستان کی کہانی ہے۔ اور اِس خوبی کے لئے ہندوستانی اس کی جتنی قدر کریں کم ہے۔ بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ روسیوں کو اہلِ فرنگ ایک جاہل اور غیر متمدن قوم سمجھ کر نظرِ حقارت سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس کے بعد جب روس نے گزشتہ صدی میں بعض معرکے کے فسانہ نگار اور شعرا پیدا کئے جنہوں نے روس کا دل چیر کر دنیا کے سامنے رکھ دیا اور روسی معاشرت کی تصویر کھینچ کر اغیار کو دکھا دی تو اہلِ روس کے متعلق وہ پرانا تعصّب یورپ کے دل سے نکل گیا۔ روسی افسانے کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ افسانے کے مصنّف اور افسانے کے افراد کی مخصوص قومی سیرت اور مخصوص قومی حالات افسانے میں سے چھلکے پڑتے ہیں۔ یہی بات شاہنامۂ فردوسی کا ایک نمایاں وصف ہے بلکہ بڑے بڑے اساتذۂ فن جب اقوامِ غیر کی کسی داستان کو بھی لیتے ہیں تو اُن کی اپنی قومیّت کی روح، اپنی پوری زندگی اور تازگی کے ساتھ اُس میں سے ابل پڑتی ہے۔ شکسپیر اِس دعوے کی زندۂ جاوید مثال ہے اور خود اردو میں انیسؔ و دبیرؔ اور دوسرے مرثیہ نگار خلوص اور تاثیر کی جس شان کے حامل ہیں، اُس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اہلِ بیت کی زندگی کو ہندوستان کے مسلمان شرفا کی زندگی میں دیکھتے ہیں۔

ہماری ادبیات کا دورِ جدید ترجمے کا دور ہے۔ یعنی آج کل ہم اقوامِ غیر سے مطالب کا سرمایہ اخذ کر رہے ہیں اور غیر زبانوں کے ظاہری و معنوی محاسن کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کے عمل میں مصروف ہیں۔ یہ زمانہ بحیثیتِ عمومی ادبی "تخلیق" کا زمانہ نہیں کہلا سکتا۔ مختصر افسانہ جو آج کل اردو ادب کی مقبول ترین صنف ہے اِسی مترجمانہ

---

[۱] "کہانی" اور "کہانی کے اندازِ بیان" کے درمیان یہ تفریق اکثر ماہرینِ فن کے نزدیک واقعی طور پر ممکن نہیں ہے لیکن تفہیم کی غرض سے یہ طریقِ تعبیر اختیار کرنا پڑتا ہے۔

انہماک کا پروردہ ہے۔ اسی لئے افسانوں میں عام طور پر ایک بڑا عیب یہ نظر آتا ہے کہ ہندوستان کی قومی خصوصیات اور مقامی حالات یا تو سرے سے غائب ہوتے ہیں اور یا کافی حد تک واضح نہیں ہوتے۔ جو افسانے "طبع زاد" بیان کئے جاتے ہیں اُن میں بھی بسا اوقات فسانہ نگار کا دماغ کسی ناموجود ماحول کی ترجمانی کرتا رہتا ہے، حالانکہ کسی خلاّق صنّاع کو کبھی نقّالی یا مترجمانہ اندازِ فکر و تحریر سے تشفی نہیں ہو سکتی۔ من سکھی اور سندر سنگھ کے قصے کو جب ہم نے خالص ہندوستان کی کہانی کہا تو اس کا یہی مطلب تھا کہ یہ ایک زبردست صنّاع کے دماغ کی خلّاقی کا کرشمہ ہے اور اس کا مصدر خود اُس کی اپنی ذات اور اُس کا اپنا مشاہدۂ حیاتِ انسانی ہے۔ ایران یا انگلستان کی ذہنی غلامی کی مہر اس قصے پر ثبت نہیں ہوئی۔

ہمارے اُن مختصر افسانوں پر بھی جو زمانۂ حال کی متمدّن ہندوستانی زندگی کے واقعی مشاہدے پر مبنی ہوتے ہیں، زمانے کے عام مترجمانہ میلان کا سایہ پڑے بغیر نہیں رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ ہندوستانی زندگی خود مغربی زندگی کا ترجمہ ہے، اور یہ ترجمہ بھی ابھی تکمیل کو نہیں پہنچا۔ ہماری تہذیب ایک منزل سے نکل کر دوسری منزل میں داخل ہو رہی ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے موجود الوقت تمدّن کے کون کون سے عناصر کو خالص ہندوستانی معاشرت اپنے اندر جذب کرے گی اور کون کون سے عناصر کو بالآخر رد کر دے گی۔ بہ الفاظِ دیگر اس وقت ہندوستان میں اعلیٰ طبقوں کا تمدّن کسی پائدار قومی بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ اس لئے اگر ہمیں ہندوستان کے دل تک پہنچنا ہو تو اس مصنوعی زندگی کی تصویر کو خواہ وہ بجائے خود کتنی ہی سچی اور صحیح ہو ہم اپنے مقصد کے لئے ناتمام پائیں گے۔ اس کے علاوہ عالمانہ طرزِ گفتگو عام انسانی جذبات اور وارداتِ قلب کی تصویر کھینچنے کے لئے ہمیشہ غیر تشفی بخش سمجھا گیا ہے۔ کسی قوم کی زندہ تصویر دیکھنی ہو تو اعلیٰ طبقے کے لوگوں سے، جو بڑی حد تک انسانیت کے مصنوعی نمونے بن جاتے ہیں، قطع نظر کر کے اُس طبقے کی طرف آنا چاہئے جو بجا طور پر قوم کی ریڑھ کی ہڈی کہلاتا ہے۔ کسان تصنّع سے آزاد ہوتے ہیں۔ اُن کا طرزِ گفتگو صاف اور قدرتی ہوتا ہے۔ اُن کی ایک ایک حرکت سے اُن کی فطرت بے نقاب ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اُن کے پاس جو کچھ ہے، سب اپنا ہے۔ نقل یا ملمع کو یہاں کوئی دخل نہیں۔ یہی باعث ہے کہ قدیم یونانی تہذیب کے زمانے سے لے کر اب تک مغربی ادیبوں کو ملک کے اس طبقے کے خاص دلچسپی رہی ہے، یہاں تک کہ ادبیاتِ مغرب میں "دہقانی شاعری" نے ایک مستقل صنفِ ادب کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بحیثیتِ صنّاع مصنف کے وجدانِ صحیح کا ثبوت یہی ہے کہ من سکھی اور سندر سنگھ کے قصے میں بادشاہ اور اُس کے اُمرا غائب ہو جاتے ہیں اور ہندوستان کے امیر اور امیر زیاں منصۂ عمل پر حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قصہ اس طریقے

پر ہندوستان کی مخصوص قومی سیرت میں دُہری طرح ڈوبا ہوُا مصنف کے دماغ سے اُبھرتا ہے۔

قصے کا پہلا نظارہ ہی ہمیں بتا دیتا ہے کہ ہم ہندوستان میں کھڑے ہیں۔ اہیر پور گاؤں میں سیتلا کا بڑا میلا ہے۔ جاڑے کا موسم نکل چکا ہے۔ گاؤں کے پیچھے جو جنگل پھیلا ہوا ہے، اُس میں طرح طرح کے بیل بُوٹے اور رنگ رنگ کے پھول کھلنے لگے ہیں۔ صبح ہی صبح گھر کے کام دھندے سے فارغ ہوکر، اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کرکے گاؤں کے سب چھوٹے بڑے باہر نکل آئے ہیں۔ تمام عورتیں اور مرد ہاتھوں میں پُجا پا لئے سیتلا کے مندر کو جارہے ہیں۔ نوعمر لڑکیاں مل جل کر اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو ساتھ لے کر چل رہی ہیں۔ بعض آپس میں ہنس بول رہی ہیں اور بعض سیتلا کے سہیلے[1] گاتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں مصنف ہمیں دو ہم عمر لڑکیوں کی باہمی گفتگو کا نقشہ دکھاتا ہے:-

من سکھی نے پاربتی کو دیکھتے ہی اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، اور دونوں کی باتیں ہونے لگیں۔ اس میں پاربتی نے کہا "من سکھی! تیرے بیاہ کو تو پانچ برس ہوگئے ہونگے اور تُو بھی پندرہ برس کی ہوئی۔ اب گونا کب ہوگا؟" اُس نے جواب دیا "ابکے بیساکھ میں بتاویں ہیں"۔ پھر پاربتی نے کہا "جی جی[2] تیرا بنڑا تو بڑا سندر ہے"۔ یہ بات سن کر من سکھی مسکرائی اور کہنے لگی "ہاں جی جی! میں نے بھی اُسے کئی بیر چھپ چھپا کے دیکھا تھا۔ مجھے بھی اُس کی صورت بھلی لگی تھی"۔ پاربتی نے کہا "من سکھی! اب تو تیرے گونے کا مہینا ہی بھر رہ گیا ہے۔ جب تو اپنے بنڑے کے ساتھ چلی جائے گی۔ تو مجھ سے کاہے کو ملے گی؟ چھ سات مہینے پیچھے کبھی آئی۔ دو چار دن رہ گئی۔ پھر تُو کہاں اور ہم کہاں!"

یہ پورا منظر جس میں دو دہاتی لڑکیوں کی بول چال کی یہ تصویر دکھائی گئی ہے پہلے ہی ایک صفحے میں گزرجاتا ہے اور پڑھنے والا شروع ہی میں چوکنا ہوجاتا ہے کہ اُسے معمولی قوتِ بیان کے کسی قصہ نویس سے سابقہ نہیں پڑا۔ پھر مندر میں پہنچ جانے کے بعد یہ عجیب وغریب تصویر آتی ہے:

من سکھی کے چچا نے اپنی بیوی سے کہا "ے موہن کی ماں! پجاپا نکال اور چھورے کے ہاتھ سے چھوا کے مہارانی پر چڑھادے۔ اور بھگت جی کو جوڑا پہنادے۔ اور بچھڑے کو چھوڑدے"۔ من سکھی کی چچی نے سب پجاپا چڑھا دیا۔ پھر سب سب مندر کے باہر نکلے۔ ایک بھنگی نے آتے ہی مرغ پھڑ پھڑایا۔ اور کہا "ماتا کی خیر! صدقے کا پیسہ دلاؤ"۔ دوسری طرف سے ایک اور بھنگی سؤر کا بچہ ہاتھ میں لئے ہوئے آیا۔ اور دو چار دفعہ لڑکے کے سر پر وار کے چھوڑ دیا اور کہا "گھینٹے کی چھڑوائی کا پیسہ مل جائے"۔ چندر کور نے ان دونوں کو ایک ایک پیسہ دے دیا۔ ذرا ہی آگے بڑھے ہونگے کہ ایک عورت مٹی کی مورت لئے ہوئے سامنے سے نظر پڑی۔ اور چندر کور کو دیکھ کر بولی "کلیجے والی کی بھی بھیٹ چڑھاتی جا"۔ ایک اور

---

[1] تعریف کے گیت [2] اکثر ہندو بہن کو جی جی اور بہنوئی کو جیجا کہتے ہیں۔

بولی "پھپھولے والی سے بھی ڈر"۔ ایک نے کہا "کھجلی ماتا کا بھی پیسہ رکھتی جا"۔ من سکھی کی جی ایسی خوفناک آوازیں سن کر کانپتی تھی اور ہر ایک کے آگے پیسہ رکھتی جاتی تھی۔ آخر کار جب پیسے دیتے دیتے حیران ہوگئی تو جلدی سے پیچھا چھڑا کر ایک طرف کو چلی اور وہیں کسی درخت کے تلے سب نے جمع ہو کر باسی کھانا کھایا۔

ذرا اس ایک لفظ باسی پر غور کرو۔ اس کے بغیر بھی قصہ بجائے خود قصہ ہی رہتا مگر اس ذرا سی تفصیل نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ان حقیر جزئیات کو سبھی دیکھتے ہیں مگر کتنے ہیں جن کے دل پر ان کا کوئی مستقل نقش رہ جاتا ہے؟ اس سیدھے سے لفظ کا اضافہ یہاں کسی استاد کا قلم ہی کر سکتا تھا۔ ہندوستان کی ... انی معاشرت کے متعلق واقعات کا ایک پورا سلسلہ اس میں پنہاں ہے۔ اس سے کہیں یہ نتیجہ نہ نکال لیا جائے کہ من سکھی اور سندر سنگھ کے قصے کا مصنف تمام حقیر اور ناقابلِ اعتنا جزئیات کو قابلِ توجہ سمجھتا ہے۔ اُن باتوں کے متعلق جن کے گرد فرومایہ فسانہ نگار رہ رہ کر چکّر کاٹتے ہیں اور جن کی تفصیلات دینے میں اُن کے صفحوں کے صفحے سیاہ ہو جاتے ہیں، اس قصے کا مصنف محض ایک اشارہ کر کے گزر جاتا ہے لیکن یہ اُس کا خاص فن ہے (جو اُس کے کمال کی دلیل ہے) کہ ایک بہت بڑے میلے کے حالات بیان کرتا ہے اور کسی شاندار مندر کے جگ مگ جگ مگ کرتے ہوئے چراغ ہمیں دکھا دیتا ہے۔ گھنٹے، گھڑیال اور سنکھ کی آواز ہم سنتے ہیں۔ مندر کے پجاری کا خاموش اور باوقار پیکر، اور پتھر کی مورتوں کے گرد آہستہ آہستہ اُس کا چراغ پھرانا ہمیں نظر آتا ہے۔ مذہبی رسوم کو ایک شانِ تقدیس کے ساتھ ادا ہوتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں اور بھجنوں کے دھیمے دھیمے سُر جو سننے والوں کی روح کو احترام و عقیدت سے لبریز کر دیتے ہیں، ہمارے کانوں میں پڑتے ہیں۔ اس کے بعد دفعتہً ہمیں یہ الفاظ نظر آتے ہیں:

سجان سنگھ نے دو پیسے اس مندر پر چڑھائے

باسی کھانے، یا دو پیسوں کی تفصیل دینا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ اس قسم کی تفصیلات کو دیکھنے سے ہمیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصنف اپنے کام سے خود بھی کس قدر لطف اندوز ہو رہا ہے اور اپنے فن کے استعمال سے لطف اندوز ہونا ایک بڑے صنّاع کی امتیازی نشانیوں میں سے ہے۔

مندروں کے متعلق اوپر جو دو اقتباس دیئے گئے ہیں اُن کو پڑھ کر اس مضمون کے ناظرین میں سے جنھوں نے ذرا بھی غور کیا ہوگا اُن کا ذہن فوراً اس حقیقت کی طرف منتقل ہو گیا ہوگا کہ جس شخص کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں اُس کا عام اندازِ تحریر ظرافت کی ایک لطیف سی چاشنی سے خالی نہ رہتا ہوگا۔ یہاں ظرافت اور تمسخر کا فرق سمجھ لینا ضروری ہے۔ ظرافت نگاری سے مراد محض ہنسی ٹھٹھا نہیں بلکہ یہ ایک برتر چیز ہے جس کے معیار پر مصنف کے ظرف کی وسعت و پابندی

دماغ کی دقیقہ رسی و تیز بینی، فہم کے توازن و استقامت اور ذوق کی لطافت و پاکیزگی کا امتحان ہو جاتا ہے۔ دو چیزوں کے باہمی عدمِ توافق کو محسوس کر لینا ظرافت کی اصل بنیاد ہے۔ موٹے الفاظ میں ظرافت کی عام تعریف یہ ہے کہ یہ نام ہے بوالعجبیوں کے احساس کا۔ اِن بوالعجبیوں کی نوعیت اِس لحاظ سے کہ ان سے مصنف کی دلچسپیوں کے وسیع یا محدود ہونے کے متعلق کیا پتا چلتا ہے اور پھر ان بوالعجبیوں کے احساس کی نوعیت کہ مصنف کا ذوق کس حد تک سلیم ولطیف یا اسکے برعکس ہے، اِس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ ظرافت نگاری کی صف میں مصنف کا پایہ کیا ہے۔ پیارے لال کی ظرافت نگاری میں جو پاکیزگی اور بے ساختگی ہے کوئی شخص اُس کو فی الفور محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان صفحات میں ہمیں ظرافت کی وہ بے اختیارانہ شدّت کہیں نہیں ملتی جو پیٹ میں بل ڈال دیتی ہے۔ ایک خاموش ظرافت شروع سے آخر تک قصے کے صفحات کو روشن کر رہی ہے۔ ظرافت نگاری کا یہ بہت بڑا کمال ہے کہ تمام قصے میں غالبًا کہیں بھی قصے کے افراد کھلکھلا کر ہنستے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ اُن کو غالبًا یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ اُن سے کوئی مضحکہ خیز حرکت سرزد ہو رہی ہے، لیکن پھر بھی ہم محسوس کرتے ہیں کہ ظرافت کے لطیف ترین جوہر قصے میں موجود ہیں۔ اس لئے کہ خود مصنف اُن کی بوالعجبیوں پر ایک ملاطفت آمیز تبسّم کی نظر ڈالتا ہوا گزرتا چلا جاتا ہے۔ رام چندر جی کے شان دار مندر پر دو پیسے چڑھانے میں سجان سنگھ کو کوئی بات خلافِ معمول نظر نہیں آتی۔ لیکن ہم اس پر مسکراتے ہیں یہ اُس "وضع الشئی فی غیر محلہٖ" کی نہایت عمدہ مثال ہے جس سے ظرافت نگار کا احساس اپنا بہترین سرمایہ حاصل کرتا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ہم کو ہنسانے کے لئے مصنف واقعات کی تحریف نہیں کرتا نہ حقائق کی صورت بگاڑتا ہے۔ کسی مندر پر دو پیسے چڑھانا ایک دہاتی کے لئے کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ مصنف نے صرف اُس بوالعجبی کو کسی قدر واضح کر دیا ہے جو اس فعل میں چھپی ہوئی ہے۔

تشریحِ بالا سے یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ مصنف کا احساسِ ظرافت کس قدر پاکیزہ اور سلجھا ہوا ہے۔ اور اس کی لطافت بعض بعض جگہ اس قدر مصفّا ہے کہ پڑھنے والے کا احساس اگر مساوی طور پر لطیف نہ ہو تو اِس کا نظر انداز ہو جانا بھی بالکل ممکن ہے۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ بوالعجبیاں جو مصنف کے احساسِ ظرافت کے لئے موجبِ کشش ہیں مصنف کی دلچسپیوں کے وسیع یا محدود ہونے کے متعلق ہمیں کیا پتا دیتی ہیں۔ اہیرپور کے مندر میں سکھی کی چچی کو جو واقعہ پیش آیا وہ ظرافت نگاری کا ایک اور عمدہ نمونہ ہے۔ بلکہ یہاں مصنف کا ظریفانہ کنایہ صاف اور غیر مشتبہ ہے۔ اس سے ہمیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصنف چھوٹی چھوٹی، تنگ نظرانہ انفرادی اور منتشر جزئیات کو سرِ مشق ظرافت نہیں بناتا بلکہ ظرافت کے لئے اُس کی نظر اتنی ہی وسیع ہے جتنی ہندو قوم۔ وہ اُس رسم و رواج پر مسکراتا ہے جو اُس کی قوم کو

ایک پیچ در پیچ جال میں مضبوطی سے جکڑے ہوئے ہیں۔ جو مذہبی یا معاشرتی رسوم اپنا وقت گزار چکی ہوں اور اُن کی اصل روح فنا ہو چکی ہو وہ مٹی کے بے جان بُت ہیں جنہیں خدا کا نور رخصت ہو کر مُردہ چھوڑ گیا ہے۔ اس کے باوجود ان بے روح پیکروں کی پرستش کرتے چلے جانا ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ ظرافت نگار اہلِ قلم اس بوالعجبی کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ خود لطف اٹھاتا ہے اور دوسروں کو اس لطف میں شریک کرتا ہے ہندوستان آج کل اپنی قومی زندگی کے جس دور میں سے گزر رہا ہے اس میں ہندوستانی مصنفین کو ظرافت کا سب سے بڑا سرمایہ رائج الوقت رسوم و اوہام میں مل سکتا ہے۔ پیارے لال کی ظرافت نگاری کا رخ زیادہ تر انہیں چیزوں کی طرف مائل ہے۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں لیکن قصے کو جوں جوں ہم آگے پڑھیں گے، اور مثالیں بھی ضمناً آتی جائیں گی۔

سجان سنگھ اور اُس کا پروہت گیان چند مشر گنگا جی کے کنارے پھر رہے ہیں۔ ایک مندر میں سجان سنگھ ایک مورت دیکھتا ہے اور گیان چند سے پوچھتا ہے "یہ کس کی مورت ہے؟"

گیان چند نے کہا "بھائی سجان سنگھ اس مورت کی بڑی کتھا ہے۔ ارجن کے بھائی راجہ بھیم نے جو بڑے بلوان تھے جب دیکھا کہ اس سنسار میں اُس سے کوئی لڑنے والا نہیں رہا تو اُس کے بازو کھجلانے لگے۔ اور اُس نے اپنے دل میں بچارا کہ میں مہادیو جی کی پوجا کروں تو وہ ضرور مجھ سے آکر لڑیں گے۔ جب مہادیو جی مہاراج اُس سے پرسن ہوئے تو بھینسے کا روپ دھار کر اُس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ بھیم نے چاہا کہ اُن سے لڑے۔ وہ بھاگ نکلے بھیم نے اُن کا پیچھا کیا۔ مہادیو جی زمین میں گھس گئے۔ یہ دیکھ کر بھیم نے اُن کی پونچھ خوب زور سے پکڑ لی۔ اور کہا مہاراج ابھاگ کر کہاں جاؤ گے ہو؟ اب تو میں نہ جانے دوں گا۔ سو پونچھ اور پچھلا دھڑ تو بھیم کے ہاتھ میں رہ گیا اور منہ نیپال کے پہاڑ میں جا نکلا۔ اب منہ کی پوجا نیپال میں ہوتی ہے اور پونچھ اور پچھلے دھڑ کی کدارناتھ جی میں۔ سو یہ کدارناتھ جی کی مورت ہے"۔ سجان سنگھ نے یہ بات سُن کر کہا "مہاراج مہادیو جی بڑے بھولے ہیں! دیکھو! بھگت کے کارن کیا روپ دھارا ہے۔"

لیکن مصنف نے رسمی پابندیوں کو جہاں ہدفِ بذلہ سنجی بنایا ہے، وہاں اُس درد و تاثیر کو بھی جا بجا نمایاں کیا ہے جو اِن قدیم رسوم میں چھپی ہوئی ہے۔ بیچاری من سکھی کی شادی ہو رہی ہے:

دولھا کے گاؤں میں آتے ہی من سکھی نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ جو کبھی نکلتی بھی۔ تو رات کے وقت ہمجولیوں سے ملنے جاتی اور خوب گلے مل مل کر روتی۔ وہ سب کی سب اسے سمجھاتیں "کیوں رو رہی ہے؟ پندرہ دن پیچھے تیرے پا چا چاچی تجھے بلالیں گے۔"

اور پٹّا پھیر کی رسم میں

جس وقت نائی نے پٹڑوں کو بدلنے کے لئے اٹھایا۔ تو پاربتی جو وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ اُس سے کہنے لگی "دیکھ رے! یہ پٹڑے آپس میں ٹکراویں نہیں۔ جو ایسا ہوا تو من سکھی اور جیجا میں سدا کھٹا پٹی رہے گی"۔

ہنسی کھیل کی ان باتوں کے بعد فوراً ہی درد کی اس تصویر کا تضاد کس قدر اثر انگیز ہے:

جب وداع کی تیاری ہوئی من سکھی اپنے سارے رشتہ داروں اور سہیلیوں سے مل کر خوب روئی اور موہن کو گود میں اٹھا کر کہنے لگی:۔ "بھائی تو چاچی سے کہتا رہیو۔ جیجی کو جلدی بلا لے"۔

یہ آخری الفاظ کتنے سچے اور اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں!

من سکھی اور سندر سنگھ کی شادی سے پہلے ہی مصنف نے ایک صنّاعانہ چابک دستی کے ساتھ اُس آنے والے واقعے کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو اس دولھا دلھن کی زندگیوں کا رخ پھیر دینے والا ہے۔ واقعات اس طرح ترتیب دیئے گئے ہیں کہ شادی سے فوراً پہلے اور شادی سے فوراً بعد قصے میں وہ تاریک سایہ نمودار ہوتا ہے جو اس شادی پر منڈلا رہا ہے۔ سیتلا کے میلے کی شام کو پہلی مرتبہ سجان سنگھ اپنی بھتیجی کی شادی کے بارے میں اپنی بیوی سے صلاح مشورہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ابھی یہ رات گزری ہی ہے کہ صبح ہی صبح وہ شخص کہانی میں داخل ہوتا ہے جسے تقدیر نے نوجوان دولھا دلھن کی قسمت پلٹ دینے کے لئے بھیجا ہے:

جب صبح ہوئی تو نمبردار چارپائی سے اٹھ کر اپنی چلم بھر ماچے پر آ بیٹھا اور حقہ پینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک فقیر جٹا دھاری کندھے پر مرگ چھالا ڈالے ہاتھ میں چمٹا لئے ہوئے اس طرف سے گزرا اور نمبردار کو ماچے پر بیٹھا ہوا دیکھ کر چپ چاپ اس کے سرہانے آ بیٹھا۔ نمبردار نے کہا "مہاراج کہاں سے آنا ہوا؟ کیا چاہیئے؟" فقیر نے کچھ جواب نہ دیا۔ نمبردار بولا "مہاراج! کچھ کہئے؟ کیا اچھا ہے؟" فقیر نے کہا "بابا کچھ اچھا نہیں۔ جو تیرا جی چاہے تو ایک سلفا پلوا دے"۔ نمبردار نے اپنے حقے پر سے چلم اتار کر فقیر کے حوالے کی۔ اُس نے ایک ایسا دم لگایا کہ لُو اٹھ آئی۔ یہ دیکھ کر نمبردار نے کہا۔ "مہاراج! کیا تمباکو کی چاندی ہی کر دوگے"؟ فقیر نے جواب دیا "سائیں کے بھنڈار میں کچھ کمی نہیں ہے۔ جو تیری یہ مرضی ہے تو ایسا ہی ہو جائے گا"۔ فقیر تو یہ کہہ کر چل دیا اور نمبردار کو گھڑی بھر کے بعد جب پھر حقے کی طلب ہوئی تو وہ چلم بھرنے گیا اور جوں ہی چلم الٹی۔ ایک چاندی کی ڈلی اس میں سے نکل پڑی۔ یہ دیکھ کر نمبردار حیران ہو گیا اور دفعتہً پکار اُٹھا "موہن کی ماں دوڑیو! موہن کی ماں دوڑیو!"

؎۱ جس وقت حقے کا ایسا دم لگاتے ہیں کہ تمباکو جل کر راکھ ہو جاتا ہے اُس وقت کہا کرتے ہیں کہ تمباکو چاندی ہو گیا۔

ہندوستان کے فقیر کی کیسی ہو بہو تصویر ہے! وہ جہالت اور خوش اعتقادی جو ان فقیروں کی پشت و پناہ ہے، سجان سنگھ کی اِس ایک متحیرانہ اضطراری جنبش اور ان چند الفاظ میں اختصار کے ساتھ ظاہر کر دی گئی ہے۔

اجمال سے کام لینا مصنف کے فن کی ایک نمایاں خصوصیت ہے اور اس کے ذریعے سے مصنف نے بڑے بڑے استادانہ کارنامے انجام دیئے ہیں۔ یہ خصوصیت اُن ناظرین کو جو قصّے کے اقتباساتِ مابعد کو توجہ کر پڑھیں گے جا بجا از خود نظر آ جائے گی۔ سندر سنگھ کی اپنی سسرال سے جو ناچاقی ہوئی اُس کا ذکر شادی کی سرگزشت کے ساتھ ہی ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

سندر سنگھ اپنی سسرال میں رہنے لگا۔ مگر وہاں رہنے سے اس کی طبیعت کچھ خوش نہ ہوئی۔ کیونکہ سجان سنگھ اس کو حقیر ... کر ہر وقت طعنے دیتا اور کبھی کبھی یہ کلام بھی اپنی زبان پر لاتا "من سکھی بڑی ابھاگی ہے جو تجھ سی نردھن کے پلے پڑی"

اور پھر اِن چند فقروں کے فوراً بعد وہی مکّار فقیر جو ایک بڑے فتنے کا سرچشمہ ثابت ہونے والا ہے اُسی پہلی خاموشی کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوتا ہے۔ شادی کو یقیناً کچھ عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس عرصے کی کوئی تفصیلات مصنف نے ہمیں نہیں دیں[۱]۔ اس لئے قصے میں جس ہنرمندی کے ساتھ شادی سے فوراً پہلے اور فوراً بعد فقیر کا ناگہانی ظہور دکھایا گیا ہے اُس سے ناشاد دولہا دلہن کی بدقسمتی کے متعلق ہمارا احساس زیادہ واضح اور قوی ہو جاتا ہے۔ سجان سنگھ جاہل ہے اور چندر کور اپنے شوہر سے زیادہ جاہل۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس فقیر کی مدارات کرتے ہیں۔ سندر سنگھ جو اس قسم کے لٹیروں سے بہت بدگمان ہے پاس بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ فقیر اُس کی نظروں سے بھانپ جاتا ہے کہ یہ میری دال یہاں نہ گلنے دے گا۔ اس پر جس ادا سے وہ رخصت ہوتا ہے وہ مصنّف کا اعجاز ہے۔ یہ بات ناظرین کی توجہ میں اکثر آئی ہوگی کہ ہمارے پرانے قصوں میں دو مختلف آدمیوں کے اندازِ گفتگو میں بالعموم کوئی فرق ملحوظ نہ رکھا جاتا تھا۔ کہانیوں میں مکالمے کا جزو اس قدر ناقابلِ التفات خیال کیا جاتا تھا کہ عورت اور مرد، جوگی اور گرہستی، گنوار اور شہری، شاہ اور گدا سب کی زبان ایک ہوتی تھی۔ اِس قصّے کی یہ ایک بڑی ادبی فتح اور اصلاحی کارنامہ ہے کہ قصے کے افراد بعینہٖ اسی طرح بولتے ہیں جس طرح واقعی زندگی میں انہیں بولنا چاہیے اور اُن کی ایک ایک بات سے اعلیٰ درجے کی سیرت نگاری کے لوازم پورے ہوتے ہیں۔ اس کے

---

[۱] یہ مصنف کی انتہائی قرینہ شناسی کا ثبوت ہے کہ کہانی کے آخر میں چل کر وہ ہمیں بتاتا ہے کہ شادی کے بعد کے زمانے میں کس طرح من سکھی اور سندر سنگھ کا انس بڑھتے بڑھتے عشق کے درجے کو پہنچ گیا۔ اور وہاں ان تفصیلات نے کہانی میں غضب کی تاثیر اور نوست بھر دی ہے۔

بعض نمونے محولۂ بالا اقتباسات میں بھی گزر چکے ہیں لیکن یہاں فقیر چلتے چلتے جو بات کہہ جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ "من سکھی اور سندر سنگھ کا قصہ" ڈراما نہیں ہے۔ محض ایک کہانی ہے۔ لیکن فقیر کے یہ الفاظ خود بخود بولتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور فقیر سامنے کھڑا دکھائی دیتا ہے:

لے بابا سجان سنگھ فقیر کے دل میں موج آگئی تھی جو تیرے پاس آنکلا تھا۔ اب ہم رمتے ہیں۔ پر ایک بات تجھ سے کہے جاتے ہیں۔ شاید تجھ کو کڑوی معلوم ہو۔ پر یہ بھی کہا ہے۔ آئی بات کو من میں نہ رکھئے۔ یہ لڑکا سندر سنگھ جو تیرا جائی ہے۔ اس کا یہاں رہنا تیرے واسطے اچھا نہ ہوگا۔ ہم نے تو کچھ اور چاہا تھا۔ پر ہونی بلوان ہے۔ اپنا چاہا ہوتا نہیں۔

فقیر کے چلے جانے سے سجان سنگھ غصے میں آجاتا ہے اور سندر سنگھ کو بھی ایک آدھ جلی کٹی سنا دیتا ہے:

سندر سنگھ جو وہیں کھڑا ہوا تھا یہ بات سن کر نہایت ناراض ہوا۔ اور آنسو بھر کر کہنے لگا "اس پاکھنڈی کا جانا نہالے لئے اچھا ہوا۔ جو میں آج نہ ہوتا تو یہ ضرور تمہارا ستیاناس کر جاتا۔ اور ایسا لوٹتا کہ بدن پر ایک لتا بھی نہ چھوڑتا" سجان سنگھ سندر سنگھ کی طرف مخاطب ہو کر بولا "لے نربھاگ کیوں جھک مارے ہے۔ میں نے تو تجھ کو اسی دن جان لیا تھا جس دن تیرے ساتھ چھوری کے پھیرے ہوئے تھے۔ پر کیا کروں۔ کرموں کی ریکھ امٹ ہے۔ نہیں تو اور میرا گھر"۔ جب سجان سنگھ نے سندر سنگھ کو ایسی سخت باتیں سنائیں، تو وہ بھی بھر آیا اور افسوس کر کے کہنے لگا "بھگوان سب پر دیا رکھے! کسی کو بگاڑے نہیں! جب میں تیرے گھر آکے رہا تو تو نے مجھے یہ باتیں سنائیں۔ لے اب تو جان اور تیرا گھر" یہ کہہ کر سندر سنگھ غصّے میں بھرا ہوا مکان کے باہر آیا۔ اور جنگل میں جا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

سندر سنگھ سے ہم یہاں پہلی مرتبہ دوچار ہوتے ہیں لیکن مصنف کے قلم کی چند پے در پے جنبشوں میں اس نیک نہاد نوجوان کی ایک روشن تصویر نگاہ کے آگے آجاتی ہے۔ نیکی کا بدلہ بدی ملتے دیکھ کر رنج کے مارے اُس کا آنکھوں میں آنسو بھر لانا اور ایک نئے طعنے پر غصے سے بے تاب ہو کر صرف یہ کہنا کہ "بھگوان سب پر دیا رکھے" پھر اسی غصے میں تیزی کے ساتھ گھر سے نکل جانا اور جنگل میں الگ بیٹھ کر رونا، امور متوقعہ نہیں ہیں بلکہ نئے انکشافات ہیں۔ یعنی ہم اس صورت حالات میں ہر انسان کے متعلق یہ پیش گوئی نہیں کر سکتے کہ وہ اُٹھ کر جنگل میں جائے گا اور پھوٹ پھوٹ کر روئے گا۔ یہ ہمیں ایک خاص طبیعت کے آدمی کی کیفیت معلوم ہوتی ہے اور یہی تخصیص و تعیین سیرت نگاری کا کمال ہے۔ ایک اچھا صناع جب اپنی داستان کے افراد کی تخلیق کرتا ہے تو ہر ایک کو ایک جداگانہ سیرت دیتا ہے جو قدرت کے انتظام کے بالکل مطابق ہوتی ہے۔ مثلاً سجان سنگھ کے متعلق ہم یہ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ بھی غصے میں یہی طرزِ عمل اختیار کرتا۔ اُسے غصہ آتا تو وہ غالباً سب سے پہلے اپنا لٹھ سنبھالنے کے لئے دوڑتا۔

اِس واقعے کے بعد سندر سنگھ تہیّہ کر لیتا ہے کہ وہ سجان سنگھ کے گھر میں نہیں رہے گا۔ اور جا کر سپاہیوں میں بھرتی ہو جائے گا۔ من سکھی اُس کا یہ ارادہ سُن کر روتی ہے اور بے اختیار پکار اُٹھتی ہے:

اے تو مرے باباجی! تجھ میں یہ گن تھے۔ تو میرے دھنی کو مجھ سے بچھاڑنے آیا تھا۔ تیرا ستیاناس جائے! آگ لگاؤں تیری جٹاؤں۔ پھونک دوں تیرے سونے چاندی کو۔

یہاں من سکھی اور سندر سنگھ کی جو گفتگو ہے وہ فطرت کی ترجمانی کا ایک نیا معجزہ ہے۔ اس میں غور کرنے والوں کے لئے معانی کے دفتر پنہاں ہیں:

پھر سندر سنگھ سے کہنے لگی "کیا تو چلا جائے گا اور مجھے چھوڑ جائے گا؟ دیکھ میں کیسے روں ہوں۔ جو ایسا کیا، تو میری صورت ہی کو ترستا پھرے گا۔ بس دیکھ لی تیری پریت جو بیٹھے دٹے جاتے ہے" سندر سنگھ نے من سکھی سے کہا "تو ہی بتا۔ اب میرا یہاں رہنا کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا تُو اس بات کو اچھا جانے ہے۔ کہ تیرے چاچا کے روز روز کے طعنے مہنے سنوں؟ دھرکار ہے میرے ایسے جینے پر۔ نام کو تو میں جمائی تھا۔ پر تیرے چاچا نے تو کتے کے برابر بھی آدر نہ دیا۔ اب میں یہاں رہ کر کیا کروں۔ میرا یہاں سے جانا تجھے بھی اچھا ہوگا۔ دیکھ تو بھگوان کیا کرے ہے۔ کیسے دلدر پار ہو ویں ہیں۔ بہت سا روپیہ کماؤں گا اور تیرے واسطے اچھے اچھے گہنے اور اوڑھنیاں بھیجوں گا۔ اور تھوڑے دنوں پیچھے تجھے بھی اپنے پاس بلاؤں گا" من سکھی نے کہا "جو تو جاتے ہے تو مجھے تھوڑا سا بس دیتا جا اور اپنے ہاتھ سے میری کفن کاٹھی کرتا جا۔ پھر جہاں تیرے من میں آوے، چلا جائیو"

سُندر سنگھ کے جانے کے بعد پاربتی آتی ہے:

پاربتی فوراً من سکھی کی کوٹھڑی میں گئی اور کہا "جی جی! آج کیا ہے؟ جو تو ایسی اداس پڑی ہے" من سکھی لمبے دُکھ کر رو پڑی اور کہنے لگی "اس سے تو مرجانا ہی اچھا ہے۔ تَیں نے سنا نہیں؟ آج تیرا جیجا نکل گیا۔ پاربتی! دکھ میں کوئی کسی کا ساتھی نہیں۔ کس کا چاچا کس کی چاچی۔ جو آج میرے ماں باپ ہوتے تو میں ایسی نرآدری کیوں ہوتی"

"تَیں نے سنا نہیں؟ آج تیرا جیجا نکل گیا" صرف یہی الفاظ من سکھی اور سندر سنگھ کے مصوّر کی استادی کا لوہا منوانے کے لئے کافی ہیں۔

ایک بہت بڑی خوبی جو کسی فسانہ نگار میں ہو سکتی ہے، یہ ہے کہ اُسے اپنے قلم پر قابو اور اپنے جذبات پر ضبط حاصل ہو یعنی اپنی داستان میں کسی خاص موقعے کی اہمیّت اُس کو اس درجہ متاثر نہ کر دے کہ اُس کے بیان میں بے محابا پھیلاؤ پیدا ہو جائے۔ اِس وصف میں بہت کم مصنف پیارے لال پر تفوق رکھنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ من سکھی اور سندر سنگھ کے سینے

میں جذبات کا جو سمندر موجیں مار رہا ہے اُس کی ایک جھلک اُس نے ہم کو دکھادی ہے لیکن اس کے بعد اُس کے خاص انداز فن سے یہ بعید ہے کہ وہ رہ رہ کر اسی موضوع کے گرد چکر کاٹتا رہے۔ اس کے بعد نئی دلچسپیاں اور نئے واقعات بہ ظاہر اُس کی توجہ کو تمام تر اپنی طرف جذب کر لیتے ہیں۔ من سکھی کا چچیرا بھائی جو موہن سے چھوٹا ہے چیچک کا شکار ہو کر چل بستا ہے۔ سجان سنگھ اپنے کنبے سمیت گنگا اشنان کو روانہ ہوتا ہے۔ گاؤں کے اور لوگ بھی چھکڑوں کا ایک قافلہ بنا کر اسی طرف کو روانہ ہوتے ہیں۔ عورتیں راگ گاتی ہوئی نکلتی ہیں:

رام!
جمنا اُرے گنگا پرے اور بیچ بہے دریاؤ

رادھا پیاری ہے!
لینا جھکولے ٹھنڈے نیر کے
پہلا جھکولا میرے رام کا جن یہ سرشٹ اپائے
رادھا پیاری ہے!
لینا جھکولے ٹھنڈے نیر کے
دوجا جھکولا میرے باپ کا جن منڈھا چھوایا
رادھا پیاری ہے!
لینا جھکولے ٹھنڈے نیر کے

اِسی طرح سات آٹھ جھکولے گزر جاتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ مصنف کی توجہ انہیں نئی دلچسپیوں میں غرق ہے لیکن اکبارگی وہ ہم کو اس بات کا ثبوت دے کر چونکا دیتا ہے کہ صرف ایک زبردست قوت سے اُس نے اپنے قلم کو تھام رکھا تھا، ورنہ من سکھی کے متعلق خود اُس کے احساسات بھی اُسی قدر بیدار تھے جس قدر اُس کے قصّے کے ناظرین کے۔ عورتیں گاتے گاتے نویں جھکولے تک پہنچتی ہیں:

نواں جھکولا میرے پُرکھ[1] کا جو لایا تھا مرودھر موڑ
رادھا پیاری ہے!
لینا جھکولے ٹھنڈے نیر کے

اس کے بعد ہم ناگہاں یہ عبارت پڑھتے ہیں:

من سکھی بھی اس راگ کے گانے میں شریک تھی مگر اُس کی آواز میں کچھ خوشی نہیں پائی جاتی تھی۔ اور جب نویں جھکولے میں

---

[1] خاوند

پرکھ کا نام آیا تو یکایک اُس کے آنسو نکل پڑے۔

مصنف نے صرف ان چند آنسوؤں سے من سکھی کے متعلق اپنی خاموشی کی پُوری تلافی کردی ہی۔ یہ کمالِ فن کی انتہا ہے۔ من سکھی کے نہ مٹنے والے رنج کا جیسا نقشہ اس طریقے پر پیشِ نظر آگیا ہے ویسا شاید تفصیلات کے بیان کردینے سے بھی نہ آتا۔ ان دو چار آنسوؤں نے ایک پورے صفحے کو جگمگا دیا ہی۔

گنگا جانے والوں کی کیفیت بجائے خود ایک نادر چیز ہے اور اس کی سطر سطر سے ہندوستان کے مقامی حالات کی تصویر کھنچتی چلی جاتی ہے۔ کھیتوں سے گھرے ہوئے میدانوں میں چھکڑوں کی قطار، مسافروں کا شور، بیل ہانکنے والوں کی پکار، گنگا مائی کے جیکارے، کچھ پیادہ پا لوگوں کا ہاتھ میں لاٹھی لئے ہوئے اور بعض کا گھوڑوں پر سوار ہوکر ساتھ چلنا، پھر دو گھڑی دن رہے پڑاؤ پر پہنچنا اور بیلوں کا کھولنا، صبح توپ چلنے پر چھکڑوں کی روانگی، سب اگرچہ نہایت دلچسپ ہیں لیکن اسی سفر کے ایک پڑاؤ میں ہندوستان کی خانگی زندگی کا ایک شیریں اور دلنشیں نظارہ جو مصنف نے دکھایا ہے وہ اپنی لطافت میں حیرت انگیز اور لاجواب ہے:

من سکھی اور پاربتی بھی گانے میں شریک تھیں۔ مگر موہن ہر گھڑی اُن کے بیچ میں آبیٹھتا اور غل مچانے لگتا۔ من سکھی نے پاربتی سے کہا "جی جی! پہلے میں اپنے بھائی کو سلا آؤں۔ پھر آکے گاؤں گی"۔ یہ کہہ کر موہن کو گود میں لے گئی اور چھکڑے میں لٹا دیا۔ مگر وہ اٹھ کر ضد کرنے لگا اور بولا "میں سو رہوں گا تو تُو پھر وہیں چلی جائے گی"۔ من سکھی نے کہا "نہیں بیرن! لے میں ایک پہیلی کہوں۔ بتاوے گا؟" موہن نے کہا "کہہ"۔ من سکھی بولی "کھیت میں اپجے سب کوئی کھائے۔ گھر میں ہوئے تو گھر بہ جائے"۔ موہن نے جواب دیا "بھلی پہیلی کہی۔ یہ تو پھوٹ ہے پھوٹ"۔ پھر من سکھی نے کہا "اچھا! یہ بتا رہی تھی من بھری تھی سوا لاکھ موتی جڑی تھی۔ راجہ جی کے باغ میں دوشالہ اوڑھے کھڑی تھی"۔ موہن نے کہا "جی جی! یہ تو نہیں بتائی جائے۔ تو ہی بتادے"۔ وہ بولی "کہہ ہارا۔ جھک مارا۔ کوئیں کا پنہارا"۔ موہن نے کہا "یہ تو نہیں کہوں"۔ من سکھی نے کہا "اچھا تو بتا ہی دوں۔ کوکری ہے"۔ اس کے بعد من سکھی نے اور بہت سی پہیلیاں کہیں۔ پھر موہن نے کہا "جی جی اب تو کوئی کہانی کہہ"۔ من سکھی نے اس کے آگے ایک کہانی کہنی شروع کی۔ اتنے میں موہن کی آنکھ لگ گئی۔ اور من سکھی اُٹھ کر پاربتی کے پاس جا گانے میں شریک ہوگئی۔

انھیں تفصیلات میں کئی صفحے گزر جاتے ہیں لیکن مصنف پھر اچانک ہمیں یاد دلا دیتا ہے کہ اُس نے اپنی کہانی کے اصل موضوع کو فراموش نہیں کیا۔ من سکھی یک بیک پاربتی سے کہتی ہے کہ وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح پیپل کی پوجا کرے گی:

من سکھی نے کہا "لے تو جی جی! اب تو جاکے تھوڑا سا دودھ لانے میں کوئیں پر سے پانی لاؤں ہوں" جب دودھ اور

پانی آگیا تو من سکھی نے دونوں کو ملاکر۔ اُس میں پھول۔ بتاسے اور رولی ڈالی۔ پھر اُسے پیپل پر چڑھا کر اُس کے آگے گھی کا ایک چراغ روشن کردیا۔ اور آپ ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی۔ اور کہنے لگی۔ "اے پیپل دیوتا! جو میرا مالک آجائے تو میں تجھے ہر سنیچر دھاؤں گی"۔

پُوجا کی رسم کی تمام تفصیلات متعلقہ کو ہم دلچسپی سے پڑھتے ہیں اس لئے کہ اس تمام عمل میں من سکھی کی جو قلبی کیفیت ہے وہ ہمارے لئے موجب دلچسپی ہے۔

گڑھ مکتیسر کے میلے میں سجان سنگھ کی مڈبھیڑ پھر اُسی پاکھنڈی فقیر سے ہوتی ہے اور یہ مژدہ وہ آکر اپنی بیوی کو سناتا ہے۔ چندر کور یہ بات سُن کر بہت خوش ہوئی مگر من سکھی نے جس وقت باباجی کا نام سنا اپنے دل میں ہزاروں گالیاں دیں۔ اور پاربتی سے کہا "پہلے تو یہ کچھ کر گیا اب اس کا کھوجڑا جائے جانے کیا کرے گا؟"

سجان سنگھ فقیر کو اپنے پاس روکنا چاہتا ہے کس قدر سیدھے سادھے الفاظ یہاں استعمال کئے گئے ہیں۔ مگر یہ الفاظ نہیں ہیں، یہ ایک متحرک تصویر ہے۔ چھکڑوں کی قطار پاس سے گزرتی جارہی ہے لیکن سجان سنگھ اور فقیر الگ ایک درخت کے تلے کھڑے گفتگو میں محو ہیں۔ سجان سنگھ ہمہ تن شوق ہے اور فقیر ہمہ تن انکار۔ اور جہالت کا ذوقِ عقیدت جس قدر زیادہ بیتاب ہوتا ہے، خرقہ پوش زہد اپنے شکار کو قابو میں پاکر اُسی قدر زیادہ استغنا اور تمرّد کا ثبوت دیتا ہے۔ غرور وخود پسندی اور عجز والحاح دُوبدو کھڑے ہیں۔ یہ موقع ہے جب ایکا ایکی سجان سنگھ فقیر کے قدموں پر گر پڑا۔ فقیر نے کہا "سجان سنگھ! کیوں دیر کرتے ہو؟ میلا تو نکلا جاتا ہے۔" اُس نے کہا "مہاراج! میں کہاں جاؤں؟........"

اِس ضمن میں مصنف سجان سنگھ کے پروہت گیان چند کو اپنی لطیف اور بے نیش ظرافت کا ہدف بناتا ہے:

گیان چند چھکڑے پر بیٹھا ہوا دل ہی دل میں جلتا تھا اور کہتا تھا "دیکھو سجان سنگھ کیا پاگل ہوا ہے۔ چھکڑا چھوڑ کر فقیر کے ساتھ پیدل ہولیا ہے بھلا اس پاکھنڈی میں کیا رکھا ہے جو اس کی اتنی چاپلوسی کرتا ہے۔ آخر اُلٹے گا پیسا کس چلا ہے کے ساتھ ہولیا ہے۔ جو کسی پنڈت کی سیوا کرتا تو اچھا بھی تھا"۔

لیکن مصنّف کی ظرافت نگاری کا نقطۂ کمال وہ مقام ہے جہاں قصّے کی دردناکی قصّہ لکھنے والے کی پاکیزہ ظرافت کے ساتھ مل جاتی ہے:

فقیر سب سے الگ ہوکر ایک کونے میں ہو بیٹھا اور ظاہر میں خدا کا دھیان کرنے لگا سجان سنگھ اس عرصے میں پُوجا جمع کرتا رہا۔ من سکھی نے جو موہن کو کھانا کھلا رہی تھی۔ دُور سے فقیر کو دیکھ کر کہا "مرجانا بگلا بھگت بن کر بیٹھا ہے"۔

اگر یہ ممکن ہے کہ کسی طرح الفاظ میں جادو بھر دیا جائے تو وہ اس آخری جملے میں ہے۔ بولنے والی کا نوخیز چہرہ آن واحد میں اُبھر کر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور بھر بسرت کے اظہار میں بھی ان چند الفاظ کا رتبہ اس قدر بلند ہے کہ پورے قصے میں بہت کم فقرے اس اعتبار سے ان کی ہمسری کرسکتے ہیں۔ یہ الفاظ من سکھی کے جس درد والم کا پتہ دیتے ہیں اُس کے باوجود ہم تصور میں سب اُس کی پیشانی کی شکنیں دیکھتے ہیں تو مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور یہ مصنف کے کمال فن کی دلیل ہے۔

اس کے بعد کی رات کو من سکھی کا خواب عجیب بے مثال چیز ہے اور پڑھنے کے قابل ہے۔ یہاں قصے کا آخری حصہ آپہنچا ہے۔ اب واقعات کی رفتار میں بالکل قدرتی طور پر یک بیک سرعت آگئی ہے اور قصہ اپنے انجام کی طرف تیزی سے بڑھنے لگتا ہے۔ فقیر کا رات کی تاریکی میں دبے پاؤں آنا اور چوری چوری موہن کا ہاتھ کھینچنا من سکھی کا جاگ اٹھنا اور شور مچانا، فقیر کا اُس کی کنپٹی پر لاٹھی کا ایک تلا ہوا وار کرکے اُسے بے ہوش چھوڑ جانا اور موہن کو چرا لے جانا، سندر سنگھ سے مڈبھیڑ اور موہن کی نجات یہ سب باتیں ڈیڑھ دو صفحوں کے اندر اندر گزر جاتی ہیں۔ مصنف حسب معمول من سکھی کے متعلق ہمیں کچھ نہیں بتاتا کہ اُس کا زخم خطرناک ہے یا معمولی۔ اس کے بعد ہم سجان سنگھ کو سندر سنگھ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اس گفتگو میں اچانک سجان سنگھ کے یہ الفاظ سن کر چونک اُٹھتے ہیں:

تمہارا کہنا سچ نکلا۔ اس چنڈال بیراگی نے ہمارا گہنا بھی لوٹا اور پھر چھپرے کو لے کر بھاگا۔ اور کیا کہوں چھوری کے ایسا سونٹا مارا کہ اس کا بچنا بھی دوبھر ہے۔

عرصے کی جدائی کے بعد دولہا دلہن پھر ملتے ہیں مگر اس حالت میں کہ دلہن مجروح ہوکر ایک چھکڑے کے نیچے زمین پر پڑی ہے۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے اور لمبے لمبے بال خاک میں کھلے ہوئے پڑے ہیں۔

من سکھی نے اُس وقت آنکھیں کھول دیں اور سندر سنگھ کی طرف نظر پڑی۔ تو اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور چاہا کہ اُس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہے۔ مگر لحاظ کے سبب سے اپنا منہ پھیر لیا۔ جب چندر کور نے یہ حال دیکھا۔ تو اُس نے اپنے خاوند اور سب لوگوں کو جو وہاں کھڑے تھے اشارے سے ٹال دیا۔

گزری ہوئی باتیں اس وقت تصویر کی طرح سندر سنگھ کے ذہن میں پھر جاتی ہیں:

سندر سنگھ حیران بنا سا کھڑا تھا اور دل میں کہتا تھا۔ ہائے کیا تھا کیا ہوگیا! کبھی اسے اپنی شادی کی امنگ اور من سکھی کے ساتھ کنگنا کھیلنے کا دھیان آتا۔ کبھی شوخی اور چھچلاہٹ سے اُس کے یہ کہنے کا خیال آتا کہ دیکھیں پہلے کنگنا کون لے!" کبھی من سکھی کا اُس کی ماں کے روبرو پیروں پڑنا۔ اور گھر کے سب آدمیوں کا ادب کرنے اور سب چھوٹے بڑوں کو خوش رکھنے کا تصور بندھ جاتا۔ کبھی اس کا پیار سے یہ کہنا۔ کہ "مجھے جگ میں

تجھ سے زیادہ کون ہے" یاد آتا۔ اور کبھی یہ سوچتا۔ کہ جب میں کھیت پر جاتا تھا تو یہ میری راہ دیکھا کرتی۔ اور تھوڑی سی دیر میں غم کے مارے مرجھا جاتی۔ اور پھر جب میں اس کے پاس آتا تو مجھے دیکھ کر کھل جاتی۔ کبھی اپنے دل میں یہ کہتا کہ ہائے! یہ وہی من سکھی ہے۔ کہ جب میں سجان سنگھ کے طعنے سُن کر جنگل میں جا کر رو دیا۔ اور پھر اُس سے ملنے گیا تو چیخ مار کر بولی "جو تو جائے ہے تو مجھے تھوڑا سا بِس دینا جا۔"

سندر سنگھ کے بے اختیار نکلنے والے آنسو اِس حیرت کا طلسم توڑ دیتے ہیں:

آخر کار وہ اپنا منہ ڈھانپ کر بے اختیار رو پڑا۔ اور زمین پر گر کر من سکھی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا۔ "ہائے! میں تجھے اس واسطے چھوڑ کر گیا تھا۔ کہ یہ دن دیکھوں۔ جو میں یہاں رہتا۔ تو تیرا یہ حال کاہے کو ہوتا۔ وہ کون سی بُری گھڑی تھی جب میں یہاں سے گیا۔ اب ذرا آنکھ کھول اور دیکھ تیرا سندر سنگھ آگیا۔ اور اب تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ پر تو اسے چھوڑ کر چلی۔"

من سکھی اپنا ہاتھ اُس کی گردن میں ڈال دیتی ہے:

"میں تو کتنے دن سے تیری باٹ دیکھ رہی تھی۔ اب مجھے مرجانے کا تو کچھ فکر نہیں ہے پر یہ سوچ تھا کہ تیرے ملے بدوں مرجاؤں گی۔ سو بھگوان نے تجھے بھی بھیج دیا۔"

یہ بات سُن کر سندر سنگھ کا کلیجا پھٹتا ہے اور وہ اپنی بیوی کو تسلّی دینا چاہتا ہے:

..... من سکھی نے کہا تو کیوں چنتا کرے ہے؟ تھوڑے دن پیچھے تیرا دوسرا بیاہ ہو جائے گا۔ اور سارا دکھ جاتا رہے گا۔ بر بچاری من سکھی کہاں!"

لیکن سندر سنگھ پھر کوشش کرتا ہے کہ اپنی کامیابیوں کی داستان سُنا کر من سکھی کے دل کو مطمئن کر دے:

دیکھ۔ اب تو بھگوان نے دن بھی پھیر دئے ہیں۔ سجان سنگھ جو پہلے طعنے دیا کرتا تھا۔ اب موم ہو گیا ہے۔ اور بڑی خوشامد کرے ہے۔ اور روپے بھی ہمارے ہاتھ گھنے سے لگے ہیں۔ اب میں تیرے پاس سے پل بھر کو نہیں ٹلوں گا۔ اور تجھے اپنی جان کے برابر رکھوں گا۔ یہ بات سُن کر من سکھی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور کہنے لگی۔ "جو میں جیتی رہتی تو تو بھی دیکھتا پریت کیسی ہوتے ہے۔ پر میری زندگی مت سمجھیو۔ میں تو دھرتی پر یوں ہی آئی اور یوں ہی چلی۔ جب بالک تھی تو ماں باپ مر گئے۔ اور جب بڑی ہوئی اور تجھ سے ملی۔ تو یہ سمجھی کہ اس جگت میں آنے کا پھل مل گیا۔ پر رام چاہے سو کرے۔ یہ بھی بڑی بات ہے کہ تیرے ہاتھ سے مٹی تو ٹھکانے لگ جائے گی۔"

خاتمہ کتنا موثر اور حسرت ناک ہے۔

پھر من سکھی نے سندر سنگھ کا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا۔ اور چپ چاپ آنکھیں بند کئے ہوئے پڑی رہی۔ جب اس طرح پڑے ہوئے تھوڑی سی دیر ہو گئی۔ اور سندر سنگھ نے اس کے جسم میں کچھ حرکت نہ پائی اور نہ سانس آتا جاتا دیکھا تو گھبرا کر اُسے پکارنے لگا۔ اور بہت سی قسمیں دلائیں۔ مگر کچھ جواب نہ پایا۔ تب تو بے قرار ہو کر اُس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے اور ایک بارگی چلاّ اُٹھا "لوگو! میں لٹ گیا"۔

درد و حسرت کی اِس تصویر کے ساتھ انسانی خود غرضی اور شقاوت کے حسبِ ذیل مظاہرے کا تضاد کس قدر واقعیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ من سکھی کے مرجانے کے بعد سب لوگ اُس کی لاش کے پاس جاتے ہیں:

پاربتی نے بھی وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ مگر اُس کی ماں نے یہ اندیشہ کیا کہ ایسا نہ ہو۔ مردے کے پاس جانے سے اس کو کچھ ہو جائے اور یہ سوچ کر اس سے کہا۔ "تو موہن کو لئے بیٹھی رہ"۔

یہ واقعہ مصنّف کی بے دردانہ حقیقت نگاری کی دلیل ہے۔ من سکھی کو بھی یہی حقیقت پرستی موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ اور کمزوری کا کوئی جذبہ مقتضیاتِ فن کے خلاف مصنّف پر غالب نہیں آسکتا۔ یہی اصول قصے کے انجام تک مصنّف کی رہنمائی کرتا ہے۔

من سکھی کی موت کے بعد کے واقعات مصنّف نے کسی قسم کی رنگ آمیزی و جذبہ آرائی کے بغیر نہایت سادگی سے بیان کئے ہیں:

سندر سنگھ وہاں سے اٹھ کر ایک طرف جا بیٹھا۔ اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ جب سب کو روتے پیٹتے گھنٹہ بھر ہو گیا۔ تو گیان چند نے کہا۔ "رو گے تو ساری عمر۔ پر اس کی مٹی تو ٹھکانے لگاؤ۔ گنگا یہاں سے دور ہے سورج چھپنے سے پہلے اس کو پھونکنا چاہیئے"۔

گیان چند ہمیشہ سمجھ کی بات کرتا ہے اور باوجود اس کے کہ وہ قصے کے زیادہ اہم افراد میں سے نہیں ہے اُس کی سیرت کافی حد تک واضح معیّن اور یک رنگ ہے۔ قصے کے آغاز میں جب سجان سنگھ نے سندر سنگھ کو اپنے گھر سے رخصت ہو جانے پر مجبور کر دیا تو

گیان چند مشر نے جس وقت یہ حال سنا۔ فوراً سجان سنگھ کے پاس دوڑا گیا اور کہا۔ "چودھری جی یہ بات تمہارے جوگ تھی۔ کہ تم اپنے جائی کو نکال دو؟ بھائی کسی کا ایک سا سما نہیں رہا۔ کیا تمہیں اس کا آدھ سیر آٹا دوبر تھا؟ ان دنوں کو بھول گئے؟ جب تمہارا ہیر پور کا گاؤں اس کے دادا کی چودھرایت میں تھا۔ بھائی کیا ٹوٹا

آجاتا؟ جواہیر کا چھورا اپنے کرتُوت کیسلے دن تمہارے گھر کاٹ جاتا؟"

اسی طرح جس وقت فقیر کے جھانسے میں آکر سجان سنگھ موہن کا زیور زبردستی اتارنا چاہتا ہے، گیان چند پاس سے گزرتے گزرتے رک جاتا ہے اور موہن کو اٹھا کر سجان سنگھ سے یُوں مخاطب ہوتا ہے:

"چودھری جا بھی۔ کیوں ہٹ کرے ہے۔ ناحق لڑکے کو دکھی کر رکھا ہے۔ اس کی روتے روتے ہچکیاں بھی بندھ گئی ہیں"

پُورے قصّے کو پڑھنے پر چندر کو رنگ کی ایک نمایاں انفرادی سیرت تصور میں قائم ہو جاتی ہے اور یہ اس قدر صاف ہے کہ ہر شخص قصّے کو پڑھ کر بطورِ خود اسے سمجھ سکتا ہے۔

من سکھی کی موت کے بعد کی رسوم سندر سنگھ کے ہاتھوں ادا ہوتی ہیں مگر یہ سب باتیں اصل قصّے کے ساتھ پڑھنے کی ہیں۔ جب سندر سنگھ کریا کرم سے فارغ ہو جاتا ہے تو سجان سنگھ چاہتا ہے کہ اُس کو اب اپنے ہی پاس رکھے لیکن سندر سنگھ یہ بات نہیں مانتا:

اتنے میں پاربتی بھی آگئی اور دیر تک یہ باتیں سنتی رہی۔ پھر کہا "جیجا! ادھر آ۔ میں تجھ سے ایک بات کہوں"۔ سندر سنگھ اُٹھ کر اس کی طرف چلا گیا۔ وہ بولی "اب جیجا! تو یہاں سے کیوں جائے ہے۔ رسالے میں جا کر کیا کرے گا؟ تُو تو یہیں کھیتی کیاری کیا کر۔ یا اپنے باپو کے گھر جا رہیو"۔ سندر سنگھ نے کہا "واہ تو تو جان بوجھ کر ایسی باتیں کرے ہے۔ بھلا اب جی کر کیا کروں گا؟" پھر پاربتی نے کہا "جیجا ایسی بات نہیں کہیں ہیں۔ اب تو تیرے پاس گھنے روپے ہیں۔ اور تیرے ماں باپ بھی تیرے لئے روتے ہوں گے۔ اب جا اور ان کو سکھ دے۔ دیکھ۔ ان کی آہ مت لے"۔ یہ سن کر سندر سنگھ نے کہا "میں تجھے کہاں تک سمجھاؤں؟ تو تو جانے ہے مجھ کو تیری بہن سے کیسی پریت تھی۔۔۔۔"

"میں تجھے کہاں تک سمجھاؤں!" یہ جملہ کتنا حسرت بھرا ہے۔ بچارے سادہ دل اہیر نے سمجھایا کچھ بھی نہیں مگر سمجھتا یہی ہے کہ میں نے سب کچھ سمجھا دیا، اس لئے کہ خود اس کے دل میں اپنی لازوال محبت کے متعلق تشریحات کی ناگفتہ داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔ لیکن اس کے بعد اس کا رنجِ عظیم خود ہی اُسے طاقتِ اظہار دے دیتا ہے:

"میرا جینا تو اُس کے ساتھ تھا۔ اب بھگوان نے اُسے اٹھا لیا"۔ بس اتنا ہی کہا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور پھر رو کر کہنے لگا "پاربتی میں کیا کروں؟ میرا دل میرے بس میں نہیں ہے۔ تیری بہن کی صورت آٹھ پہر میرے من میں بسی رہے ہے۔ مجھے نہ دن کو چین ہے نہ رات کو نیند۔ اور اس گاؤں میں جس چیز کو میں دیکھتا ہوں۔ مجھے سب اُس کی یاد دلاویں ہیں"۔

رخصت کے وقت اُس کے الفاظ میں وہ تاثیر ہے جیسے دردِ دل اور خلوص ایک دہقان کی زبان میں بھی

پیدا کر سکتے ہیں:

چلتے وقت موہن کو گود میں اٹھا کر پیار کیا - اور ایک روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھ کر کہا "جو تجھے جان کے برابر رکھتی تھی - وہ تو مرگئی - اب تو اُسے اور مجھے یاد رکھیو" اور پھر پاربتی کو بلا کر کہا "لے رام رام پاربتی! جیسی پریت تَیں نے اُس کے ساتھ کی - اور جیسی تَیں نے میری دھیر بندھائی - بھگوان تجھے راضی رکھے - اب ہمارا تیرا ملنا نہیں ہوئیگا - جہاں تو اُسے یاد کرے وہاں مجھے بھی یاد کرلیجیو - اب میرے جینے کا بھی کچھ بھروسا نہیں ہے"

قصّے کے انجام میں بھی حقیقت و صداقت کے ساتھ مصنّف کی وابستگی اُسی پہلی بے رحمانہ سختی سے قائم رہی ہے - اور کوئی بیرونی خیال اُسے مقتضیاتِ فن سے سرتابی کرنے پر آمادہ نہیں کرسکا - یہ آنکھوں میں آنسو بھر لانے والا نوجوان جو قصّے کے آغاز میں سجان سنگھ کے گھر سے رخصت ہوا تھا، اب خود قصّے میں سے اُس شان کے ساتھ رخصت ہوتا ہے جو اُس کا حق ہے - انجام اگر یوں نہ ہوتا - تو وہ آب جو قصّے کی موجودہ صورت میں ہم کو نظر آتی ہے یقیناً کسی حد تک ماند پڑ جاتی - ایک کسان لڑکی اور کسان لڑکے کی سیدھی سادھی محبت کی داستان کو ایک رزمیہ نظم کے تخیل کی عظمت و شان سے کوئی خاص مناسبت معلوم نہیں ہوتی - لیکن داستان کے آخری واقعے کی اہمیت اور پھر اندازِ بیان کی وہ خاموشی جس سے یہاں کام لیا گیا ہے بے اختیار انگریزی کی سب سے بڑی رزمیہ نظم کے خاتمے کی یاد دلادیتی ہے - پیارے لال کی خاموش اور شفّاف روانی کو ملٹن کے شکوہ وجلال سے کوئی نسبت نہیں ہوسکتی - بااین ہمہ درد وکرب کے ایک طوفان کو سمیٹتا ہوا جس سکون کے ساتھ یہ قصّہ انجام کو پہنچتا ہے اُس میں وہی ادا جھلکتی ہے جس سے انگریز شاعر نے آدم اور حوّا کے بہشت سے نکلنے کا ذکر کیا ہے:

پھر اہیر پور پر جہاں ایسے دکھ اٹھائے تھے آخر نظر ڈال کر اپنے رسالے میں چلا گیا - اور وہاں رات دن من سکھی کے خیال میں رہا - اور انجام کار اسی غم میں گھل گھل کر مرگیا -

حمید احمد خاں

ضمیمہ

اس مضمون کا بیشتر حصّہ قلم بند ہوچکا تھا کہ راقم الحروف کو اسی سلسلے میں مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا کی "سیر المصنفین" جلد دوم کی طرف توجہ دلائی گئی جنہوں نے اپنی کتاب کے ایک حاشیے میں مسٹر پیارے لال کے لئے بھی تھوڑی سی جگہ نکالی ہے - اس طرح مسٹر پیارے لال کے متعلق کچھ نئی معلومات بہم پہنچیں جن کو پڑھ کر اپنی اِس مجرمانہ غفلت پر اَور زیادہ افسوس ہوا کہ ایک ایسے جوہر قابل کی ہستی اب تک کیوں گلدستۂ طاقِ نسیاں بنی رہی - پنجاب کی نوجوان نسل کے زمانۂ طالب علمی سے پہلے "رسوم ہند" نصابِ تعلیم سے خارج ہوچکی تھی اور بعد میں اسے کوئی

مستقل ادبی حیثیت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے روپوش ہونا پڑا۔ اس لئے اس کتاب سے ہماری ناواقفیت باعثِ تعجب نہیں۔ البتہ رنج کا مقام یہ ہے کہ اردو کی تیسری کتاب" یا "قصصِ ہند" جیسی کتابیں جو غالباً ہم سب نے پڑھی ہیں، اب تک ایک عام مغالطے کی بنا پر بالعموم مولانا محمد حسین آزاد سے منسوب کی جاتی رہیں حالانکہ ان کا حقِ تصنیف مسٹر پیارے لال کو پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ مسٹر پیارے لال ہی کے رسوخ اور ہمدردانہ کوشش سے محکمۂ تعلیم پنجاب نے آزاد مرحوم کی قابلیت کو پہچان کر اُن کی قدردانی کی تھی (سیر المصنفین جلد دوم صفحہ ۱۹۲-۱۹۳) سرکاری اخبار "اتالیقِ پنجاب" مسٹر پیارے لال کی اڈیٹری میں نکلتا تھا اور اس کے سب ایڈیٹر آزاد مرحوم تھے۔ جب آزاد پروفیسر ہو گئے تو حالی مرحوم نے بھی کچھ عرصے تک اس اخبار کی سب ایڈیٹری کی۔

ناظرین کی آگاہی اور دلچسپی کے لئے ہم "سیر المصنفین" میں سے مسٹر پیارے لال کے حالات یہاں نقل کرتے ہیں۔

"ماسٹر پیارے لال آشوب ۱۸۳۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے جو تین سو برس سے ان کے بزرگوں کا مسکن رہا ہے۔ ان کا نسبی سلسلہ شہنشاہِ اکبر کے مشہور وزیر راجہ ٹوڈرمل تک پہنچتا ہے۔ آپ پرانے دہلی کالج کے تمام درجے طے کر کے ۱۸۵۵ء میں تکمیلِ علم کے لئے آگرہ کالج میں داخل ہوئے اور وہاں سے سند حاصل کرنے کے بعد ۱۸۵۵ء میں بریلی جا کر سرکاری ملازمت اختیار کی۔ مگر ایک سال کے بعد پنجاب چلے آئے۔ تھوڑے عرصے تک گوڑگانواں اور دہلی میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ ۱۸۶۴ء میں دہلی سے تبدیل ہو کر لاہور پہنچے۔ اور وہاں کیوریٹر کے نازک عہدے کے اہم فرائض کو ۱۵-۱۶ برس تک نہایت ہوشیاری اور دیانت داری سے انجام دیا۔ ۱۸۸۴ء میں انسپکٹر مدارس ہو گئے اور ۱۸۹۵ء تک اس عہدے پر فائز المرام رہے۔ قیامِ لاہور کے زمانے میں کئی برس تک سرکاری اخبار کے ایڈیٹر رہے۔ میجر فلر صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم ان سے بہت خوش تھے ان کے پاس کلکتہ یونیورسٹی سے سوال آیا کرتے تھے۔ اور وہ ان کے جواب میں اکثر رائے بہادر صاحب سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کلکتہ یونیورسٹی سے یہ سوال آیا کہ مسجع و مقفیٰ عبارت میں کیا فرق ہے، مع مثال بیان کرو۔ حسبِ معمول یہ سوال بھی رائے صاحب کے پاس بھیجا۔ رائے صاحب نے یہ سوال بجنسہٖ مرزا غالب کے پاس بھیج دیا جن کی خدمت میں رائے صاحب کو نیاز حاصل تھا اور مرزا صاحب اُن پر بہت مہربانی فرماتے تھے انہوں نے اس کا جواب مع امثال نظم میں لکھ کر بھیج دیا جس کا اخیر شعر یہ تھا ؎

تحریر ہے یہ غالبِ یزداں پرست کی ۔۔۔ تاریخ اس کی آج نویں ہے اگست کی

سنا ہے کہ پروفیسر آزاد اور مولانا حالی کو نیچرل شاعری کا شوق اور خیال آپ ہی کی صحبت میں ہوا اور آپ ہی سے اس کے متعلق معلومات حاصل کیں[1] لیکن ہمارے نزدیک جو کچھ شوق ہوا وہ کرنل ہالرائڈ ہی کی تحریک اور امداد سے ہوا۔ اب جو چاہے اپنا نام کر لے۔

آپ نے "رسومِ ہند" کے پہلے تین باب "قصصِ ہند" اول و سوم" اردو کی تیسری کتاب" لکھی اور ترجمہ "تاریخِ انگلستان کلاں" کیا۔ نیز رسالہ "اتالیقِ پنجاب" کے اکثر مضامین لکھے۔ ترجمہ دربارِ قیصری ۱۸۷۷ء مولفہ مسٹر ویلر شستہ و بامحاورہ بلکہ برجستہ و دلآویز کیا۔ اور اس کے صلے میں آپ کو ایک تمغہ اور ایک جلد مطلا و مذہب مرحمت ہوئی۔ ۱۸۹۱ء میں آپ کو رائے بہادری کا خطاب ملا اور ۱۸۹۵ء میں ۳۶ سال کی ملازمت کے بعد پنشن لے لی۔ آپ ایک علم دوست آدمی تھے۔ عرصہ ہوا کہ آپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ افسوس کہ صحیح تاریخِ وفات معلوم نہیں ہوئی" +

---

[1] کاش کہ مولوی محمد یحییٰ صاحب اس روایت کے ماخذ کی تصریح فرما دیتے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیتے کہ کس سند پر وہ اس روایت کی (جو واقعات پر غور کرنے سے بڑی حد تک قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے) اس شدت کے ساتھ تردید کرتے ہیں۔

نشاطِ رُوح

خونِ آرزو افشا ہو کسی بہانے سے — رنگ کچھ ٹپکتا ہے حُسن کے فسانے سے

اِس فضائے تیرہ کو گرم کر منوّر کر — داغِ دل نہیں کھلتا دیکھنے دکھانے سے

مسکرائے جاتا ہوں اشک بہتے جاتے ہیں — غم کا کام لیتا ہوں عیش کے ترانے سے

زخم آپ پیتا ہوں لذّتیں اُٹھاتا ہوں — تجھ کو یاد کرتا ہوں درد کے بہانے سے

اِک نگارِ محبوبی اشکِ خوں میں پنہاں ہے — حُسن کی نمائش ہی عشق کے بہانے سے

ایک ایک تنکے پر شکستگی طاری — برق بھی لرزتی ہے میرے آشیانے سے

اب جو کچھ گزرنا ہو جان پر گزر جائے — جھاڑ کر اُٹھے دامن اُسکے آستانے سے

جلوۂ مظاہر ہے دفترِ فنا آموز — نیند آئی جاتی ہی حُسن کے فسانے سے

روشنی ہو جگنو کی جیسے شبستاں میں — وہ نقاب کا عالم اُس کے مسکرانے سے

بیخودی کا عالم ہے محوِ جبہ سائی ہوں
اب نہ سر سے مطلب ہے اور نہ آستانے سے

اصغر
گونڈوی

قبرستان

خوشی کے چہچہوں سے دُور یہ سنسان بستی ہے
یہاں ہر سمت ویرانی ہی ویرانی برستی ہے

قیامت کی سیاہی ہے، قیامت کا اندھیرا ہے
زمیں کو ہر طرف وحشت نے تاریکی نے گھیرا ہے

صدائیں گیدڑوں کی دُور میدانوں سے آتی ہیں
بلاؤں کی طرح ویرانیوں پر پھیل جاتی ہیں

زمیں پر خشک پتّوں کی اچانک سرسراہٹ سے
جھجک اُٹھتے ہیں انسانی قدم اپنی ہی آہٹ سے

صدائے بُوم گونج اٹھتی ہے برگد کے درختوں پر
نحوست رو رہی ہے اِس جہاں کے تیرہ بختوں پر

بدن میں سنسنی پیدا ہے تاریکی کے اژدر سے
لرزجاتا ہے دل ہر گام پر آسیب کے ڈر سے

تم ان ٹوٹی ہوئی قبروں کی بربادی پہ مت جاؤ
حقیقت سے تمہیں آگاہ کرتا ہوں اِدھر آؤ

یہاں کے ساکنوں کی ظاہری حالت کو جانے دو
زمانہ گر نشاں اِن کے مٹاتا ہے مٹانے دو

جو سچ پُوچھو تو کتنی قابلِ رشک ان کی حالت ہے!
میسّر ان کو کتنا چین ہے کیسی فراغت ہے!

نہ دنیا کے بکھیڑے ہیں مصیبت ہے، نہ بیماری!
نہ آپس کی عداوت ہے، نہ چالاکی نہ مکّاری!

میسّر ہے یہاں عالم کی سب فکروں سے آزادی
خموشی اور سکوں کا گھر ہے یہ ویران آبادی

یہاں کی سرزمیں اک دوسرے عالم میں شامل ہے
یہاں غمناک روحوں کو دوامی عیش حاصل ہے

یہاں ٹوٹے دلوں کو مرہمِ تسکیں مہیا ہے
یہاں کی نیند انسانی مصائب کا مداوا ہے

شکستہ خاطروں کی آخری منزل ہے یہ بستی
تھکے ہارے ہوؤں کی جاوداں محفل ہے یہ بستی

ذوقی

میری

(جاپان کی ایک سچی کہانی)

جاپان کی سرزمین کے چپے چپے میں قدرت کے ان گنت خزانے مدفون ہیں اور انسان کو اس کے گوشے گوشے میں ہر آن پُراسرار خطروں کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اُس کے تہذیب و تمدن اور جغرافیائی حالات سے اجنبیوں نے جو واقفیت حاصل کی ہے اُس کو محض بالائی سطح کی کُھرچن یا پت جھڑ کی رُت کے سُوکھے پتّوں کے ڈھیر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ بالخصوص اس کے باشندوں کی سیرت اور عادات و اطوار کے متعلق تو کسی اجنبی کے لئے کوئی رائے قائم کرنا نہایت مشکل ہے۔ جاپانی مہذب اقوام میں سب سے زیادہ خاموش واقع ہوئے ہیں۔ غیر ملکی سیّاح طویل سے طویل قیام کے بعد بھی جاپانیوں کے جذبات و احساسات کے علم سے بالکل کورے رہتے ہیں لیکن ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ کبھی کبھی کوئی غیر ملکی باشندہ اپنے ہمدردانہ طرزِ عمل سے جاپانیوں کے دل میں جگہ حاصل کر کے اُن چھپے ہوئے حقائق سے واقف ہو جاتا ہے جو نہ صرف اغیار سے بلکہ اکثر خود جاپانیوں سے بھی اُسی طرح پوشیدہ رہتے ہیں جس طرح عام نظروں سے لومڑی کا بھٹ یا وہ تاریک بانبی جہاں ناگ کی زہریلی آنکھوں میں بھی گھڑی دو گھڑی کیلئے نیند کا امرت گھل مل جاتا ہے۔ جاپانی اہلِ قلم بھی اپنی مخصوص ذہنیت کے باعث اپنے ہم وطنوں کی سیرت کی حقیقی تصویریں پیش نہیں کرتے۔ چیخوف کی طرح کسی جاپانی مصنّف نے اپنے ادب کو اپنے اہلِ ملک کی سیرت کے مرقعوں سے مالا مال نہیں کیا۔ یہ بھی ممکن ہو کہ جدید تہذیب و تمدن کے گھمنڈ میں جاپانی اپنے پس ماندہ ہم جنسوں کے حالات کو قابلِ ذکر ہی نہ سمجھتے ہوں، اسی لئے کسی جاپانی مصنّف نے اس قسم کا ذخیرۂ ادب بہم نہیں پہنچایا جس قسم کا میکسم گورکی نے روسیوں کی زندگی اور معاشرت کی صحیح صحیح تصویریں پیش کر کے فراہم کیا ہے۔ جاپانی مصنّف کم از کم معرضِ تحریر میں کوئی ایسی بات نہیں لاتے جو ناقابلِ توجیہ ہو اور جس سے اہلِ ملک پر اوہام پرستی کا الزام عائد ہونے کی گنجائش نکل سکے۔ ان حالات کی موجودگی میں کوئی غیر ملکی سیاح خواہ وہ کیسا ہی صاحبِ بصیرت کیوں نہ ہو طویل سے طویل قیام کے باوجود بھی اہلِ جاپان کی زندگی اور سیرت کے متعلق بھول بھلیاں میں پڑا رہتا ہے۔

جاپانیوں کے متعلق یہ نظریہ جو میں نے پیش کیا ہے کچھ زیادہ واضح نہیں مگر فی الحال میرا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس عظیم الشان ایشیائی ملک کی زندگی میں دلچسپ اور پُراسرار واقعات اور خوفناک حقائق بہت کثرت

سے موجود ہیں لیکن اِس کے باشندوں کے قدیم یا جدید تمدن و معاشرت کے عام مطالعے سے اِن پوشیدہ حقائق پر کچھ زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔

میں جو دردناک داستان ذیل میں سپردِ قلم کر رہا ہوں اُس کے ماخذ تک میری رسائی محض اتفاقی طور پر ہوگئی تھی۔ اِس داستان کا تعلق میرے ایک جاپانی دوست اور سابق شاگرد سے ہے جو جدید تہذیب و تمدن سے بدرجۂ اتم بہرہ مند ہے۔ اُس کی وضع وقطع امیرانہ ہے اور اُس کے زرد چہرے سے فطری ذہانت کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔ اپنے لباس اور آدابِ معاشرت سے وہ بالکل یورپین معلوم ہوتا ہے جب وہ کالج میں پڑھتا تھا تو مجھے اُس کی انگریزی تحریریں دیکھ کر اُس سے خاص دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اِس کے علاوہ اُس کی خوش آئند سیرت نے رفتہ رفتہ مجھے اُس کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ اکثر شام کو ہم مل کر سیر کے لئے جایا کرتے تھے اور اُس کے ذریعہ سے مجھے جاپان کے قدیم آثار و مقامات کے متعلق نہایت دلچسپ اور اہم معلومات حاصل ہوا کرتی تھیں۔

وقتاً فوقتاً وہ اپنے مضامین میں اپنے دور افتادہ کوہستانی گاؤں اور اُس کے مضافاتی علاقے کے مرقعے بھی پیش کیا کرتا تھا۔ اِن مضامین کے پڑھنے سے میرے دل میں اُن مقامات کو دیکھنے کی غیر معمولی خواہش پیدا ہوگئی۔

آخر ایک دفعہ موسمِ بہار کی تعطیل میں اُس نے مجھے اپنے پہاڑی مسکن میں کچھ دن گزارنے کے لئے مدعو کیا اور میں نے اُس کی دعوت کو بخوشی قبول کر لیا۔ ہم نے اپنے شہر سے جو جزیرۂ جاپان کے ساحل پر واقع ہے تین گھنٹے تک ریل کا سفر کیا۔ اس کے بعد ہم برقی گاڑی پر سوار ہوئے۔ اِس قسم کی برقی گاڑیاں جدید جاپانی معاشرت کا ایک لازمہ ہیں۔ سرِ شام ہم ایک سٹیشن پر پہنچے جو ایک پُرشور پہاڑی ندی کے کنارے واقع تھا۔ ندی کو ایک چھوٹے پل کے ذریعے سے عبور کر کے ہم ایک گاؤں میں پہنچے جس میں ایک لمبا بازار دُور تک چلا گیا تھا۔ ہماری نظروں کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک دراز سلسلۂ کوہستان پھیلا ہوا تھا جس کی بلند ترین چوٹی ہکوسان بارہ مہینے برف سے ڈھپی رہتی ہے۔ میرے شاگرد نے کسی دوکان سے ایک قندیل جلا کر ساتھ لے لی۔ اِس کے بعد اُس نے اُس طویل سلسلۂ کوہستان کے دامن کا رخ کیا جس کے پیچھے ہکوسان کی فلک بوس چوٹی ثریا کو ثریا سے ملا رہی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد ہم ایک گھنے جنگل میں داخل ہوئے۔ اس وقت رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے نے چاروں کھونٹ چھاؤنی چھا لی تھی اور ہم اس تنگ پتھریلی سڑک پر چراغ کی مدد سے بمشکل اپنی راہ کا پتہ چلا رہے تھے۔ میرے شاگرد نے مجھے بتایا کہ یہ سڑک آٹھ سو سال قبل اُن کے مندر کے ساتھ ہی تعمیر ہوئی تھی۔ سالہا سال

سے برف و باراں کا طوفان پتھروں کو اپنی جگہ سے ہٹا رہا ہے۔ اسی وجہ سے سڑک کے آثار قریب قریب مفقود ہو رہے ہیں۔

کچھ عرصے کے بعد ہم ایک گنبد کے پاس پہنچے یہاں اُس نے بہ ادب اپنا سر جھکایا اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد جب ہم اُس کے گھر کے بالکل قریب پہنچ گئے تو اُس نے ایک درخت پر اپنی کاغذی قندیل سے روشنی ڈال کر مجھے بتایا کہ اِس کے نیچے شاکا سا مانی یعنی مہاتما بدھ روحانی ریاضت کے لئے بیٹھے تھے۔

آخر ہم اُس کے گھر کی تاریک عمارت میں داخل ہوئے جہاں اُس کے سن رسیدہ باپ نے جو مندر کا محافظ اور مذہبی پیشوا تھا نہایت تعظیم و تکریم سے ہمارا استقبال کیا۔ اُس کی ماں مختصر قد و قامت کی ایک غریب مزاج خاتون تھی اُس کے چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُس نے نہایت محنت اور مشقّت کی زندگی بسر کی ہے۔ میرے دوست کے والدین فرطِ احترام سے میرے سامنے بات بھی نہ کرتے تھے۔ اُن کے دل میں اپنے بیٹے کی غیر معمولی عزت اور وقعت تھی اور میں نہ صرف اُس کا استاد تھا بلکہ وہ پہلا اجنبی شخص بھی تھا جس نے اُن کی دہلیز پر قدم رکھا۔ اِس دوگونہ اتفاق نے اُن کے دل میں میری جگہ اس قدر بلند بنا دی تھی کہ میں کئی مرتبہ کی کوشش کے باوجود کسی طرح اپنے ہبوط پر قادر نہ ہو سکا۔ انہوں نے میری آسائش کے لئے بہتر سے بہتر اہتمام کیا اور مجھے نہایت اعلیٰ درجہ کی خوراک بہم پہنچائی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس پہاڑی گاؤں میں مجھے اِن تکلفات کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔

صبح کے وقت مجھے معلوم ہوُا کہ آس پاس کوہسار کا منظر نہایت دلکشا ہے۔ جا بجا پرانی عمارتوں کے کھنڈر بھی نظر آتے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ کبھی اِن عمارتوں میں چھ ہزار سے زائد بدھ بھکشو آباد تھے، مگر اب انقلابِ روزگار نے بجز ایک مندر کے اَور کچھ نہ چھوڑا تھا۔ پھر مجھے میرا شاگرد ایک مربع کمرے میں لے گیا۔ یہاں مندر کے تاریخی تحائف کا ایک حیرت انگیز خزانہ میری نظروں سے گزرا۔ میرے سوال پر اُس نے مجھے بتایا کہ کوئی شخص اس بیش بہا خزانے کے سرقے کا خیال دل میں بھی نہیں لا سکتا اور یہ اس ویرانے میں کامل طور پر محفوظ ہے۔

آفتاب ڈھل چکا تھا اور میں اپنے جاپانی شاگرد کے قلبی احساسات سے بالکل بے خبر بیٹھا ہوُا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔

اُن کے گھر پر بلکہ تمام جنگل پر اُداسی اور افسردگی سی چھا رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ابھی موسم سرما کو گزرے زیادہ عرصہ نہ ہوُا تھا۔ پالا بھی وہاں اِس غضب کا پڑتا ہے کہ چھتوں تک برف کی تہ پہنچ جاتی ہے اور اُس کے سفید فرش پر جنگلی ہرنوں، سؤروں اور ریچھوں کے نقشِ رہگذار کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

شہر میں واپس آنے کے بعد کچھ عرصے تک کام کی کثرت اور اپنی مصروفیت کے باعث ہم دونوں کو کالج سے باہر ملاقات کا موقع نہ ملا۔ آخر ایک دن میں نے اپنے طلبہ سے خواب کے موضوع پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ معلوم نہیں نوجوان طلبہ کے دلوں میں صبح کے سہانے وقت اور سہانے منظر نے کوئی خاص کیفیت پیدا کر دی یا وہ کسی افسون کے زیر اثر اپنی دلی کیفیات کے اظہار پر مجبور ہو گئے مگر جو کچھ انہوں نے لکھا وہ میرے لئے انتہائی حیرت اور دلچسپی کا موجب ہوا۔ بعض طلبہ نے اپنے بزرگوں کے خواب بیان کئے تھے، اور یہ خواب بھی جاپان کے عہد قدیم سے تعلق رکھتے تھے جس کو انہوں نے دوبارہ عالم خواب میں دیکھا تھا۔ انسانی جذبات کے ان مرقعوں میں سے بعض اس قدر پُر اثر بلکہ سحر آلود تھے کہ اُن کو پڑھ کر میری طبیعت میں ایک قسم کا ہیجان پیدا ہو گیا۔ چنانچہ میں نے یوہارا کو کہ میرے اس شاگرد کا نام یہی تھا شام کا وقت اپنے پاس گزارنے کی دعوت دی لیکن مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میری یہ دعوت کیا نتائج پیدا کرنے والی ہے۔

ہم دونوں دیر تک خواب کے موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لئے خاموشی طاری ہو گئی تو میرے تصور نے مجھے ایک دفعہ پھر جنگل میں اس مندر کے ایک بالائی کمرے میں تنہا پایا۔ کوہستانی ہواؤں کی وہی سائیں سائیں اور جنگلی درختوں کی ٹہنیوں کی وہی کڑکڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

اِس کے بعد میرے حافظے میں دفعتاً ایک واقعہ تازہ ہو گیا جس کو میں اپنا ایک پریشاں خواب سمجھ کر بالکل فراموش کر چکا تھا۔

جنگل کے قیام کی آخری شب کو میرے میزبانوں نے کھانے پینے کا غیر معمولی اہتمام کیا تھا۔ میں رات کے وقت سادہ غذا کھانے کا عادی ہوں۔ لیکن اس کے بجائے انہوں نے مجھے ازراہِ تواضع بہ اصرار اس قدر مچھلی اور ہرن کا بھنا ہؤا گوشت کھلا دیا کہ میں رات کو دیر تک نہ سو سکا۔ بیداری کے اُن طویل لمحوں میں میرا تصوّر برابر کام کرتا رہا اور میں اپنے جنگلی ماحول اور اردگرد کی اُن ویران اور خوفناک گھاٹیوں سے ایک دم غافل نہ ہؤا جو ہمارے اور اُس بے برگ و گیاہ کوہستان کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں جس کی سفید برف پوش چوٹی تاروں بھری رات میں ہمارے مسکن سے نو ہزار فٹ کی بلندی پر جھلملا رہی تھی۔

تقریباً دو بجے میں سویا۔ اس کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں دفعتہً چونک کر اٹھ بیٹھا، یا میں نے ایک سراسر انگیز خواب دیکھا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ میں نے کسی خوفناک چیز کے غرّانے کی آواز سنی ہے جس کی وجہ سے میرا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ اسی طرح مجھے کسی ایسی نہایت دہشت ناک چیز کے قرب کا بھی احساس ہؤا جس کے بیان سے

الفاظ قاصر ہیں لیکن میں نے اپنے دل کو اس خیال سے تسلی دی کہ یہ سب کچھ میرے جسم اور بستر کی غیر معمولی گرمی کا نتیجہ ہے۔ بس پسینے میں شرابور ہو رہا تھا لیکن احساس خوف کی شدت کے باعث میں بستر سے نکل کر دیا سلائی سے چراغ جلانے کی ہمت بھی نہ کر سکا۔

پھر میں نے صاف الفاظ میں ایک انسانی آواز سنی۔ یہ کسی لڑکی کی آواز تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ انتہائی دہشت کے درد و کرب میں بے دم ہو کر چلا رہی ہے "انجن، ہیاکو، کروشیائی" بھائی جلدی کرو۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کے بعد دوبارہ ویسی ہی غرانے کی آواز سنائی دی جس کو سن کر میں جاگ اٹھا تھا۔ پھر میں نے رونے اور کراہنے کی دبی دبی سی آواز سنی جس کے بعد دوبارہ بالکل خاموشی چھا گئی۔

میں اس وقت تک بالکل دم بخود لیٹا ہوا تھا۔ اب مجھے لمبے سانس کھینچنے کا خیال آیا اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنے حواس پر قابو پا لیا۔ پھر میں نے دل میں خیال کیا کہ یہ غالباً میرے شاگرد کی بہن کے خواب میں رونے اور چلانے کی آواز تھی جو نیچے کی منزل میں سو رہی تھی۔

دوسرے دن صبح میں دیر سے اٹھا۔ سورج کی کرنیں میرے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ جنگل کے پرندے گا رہے تھے اور کوہستانی ندیوں کا شور بہت دلکش معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ رات کا واقعہ میرے ذہن سے بالکل اتر گیا اور آج معلوم نہیں میرے شاگرد کے قلبی حسیات کے تصرف سے، یا کس طرح، مجھے اس رات کی ایک ایک بات پھر صاف یاد آگئی۔

میں نے محض برسبیل تذکرہ اس واقعے کا ذکر کیا تھا لیکن جب میری زبان پر وہ الفاظ آئے جو اس رات میں نے سنے تھے: "انجن، ہیاکو، کروشیائی"، تو میرے شاگرد کے چہرے پر جو تغیر نمودار ہوا وہ مجھے عمر بھر نہ بھولے گا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر کرسی سے نیچے گر پڑے گا۔ اس کا چہرہ جو ہمیشہ زرد رہتا تھا اب بالکل سفید پڑ گیا تھا اور اس کی سانس رک رک کر چل رہی تھی۔ پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ سہارا ڈھونڈنے کے لئے پھیلایا۔ میں نے اس کا ہاتھ جو متشنج معلوم ہوتا تھا اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے بستر پر لٹانا چاہا لیکن اس نے لیٹنے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ یکلخت اٹھ بیٹھا اور نگاہیں گاڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کو میرے پیچھے، کوئی نہایت ہی ہولناک چیز نظر آرہی ہے۔

میں اس کے اس طرز عمل سے کچھ مضطرب سا ہو گیا چنانچہ میں نے مڑ کر اپنے پیچھے کی کھڑکی کھول دی۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، اس لئے میں نے اس سے کہا کہ تم اب رات یہیں گزار لو۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اپنے طرز عمل کے لئے معذرت کی۔ میں نے شرمندگی سے کہا کہ آپ لوگ جس قدر تواضع اور مدارات کے ساتھ مجھ سے پیش آتے رہے

میرا دل ہی جانتا ہے اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس واقعے کو بیان کرکے تمہیں ناحق اذیت دی حالانکہ یہ ایک پریشان خواب تھا جس کو میں خود بھول چکا تھا۔

اُس نے کہا یہ پریشان خواب نہ تھا بلکہ سرے سے یہ خواب تھا ہی نہیں۔ پھر اُس نے جیب سے یادداشت کی ایک سیاہ کتاب نکالی اور اُس میں سے حنائی کاغذ کا ایک لو سیدہ سا ٹکڑا نکال کر مجھے دکھایا۔ اس پر خون کے حروف میں کسی بچے کے ہاتھ کا لکھا ہُوا یہی فقرہ دیکھ کر میں تصویر حیرت بن گیا: "اچن، ہیاکو، کروشیائی"

اس دردناک التجا کو اپنے سامنے دیکھ کر خود میرا جسم نامعلوم طور پر سرد ہوگیا اور مجھے یوں محسوس ہُوا گویا میرا دل غم و اندوہ کے ایک بے پایاں طوفان میں ڈوب گیا ہے۔

میں نے اُس سے پوچھا "آخر یہ کیا بات ہے؟"

پھر اُس نے درد بھری آواز سے خلاف معمول مجھے جاپانی زبان میں یہ واقعہ سنانا شروع کیا، اور اُس کے بیان کے ابتدائی الفاظ ہی کو سُن کر میں درد و غم کا پیکرِ مجسم بن گیا۔

اُس نے کہا "آپ کو معلوم ہے میری ایک چھوٹی بہن ہے" اِن الفاظ کو سُن کر مجھے وہ تیرہ چودہ سال کی شرمیلی لڑکی یاد آگئی جس کی ایک آدھ جھلک مجھے اپنے دورانِ قیام میں اُس پہاڑی مکان کے دروازوں کے پیچھے سے وقتاً فوقتاً نظر آئی تھی۔

اس کے بعد اُس نے کہا "وہ اب بالکل تنہا رہ گئی ہے" پھر کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہوگیا اُس وقت اُس کی نظر زمین کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ اس کے بعد اُس نے کہا "گزشتہ سال اُس کی ایک سہیلی بھی تھی جو اُس کے ساتھ کھیلا کرتی تھی اور وہ دونوں ایک دوسری کے ساتھ بہت خوش رہا کرتی تھیں۔ اس کا نام سکی تھا لیکن میں اُسے میری کہا کرتا تھا کیونکہ مجھے اس سے محبت تھی۔

"اس کے والدین کا انتقال ہوچکا تھا اور کچھ مدت سے وہ ہمارے گھر میں رہنے لگی تھی کیونکہ وہ میری بہن فیومی کی نہایت عزیز سہیلی تھی۔ میرے والدین اگرچہ غریب ہیں لیکن انہوں نے اس کی پرورش اور نگہداشت اپنی بچّی کی طرح کی، اور چونکہ وہ اُن کو بہت پسند تھی اس لئے وہ اُس کو آئندہ اپنی بہو بنا لینے کا ارادہ رکھتے تھے۔

"وہ میری بہن کے مقابلہ میں بہت زیادہ ذہین تھی اور غیر ممالک کی ہر چیز سے گہری دلچسپی لیا کرتی تھی، مثلاً وہ انگریزی آداب معاشرت، انگریزی گفتگو اور پیانو وغیرہ بجانا بخوشی سیکھ لیتی، حالانکہ اس دور و دراز پہاڑی گاؤں میں ایسی باتیں خواب و خیال سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔

"پس آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ جب میں تعطیل کے زمانے میں اپنے گھر جاتا تھا تو ہم سب آپس میں مل کر کس قدر خوش

ہوتے ہونگے۔ اِن موقعوں پر وہ مجھ سے تمام نئی باتیں جو میں کالج سے سیکھ کر آیا کرتا تھا پوچھ لئے بغیر دم نہ لیتی تھی"۔

اس ذہین لڑکی کے حالات سُن کر میرا دل نہایت رنج محسوس کر رہا تھا۔ مجھے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ اب اس دنیا سے وہ ہمیشہ کے لئے مفقود ہو چکی ہے۔

میرے شاگرد نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "آخری مرتبہ میری سے میری ملاقات ستمبر کے مہینے میں ہوئی۔ میری، فیومی اور مَیں، ہم تینوں سیر و تفریح کے لئے صبح کے وقت گھر سے نکلے۔ ہم نے پہاڑ کے دامن کا راستہ لیا۔ اس زمانے میں یہ پہاڑی راستہ بالکل ویران ہو جاتا ہے۔ ہم نے اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی لے لیا تھا۔ پھر بڑی پگڈنڈی کو چھوڑ کر ہم ندی کے کنارے کنارے ہو لئے۔ ہم ایک آبشار کو دیکھنے کے لئے جانا چاہتے تھے جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ صبح کا تمام وقت ہم نے وہاں دھوپ میں بیٹھ کر گزارا۔ کبھی کبھی لڑکیاں اُٹھ کر ریت پر چلنے کا لطف اٹھاتی تھیں اور ہم سب مل کر خوشی سے گیت گاتے تھے۔ آخر جب سورج پہاڑوں کے پیچھے چھپنے لگا تو ہم نے گھر واپس جانے کا ارادہ کیا۔ ہم ندی کے کنارے کنارے واپس چلے آرہے تھے اور ابھی بمشکل چند سو گز کا فاصلہ طے کرنے پائے تھے جب میری کو یاد آیا کہ وہ اپنے تصویردار کارڈوں کا مجموعہ ایک چٹان کے پیچھے بھول آئی ہے۔ وہ اپنے کارڈ لانے کے لئے بھاگتی ہوئی گئی اور ہم اُس کے انتظار میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اُس وقت جنگل کا منظر نہایت سہانا معلوم ہوتا تھا۔ درختوں کی ٹہنیوں میں چڑیاں خوشی سے چہچہا رہی تھیں اور پھدک پھدک کر ایک دوسری کی طرف جا رہی تھیں۔

دفعتہً ہمیں ایک خوف زدہ چیخ سنائی دی اور ہم خطرے کا احساس کر کے واپس بھاگے۔ ہمارا خیال تھا کہ میری کسی بندر وغیرہ سے ڈر گئی ہے۔ لیکن آبشار کے پاس پہنچنے پر وہ ہمیں کہیں نظر نہ آئی۔ تصویردار کارڈ آس پاس اس طرح بکھرے ہوئے تھے جیسے کسی نے انہیں زور سے زمین پر پٹک دیا ہو"۔

اس کے بعد اُس نے اپنی یادداشت کے ورق دوبارہ الٹے اور اُس میں سے دو کیچڑ سے بھرے ہوئے کارڈ نکال کر مجھے دکھائے جن پر بعض مشہور مغربی مصوّروں کے ہاتھ کی تصویریں تھیں۔

پھر اُس نے کہا "وہاں ہمیں اور کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اس مقام سے باہر جانے کا دوسرا کوئی راستہ بھی نہ تھا تینوں طرف بلند اور دشوار گزار چٹانوں کی سنگلاخ دیواریں کھڑی تھیں ہم نے میری کو ہر طرف ڈھونڈا۔ ہم بار بار بہ آوازِ بلند اُس کا نام لے کر اُسے پکارتے رہے لیکن گرتے ہوئے آبشار کے شور کے سوا جواب میں ہمیں کوئی دوسری آواز سنائی نہ دی۔ صرف ایک دفعہ ہم نے ایک عجیب و غریب آواز سنی جو جنگل کی ہواؤں میں ریل کے انجن کی سیٹی کی طرح

گونجی۔ میں نے ایسی آواز اس سے پہلے کبھی نہ سنی تھی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی ہرن کی آواز تھی یا ریچھ کی۔

"تاریکی دمبدم چھارہی تھی اور ہماری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کریں فیومی گھبرا کر رو رہی تھی اور میں اُسے نہ تنہا چھوڑ سکتا تھا اور نہ اکیلے گھر جانے کی اجازت دے سکتا تھا۔ اس ہولناک سانحے نے اُس کے ہوش و حواس بالکل گم کر دیئے تھے۔

"ناچار ہم گھر کو واپس گئے جہاں ہماری والدہ نہایت بے قراری سے ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ میں فیومی کو گھر میں پہنچانے کے بعد فوراً گاؤں کی طرف بھاگا اور لوگوں کو اطلاع دی۔ وہاں سے کئی لوگ میری مدد کے لئے چراغ ہاتھوں میں لے کر آئے۔ ہم وہ تمام رات اور پھر دوسرا تمام دن جنگلوں میں میری کو ڈھونڈتے رہے لیکن ہمیں اُس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ میری کا اس طرح گم ہو جانا سب لوگوں کے لئے ایک ناقابلِ فہم راز تھا۔ چند دنوں کے بعد مجھے کالج میں حاضر ہونا تھا لیکن روانگی سے قبل میں نے گرد و نواح کی تمام صحرائی آبادی میں پھر کر لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ حتی المقدور میری کی تلاش جاری رکھیں۔

"میری بہن کے خط مجھے باقاعدہ ملتے رہتے تھے لیکن اُن میں بجز حسرت و یاس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ آخر نومبر کے مہینے میں ایک دن مجھے ایک تار ملا کہ مجھے فوراً گھر کو روانہ ہو جانا چاہیئے۔ دن بھر میں سخت مضطرب الحال رہا اور رات کو جب میں گھر پہنچا تو گھر والوں نے میرے ہاتھ میں کاغذ کا یہ بوسیدہ ٹکڑا دیا جو میں نے ابھی آپ کو دکھایا ہے۔ یہ کاغذ ایک شکاری کو پہاڑ کی بلندی پر اُس مقام سے دس میل کے فاصلے پر، جہاں ہم نے میری کو کھویا تھا صنوبر کے کسی درخت کی شاخ میں اٹکا ہوا ملا تھا۔"

میرے شاگرد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ میرا خواب سُن کر کیوں اس قدر آسیمہ حال ہو گیا تھا۔

پھر اُس نے کہا "میری کے متعلق سب سے آخری اطلاع جو ہمیں حاصل ہوئی ہے وہ یہی ہے، بشرطیکہ وہ، بشرطیکہ وہ ــــــ"

اُس کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنا مافی الضمیر زبان سے ادا نہ کر سکا۔

اب مجھے اس ہولناک واقعے کا پوری طرح سے احساس ہو گیا۔ یہ لڑکی انسان سے کسی ادنیٰ درجے کے ذی روح کی گرفت میں اب تک کہیں زندہ موجود تھی اور اُس رات وہ کسی طرح بھاگ کر اپنی اُس تنہا جائے پناہ کی طرف آئی تھی لیکن اُس کے دروازے اُس کے لئے نہ کھل سکے اور وہ پھر اُسی بلا کے پنجے میں گرفتار ہو گئی۔ ہمارے چہرے زرد

پڑ گئے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف خوف بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، اُس کا منگیتر اودیں۔
اس واقعے کو بھی ایک مہینے کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن کسی نے اب تک اُس کی رہائی کے لئے کوئی کوشش نہ کی تھی۔

پھر میں نے کہا "کیا اس معاملہ میں پولیس یا فوج کا محکمہ کوئی مدد نہیں دے سکتا؟"

اُس نے جواب دیا "افسوس یہ ممکن نہیں آپ ان پہاڑوں سے واقف نہیں ہیں وہاں پولیس اور فوج کے دستوں کے دستے غائب ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو لوگ ان پہاڑوں سے بخوبی واقف ہیں وہ اپنی انتہائی کوشش صرف کر چکے ہیں مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن اب آپ نے جو کچھ بتایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیری ابھی تک زندہ ہے۔ میں علی الصباح گھر کو روانہ ہو جاؤں گا۔ اور تمام کوہستانی نواح میں اس واقعے کی خبر پہنچا دوں گا"

میں نے اُس کے ارادے کی تائید کی اور پھر اس سے کہا کہ "اگر میں کالج کے لڑکوں سے اس بات کا تذکرہ کروں تو میرا خیال ہے کہ بہت سے طلبہ تلاش میں مدد دینے کے لئے بخوشی آمادہ ہو جائیں گے۔

اُس نے کہا "مگر اس سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا وہ خود پہاڑوں میں کھو جائیں گے۔ کیونکہ بارہا ایسے اتفاقات پیش آ چکے ہیں"

صبح پو پھٹنے سے قبل میں اسے سٹیشن پر پہنچا آیا۔ ہم دونوں بھرے ہوئے دل کے ساتھ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

ایک ہفتے کے بعد وہ واپس آیا۔ وہ بہت دبلا معلوم ہوتا تھا اور اُس کا چہرہ تمازتِ آفتاب سے جلا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ دو پہاڑی رہنماؤں کی مدد سے دن رات پھر کر اُس نے پہاڑوں کا ایک ایک گوشہ دیکھا ہے لیکن بجز مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس پر میرے دل میں ایک نیا خیال جاگزیں ہوا۔ میں نے ارادہ کیا کہ موسم گرما کی تعطیل کا تمام زمانہ اُن پہاڑوں میں گزاروں گا اور یوہارا کے گھر سے دُور دُور کے علاقے میں جستجو جاری رکھوں گا۔
مَیں نے اپنے شاگردوں میں سے دو کو اپنا ہمراہی منتخب کیا۔ ایک کا نام کاموری تھا۔ جو نباتیات سے گہرا شغف رکھنے کے باعث جاپان کے اُن عظیم الشان پہاڑوں کے چپّے چپّے پر پھر چکا تھا اور دوسرے شاگرد کا نام ردکومتسو تھا۔ وہ ایک پہاڑی گاؤں کا رہنے والا تھا اور اُس کا شمار اس سلسلۂ کوہستان کے بہترین واقفوں میں کیا جا سکتا تھا۔
ہم نے اپنے ساتھ ایک خیمہ بستر اور چند ضروری اشیا رکھ لیں۔ اس کے علاوہ ہم نے تقریباً ایک درجن اشخاص کی خدمات حاصل کیں جو ہمیں آس پاس کی خبریں اور کھانے پینے کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ پہاڑ پر ہمیں آئے

دن جو عجیب و غریب اور دلچسپ تجربے حاصل ہوتے رہے اُن کے بیان کے لئے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔ کاموری پہاڑی جڑی بوٹیوں سے بے انتہا دلچسپی لیتا رہا اور روکومٹسو نے اپنے شوق کے مطابق پہاڑوں کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ جب کبھی وہ پہاڑوں میں غائب ہو جاتا اور ہم اس کو ڈھونڈ نہ سکتے تھے تو وہ اپنی بندوق کی آواز سے ہمیں اپنے متعلق اطلاع دیا کرتا تھا۔ ادھر سے میں اپنی بندوق کے ساتھ جو ہمیں تازہ شکار بھی بہم پہنچایا کرتی تھی اُس کے اشارے کا جواب دیا کرتا تھا۔

ایک دن سہ پہر کے وقت کاموری پیچھے خیمے میں رہا اور روکومٹسو اور میں دونوں ایک طرف دُور نکل گئے۔ دو میل کے فاصلہ پر جاپان کا سب سے بڑا آبشار تھا جو دو ہزار فٹ بلند ہے۔ ہم اس کو دیکھنے کے لئے آگے جا رہے تھے کہ راستہ میں ہم ایک نہایت خوبصورت مقام پر پہنچے، جہاں مصفّا پانی کے ایک چشمے کے کنارے ہم اپنا کھانا، جس میں چاول، بھنے ہوئے تیتر اور کچھ آلوچے شامل تھے کھانے کے لئے بیٹھے۔ جس وقت میں توشہ دان کھول رہا تھا روکومٹسو کچھ فاصلہ پر زمین کو کھودنے لگا۔ دفعتہً اُس نے میری طرف متوجہ ہو کر دھیمی لیکن مضطرب آواز سے کہا "جناب ذرا یہ دیکھئے"۔ اس کے بعد اُس نے معمولی سرخ فلالین کا ایک ٹکڑا میرے ہاتھ میں دے کر کہا "یہ کسی عورت کے لہنگے کا حصّہ ہے"۔

میں نے حیرت سے اس ٹکڑے کو دیکھا اور پھر اُس سے پوچھا "کیا تمہیں پورا یقین ہے؟"

اُس نے اثبات میں جواب دیا اور پھر چشمے کے کنارے انسانی پاؤں کے کچھ نشانات کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اُسی وقت دوبارہ توشہ دان کو بند کر دیا اور پھر ہم دونوں نہایت احتیاط سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ لیکن اَور کہیں نہ تو ہمیں کوئی نقش قدم نظر پڑا اور نہ کہیں کسی قسم کا دھواں وغیرہ دکھائی دیا۔ آخر ہم نے چلنا شروع کیا۔ تا بمقدور ہم چٹانوں کی آڑ میں ہو کر چلتے تھے۔ قدم قدم پر ہمیں خطرے کا احساس تھا لیکن اُس ویرانے میں پہاڑی چنڈولوں کی پھڑپھڑاہٹ کے سوا اور کسی قسم کی آواز یا آہٹ سنائی نہ دیتی تھی۔ آخر جب ہم ایک ذرا کھلے مقام پر پہنچے جس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی چٹانیں کھڑی تھیں اور جو بلندی میں قدِ آدم سے بھی کم ہونگی تو یکایک ہوا میں ایک سیٹی کی آواز گونجی اور اس کے بعد ایک گرانڈیل پتھر ایک سخت چٹان پر اس زور سے آ کر گرا کہ اس میں سے آگ کے شرارے پیدا ہو گئے۔ میں اس قدر نزدیک تھا کہ اس طرح جس گیس کا اخراج ہوا اُس کی بُو مجھے محسوس ہوئی۔ میں نے فوراً اوپر نظر اُٹھائی۔ ہم سے پچاس فٹ کی بلندی پر ایک جھکی ہوئی چٹان کے سائے میں ہمیں ایک جھونپڑا سا دکھائی دیا جو کسی جنگلی جانور کے بھٹ سے مشابہ تھا اور جس پر درختوں کی سوکھی ٹہنیاں پڑی ہوئی تھیں۔

اس کے سامنے ہمیں انسانی صورت میں ایک ہولناک اور عظیم الجثہ پیکر استادہ نظر آیا۔ وہ عام انسانوں سے کہیں زیادہ بلند قامت تھا اور اُس کے بڑے بڑے اور گندے گندے گندمی اعضا بغایت مکروہ اور بغایت گھناؤنے تھے۔ اُس کے ڈراؤنے چہرہ کے گرد جو دیوانگی اور غضبناکی کا مجسمہ تھا اُس کے لمبے لمبے مٹیالے بال لٹک رہے تھے۔ اُس کی کمر کے گرد ریچھ کی ایک کھال لپٹی ہوئی تھی اور اُس کی بن مانس کی سی برہنہ چھاتی کے گھنے گھنے بال اُس کی اِس پوشش سے بالکل ملے جلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

وہ دانت پیس رہا تھا اور بھیڑیوں کی طرح غرّا رہا تھا۔ یکایک مجھے یاد آیا کہ یہی وہ آواز ہے جس نے مجھے جنگل کی اُس خوفناک رات میں اُس مندر کے اندر نیند سے چونکا دیا تھا اور وہاں بھی اُس وقت کھلی ہوا اور سورج کی روشنی میں میرا جسم کانپ اُٹھا۔

اُسی وقت جھونپڑے کے پست اور تاریک سے دروازے میں جو محض ایک موکھا سا تھا ہمیں ایک اَور چہرہ دکھائی دیا۔ چہرے پر سورج کی روشنی پڑ رہی تھی اور ایک زرد رُو اور مصیبت زدہ لڑکی صاف نظر آ رہی تھی۔ اُس کی نظر پہاڑوں پر اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھی۔ پھر دفعتہً اُس کی متحیر نگاہ ہم پر جم گئی۔ اس وقت اُس کے منہ سے ایک چیخ نکلی لیکن وہ وحشی درندہ اُس کی طرف مڑ کر فرطِ غضب سے غرّایا اور وہ ڈر کر اندر چلی گئی۔ اِس کے بعد وہ ایک لگڑ بگڑ کی طرح چیختا، چلّاتا اور شور مچاتا، سیدھا ہماری طرف نیچے کو اترنے لگا۔ وہ اپنی انسانی ہیئت کے باعث اَور بھی زیادہ خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ اب ہمارے لئے بجز فائر کرنے کے اَور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ چنانچہ میں نے گولی مار کر دائیں کندھے میں اُسے زخمی کیا۔

وہ چند قدم آگے بڑھا اور اس کے بعد پیچ و تاب کھاتا ہوا اور زہریلے ناگ کی طرح پھنکارتا ہوا لڑھک کر نیچے پتھروں پر آ پڑا۔ میں نے روکو مٹسو سے چلّا کر کہا کہ اگر وہ ذرا بھی جنبش کرے تو وہ بڑا پتھر گرا کر اُسے کچل دو! اِس کے بعد خود میں نے جھونپڑے کا رخ کیا۔ اوپر نظر اٹھانے پر مجھے وہ خوفزدہ چہرہ بھٹ سے نکلتا ہوا دکھائی دیا۔

"میں نے پکار کر کہا" میری آؤ اب تم بالکل محفوظ ہو" لیکن اُس نے دیوانوں کی طرح مجھ پر ایک ہراساں نگاہ ڈالی اور بھاگ کر چٹانوں میں چھپ گئی۔ اُس کے نحیف اور حسرت زدہ جسم پر چیتھڑے لٹک رہے تھے۔

میں نے روکو مٹسو سے چلّا کر کہا اُس کے پیچھے بھاگو وہ مجھ سے ڈر رہی ہے۔

روکو مٹسو چند جستوں میں اس ڈھلوان پہاڑی کو طے کر گیا اور میں واپس وہاں پہنچا جہاں وہ دیو قامت عفریت گرا ہوا تھا۔ وہ اب بھی غرّا رہا تھا اور دانت پیستا تھا۔ تناسبِ اعضا کے لحاظ سے بلاشبہ

وہ انسان تھا لیکن اعضا کے فوق الانسانی نشو و نما اور اُس کی سانڈ جیسی گردن کو دیکھ کر بے اختیار اتنی گھن آتی تھی کہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ کچھ دیر کے بعد لیٹے لیٹے اُس کا چہرہ اوپر کی طرف اٹھا تو اُس کی خوفناک آنکھوں، مہیب دانتوں اور اُس نفرت انگیز گڑھے کو دیکھ کر جہاں ناک ہونی چاہئے تھی میں اپنے تحفظ کے لئے بالکل چوکس ہو کر کھڑا ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے ہوشی کی حالت سے بیدار ہو رہا ہے اور اب مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ گولی نے اُسے کچھ اتنا زیادہ نقصان نہیں پہنچایا بلکہ گرنے کے صدمے سے اُس کے حواس معطّل ہو گئے ہیں۔ اُس نے ہاتھوں کے بل اٹھنا چاہا لیکن پھر درد سے کراہنے لگا۔ اس پر میں نے اپنی بندوق اٹھائی جس کو دیکھ کر وہ خاموشی سے پھر زمین پر لیٹ گیا۔ لیکن چند ہی لمحوں کے بعد وہ دفعتہً کنگرو کی طرح اچھل کر اٹھا اور زقندیں لگاتا اور چٹانوں کے بیابان کو پھاندتا ہوا نکل گیا اور پھر دو چار وحشیانہ جستوں میں کوہستان کی دشوار گزار چوٹیوں پر پہنچ کر کہیں غائب ہو گیا۔ اب کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہا تھا۔

اِدھر وہ بلائے مہیب نظروں سے غائب ہوئی اور اُدھر مجھے روکومٹسو ایک مشتِ استخوان کو ہاتھوں میں لئے آتا دکھائی دیا۔ میں بھاگ کر اُس کی طرف گیا۔ وہ بیہوش تھی اور اُس کا سر پیچھے کو لٹک گیا تھا۔ پھٹے ہوئے کپڑوں میں سے اُس کے منحنی جسم پر جا بجا زخموں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ اُس کی حالت اس قدر زار تھی کہ روکومٹسو جیسا سنگین دل پہاڑی لڑکا بھی اُس کو دیکھ کر آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اُس بھٹ میں نظر ڈالی لیکن وہاں جانوروں کے پروں اور ہڈیوں کے انباروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ انسانی ضروریات کی کوئی چیز مجھے وہاں نظر نہ آئی۔

میں نے میری کو روکومٹسو کی پیٹھ پر باندھ دیا اور چشمے پر پہنچ کر ہم نے اُس کے چہرے پر سرد پانی کے چھینٹے دیئے جس کے بعد اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اب ہمیں اس کے متعلق کوئی شبہ نہ رہا کیونکہ اُس نے دوبارہ اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے دھیمی آواز میں یہ الفاظ گنگنائے "آ! کروشی! آ! میں یہ برداشت نہیں کر سکتی!"

وہاں سے روانہ ہو کر ہم سہ پہر کے تین بجے واپس اپنے خیمے میں پہنچے۔ کاموری کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ کئی لمحوں تک اسے اپنی نگاہ کا فریب سمجھتا رہا۔ اس کے بعد وہ بھاگا ہوا گیا اور دُور پہنچ کر بندوق کے متواتر فائروں کے مقررشدہ اشارے سے اپنے اُن بارہ مددگاروں کو کامیابی کی اطلاع دی۔ چنانچہ اُن بارہ میں سے چار غروبِ آفتاب کے قریب ہم سے آ ملے۔ اس اثنا میں ہم نے میری کو گرم شوربے اور بعض

محرکات کا استعمال کرایا، اور وہ گہری نیند سو گئی۔ رات بھر کاموری اور مَیں اُس کی خبرگیری کرتے رہے۔
خیمہ سے باہر ہمارے آدمی آگ کے الاؤ کے پاس بیٹھے اُس دیو قامت حیوان کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ آخر
روکومنٹو کے اِس بیان پر سب نے اتفاق کیا کہ اُس کا تعلق کُشتی گروں کی اُس عجیب و غریب قدیم نسل سے
ہے جو پہاڑوں کے اُس پار بعض جنگلی علاقوں میں آباد ہے۔ وہاں کے باشندے بالعموم عظیم الجسامت
اور عادات و اطوار میں بالکل وحشی ہوتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ان میں سے بھی کوئی فرد اپنی فوق العادت
وحشیانہ درندگی میں اتنی سبقت لے جاتا ہے کہ دوسرے لوگ اُس کی تندخوئی کے باعث اُسے آبادی میں
رہنے کے قابل نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگ جب قید یا موت سے بچنا چاہیں تو تنہا بھاگ کر پہاڑوں کی طرف
نکل آتے ہیں۔ اُن کی خونخواری کے خوف سے کوئی شخص اُن کا ساتھ دینے کی جرات نہیں کرسکتا۔

پو پھٹ رہی تھی، جب مجھ پر کچھ غنودگی طاری تھی اور باقی سب لوگ سو رہے تھے۔ اُس وقت میری
دفعتہً اُٹھ بیٹھی اور میری طرف درد انگیز نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اُس کی نظروں میں وحشت اور اُس کی آنکھوں
میں دیوانوں کی سی چمک نظر آتی تھی۔ پھر کچھ دیر تک وہ کھانستی رہی۔ اِس کے بعد اُس کے منہ سے ذرا سا خون نکلا
اور دوبارہ بستر پر گر کر وہ ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

گجر دم ہم نے اُس کی ارتھی بنائی اور اُسے اٹھا کر دو دن تک پتھریلے پہاڑی راستوں پر چلتے رہے
آخر یوموٹو کے گرم چشموں کے پاس ٹھہر کر ہم نے ایک دن آرام کیا اور پھر دوبارہ اُس کو اٹھا کر جنگل میں
اُسی مندر کی طرف اُس کے آخری مسکن کو روانہ ہوئے جہاں میں نے پہلے پہل اُس کی وہ یاس انگیز
پکار سُنی تھی جس کی طرف کوئی ملتفت نہ ہُوا تھا۔ اب وہیں مندر کے قریب ایک بڑے درخت کے نیچے
اُس کی قبر نظر آتی ہے جس کی لوح پر میری کا لفظ کندہ ہے۔

رقم زدہ پروفیسر ای۔ ای سپیٹ

تلخیص و ترجمہ

از

حامد علی خاں

اِن کاوشوں کا ماحصل؟

ہر گل میں ہر شجر میں ترا رنگ و بُو سہی
ہر لعل ہر گہر میں تری آبرو سہی

سب مہر و ماہ تیرے ہی آئینہ دار ہیں
تیری ضیا فروغِ نظر سُو بسُو سہی

ہر مہروش نے حسن سی تیرے ہی لی زکوٰۃ
محتاج تیرے نور کا ہر ماہرُو سہی

معصومیوں میں تیری ہی عصمت ہے جلوہ گر
روئے ہلال و چشمِ ستارہ میں تُو سہی

مانا کہ تُو ہے اول و آخر کا مبتدیٰ
اور منتہیٰ بھی اول و آخر کا تُو سہی

مانا اجارہ دارِ بقا ایک تُو ہی ہے
اور نفیِ ماسوا کی تجھے آرزو سہی

اپنے سوا ہر اِک کو گھٹانے کی آرزو
اپنے سوا ہر اک کو مٹانے کی خُو سہی

محتاج بھی غلام بھی قیدی بھی ہوں ترا
میں بستہ رسن بھی ترا مُو بمُو سہی

کچھ تیرے سامنے نہیں یارائے دم زدن
میں خود نہیں ہوں کچھ بھی جو کچھ ہے سو تُو سہی

لیکن یہ بے نتیجہ تڑپ کیوں ملی مجھے
وجہِ سکونِ رُوح مری ہائے و ہُو سہی

میں صبحِ کن فکاں سے ہوں ناکامِ جستجو
عالم کے ذرے ذرے میں تیری نمُو سہی

میرے نصیب کیوں تری تمثال ہی فقط
ہر بزم کا فروغ ترا عکسِ رُو سہی

وہ جلوہ کیوں نہیں ہے کہ "تیرا" کہوں جسے
ہر آئنہ میں عکس ترا ہُو بہُو سہی

ہر شے ترے بغیر ہے کھوئے ہوئے قرار
چرچا ترا تلاش تری کو بکُو سہی

ہر قطرہ موجِ بحر کا تجھ بن ہے مضطرب
ہر ذرۂ زمین کو تری جستجو سہی

ہر آبشار تیری ہی جانب روانہ ہے
تیری تلاش ہی میں ہر اِک آبجُو سہی

تُو پردۂ خفا میں ہو ہرچند گوشہ گیر
سب تجھ پہ مر مٹیں یہ تجھے آرزو سہی

اِن کاوشوں کا ماحصل اے رازداں بتا
وجہِ حجاب کیا ہے؟ یہ سرِّ نہاں بتا

ج

غزل

وہ دل نہیں، کس دل سے جفا کیجئے اُس سے
جو اُس نے کیا ورنہ سوا کیجئے اُس سے

پھرتے ہو اب آوارہ و افسردہ و تنہا
کہتے نہ تھے سب کم ہی ملا کیجئے اُس سے

اِس روح کو اِس تن سے جُدا کیجئے اوّل
گر چاہئے، پھر مجھ کو جُدا کیجئے اُس سے

کیوں حضرتِ دل ہمّتِ پروانہ بھی دیکھی؟
وہ جل گیا اب آپ جلا کیجئے اُس سے

ہوگا نہ وہ مائل بہ وفا ذکرِ وفا سے
اپنی سی نہ بے سُود کہا کیجئے اُس سے

دشمن ہی سہی دشمن ہی، جو ہے دوست سو دشمن
اب اِس سے گلہ کیجئے یا کیجئے اُس سے؟

جس بے سر و ساماں سے کسی نے نہ وفا کی
لازم نہیں اب آپ دُعا کیجئے اُس سے

بُت خانے میں دل ہار گئے حضرتِ واعظ
وہ آپ کا اللہ ہے؟ دُعا کیجئے اُس سے

حامد علی خاں

پھول پتیاں

زندگی کے دن جوں جوں گزرتے جاتے ہیں جو شے مجھے روز بروز زیادہ عزیز ہوتی جاتی ہے وہ دنیا کی الفت وملاحت اور نزاکت ہی ہے، نہ کہ اُس کا عقل و ہنر اور اُس کے علم کی عظمت۔ نہیں بلکہ ننھے ننھے بچوں کے قہقہے اور دوستوں کی دوستی اور باہمی گفت و شنید ایک گھر کے آرام دہ کمرے میں اور حسین پھولوں کے منظر اور موسیقی کے نغمے!

کیا حاصل ہے اِس تاروں بھرے آسمان اور گردش کرتے ہوئے سیاروں کا اور آفرینش کی اِس تمام محنت و مشقت کا جو ازل سے آج تک ہوتی رہی ہے اگر وہ انسان کو اس قابل نہ بنا سکے کہ وہ آزادی اور خوشی سے اپنے دائرۂ زندگی میں چست بن کر عمر بسر کرے!

انسان کی زندگی! انسان ایک شیشۂ بلوریں ہے۔ زندگی پانی ہے اس کمزور برتن کے اندر پڑا ہوا۔ گناہ موت لاتا ہے۔ موت اس شیشے کو توڑ دیتی ہے پھر پانی بہ جاتا ہے۔ بس یہ ہے خاتمہ!

میں خوشی کے ساتھ میل بھر چلا۔ وہ سارا رستہ بولتی رہی لیکن اُس کی گفتگو سے میری قابلیت میں کچھ اضافہ نہ ہوا۔
میں غم کے ساتھ میل بھر چلا اور اُس نے ایک لفظ منہ سے نہ نکالا لیکن کیا کہوں کہ میں نے کیا کچھ نہ سیکھا جب غم یوں میرے ہمراہ تھا۔

محبت اُسے ملی تھی اُن جھونپڑیوں میں جہاں مفلس رہتے ہیں اُس کے روزمرہ کے سبق دینے والے جنگل اور ندی نالے تھے اور وہ خاموشی جو تاروں بھرے آسمان میں ہو اور وہ نیند جو دُور تنہا کوہساروں میں میسر آتے۔

کیسے شیریں ہیں وہ خیال جو قناعت کی رنگ و بو میں بسے ہوئے ہوں ایک مطمئن دل شاہی تاج سے زیادہ بیش بہا ہے کیسی سہانی ہیں وہ راتیں جو بے فکری کے خواب میں بسر ہوں۔ ایک مفلس کا گھر زر و حشمت کے غصے سے بھری نگاہوں کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ ایسی شیریں قناعت کی فضا لیے دل و دماغ ایسی نیند اور ایسی برکت!

عقل اکثر اُس وقت ہمارے قریب ہوتی ہے جب ہم جھکیں نہ کہ جب ہم اُڑیں۔

اپنے خیالوں کا نگہبان بن کیونکہ خیال آسمانوں میں سنائی دیتے ہیں۔

(ترجمہ)

بشیر احمد بیگم

قبر کا بھید

یہ ہے عفریت قبر کا بھید چھپائے ہوئے"!

کوئی بھید نہ تھا جسے انسان نے کھول کے رکھ نہ دینا چاہا۔ کوئی بات نہ تھی جس کی کنہ اُس نے دریافت نہ کی۔ کوئی خیال نہ تھا جو اُس کے وہم میں نہ آیا۔ کوئی ذرّہ تک نہیں جس کو اُس نے ہزار ٹکڑے کرکے اُسکے اندر کی دنیا باہر نہ کردی! یوں تو اُس نے لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا سُن کر بظاہر سرِ نیاز جھکا دیا لیکن لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کے ارشاد پر اُس نے سرِطغیان وجوش کو پھر اُٹھایا اور کرنی نہ کرنی سب کرنی چاہی! پہاڑ اکھاڑ کر رکھ دیئے زمین کے پیٹ میں سلاخیں گاڑ دیں آسمان کی فضا میں ہوائی بھوت اڑا دیئے، اونچے سے اونچے پہاڑ کی چوٹی پر جا دھمکا، گہرے سے گہرے سمندر کی تہ تک جا پہنچا، بڑے سے بڑے لق ودق صحرا کی تنہائیوں میں خلل انداز ہوگیا ـــــ یہ انسانِ ضعیف البنیان!

یہ تو خیر درست تھا مناسب تھا روا تھا شاید مقرر تھا لیکن اُس نے نادرست کو درست نامناسب کو مناسب اور ناروا کو روا کر دینا چاہا اور غیر مقررہ کو مقرر بلکہ مستور کو منظور کر دینے کی ٹھان لی ـــــ دنیا ڈر گئی سہم گئی دبک کے بیٹھ رہی تارے تارے میں سرگوشیاں ہونے لگیں، کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک کھلبلی پڑگئی کہ خدا کی خدائی آشکار ہو چلی، لپٹی ہوئی کھولی گئی چھپی ہوئی پائی گئی جانی گئی پہچانی گئی!

دفتر دفتر کے محافظ بڑھے لپکے دوڑے کہ اس ڈاکو کو روکیں پکڑیں باندھ لیں لیکن یہ بادی جو یہ زمین و آسمان کا تانتا بھیل روکے کب رُکتا تھا باندھے کب بندھتا تھا اُچھلا پھاندا کودا دوڑا اور کہیں کا کہیں نکل گیا!

خدا جو ہمہ تن نیکی ہے جسے دنیا جہان کی بہبود مدِّ نظر ہے اُس نے اِس سرفراز و سرکش کو سرزنش اور عقوبت کا چابک لگایا اور محض دوڑانے کی خاطر خوب دوڑایا بھگایا کہ اُس کے حواس ٹھکانے نہ رہیں اور یہ وقت سے پہلے اَن دیکھی چیزیں دیکھنے اَن کرنے کام کرنے کے پیچھے نہ پڑا رہے ـــــ لیکن اس وعدہ ناوفا پر اب اعتبار کیا ہوتا نیکی کے سردار نے بُری بھدّی بھیانک سی ہستیوں کو اُبھارا کہ وہ اُس بھید کو جس کا ابھی بھید بنے رہنا ہی سب کے لئے مفید و مناسب ہے، اپنے سربمہر ظرف میں چھپائے رکھیں!

اے انسان! تو بھی ابھی موت کا راز چھپا ہی رہنے دے تاکہ تجھ پر زندگی کے صحیح معنی آشکار ہوں!

ل

مقبرۂ زُبیدہ

خلیفہ جعفر بن منصور کی بیٹی اور خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ کا مقبرہ مدینۂ بغداد کے اُس مشہور حصّے میں واقع ہے جو دجلہ کے دائیں کنارے پر آباد ہے اور "الکرخ" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس حصّے کو مدینۃ المنصور بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ خلیفہ منصور کے عہد میں دارالعاصمہ رہ چکا ہے۔ مقبرہ بغداد ریلوے کے اسٹیشن سے تقریباً دو سو قدم کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کے قرب و جوار میں بہت سے اولیا و علما کے مزار بھی ہیں، جن میں سے چند قابلِ ذکر یہ ہیں:۔

حضرت الشیخ الکرخی۔ حضرتِ منصور ابن حلّاج۔ حضرت عون و حضرتِ بہلول۔

مزار وزارۃ الاوقاف کی حفاظت میں ہے اور اُس کی موجودہ حالت اچھّی ہے۔

ہارون کی عمر اُس وقت انیس برس کی تھی جب اُس نے شہزادی زبیدہ سے شادی کی جو ایک نہایت دانشمند اور فیاض خاتون تھی، اور جو ہارون کی وفات کے بعد تیس سال تک زندہ رہی۔ اُس کی فیاضی کی زندہ شہادت وہ نہریں، تالاب، پُل اور مہماں سرائیں ہیں جن کو اُس نے اپنی جیبِ خاص سے لاکھوں روپے خرچ کر کے تعمیر کرایا۔ حجاز میں ملکہ زبیدہ کے قابلِ ذکر و رود کی یادگاریں اب تک باقی ہیں (سنہ ۸۰۲ء)۔ یہ دیکھ کر کہ پانی کی قلّت کی وجہ سے اہلِ مکّہ کو بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُس نے وہ مشہور نہر تعمیر کرائی جو آج تک اس شہر کے رہنے والوں کے لئے بے اندازہ رحمت و برکت کا موجب ہو رہی ہے۔

زبیدہ کی طبیعت میں فطرت نے ایجاد و اختراع کا مادہ بھی ودیعت کر رکھا تھا چنانچہ معاشرت اور آرائش میں اُس نے کئی نئی باتیں رائج کیں۔ آرام کرسی، طلائی جھومر، مرصّع جُوتے اور زرنگار کمربند اُسی کے ایجاد ہیں۔

منصور احمد

پریم ناچ

جھن من جھن من جھن جھنکار

ناچیں کودیں گانے گائیں اپنے اپنے من کی سنائیں
پیار کریں آ باہم پیار
جھن من جھن من جھن جھنکار
جھن من جھن من جھن جھنکار

گانے گانا یہ کب تک ؟ ہنسنا ہنسانا یہ کب تک ؟
کب تک الفت کب تک پیار؟
جھن من جھن من جھن جھنکار
جھن من جھن من جھن جھنکار!

بستی دنیا کی دو دن   مستی دنیا کی دو دن

اِس مستی سے ہوں بیدار

جھن من جھن من جھن جھنکار

جھن من جھن من جھن جھنکار!

رنگیں پھُولوں سے کھیلیں   سیمیں جھُولوں سے کھیلیں

دل ہو اُلفت کی چہکار

جھن من جھن من جھن جھنکار

جھن من جھن من جھن جھنکار!

تن من دھن سے منہ موڑیں   رشتہ دُنیا سے توڑیں

ہو کر عشرت سے بیزار

پیار کریں آ باہم پیار

جھن من جھن من جھن جھنکار

جھن من جھن من جھن جھنکار

پریمی

ناکام فاتح

شام کی خاموشی میں جب رات کے دھندلے دھندلے سائے گہرے ہو چلے تھے محنت کش سپاہی چند ساعتوں کے لئے اپنے درشت کام کی کوفت سے آزاد ہو کر گھر میں داخل ہوا۔

اُس کی بیوی اپنا شام کا کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ رسیلی لکڑیوں کے دھوئیں سے اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور اُس کا اترا ہوا زرد چہرہ جس پر گہری سوچ بچار اور آئے دن کی ناکامیوں نے کئی خط کھینچ دیئے تھے دھوئیں کی کثیف تاریکی میں دھندلا سا نظر آتا تھا۔

سپاہی نے اپنی وردی اتار دی اور چراغ روشن کرنے کے بعد ایک لکڑی کی چوکی چولہے کے نزدیک سرکا کر آگ تاپنے کے لئے بیٹھ گیا۔

اُس کے بیٹے کا زخمی پاؤں ابھی تک اچھا نہیں ہوا تھا۔ غریب لڑکے کی جوتیاں پھٹ گئی تھیں اور ٹھوکریں کھا کھا کر یہ زخم پیدا ہو گیا تھا۔ اُس کا دوسرا لڑکا مہینوں کی بیماری کے بعد اچھا ہوا تھا۔ لیکن سردی آگئی اور اُسے گرم کپڑا تک میسر نہ ہوا اور اب اُسے کھانسی ہو رہی تھی۔ اُس کی ننھی بچی اپنی تمام جسمانی تکلیفوں کو بھول کر صرف ایک لکڑی کی گڑیا کے لئے کس قدر آرزومند تھی۔ لیکن ہفتے گزر گئے اور ابھی تک وہ لکڑی کا بے حقیقت سا کھلونا بھی گھر میں نہ آسکا تھا۔

اُس سے کم رتبہ سپاہی، سست اور نااہل، اُس کے مقابلے میں کتنی ترقی حاصل کر چکے تھے۔ لیکن وہ اپنے افسر کے سنگدلانہ مشاغل کی دلچسپیوں میں کوئی حصہ نہ لینے کا مجرم تھا اور ابھی تک وہیں اُس کے بے جا عتاب کی سختیاں جھیل رہا تھا۔ اُس کے افسر کی رائے اُس کی نسبت ہمیشہ سے یہی تھی کہ یہ بودے جذبات کا رقیق القلب غلام سپاہی بننے کے بجائے کسی گوشہ عزلت میں پڑے پڑے سسکیاں بھرتا ہوا زیادہ موزوں معلوم ہوتا۔

مگر آج ان سب باتوں کا خیال ہمیشہ کی طرح اُس کی روح کا سوہان نہیں بن رہا تھا۔ جب درد کا درماں ہاتھ لگ جائے تو اذیت آدھی بھی نہیں رہتی۔ اسی طرح اُس کے خوشگوار مستقبل نے آج ماضی کی تلخیوں کے نقوش اُس کے دل پر دھندلے کر دیئے تھے۔

اپنی بیوی کے افسردہ انداز سے اُس کی تمام رکی ہوئی احتیاجوں کا اندازہ لگاتے ہوئے اُس نے کہا

"میرے دل میں بھی کئی آرزوئیں ہیں"۔ اور پھر اپنی جیب کو ٹٹول کر اُس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ آخر اُس نے قاتل کا سراغ پالیا تھا اور سرکار سے دس ہزار کا مقررشدہ انعام حاصل کرلینے میں چند گھنٹے ہی تو باقی رہ گئے تھے۔ اور اب اُسے اپنے عہدے کی ترقی یقینی تو نہیں لیکن ایک حد تک لازمی امر ضرور معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے خیال کیا "کیا تقدیر کی رسائی اسی کو نہیں کہتے؟ بڑے بڑے سراغ رساں جس راز کا پتہ نہ چلا سکے، اس وقت وہ میری جیب کے اندر محفوظ پڑا ہے۔ سفاک قاتل جس نے سرکار کو بھی پریشان کردیا تھا کس صفائی سے اب تک لوگوں کو اپنے فریب میں مبتلا کئے رہا بلکہ الٹا اس واقعہ کے بعد اُس نے بعض حلقوں میں ایک خاص وقعت حاصل کرلی۔ وہ مہینے بھر سے اِسی شہر میں فروکش ہے اور آج کے بعد سب سے پہلا جہاز جو یہاں سے روانہ ہوگا اُس میں سیر وسیاحت کے بہانے کسی غیر ملک کو نکل جانے والا ہے جہاں وہ قانون کی زد سے باہر ہوگا۔ آزاد، اور اپنے سفاکانہ جرم کے باوجود مدتوں پھر اُسی دنیا کی فضا میں سانس لیتا رہے گا جسے ایک بار اُس کا گناہ اُس کے لئے حرام کرچکا ہے۔

لیکن کل جب اُس کا سفر سفرِ آخرت میں تبدیل ہوچکا ہوگا اُس وقت کون ہے جو میری عقل و دانش کی داد دیئے بغیر رہ سکے گا۔ پُراسرار راز جس قدر آسانی سے مجھے حاصل ہوگیا اتنا ہی حقیقت میں اُس کا حصول دشوار تھا۔ اور یہ سب قدرت کا کوئی کرشمہ ہے ورنہ میں کون ہوں؟ ایک غریب اور بے وسیلہ سپاہی!" اُس کی نظر بار بار اپنی جیب کی طرف اٹھتی تھی اور وہ خیال کرتا "اس کاغذ کے پرچے کو دیکھ لینے کے بعد بھی قاتل کے جرم میں کسی شبہ کی گنجائش باقی رہ سکتی ہے؟"

اُس نے جلد جلد اپنا سادہ سا کھانا ختم کرلیا۔ گزشتہ رات جو کہانی وہ بچوں کو سنا رہا تھا ابھی وہ انجام کو نہیں پہنچی تھی اور اب بچے باقی ماندہ کہانی سننے کے لئے ضد کر رہے تھے۔ لیکن وہ اُن سے چھپ کر گھر سے نکل گیا۔ بیوی کے استفسار پر کئی بار اصل بات اُس کے ہونٹوں تک آتے آتے رک گئی تھی ـــــ قاتل کا سراغ ـــــ دس ہزار ـــــ شہرت ـــــ اور ترقی ـــــ کئی الفاظ اُس کی زبان تک آئے اور وہیں رک گئے۔ خدانخواستہ اگر وہ ناکام رہا تو اس امید کے منقطع ہونے کے بعد اُس کی بیوی جیتے جی مرجائے گی۔ اگرچہ ناکامی کا اِس معاملے میں بالکل ہی احتمال نہ تھا لیکن پھر بھی وہ ابھی اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

قصر نما عمارتوں کے سایوں میں سے گزرتا ہوا اب وہ جلد جلد کوتوالِ شہر کے مکان کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ لیکن یکفتہً وہ رکا اور سڑک سے دائیں ہاتھ مڑکر اُس نے بےتابی سے ایک وسیع بنگلے کے بورڈ کو پڑھا۔ مکان کے

بیرونی حصہ میں کوئی دھیمی سی سرخ روشنی جل رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لئے اُس پر ایک عجیب ہیبت سی طاری ہو گئی۔ یہی قاتل کی قیام گاہ تھی۔ اور یہی مکان گزشتہ چند ساعتوں سے ایک غریب سپاہی کی امید کا مرکز بنا ہوا تھا۔

پھر اُس نے آہستہ سے اپنی جیب کو ٹٹولا ——— دس ہزار ——— اور اُس نے اپنی مسکراہٹ کو زیر لب چھپاتے ہوئے کہا "اب مجھے زیادہ دیر نہ کرنی چاہئے۔ وقت تیزی سے گزرا جا رہا ہے" پھر وہ شاہراہ کی طرف مڑنے لگا لیکن کسی نے آہستہ سے اُس کے کان میں کہہ دیا "پہلے ایک نظر اپنے شکار کو دیکھ تو لو" اُس نے کہا "میں اپنی زندگی کے کئی قیمتی لمحے انہیں بے حاصل باتوں میں کھو چکا ہوں اور آج مجھے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہئے"۔ لیکن کسی کمرے سے کلاک نے گھنٹہ بجا کر کہہ دیا ——— "وقت ابھی کافی پڑا ہے"۔ مکان کی کھڑکیوں میں سے روشنی باہر جھانک جھانک کر اُسے دعوت دینے لگی "آؤ آخر ایک نظر دیکھ لینے میں کون سی دیر ہو جائے گی"۔ ایک زبردست خواہش جو بیتابی سے کچھ ہی کم تھی اُس کی روح پر غالب آ گئی۔

پھاٹک کھلا ہوا تھا اور اب روشنی کو چھوڑ کر وہ تاریکی کی طرف بڑھا۔ مکان کے عقب میں تاریکی تھی اور وہاں صحن کے ایک تنگ سے گلی جیسے حصہ میں نیم کے بڑے بڑے درختوں نے سیاہی کو اور بھی گہرا کر دیا تھا لیکن کمروں کی کئی کھڑکیاں ادھر کو کھلتی تھیں۔ اُس نے کان لگا کر کچھ سنا اور لپک کر اُس طرف کو بڑھا جدھر سے دھیمی دھیمی آوازیں اور کسی بچے کی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ کھڑکی میں ایک چھوٹا سا شگاف تھا جس سے کمرے کا اندرونی حصہ بآسانی نظر آ سکتا تھا۔ اُس نے دیوار کے ساتھ لگ کر اندر کی طرف جھانکا۔ بجلی کی جگمگاتی ہوئی روشنی میں کمرے کا بیش قیمت سامان اُس کی نگاہ کے سامنے تھا اور اس کے بعد سب سے پہلے اُسے کمرے کے وسط میں ایک نوعمر [illegible] نظر آئی جس کا چہرہ حزن کی ایک چھپی ہوئی جھلک کے باوجود بھی دمکتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور اُس کے [illegible] فربہ جسم کا ایک دراز قامت شخص بیٹھا تھا۔ اُس کا بشرہ پُر عزم تھا لیکن اُس کے چہرے سے اطمینان [illegible] گہرے آثار کے باوجود سپاہی نے جرم کا پیغام پڑھ لیا۔ یہی قاتل تھا اور وہ اُس کی بیوی تھی۔ ایک [illegible] لی جس کے گھنگھریالے بالوں میں سرخ فیتہ بندھا ہوا تھا فرش پر اپنی چینی کی گڑیا کو تھپکا تھپکا کر سُلا رہی تھی۔ اور [illegible] کا باپ اپنی انگلیوں سے آہستہ آہستہ اُس کے بالوں کو چھیڑ رہا تھا۔ اور ایک لڑکا جس کا چہرہ معصوم تھا اپنے زعم میں اپنی بہن کی گڑیا کو جگا دینے کے لئے تالیاں بجا بجا کر شرارت سے ہنس رہا تھا۔

کسی ناگہانی جذبے سے مغلوب ہو کر سپاہی نے اپنی آنکھیں اُدھر سے پھیر لیں۔ عالم خیال میں اُس نے مسلح سپاہیوں کے ایک دستے کو اس کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ قاتل کو ہتھکڑی پہناتے ہوئے کہہ رہے تھے

"تمہیں ابھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا" ۔۔۔۔۔ اور اُس کی بیوی کا رنگ اب کاغذ کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ خوف کی ایک ہلکی سی چیخ اُس کے منہ سے نکل گئی تھی ۔۔۔۔۔ اور اُس کا بیٹا سہم کر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں اپنے چہرے کو چھپا رہا تھا ۔۔۔۔۔ اُس کی بیٹی کی گڑیا فرش پر اوندھے منہ گری تھی اور وہ روتے ہوئے اُس کے کوٹ کا دامن اپنی طرف کھینچ کر کہہ رہی تھی "ابا میں تم کو نہ جانے دوں گی" ۔۔۔۔۔ یہ تمام واقعہ گزر گیا اور اب وہ خود دس ہزار روپیہ کا چیک لے کر خوشی خوشی اپنے گھر کو جا رہا تھا۔ اُس کے عہدے میں ترقی ہو چکی تھی۔ سرکار میں اُس کی توقیر بڑھ گئی تھی۔ ہر طرف عوام میں اس واقعے کے چرچے تھے اور اب وہ اپنے افسر کے جور و جفا سے آزاد تھا۔ اُس کی بیوی کے دل پر اُس کی اس دانشمندانہ کارروائی کا احترام آمیز اثر تھا اور اُس کے بچے اس واقعہ کو ہمیشہ ناز سے بیان کیا کرتے۔

اُس نے جست بھر کر وہاں سے نکل جانا چاہا۔ کیونکہ اب دیر ہوئی جا رہی تھی اور اُسے بہت جلد کوتوالِ شہر سے ملنا تھا۔ لیکن پھر اُسے اپنے پاؤں تاریکی میں کھڑکی کے نیچے جمے ہوئے محسوس ہوئے اور دفعتہً پھر ایک نظارہ اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ کوئی قاتل پھانسی کے پھندے میں تڑپ تڑپ کر جان دے رہا تھا۔ اور ایک چھوٹی سی لڑکی جس کے گھونگریالے بالوں میں سرخ فیتہ بندھا ہوا تھا عالمِ مایوسی میں اپنی ماں کے بازوؤں میں گری ہوئی سسکیاں لے رہی تھی۔ اور ایک یتیم لڑکا جس کی آنکھیں شدتِ خوف و ہراس سے پتھرائی جا رہی تھیں لوگوں کی قہر آلود نظروں کا شکار ہو رہا تھا وہ اسے جھڑک جھڑک کر کہہ رہے تھے ۔۔۔۔۔ "تیرا باپ قاتل تھا اور تو خدا جانے کیا ہوگا" اور کوئی ناشاد عورت حسرت و حرمان کی تصویر بنی ہوئی اپنے سیاہ خانے میں درد و کرب کی راتیں بسر کر رہی تھی۔

بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک خیال اُسکے دل و دماغ پر محیط ہوتا گیا۔ لیکن پھر اُس کے اپنے ہی دل کی آواز نے للکار کر کہا "بزدل تجھے سپاہی کس نے بنایا تھا وہ قاتل ہے اور اُس کے لئے اپنے جرم کی سزا پانا ضرور ہے"۔

پھر عالمِ تصوّر میں اُسے اپنے بیٹے کا زخمی پاؤں نظر آیا۔ اُس کا پنجہ پھٹے ہوئے جوتے سے باہر نکل کر لہولہان ہو رہا تھا اور درد کی تکلیف سے اُس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ اور اُس کا چھوٹا لڑکا نحیف و ناتوان ۔۔۔۔۔ اُسے کس قدر کھانسی تھی! اپنے بچے کی شدید کھانسی کی آواز پھر اُس کے دل پر ضربیں لگانے لگی ۔۔۔۔۔ اور اُس کی ننھی بچی اپنے برف کے سے سرد ہاتھوں کے ساتھ اُس کے شانوں کو ہلا ہلا کر کہہ رہی تھی "آج بھی تم میری گڑیا نہیں لائے"۔ اور اُس کی زرد رُو بیوی چراغ کی دھیمی روشنی میں جھکی ہوئی اپنے بوسیدہ لباس کو پیوند لگا رہی تھی

سیلی لکڑیوں کے دھوئیں نے ابھی تک اُس کی آنکھوں کو سرخ کر رکھا تھا۔
اُس نے فیصلہ کن لہجے میں اپنے دل سے کہا کچھ بھی ہو اب مجھے فوراً کوتوال سے ملنا چاہئے لیکن ایک بار پھر کسی مقناطیسی طاقت نے اُس کی آنکھوں کو کھڑکی کے شگاف سے لگا دیا۔ چھوٹی بچی اب گڑیا کو چھوڑ کر ننھے ننھے بازو اپنے باپ کی گردن کے گرد حمائل کئے ہوئے تھی اور اُسے چُوم چُوم کر کہہ رہی تھی "ابا میں تمہاری بیٹی ہوں" اور اُس کا بیٹا اُس کے زانو پر سر رکھے اب مسکرا رہا تھا۔ وہ قاتل تھا لیکن جب وہ نظر بھر کر اپنے بچوں کو دیکھتا تو محبت نُور کی شعاعوں کے مانند اُس کی آنکھوں میں جگمگا اٹھتی۔ اور کون تھا جو اس نور کی موجودگی میں اُس کے گناہ کی تاریکی کو ان آنکھوں میں ڈھونڈ لیتا؟

ایک لمحہ کے لئے پھر وہ ساکت و صامت کھڑا رہ گیا۔ پھر اُس کا سر چکرانے لگا اور اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی ہیئت کسی خبیث روح کے پیکر میں تبدیل ہوگئی ہے جو اپنے گھناونے چہرے میں لمبے لمبے تیز دانتوں کو چھپائے ہوئے بچوں کی معصوم مسرتوں کو تہ و بالا کرنے کے لئے کسی کونے میں چھپی کھڑی ہو۔
بچے اُس کے آگے اپنے ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر کہہ رہے تھے "ہماری خوشیاں ہمیں کو دے ڈال۔ کیا تیرے بچوں کے پاس اس شے کی کمی ہے جو تُو ہم سے چھینے لیتا ہے؟"
لیکن وہ اُن کی معصوم تمناؤں کو روندے ڈالتا تھا اور جب وہ ننھے بچوں کے دل توڑ چکنے کے بعد اُن کی تمام خوشیوں کو سمیٹ کر اپنے گھر میں داخل ہوا تو اُس کی بیوی اُسے ملامت آمیز نظروں سے گھور رہی تھی "ہٹو تمہیں کس نے بنایا تھا۔ تمہیں اپنے بچوں کا خیال بھی نہ آیا۔ جاؤ میں یہ ظلم کی کمائی اپنے بچوں پر صرف نہ کروں گی" اور اب اس کا سر شرم سے جھکا ہوا تھا اور اُس کے کانوں میں بچوں کی آہ و زاری اب تک حشر برپا کر رہی تھی۔
پھر وہ اپنے مستقبل کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ بچوں کی خوشیوں کے مقابلے میں ساری دنیا اُسے ہیچ نظر آنے لگی۔ اُس نے کہا وہ قاتل ہے تو ہُوا کرے۔ بچوں کی مسرت اسی کے دم سے وابستہ ہے اور میں کون ہوں جو چاندی کی چند ٹکلیوں کے عوض میں اس بیش بہا شے کو تباہ کرنے پر تُلا کھڑا ہوں" وہ سپاہی تھا لیکن جوشِ جذبات سے اس کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔
دوسرے لمحے میں وہ صحن کی دیوار سے باہر تھا۔ سائے کی اوٹ میں اُس نے بے صبری سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ کاغذ جسے وہ اتنی احتیاط سے کئی تہوں کے اندر چھپا کر لایا تھا، بچوں کی مسرت کے مقابلے میں اُس کی حقیقت ہی کیا تھی! وہ حقارت کے انداز سے مسکرایا۔ اُسے خوف معلوم ہونے لگا کہ تاریکی میں کوتوال کا ہاتھ

بڑھ کر اُس سے یہ کاغذ چھین نہ لے جائے۔ اُس نے جیب سے دیا سلائی نکالی اور آہستہ سے رگڑ کر کاغذ کو آگ دکھادی۔ پھر ایک بار عظیم اُسے اپنے سینے پر سے اترتا ہؤا محسوس ہوا۔ اُس نے کہا "بچوں کی خوشیوں کی حفاظت مجھ پر لازم تھی۔ اور اسی لئے یہ کاغذ خدائے قدیر نے صرف میرے سپرد کیا تھا"

مکان کے اندر سے بچوں کے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ اُس نے کہا "اب وہ مجھ سے خوش ہیں" عالمِ تصور میں پھر اک بار اُسے وہ چھوٹی سی لڑکی نظر آئی جس کے گھونگریالے بالوں میں سرخ فیتہ بندھا ہؤا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور کہہ رہی تھی "میاں سپاہی تم نے بہت اچھا کام کیا"

چاند اب نکل آیا تھا اُس کے پاس روپیہ تھا نہ شہرت اور نہ ترقی لیکن ایک فاتح کے انداز میں بے پایاں مسرت کا ہیجان دل میں لئے ہوئے وہ گھر کی جانب جارہا تھا تاکہ اگر اُس کے بچے ابھی تک جاگ رہے ہوں تو وہ باقی ماندہ کہانی انہیں آج ہی سنادے۔

ز۔ب

خدا کا صرف ایک ہی نام ہے خدا! نیکی کا صرف ایک ہی بدلہ ہے نیکی! کسی کو دوست بنانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے خود دوست بن جانا!

دوستی روح کی بقا کی طرح اتنی اچھی اور پیاری شے ہے کہ اُس کا یقین نہیں آتا!

جو میری سنتا ہے جو میری سمجھ لیتا ہے وہ میرا ہو جاتا ہے میرا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے!

ہم دنیا میں یوں اکیلے گھومتے رہتے ہیں، دوست جیسے کہ ہم چاہتے ہیں محض سُپنے ہیں اور کہانیاں لیکن ایک عظیم الشان امید ہر لحظہ باوفا دل کا جی لگائے رکھتی ہے کہ کہیں اَور عالمگیر طاقت کے دوسرے عالموں میں اب اِس گھڑی ہی ایسی روحیں ہیں کام کرنے دُکھ بھرنے ہمت دکھانے والی جو ہم سے محبت کر سکتی ہیں اور جن سے ہم محبت کر سکتے ہیں۔

گلچیں

نذرانۂ رُوح

عفوِ تقصیر کرانے کے لئے آیا ہے — تیری درگاہ میں اک بے کس و بے بس مجبُور
نذر کرنے کے لئے لختِ جگر لایا ہے — ارمغاں رُوح کا کر لے مرے مولا منظور

دِل میں ہے اک نگہِ لطف کی حسرت باقی — رُخِ انور کی ضیا سے ہو یہ سینہ معمُور
جامِ وحدت کا مُجھے بھی ہو عطا اے ساقی — دل کے پردہ سے ہو تاریکیٔ غفلت کافُور

پانی ہو ہو کے بہے ذوقِ شہادت میں جگر — لُطف امرت کا دکھا زہرِ ہلاہل میں مجھے
وہ تصوّر ہو عطا چشمِ بصیرت کو مگر — نقشِ باطل نظر آئے نہ کوئی دل میں مجھے

نگہِ شوق میں ہر ذرّہ ہو رشکِ خورشید — جزو میں کل کا تماشا نظر آجائے مجھے
پیش خیمہ ہو امیدوں کا مری ہر امید — یعنی ہر قطرہ میں دریا نظر آجائے مجھے

اندر جیت شرما

تجلّیات

آنکھوں سے دل میں روح میں دل سے سما گیا
کیا جانے کس لئے مجھے اتنا وہ بھا گیا

ہر آرزو کو فتنۂ محشر بنا گیا
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جادُو جگا گیا

جلوہ تو اُس کا دیکھ لیا چشمِ شوق نے
پروا نہیں ہے اس کی اگر دل گیا گیا

ہر سمت دیکھتا ہوں اُسی کے جمال کو
اتنا مری نگاہ میں کوئی سما گیا

آیا نہ تھا زباں پہ ابھی حرفِ مدعا
وہ مدعائے دل مری نظروں سے پا گیا

"آتے ہی اُن کے دُور ہوئیں کلفتیں تمام"
جاتے ہی اُن کے زیست کا سارا مزا گیا

آغوشِ انتظار ابھی وا ہے اور وہ
آغوشِ انتظار میں آیا چلا گیا

اس دلربا ادائے محبّت سے پُوچھئے
مجھ سے یہ بار بار نہ کہئے کہ کیا گیا

ہمدم جو پھر کہوں تو کہوں کس امید پر
سو بار اُن سے حالِ تمنّا کہا گیا

ہر زخم دل کا پھوٹ کے ناسُور ہو گیا
یہ موسمِ بہار عجب گُل کھِلا گیا

وہ! اور وعدہ ہائے وفا و کرم! غلط!!!
قاصد بنا گیا! مجھے قاصد بنا گیا!!

اکبر ملول رہتے ہو کس کے فراق میں
یہ کون راہ موت کی تم کو بتا گیا

اکبرؔ

مس پنڈرہ

"میں پہاڑ پر اس لئے تو نہیں آیا تھا کہ ہسپتال میں پڑے پڑے اپنا تمام وقت گزار دوں!" انند کمار نے شکوہ کے انداز میں کہا۔

ڈاکٹر نے جواب دیا "بے شک نہایت افسوس کا مقام ہے لیکن مجبوری کا کیا علاج۔ اور وہ ہسپتال نہیں نرسنگ ہوم ہے۔ شاید اس لئے کہ یہ نام ہسپتال سے زیادہ آرام دہ معلوم ہوتا ہے ——"

"ہسپتال کا نام کچھ بھی رکھ لو۔ مجھے تو اس کے خیال سے وہی ایتھر اور آئڈوفارم کی بُو کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہیں ہوٹل میں میرا علاج نہیں ہو سکتا؟"

"ہو تو سکتا ہے لیکن ہوٹل کے دیگر مہمان ڈاکٹروں اور نرسوں کے ہر وقت آنے جانے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور مریض کے لئے بھی یہاں اُس قدر سہولت میسّر ہونا مشکل ہے۔"

"نرسیں؟ —— آپ نے مجھے جنگ کا زمانہ یاد دلا دیا جب میں طالب علم تھا —— لیکن اگر نرس رکھنا ہی ہے تو خدا کے لئے مجھے کسی یورپین حسینہ کے حوالے نہ کر دینا۔ اول تو ہر منٹ وہ چاہے گی کہ میں اُس کی اداؤں کی تعریف کروں۔ اس پر کہیں ہندوستان میں دنگا فساد ہو گیا تو یہ کہہ کر مجھے چھوڑ کے چل دے گی کہ "ہم کالا آدمی کا علاج نہیں کرتا" میں صاف کہے دیتا ہوں ڈاکٹر صاحب کہ مجھ میں اس وقت ناز اُٹھانے کی طاقت نہیں ہے۔"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا "آپ بے فکر رہیں آپ کو نازبرداری کی ضرورت نہ ہوگی۔ وہاں زیادہ تر نرسیں یورپین ہیں لیکن میں نے چند روز ہوئے سنا تھا کہ ایک ہندوستانی خاتون نرسنگ کا امتحان پاس کرنے کے بعد مشق کی غرض سے آئی ہوئی ہے اور گو ابھی اسے زیادہ تجربہ نہیں تاہم اپنا کام خوب ہوشیاری اور دلدہی سے کرتی ہے۔ اگر ممکن ہو سکا تو میں اُسے آپ کے لئے مقرر کرا دوں گا ——"

"وہ حسین تو نہیں ہے؟"

"نہیں اِس قدر حسین نہیں کہ آپ کو اندیشہ ہو۔ اور غالباً کسی معزز خاندان سے ہے یہ کام فقط شوقیہ سیکھ رہی ہے۔"

"خیر تو اُن سے کہہ دینا کہ اگر یہ شرائط پوری نہیں ہو سکتیں تو میں وہاں رہ کر علاج نہیں کراؤں گا!"

ڈاکٹر نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا "بہت اچھا۔ بہت اچھا۔ امید ہے انتظام ہو جائے گا" لیکن واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر رابنسن کو اس نوجوان لکھ پتی کی باتوں پر ہنسی کو روکنے میں نہایت مشکل کا سامنا ہوتا تھا۔ اور اس کے خیال میں ان امیر لوگوں کو جو ضدی بچوں کی طرح ہوتے ہیں کبھی کبھی اس بات کا احساس ہونے کی ضرورت تھی کہ روپے سے دنیا کی ہر ایک چیز نہیں خریدی جاسکتی بلکہ اصلیت میں وہ تمام اشیاء جو حقیقی معنوں میں قابل حصول ہوتی ہیں روپے کے عوض نہیں ملتیں۔ ورنہ جس نرسنگ ہوم میں انند کمار کو رکھے جانے کا خیال تھا وہ قصبہ راج پور سے اوپر کی جانب ایک خوبصورت علیحدہ پہاڑی پر چونکہ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کھولا گیا تھا اُس کی یورپین مالکہ ایک ایسے متمول آدمی کو اپنے یہاں رکھنے کے لئے ملک کا کونہ کونہ چھان مارتی اور کہیں سے اُس کے مزاج کے مطابق ہندوستانی نرس ڈھونڈ نکالتی۔

سچ پوچھئے تو انند کمار کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔ طالب علمی کے جھمیلوں سے فراغت پا کر تین چار سال میں ہی سخت محنت کر کے اُس نے ثابت کر دیا تھا کہ مرحوم باپ کی کثیر جائداد اور تجارت کا کاروبار سنبھالنے کی اُس میں غیر معمولی قابلیت تھی۔ اور خود مختار ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ موسم گرما پہاڑ پر بسر کر کے کچھ آرام لینے کی فکر میں گھر سے روانہ ہوا تھا۔ اب اسے مشیت کہئے یا اتفاق ڈیرہ دون میں آئے دو ہی دن ہوئے تھے اور آگے منصوری جانے کا خیال تھا کہ صبح کے وقت خود موٹر چلاتے ہوئے چند بے فکرے نوجوانوں کی موٹر کے ساتھ دوڑ ہو گئی۔ چونکہ راستے سے واقفیت نہ تھی جونہی اُس کی موٹر اُن سے آگے نکلی ایک بہت ٹیڑھے موڑ پر چھوٹا سا پُل سامنے آگیا۔ جگہ اس قدر تنگ تھی کہ موٹر رک نہ سکتی تھی جنگلا توڑ کر نالے میں اوندھی ہو گئی۔ دوسری موٹر والے بیہوش انند کمار کو اٹھا کر ہوٹل میں لائے ڈاکٹر رابنسن سول سرجن کو بلایا۔ دو پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ سر میں کئی جگہ چوٹیں تھیں تمام بدن کی کوئی جگہ خالی نہ تھی جہاں چوٹ زخم یا کم از کم خراش نہ ہو۔ کئی گھنٹے کے بعد ہوش آنے پر ڈاکٹر سے مندرجہ بالا گفتگو ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر نے احتیاطاً انند کمار کو ایک خواب آور دوا پلادی اور خواب کی حالت میں ہی اُسے موٹر میں رکھ کر نرسنگ ہوم پہنچا دیا گیا۔ اس لئے جب شام کے قریب وہ بیدار ہوا تو بالائی منزل کے ایک نہایت صاف ستھرے ہوادار کمرے میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں روپہلی کناروں والے گلابی اور بنفشئی بادلوں میں سے چھن کر اُس کے بستر پر پڑ رہی تھیں۔ اور بارش کے بعد دھلے ہوئے سبزہ کا سماں۔ اور دُور پہاڑیوں کے سیاہ دامنوں پر چھوٹے بڑے روئی کے سفید گالوں کی استراحت کا نظارہ پیش نظر تھا۔

وہ دیر تک خاموشی سے بے حس و حرکت پڑا ہوا اس منظر کا لطف اٹھاتا رہا۔ پھر پلنگ کی پائینتی کی جانب نظر

اٹھائی تو دیکھا کہ اس طرف بھی ایک بہت بڑی کھڑکی ہے جس کے پٹ کھلے ہیں اور سامنے کے پہاڑوں پر بے شما
روشنیاں کپورتھلہ کی کوٹھی کے بڑے لمپ سے لے کر لنڈور بازار تک تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد ٹمٹماتی ہوئی
ظاہر ہوتی جارہی ہیں۔ گویا منصوری کی پہاڑی حسینہ اپنے شبانہ لہو ولہب کے لئے جھپکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ
آہستہ آہستہ خواب ناز سے بیدار ہو رہی ہے۔

یک لخت سٹفل کے یہاں کی روشنیاں گلابی ریشم کے اوندھے کنول سے مشابہ شیڈوں میں اردگرد کے سفید
ستاروں کے درمیان بہت سے مریخوں کی طرح خون آشام دلوں کا سرخ رنگ لئے ہوئے چمکیں اور انند کمار کے دل کا
جمع شدہ غبار اُس کے منہ سے انگریزی کے اُس پُرمعنی لفظ کی شکل میں پھوٹ نکلا جس سے بہتر پامال شدہ آرزوؤں کے
بے ساختہ اظہار کے لئے اردو زبان میں کوئی ایک لفظ نہیں ہے ———

"ڈیم! . . . ."

اب باوجود اس کے کہ یہ لفظ ایک خاص کیفیتِ قلب کے اظہار کے واسطے انگریزی زبان میں بھی لاجواب ہے،
اہلِ زبان اسے 'فصیح' نہیں کہتے۔ یہاں تک کہ مستورات کی موجودگی میں اُسے منہ سے نکالنا سخت معیوب خیال کیا جاتا ہے،
یہ وجہ تھی کہ انند کمار جو اپنے آپ کو کمرہ میں اکیلا سمجھے ہوئے تھا گھبرا کر محجوب سا ہوگیا جب کچھ آہٹ ہوئی اور کمرے
کی دیوار کی جانب دھندلی تاریکی میں سے ایک صورت نرس کے لباس میں آکر اُس کی آنکھوں اور منصوری کے نظارے
کے درمیان حائل ہوگئی ——— اور پوچھا

"آپ بیدار ہوگئے کیا؟ اب مزاج کیسا ہے؟"

تھوڑی دیر رک کر انند کمار نے بھی سوال ہی کیا "جو کچھ میں کہہ رہا تھا کیا تم نے سنا؟"

جواب ملا "ہاں سنا تو ———"

"امید ہے تمہیں سُن کر بہت صدمہ نہیں ہوا ہوگا۔ کیونکہ وہ مزاج ہی کی کیفیت تو تھی جو میرے منہ سے نکلی ——"

"خیر کوئی حرج نہیں۔ اب مجھے آپ کا ٹمپریچر لینا ہے۔ لیکن پہلے یہ بتائیے کہ کوئی اور کام ایسا تو نہیں جو
آپ چاہتے ہوں میں پہلے کرلوں؟"

"ہے تو سہی" آنند کمار نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے سوفا پر بٹھا کر سامنے کی سرخ روشنیوں والی عمارت کے
اندر بال روم میں پہنچا دو۔ اُسی کی جھلک نے میری طبیعت کو زیادہ خراب کردیا ہے۔ کیونکہ میں نے اسے طالب علمی کی
بندشوں کے زمانہ میں دیکھا تھا آزادی سے دیکھنے کی آرزو تھی ——— لیکن یہ آرزو اب غالباً کبھی پوری نہ ہوسکے گی۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اب میرا صحت پا جانا محال ہے۔ جب ڈاکٹر بھی اس قدر تسلیم کرتا ہے کہ میری حالت خطرناک ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کی کوئی امید نہیں۔ مجھ سے زیادہ بدنصیب بھی دنیا میں کوئی نہ ہوگا ——"

"آپ کا خیال غلط ہے۔ دنیا میں بہت سی ایسی ہستیاں موجود ہیں جنہیں امراض سے اتنی فرصت ہی نہیں کہ اپنی بدنصیبی پر غور کرسکیں۔"

"ہونگی —— لیکن میرے خیال میں ایسا کوئی نہیں ہوگا جس کے ساتھ قسمت نے اس قدر ستم ظریفی کا برتاؤ کیا ہو جیسا میرے ساتھ کیا ہے۔ میری جگہ اگر کوئی غیر بھی ہوتا تو مجھے اُس کی حالت پر رونا آتا ——"

"لیکن اگر یہیں اس نرسنگ ہوم میں ہی کسی کی حالت آپ سے زیادہ خراب ہو۔ اور آپ بھی اسے تسلیم کرلیں تو ——؟"

"ناممکن ہے۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسا کوئی نہ ہوگا۔"

"مجھے یہاں کے ضوابط شرط لگانے کی اجازت نہیں دیتے۔ ورنہ جیت لینے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔"

"تو کیا کوئی خاص کیس مدِنظر ہے؟ —— ویسے تو غالباً مجھے بھی یہاں کے لوگ "کیس" ہی کہتے ہونگے اور مجھے اس لفظ سے سخت نفرت ہے۔ گویا کسی بے جان چیز کا ذکر ہو رہا ہے —— اور مجھے اس سے بہتر کوئی نام رکھوانے کا حق بھی کیا ہے۔ مُردوں سے بدتر ہوں —— مرجاتا تو اچھا رہتا۔ چھٹکارا ہو جاتا۔ اب خدا جانے کب تک اسی طرح پڑا رہوں گا —— اور نتیجہ پھر وہی۔ صحت تو ہونے سے رہی۔ علاج کرنے سے کیا حاصل ——!"

نرس نے دوبارہ اُس کے خیالات کو پلٹنے کی کوشش کی "سنئے تو۔ ایک خاص کیس مدِنظر ہے اور وہ بھی بہت عجیب ——"

"مرد ہے یا عورت؟"

"عورت ہے —— عورت بھی کیا نوجوان لڑکی ہے۔ اُس کے حالات آپ سنیں گے تو اپنی تکالیف بھول جائیں گے۔"

اتنے میں دروازے کے باہر آہٹ ہوئی۔ نرس نے جلدی سے یہ کہہ کر "باقی کل بتاؤں گی" بجلی کا لمپ جو انہوں نے نظارے کا لطف اٹھانے کے لئے اب تک جلانے نہیں دیا تھا روشن کردیا۔ دروازہ کھلا۔ ایک اور نرس اور ڈاکٹر اندر آ گئے۔ اور یہ نرس دروازے کے پاس ڈاکٹر سے کچھ گفتگو کر کے چلی گئی۔

ڈاکٹر نے نبض دیکھی تھرمامیٹر لگایا —— حرارت بڑھنے لگی تھی —— اور مرہم پٹی کو جہاں جہاں ضرورت

تھی درست کرکے تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا۔

"امید ہے آپ کو جلدی صحت ہو جائے گی۔ آپ کے قویٰ مضبوط ہیں اور یہاں کی آب و ہوا نہایت اچھی ہے ـــــ"

انند کمار نے جھنجھلا کر کہا "اجی چھوڑو بھی ڈاکٹر صاحب۔ مجھے دھوکا دینے سے کیا حاصل! صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ہفتہ عشرہ کا مہمان ہوں ـــــ؟"

"واہ صاحب آپ ہمت کیوں ہارے دیتے ہیں؟ آپ ایسے نوجوان تو جنگِ عظیم میں میں نے کئی مرتبہ دیکھا مر کر زندہ ہو ہو گئے ہیں۔ اور آپ کے تو کوئی زیادہ خطرناک چوٹ بھی نہیں آئی۔ اعضائے رئیسہ صحیح و سالم ہیں۔ بس چار پانچ روز کی بات ہے۔ جہاں زخم درست ہونا شروع ہوئے طبیعت بحال ہو جائے گی۔ اور ابھی تو پہلا دن ہے۔ رات میں غالباً بخار بڑھ جائے گا اور زخموں میں درد بھی محسوس ہو گا۔ اگر ابھی سے آپ گھبرا گئے تو بیماری کیسے کٹے گی ـــــ؟"

غرض اسی طرح کی چند باتیں کرکے ڈاکٹر چلا گیا اور انند کمار نے بخار کی حدت اور درد اور بے چینی کی وجہ سے رات آنکھوں میں کاٹی۔ صرف صبح کے وقت ایک دو گھڑی کے لئے بمشکل اُس کی آنکھ لگی۔

دن کافی نکل چکا تھا کہ انند کمار جاگا اور سب سے پہلے اُس کی نظر سامنے کے پہاڑوں پر پڑی جہاں پیلی پیلی دُھوپ ہرے ہرے لہلہاتے ہوئے سبزے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ فرطِ مسرت سے اُچھل کر پلنگ پر بیٹھ جانے کو تھا کہ بجلی کے شرارے کی طرح درد کی ایک لہر سر کی طرف سے اٹھی اور پاؤں کی طرف سے نکل گئی۔ اور گزشتہ رات کا خیال آنے سے اُس کی تمام اُمنگ پر پانی پھر گیا۔

اُس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور رات کے واقعات ایک ایک کرکے اُس کے خیال میں گزرنے لگے وہ موٹر کی دوڑ ـــــ پل کا سامنے آجانا ـــــ بے خبری۔ ہوٹل کا کمرہ اور ڈاکٹر ـــــ نرسنگ ہوم۔ شام اور ـــــ نرس ـــــ ہاں نرس ـــــ حسین تو نہ تھی ـــــ لیکن اُس نے اس کی صورت ہی کب دیکھی تھی ـــــ صرف اندھیرے میں۔ آسمان کے مقابل ـــــ چہرے کے خطوط بُرے نہ تھے لیکن ہندوستانی تھی ـــــ غالباً کالی ہو گی۔ اور کالی بھی وہ جسے پنجابی شاہ کالی کہتے ہیں ـــــ مدراس یا بمبئی کی رہنے والی ـــــ گو معلوم ہوتا ہے تعلیم یافتہ تھی ـــــ اور ہمدرد ـــــ ہاں ہمدرد ضرور تھی ـــــ وہ کسی لڑکی کا ذکر بھی تو کر رہی تھی جو بہت بیمار ہے ـــــ مجھ سے بھی زیادہ ـــــ شاید یورپین نرس اتنی ہمدرد نہ ہوتی۔ وہ تو یہ چاہتی کہ میں اُس کے حسن کی تعریف کروں ـــــ

ـــــ کسی نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا ـــــ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ نرس کھڑی تھی ـــــ وہی؟ ہاں

غالباً وہی ——— لیکن یہ کالی تو نہ تھی ——— اور آنکھیں ——— اُف کتنی بڑی بڑی! اور ان میں ———

"آج مزاج کیسا ہے؟" نرس کی آواز آئی۔

"بہت بُرا ———"

"کیوں؟ کیا تکلیف ہے؟"

"یہی کہ میں اُن پہاڑوں پر جانے کے ناقابل ہوں" اور اُس نے آنکھ سے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"اِس کا وقت بھی آجائے گا۔ آپ کو اتنا بے صبر نہیں ہونا چاہئے"

اِس گفتگو کے بعد ڈاکٹر آگیا۔ مرہم پٹی ہوئی۔ خوراک دی گئی وغیرہ ——— اور جب سب چلے گئے تو انند کمار نے نرس سے پُوچھا۔

"نرس تمہارا نام کیا ہے؟"

"مجھے یہاں نرس بملا کہتے ہیں"

"وطن ———؟"

"گجرات"

"گجرات؟" انند کمار نے حیرانی سے کہا۔ "کاٹھیاوار؟"

"نہیں تو۔ گجرات پنجاب"

"اچھا ——— ! جبھی ———"

"جبھی کیا؟"

"کچھ نہیں" جلدی سے بات ٹال کر انند کمار نے کہا "تم کل کسی لڑکی کا ذکر بھی تو کر رہی تھیں جو اسی نرسنگ ہوم میں ہے۔ اور مجھ سے زیادہ بیمار ہے ———"

"——— ہاں کر رہی تھی ——— لیکن ہمیں مریضوں کا حال ایک دوسرے سے کہنے کی اجازت نہیں اور ممکن ہے اُس کے متعلق سُن کر آپ کی طبیعت پر اثر ہو اور ٹمپریچر بڑھ جائے ———"

"واہ! کسی عورت کا حال سننے سے میرا ٹمپریچر بڑھ جائے۔ وہ جنّت کی حُور بھی ہو تو یہ ممکن نہیں۔ اُس کا نام کیا ہے؟"

"صُورت تو واقعی ایسی ہے کہ حوروں کی بھی نہ ہوگی۔ لیکن نام یا پتہ کسی کو معلوم نہیں۔ اور ہوتا بھی تو نرسنگ ہوم میں مریضوں کو اُن کے نام سے یاد نہیں کیا جاتا۔ کمرے کے نمبر ہر مریض کا نام ہوتا ہے!"

"یعنی؟"

"یعنی اُس کا نام مس پندرہ ہے۔ کیونکہ وہ پندرہ نمبر کے کمرے میں ہے۔"

"اور میں؟"

"آپ نمبر آٹھ یا مسٹر آٹھ ہیں"

"اچھا تو اُس کا نام یا پتہ کسی کو معلوم نہیں؟ کیوں؟"

"یہ بھی ایک افسانہ ہے۔ وہ کل آپ کے آنے سے پہلے یہاں لائی گئی تھی۔ ڈیرہ دون کے سٹیشن پر اکیلی ریل سے اتری اور اُترتے ہی بیہوش ہو کر گر گئی۔ لباس سے کسی معزز اور امیر گھرانے کی معلوم ہوتی تھی۔ صرف ایک بیگ ساتھ تھا۔ اب تک اُسے پورا ہوش نہیں آیا اور بہکی بہکی باتیں کرتی ہے۔"

"ہندو ہے یا مسلمان؟"

"یہ بھی کسی کو علم نہیں بے حد کمزور ہے اور جب کبھی آنکھیں کھولتی ہے۔ سخت خوف زدہ معلوم ہوتی ہے۔"

"آخر بات کیا ہے؟"

"کچھ پتہ نہیں۔ اب آپ زیادہ گفتگو نہ کریں۔ سر میں درد ہو جائے گا۔ ڈاکٹر منع کر گیا ہے۔ سونے کی کوشش کیجئے۔ رات بھی آپ بہت کم سوئے ہیں۔ اور جن حالات کا آج شام کو پتہ چلے گا کل آپ کو بتاؤں گی۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ ڈاکٹر یا کسی دوسری نرس سے کہیں مس پندرہ کی نسبت دریافت نہ کیجئے گا۔ ورنہ اول تو میٹرن مجھ سے ناراض ہوگی کہ میں نے ایک مریض کا حال دوسرے سے کہا۔ اور ـــــ ایک وجہ اور بھی ہے جو پھر کبھی بتاؤں گی ـــــ"

اند کمار نے سر کے اشارے سے 'اچھا' کہا۔ اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کے منتشر خیالات کے ہجوم میں حسین مس پندرہ کی کہانی اور اس کی بے بسی کے ساتھ نرس بملا کے رازدارانہ انداز اور بڑی بڑی پُر اسرار آنکھوں کا دھندلا سا تصور بھی وقتاً فوقتاً سینما کے نظاروں کی طرح پردے پر آتا اور غائب ہو جاتا۔

تیسرے روز جب ڈاکٹر آ کر چلا گیا تو اند کمار رات کی تکالیف کے بعد حسبِ معمول اپنی بدنصیبی پر تاسف اور قسمت سے گلا کرنے میں مشغول تھا کہ نرس بملا نے کہا

"رات سے وہ پورے ہوش میں ہے ـــــ"

"کون ہوش میں ہے؟"

"مس پندرہ"

"تو میں کیا کروں ----!"

"اچھا مجھے تو خیال تھا کہ شاید آپ کی وجہ سے اس کی جان بچ جائے۔ لیکن آپ کو کسی کی تکلیف یا راحت کا احساس ہی نہیں۔"

"میری وجہ سے؟"

"ہاں آپ کی وجہ سے۔ گزشتہ رات میں اُس کے پاس تقریباً ایک گھنٹے تک بیٹھی رہی۔ وہ کسی سے بے حد خوفزدہ ہے اور اس خوف کے باعث ہی اپنا نام پتہ یا حالات نہیں بتاتی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ اُس نے سٹیشن پر اترنے سے پہلے ایک زہریلی دوائی کھائی تھی گویا خودکشی کرنا چاہتی تھی۔ حسن اتفاق سے بیہوش ہوگئی اور یہاں پہنچتے ہی اُس کا علاج شروع ہوگیا۔ میں سمجھتی تھی کہ اگر کوئی آپ ایسا با اثر نوجوان جو تھوڑے بہت خطرے سے نہ گھبراتا ہو اُس کی امداد پر تیار ہو جائے تو ممکن ہے اُس کی جان بچ سکے ورنہ یقینی امر ہے کہ ہر وقت روتے رہنے۔ ذرا ذرا سی آہٹ پر اچھل پڑنے اور دروازے کی طرف اس طرح دیکھنے سے گویا موت کا پیام آیا چاہتا ہے وہ گھل گھل کر چند روز میں ختم ہو جائے گی۔"

"لیکن میں تو اپنی جان سے بیزار اور خدا جانے کتنے دنوں کا خود مہمان ہوں۔ میں اُس کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"یہ آپ کا وہم ہے۔ اگر آپ کوشش کریں تو ہفتہ عشرہ میں بھلے چنگے ہوسکتے ہیں۔ ہاں البتہ اگر آپ کسی کے لئے خطرے میں نہ پڑنا چاہیں تو دوسری بات ہے ------"

"نہیں جو کچھ مجھ سے ہوسکے گا میں اُس کے لئے تیار ہوں لیکن میرے صحت پانے تک وہ یہاں کیوں پڑی رہے گی؟"

"اس کی میں ذمہ دار ہوں میں اسے سمجھا بجھا کر راضی کرلوں گی کیونکہ اُس کے زندہ رہنے کا غالباً فقط یہی ایک ذریعہ ہے۔"

اس کے بعد انند کمار کے چند عزیز آ گئے اور یہ گفتگو یہیں ختم ہوگئی۔ لیکن شام کو رخصت ہونے سے پہلے نرس بملا نے مسکرا کر مس پندرہ کی امداد پر تیار ہو جانے کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ مسکرانے میں اُس کے ہونٹوں کے دونو طرف کچھ فاصلے پر دو چھوٹے چھوٹے گہرے گڑھے پیدا ہو گئے۔ جو رات میں نیم خواب کی حالت میں بار بار انند کمار کی آنکھوں کے سامنے آجاتے۔ وہ حیران تھا کہ کیوں ------

اسی طرح دو ہفتے گزر گئے۔ مس پندرہ اور انند کمار کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ نرس بملا کی وساطت سے جاری رہا اور آخر میں ایک دفعہ انند کمار نے ایک تحریر بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجی جس کا جواب نہایت خوبصورت گول گول حروف میں لکھا ہوا اُسے ملا۔ لیکن مس پندرہ نے بہت بہت شکریہ پر ہی اکتفا کی تھی۔ اپنا نام پتہ اور مزید حالات

بتانے کا وعدہ انند کمار کو صحت ہونے پر تھا۔ وہ بھی اب جلدی صحت یاب ہو جانے کے لئے بے چین تھا۔ اور ہر روز ڈاکٹر سے بار بار یہ پوچھ کر اُس کا ناطقہ بند کر دیتا کہ کب تک نرسنگ ہوم چھوڑ دینے کے قابل ہو سکے گا۔ ڈاکٹر اور میٹرن مس بملا کے حد سے زیادہ مداح تھے کہ اُس نے انند کمار کی زندگی سے مایوسی کو کس طرح جلدی اٹھ کر چلنے پھرنے کی خواہش میں تبدیل کر دیا۔ جب وہ اُس سے یہ سوال کرتے تو وہ مسکرا کر چپ ہو رہتی۔

آخر وہ دن آگیا جب انند کمار کو اپنا لباس پہن کر کمرے میں چلنے پھرنے اور آرام کرسی پر بیٹھنے کی اجازت ملی اُس روز نرس بملا کے ساتھ تنہا ہوتے ہی اُس نے مس پندرہ سے ملاقات کا تقاضا شروع کر دیا۔ نرس کچھ دیر تک تو سوچتی رہی۔ پھر اُٹھ کر کھڑکی کی طرف چلی گئی۔ اور رومال نکال کر منہ سے لگا لیا۔ انند کمار نے غور سے دیکھا تو معلوم ہؤا کہ آنسو بہہ رہے ہیں۔ اور باوجود سخت کوشش کے نہیں رکتے۔ ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ حیران تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے ———

وہ اٹھا اور نرس کے بازو کو سہارا دے کر اُسے آہستہ سے کرسی پر بٹھا دیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد پُوچھا۔

"دیکھو تو بملا بات کیا ہے؟ کیا مس پندرہ پھر زیادہ بیمار ہو گئی ہے؟"

نرس بملا نے ننھا سا لیس دار رومال جو آنسوؤں سے بالکل تر ہو گیا تھا ہٹایا۔ اور آنکھیں اٹھا کر انند کمار کی طرف دیکھا۔ بڑی بڑی آنکھیں جو پہلے ہی بڑی تھیں اب اور بھی زیادہ طویل و عریض معلوم ہوتی تھیں۔ اُن کی سفیدیوں میں سرخ سرخ ڈوروں کا جال سا بچھا ہؤا تھا اور کہیں کہیں آنسو لمبی خمیدہ پلکوں میں۔ مکڑی کے جالے میں شبنم کے موتیوں کی طرح پروئے ہوئے دکھائی دیتے تھے ——— اور جواب دیا۔

"مس پندرہ ہوتی تو جھگڑا ہی کس بات کا تھا؟"

"تو کیا ——— وہ کہیں چلی گئی؟"

"تھی کہاں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ کُل ایک فرضی افسانہ تھا" نرس بملا نے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو ضبط کر کے کہا گو اب بھی ہچکی آ کر گاہے گاہے اُس کے فقروں کو توڑ دیتی تھی "لیکن آپ کی حالت اس قدر خراب تھی ——— اور آپ کے ہر وقت کے تفکرات اور صحت سے مایوسی ——— اُن سے آپ کی جان کا خطرہ تھا ———"

"تو گویا کُل نرسنگ ہوم والوں نے مِل کر مجھے دھوکا دینے کے لئے یہ افسانہ گھڑا تھا؟"

"نہیں تو ——— اس میں اور کسی کا قصور نہیں۔ اور میں جانتی ہوں کہ یہ قصور قابلِ معافی نہیں لیکن پہلے تو صرف آپ کی توجہ اپنی تکالیف اور بدقسمتی کی طرف سے ہٹانے کے لئے میں نے مس پندرہ کا ذکر چھیڑا تھا لیکن بعد میں آپ کے سوالات۔ اور اپنے پہلے جھوٹ کو قائم رکھنے کی ضرورت نے مجھے مزید جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں تک کہ معاملہ بہت دور پہنچ گیا۔ یہی وہ دوسری وجہ تھی جس کے لئے میں نے کسی اور سے مس پندرہ کی نسبت دریافت نہ کرنے کی آپ سے درخواست کی تھی ———"

"اور وہ خط؟"

"میرا لکھا ہوا تھا ———"

کچھ عرصے تک تو انند کمار چپ چاپ سوچتا رہا پھر یک لخت قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ اور کہا "تو گویا تم نے میری جان بچائی؟ اکیلی تم نے ——— یہ کیوں؟

نرس بملا نے آنکھیں نیچی کر لیں اور کچھ جواب نہ دیا۔ انند کمار نے تھوڑے وقفہ کے بعد پھر کہا "اچھا تو اب اس میری جان بچانے کے قصور کی سزا کیا ہونا چاہیئے؟"

اُسی طرح آنکھیں نیچی کئے ہوئے بملا نے جواب دیا "جو آپ کا دل چاہے"

"سزا یہ ہے ———" انند کمار نے مسکرا کر اُس کی ٹھوڑی کو انگلی سے اٹھاتے ہوئے اُس کا چہرہ اپنے مقابل کر کے کہا "——— کہ تم مستقل طور پر میری تیمارداری اپنے ذمے لے لو ———"

بملا نے ایک دفعہ آنکھیں اٹھا کر پھر انند کمار کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں سے کچھ دُور دونو طرف وہی گڑھے پیدا ہو گئے جن کے انند کمار خواب دیکھا کرتا تھا۔ آنکھیں نیچی ہو گئیں اور بملا نے آہستہ سے کہا

"جس طرح آپ کی مرضی ———"

اس سے تقریباً ایک ماہ بعد مسٹر اور مسز انند کمار منصوری پر سٹفل کے بال روم میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اور چاروں طرف بجلی کی قمقمیاں گلابی ریشم کے اوندھے کنول سے مشابہ شیڈوں میں سینکڑوں خون آشام دلوں کا رنگ لئے ہوئے آویزاں تھیں +

عطاء الرحمٰن

داستانِ دل

زندہ انہیں کے دم سے ہے نام و نشانِ دل
جذباتِ حُسن و عشق ہیں روح و روانِ دل

نازو نیاز میں بھی یہ ہے پاسِ حُسن و عشق
اِک آستانِ دل ہے تو اِک پاسبانِ دل

معنائے حسن، خوبی و نیکی ہے بالیقیں
اِس کے سوا کہے تو غلط ہے بیانِ دل

ہے عشق کیا طلب ہے فقط نیک و خُوب کی
جو اِس سے منحرف ہیں وہ ہیں دشمنانِ دل

تہذیب جس کے ساتھ ہو اخلاق جس کے پاس
وہ عشق پاک و صاف ہی شایانِ شانِ دل

سیرِ مجاز چھوڑ! فریبِ نظر ہے یہ
اُٹھ!! بامِ معرفت پہ لگا نردبانِ دل

اللہ رے عاشقانِ حقیقی کی ہمتیں
دیتے ہیں ہنس کے جان دمِ امتحانِ دل

موت اُن کی، زندگی ہے۔ فنا اُن کی ہے بقا
ہے رشکِ عیش اُن کو غمِ جاودانِ دل

باغِ خلیل، آتشِ نمرود بن گئی
تھی ایک یہ کرامتِ سوزِ نہانِ دل

یہ ذکر اگرچہ لائقِ تفصیل ہے مگر
تھوڑا ہے وقت اور بڑی داستانِ دل

زندہ رہا تو پھر کبھی احسنؔ سناؤں گا
بن کر زبانِ حال سے میں ترجمانِ دل

احسن
مارہروی

غزل

عجب کیا ہی جو سُن لے اب کوئی دم میں خدا میری
کہ تیری ضد سے ٹکرائی ہے برسوں التجا میری

توجہ سے کبھی قابل نہ ہو گی التجا میری
کہ تعلیم تغافل اُن کو دیتی ہے وفا میری

توقع کچھ اگر رکھوں سراسر ہے خطا میری
کہ اُن کے رُو برُو میں کیا ہوں اور کیا التجا میری

بہانہ چاہیے تجھ کو نہ مجھ کو عذر کی حاجت
مُسلّم ہے زمانے میں کرم تیرا خطا میری

عبث احباب مجھ سے کرتے ہیں اظہار ہمدردی
نہ وہ میرا مرض سمجھیں نہ وہ جانیں دوا میری

نہ تُو نے کی کمی کوئی نہ میں ثابت ہوا قاصر
رہیں دست و گریباں ہی جفا تیری وفا میری

نہ سمجھو تم تو میرا مدعا اک حرفِ باطل ہے
اگر سمجھو تو پھر میری خموشی ہی صدا میری

ترے نازِ بلا انگیز سے فریاد کرتا ہوں
تری ایک ایک ادا او فتنہ پیکر ہی قضا میری

کبھی تو گوشۂ ابرو کو جنبش کی اجازت دے
بہت اندوہ گیں رہتی ہی جانِ مبتلا میری

یہی بہتر ہے اپنے کام سب تقدیر پر چھوڑوں
کہ وحشت ہو چکی اب کوششوں کی انتہا میری

رضا علی
وحشت

افکارِ رعنا

ملتے ہی آنکھ جامِ محبت پلا دیا
یہ تم نے اِک نظر میں مجھے کیا دکھا دیا

جاں کیا تھی جان ڈال دی اُس میں خیال نے
دِل کیا تھا آرزو نے اُسے دل بنا دیا

کِس دل سے دُوں دعائیں نشاطِ خیال کو
دنیا کو میرے واسطے جنّت بنا دیا

قُدرت کی بخششوں کا بھلا کیا شمار ہو
سب کچھ دیا کہ اِک دلِ بے مُدّعا دیا

یُوں رنگ لائی میری پشیمانیٔ گناہ
رکھ دی جہاں جبیں وہیں کعبہ بنا دیا

اظہارِ دردِ دل سے سوا دردِ دل ہُوا
رعنا غضب کیا کہ یہ پردہ اُٹھا دیا

ملک سلطانہ رعنا

غزل

نہ چھیڑو، کیا ستم کرتے ہو۔ اِک بسمل کے ٹکڑے ہیں
جسے شیشہ سمجھتے ہو، یہ میرے دل کے ٹکڑے ہیں

بہت رونا مجھے آتا ہے غنچوں کے تبسّم پر
فقط۔ کھلنے ہی کی ہی دیر ساری کِھل کے ٹکڑے ہیں

فدا ہے گُل پہ بلبل مَیں ترے ہونٹوں پہ مرتا ہوں
وہ اُس کے دل کے ٹکڑے ہیں یہ میرے دل کے ٹکڑے ہیں

مزا دیتی ہے کیا کیا۔ روز کی یہ چارہ فرمائی
مرے زخموں کے پھاہے دامنِ قاتل کے ٹکڑے ہیں

آغا شاعر دہلوی

محفلِ ادب

اختلافاتِ السنہ

یہ پتہ لگانا بہت دشوار ہے کہ ابتدائے تمدّن میں ایک ہی زبان بولی جاتی تھی یا کئی۔ جن اقوام کا مذہبی عقیدہ ہے کہ تمام انسان ایک ہی ابوالبشر کی اولاد سے ہیں۔ خواہ وہ یہود و نصاریٰ و اہلِ اسلام کے خیال کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام ہوں یا مجوسیوں کے قول کے مطابق "مہ آباد" یا ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق "سویمبو منو"۔ یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ابتدا میں ایک ہی زبان تھی جس سے دیگر السنہ مشتق ہوئی ہیں۔ لیکن وہ ابتدائی زبان کون سی تھی اور اس کی ہیئتِ کذائی کیا تھی؟ اِس کے جواب میں قومیں مختلف الآرا ہیں۔ ہر قوم اپنے خیالی مورثِ اعلیٰ کی زبان کو تمام دیگر السنہ کا ماخذ قرار دیتی ہے۔ کوئی 'سریانی' کو، کوئی 'ارامی' کو، کوئی 'سنسکرت' کو اور کوئی 'اُستادی زبان' کو ام الالسنہ، قرار دیتا ہے۔ ساسانی مجوسیوں کا قول ہے کہ 'مہ آباد' نے جس کی زبان استادی تھی، اپنے شاگردوں کو مختلف زبانوں کی تعلیم دے کر مختلف ممالک میں بھیجا۔ اس طرح مختلف قطعاتِ ارض میں مختلف زبانیں بولی جانے لگیں۔ اگر یہ واقعہ سچ بھی ہو تو وہ اختلافِ زبان کی وجہ قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ اس سے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مختلف قطعاتِ ارض پہلے سے آباد تھے۔ اور ہر جگہ کی زبان الگ الگ تھی۔ اِس لئے ہر ملک کے لوگوں کو انہیں کی زبان میں اصولِ مذہب کی تعلیم دینے کے لئے 'مہ آباد' نے اپنے شاگردوں کو مختلف زبانیں سکھائیں۔ دورِ حاضر کے دانایانِ فرنگ کا خیال ہے کہ انسان کسی فردِ واحد کی اولاد نہیں ہے، بلکہ اُس نے جسمِ حیوانی سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے اور ارتقا کے بے شمار مدارج طے کرنے کے بعد جامۂ انسانی زیبِ تن کیا ہے۔ لہٰذا اُن کا خیال ہے کہ ابتدائے تمدن ہی میں دُور دراز ممالک کے وحشی انسان مختلف زبانیں بولتے ہونگے۔ بہرحال اگر یہ مسئلہ غیر فیصل ہی چھوڑ دیا جائے کہ ابتداً انسان کی زبان ایک تھی یا متعدد، تو بھی یہ امر مسلّم ہے کہ اُس وقت آج کل کی طرح لاکھوں زبانیں نہیں بولی جاتی تھیں۔

علمی لحاظ سے اختلافِ السنہ کی سب سے بڑی وجہ متفرق ممالک کی آب و ہوا اور دیگر جغرافی خصائص کا اختلاف ہے۔ جب مادرِ وطن میں اُس کے تمام فرزندوں کے لئے کافی جگہ اور گنجائش باقی نہیں رہی تو فاضل آبادی دوسرے ملکوں

میں ہجرت کرنے لگی ۔ مثلاً آریاؤں کا قدیم وطن وسطِ ایشیا تھا، لیکن عمران و آبادی کی کثرت نے انہیں وطن کو خیرباد کہہ کر دوسرے ملکوں میں جا بسنے پر مجبور کیا ۔ اُن کا اکثر و بیشتر حصہ مغرب کی جانب تلاشِ معاش میں چل کر تمام یورپ پر چھا گیا ۔ کچھ لوگ جنوب کی طرف روانہ ہو کر ایران اور ہندوستان میں آ بسے ۔ یہی حال دوسری نسلوں کا ہُوا ۔ الغرض مرکزی وطن سے ہجرت مختلف قطعاتِ زمین کی آبادی کا باعث ہوئی ۔ اُس زمانے میں آج کل کی طرح دُور دُور ملکوں کے درمیان رسل و ترسیل اور حمل و نقل کے ذرائع موجود نہ تھے ۔ اس لئے ایک ہی نسل کے لوگوں کے جو مختلف بلاد میں جا بسے تھے باہمی تعلقات منقطع ہو گئے ۔ متفرق ممالک کی آب و ہوا اور دیگر جغرافی خصائص کے زیرِ اثر نہ صرف مختلف قوموں کے عادات و خصائل، میلانات و رجحانات، ضروریات و خصوصیات رسم و رواج ہی ایک دوسرے سے متغائر ہو گئے بلکہ اُن کے قد و قامت جسمانی ساخت، آلاتِ گویائی کی بناوٹ، منہ، زبان، ناک، دانتوں، حلق، ہونٹوں اور صوتی نلیوں وغیرہ کی ہیئت اور ساخت میں بھی افتراق پیدا ہو تا گیا ۔ لہٰذا اُن کے لب و لہجہ، آواز و اصوات، مخارج و تلفظ، طرزِ ادا، اسلوبِ بیان وغیرہ بھی ایک دوسرے سے متباین ہو گئے ۔ مثلاً پہاڑی علاقوں کے لوگوں کی آواز میں خشونت، میدانی قطعات کے باشندوں کی آواز میں ہمواری، سلاست اور روانی، تنزی کے رہنے والوں کی زبان میں نرمی اور لوچ، معتدل آب و ہوا میں زندگی بسر کرنے والوں کی بولی میں شیرینی اور حلاوت پیدا ہو گئی ۔ یہ تو لب و لہجہ کا تغیر ہوا، ایسی ہی تبدیلیاں مخارج اور تلفظ میں بھی رونما ہوئیں ۔ مختلف مرز بوم کی آب و ہوا کے زیرِ اثر بعض قوموں کے آلاتِ گویائی کی ساخت میں کچھ ایسا بجوگ آ پڑا کہ وہ بعض آوازوں کے بولنے سے قاصر ہو گئے ۔ مثلاً پ ۔ چ ۔ ژ ۔ ٹ ۔ ڈ ۔ گ وغیرہ کا تلفظ عربوں کے لئے ناممکن ہے ۔ اسی طرح انگریزیت، ع، غ، خ، ق، وغیرہ کا تلفظ نہیں کر سکتے ۔ بھ، پھ، تھ، دھ، کھ، اور ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ خاص ہندی النسل اصوات ہیں ۔ جن کے ادا کرنے سے دُنیا کی اکثر قومیں معذور ہیں ۔ اِس اختلافِ تلفّظ کی وجہ سے ایک ہی لفظ نے مختلف ممالک میں پہنچ کر مختلف شکلیں اختیار کر لیں، مثلاً ایران کی دختر ہندوستان میں آ کر "دوہتر" اور انگلستان میں پہنچ کر "ڈاٹر" بن گئی ۔ "باپ" کو لاطینی میں "پاتر" فارسی میں "پدر" سنسکرت میں "پتر" اور انگریزی میں "فادر" کہتے ہیں ۔ اسی طرح گائے کو فارسی میں "گاؤ" سنسکرت میں "گئو" اور انگریزی میں "کاؤ" کہتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ابتدا میں یہ ایک ہی لفظ تھے لیکن مختلف مرز بُوم کی آب و ہوا نے تلفظ اور لب و لہجہ میں تفریق پیدا کر دی ۔ پس ایک ہی لفظ کا تلفظ مختلف قوموں میں جا کر مختلف ہو گیا ۔ علاوہ بریں ایک ہی ملک میں بھی کسی زبان کے الفاظ بمرورِ زمانہ منجھے اور شستہ ہوتے اور تراش خراش پاتے رہتے ہیں ۔ اس لئے زبان کی ہیئت بتدریج بدلتی رہتی ہے ۔ الزبتھ کے عہد کی انگریزی اور موجودہ انگریزی یا سترہویں صدی کے اواخر کے ریختے اور آج کل کی اردو میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ زبان کے اختلاف کی ایک بڑی وجہ نئے الفاظ کی توضیع و تشکیک ہے ۔

مادرِ وطن میں جگہ کی قلت اور ذریعۂ معاش کی تنگی کے باعث ایک نسل کے لوگ ابتدائے تمدن ہی میں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ چونکہ اُس وقت اُن کی ضروریات نہایت سادہ اور معلومات محدود تھیں، اِس لئے اُن کے الفاظ کا ذخیرہ بھی نہایت قلیل تھا۔ لیکن جُوں جُوں تمدن بڑھتا گیا اور ضروریات اور احتیاجات میں اضافہ اور معلومات و خیالات میں وسعت پیدا ہوتی گئی، مختلف ملکوں میں اشیا کے لئے نئے نئے نام اور ادائے مطلب کے لئے نئے نئے اسالیبِ بیان گھڑے گئے۔ چونکہ اُس وقت سلسلۂ مواصلت و نامہ و پیام مفقود تھا۔ اِس لئے ہر جگہ کی بولی اور اسلوبِ بیان جداگانہ ہوتا گیا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایک ملک کی بعض نباتی، حیوانی اور جمادی پیداواریں دوسرے ملک کی پیداواروں سے متباین ہوتی ہیں۔ اِس لئے کسی ملک کی مخصوص چیزوں کے لئے جو نام وہاں مقرر ہوئے وہ دوسرے ملک کی زبان میں ناپید تھے۔ جس طرح مختلف ممالک کے باشندے وہاں کی آب و ہوا اور ملکی خصائص کے زیرِ اثر بلحاظِ قد و قامت، خط و خال، جسمانی ساخت، صورت شکل، ایک دوسرے سے نہیں ملتے، اُسی طرح مختلف قوموں کے خیالات و افکار، مذاق اور پسند بھی جداگانہ ہوتے ہیں۔ ہر قوم نے اپنے افکار و آرا کے اظہار کے لئے اپنے مذاق کے مطابق ایک علیحدہ طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان اختیار کیا۔ بہر کیف مندرجہ بالا تمام وجوہات کی بنا پر ہزاروں زبانیں معرضِ وجود میں آئیں اور جُوں جُوں زمانہ گزرتا جائے گا آئندہ بھی آتی رہیں گی۔ دورِ حاضر میں حمل و نقل کی سہولت اور تجارت کی ترقی کے باعث مختلف اقوام کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور تبادلۂ خیالات کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ آپس میں کاروبار چلانے اور لین دین جاری رکھنے کے لئے ایسے وسائل کی ضرورت پڑتی ہے جنہیں سب سمجھ سکیں۔ لہٰذا مختلف زبانوں کے باہمی تصادم سے اُن پر اثر و تاثر کا عمل شروع ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ ان زبانوں کے اختلاط سے ایک نئی زبان معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اول اول یہ محض کاروباری اور بول چال کی زبان ہوتی ہے لیکن بتدریج مستقل ہیئت اختیار کر لیتی ہے اور اُس کا دامن علمی اور فنی جواہر ریزوں سے بھرنے لگتا ہے۔ آخر ش اُس کا بھی شمار دنیا کی اہم علمی زبانوں میں ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ اُردو اِسی قسم کی ایک زبان ہے جو مختلف السنہ کے باہمی اختلاط سے پیدا ہوئی ہے۔ واضح رہے کہ ابھی زبانوں کے اختلافات کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے بلکہ آئے دن نت نئی زبانیں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ الغرض تمدن کی ترقی، عمران اور آبادی کی فراوانی، معاملات و معاشرت کی پیچیدگی کے باعث ربع مسکوں کا ہر حصہ آباد ہو گیا ہے۔ بہ امتدادِ زمانہ نہ صرف زبانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا بلکہ طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان میں شگفتگی اور رنگا رنگی بھی پیدا ہوتی گئی۔

"اردو"

ایک ہندی غزل

جس کو اکیلے میں آ آ کر دھیان نیرا رہ رہ کے ستائے — چپکے بیٹھا روئے، آنسو پونچھے اور رہ جائے
گھم بات پہیلی ایسی، بس وہی بوجھے جس کو بجھائے — بھید نہ پائے تو گھبرائے، پھیر جو پائے تو گھبرائے

مجھ سا باتیں بنانے والا ہنس کے ہنسائے رو کے رلائے
جب وہ بلائیں اسے کیا کہئے، جائے تو منہ تکتا رہ جائے

ساری کہانی بے چینی کی ماتھے پر لکھ دیتی ہے
ایسی بات کہ گھٹتے گھٹتے منہ تک آئے اور رہ جائے

اُس کے منہ کو تکنے کو نہ پوچھو آس بھی جس کی ہراس بھی ہے
منہ سے نکالے تو چھپائے جی میں رکھے تو چھپائے

چُپ سے چھُپے گی چاہت کیونکر جب اُس میں یہ کھٹکا ہے
اپنی بیتی ایک کہے اور جگ بیتی کا بھرم کھل جائے

ایک نہ سننے والے سے کہنا پتھر سے ٹکرانا ہے
بات بھی وہ جو ڈرتے ڈرتے ہوکے ادھوری منہ تک آئے

چھیڑ کے پوچھو، پوچھ کے سمجھو، سُن کے نہ ایسی بات سناؤ
آس لگا کر کہنے والا اپنا سا منہ لے کر رہ جائے

ہائے کی چوٹ نہ سہنے والا کھوٹ بھی کرتے ڈرتا ہے
جیسے بے بس سانپ چٹیلا پلٹے کھا کھا کر رہ جائے

آرزو ایسے یوں بہتیرے، ہنس مکھ پتھر کوئی نہیں
چین سمجھ لے بے چینی کو، ہائے کرے اور ہنستا جائے

"نیرنگ خیال"

مصوّری اور اسلام

دنیا کی تمام قوموں کے تشکیلی فنون کی ابتدا جذبۂ پرستش سے ہوئی ہے اور اُن کا نشو و نما اُن کے مذاہب کے ساتھ بالکل نہیں تو ایک بڑی حد تک وابستہ رہا ہے۔ شوقِ سجود سے مجبور ہو کر انسان نے مختلف آب و ہوا میں مختلف تخیلات کے مطابق مختلف قسم کی ایسی شکلیں اختراع کیں جن کو وہ پیکرِ ایزدی کا مرقع سمجھ کر اُن کے سامنے سرِ نیاز خم کرے اور اپنے بنانے والے اور اس کے قوانین و مظاہر کی طرف سے جو ہیبت اور محبت کے جذبات اس کے سینے میں مشتعل ہوتے ہیں اُن کا اظہار اپنی بندگی کے اعتراف سے کرے۔ وحشی اقوام کے فنّی کارنامے اس خیال کے اسی طرح حامل ہیں جس طرح کہ پرانے تمدنوں کے قدیم آثار۔ ہمارے پاس مصر، چین، ہندوستان، یونان کی مثالیں ایک طرف اور افریقہ کی وحشی اقوام کے تراشے ہوئے بت دوسری طرف اس قول کی تائید کے لئے موجود ہیں۔ انسانی تخیل نے ذاتِ ایزدی کو ہندوستان میں اگر چہار دست شیو یا اتری مورتی کی صورت میں پیش کیا تو یونان میں انسانی حسن کے انتہائی امکانات کی صُورت میں جس کی مثالیں اپالو، زہرہ اور بے شمار دوسرے مجسمے ہیں۔ آج دیکھنے اور غور کرنے سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ شوقِ سجود میں جس درجہ بے تابی اور جبیں سائی میں جس درجہ انہماک ایک قوم میں پایا جاتا تھا اسی درجہ اس کی اختراع کردہ اشکال واقعی مظہر ہوتی تھیں ذاتِ خداوندی کی، اس کے جلال، اس کی رحمت اس کی عظمت کی! انسان کی صورت میں اوتار ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں لیکن اِن پتھروں کی صُورت میں اوتار ضرور ہو جاتے تھے اور سجدوں کا جو تلاطم ہندوستان کی پیشانی میں مضمر تھا وہ نہ یونان کو نصیب تھا نہ مصر کو اور یہی وجہ ہے کہ جس پائے کی شکلیں ہندوستان نے تراشی ہیں کسی دوسرے ملک سے ممکن نہ ہوئیں اور تخیل کی جو جسارت اُس میں پیدا ہے کہیں اور پیدا نہیں۔ لیکن شوقِ سجدہ سے جو تخلیقِ صورت وابستہ ہے اُس کی علت و رہنما انسان کے مذہبی ولولے ہوتے ہیں اور اُس میں

ذہنی عنصر کی رہبری سے حصولِ حسن اور جمال آفرینی کا دانستہ دخل معدوم یا کالعدم ہوتا ہے۔ ان کا مسلک حسن آفرینی نہ تھا اور وہ حسن کے لذتِ حسن کی خاطر متلاشی نہ تھے۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ ہم کو ان کے کارناموں میں اکثر انتہائی حسن کے نمونے نہیں ملتے بلکہ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ دانستہ اس عنصر کے متلاشی نہ تھے برخلاف اِن اقوام کے جب ہم مسلمانوں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ الست کے متوالے اپنی وارفتگیٔ توحید میں بتانِ آذر سے دست و گریباں ہوئے اور یہ نہ سمجھے کہ "مانو تو بُت، نہیں تو پتھر" یا نہ مانے تو پتھر نہیں تو بُت۔ اسلام میں مذہبًا یعنی بحکم قرآن یا بحکم حدیث تصویر کشی یا شکل تراشی ممنوع ہو یا نہ ہو لیکن اس کے ولولۂ توحید کا اقتضا شروع شروع لازمی طور پر یہ تھا کہ انسان اپنی شبیہ بنانے سے کنارہ کش رہے۔ چنانچہ ان کی حُسن آفرینی کی امنگ جو فطرتِ انسانی کا ایک لازمی عنصر ہے، ایک عرصہ تک فنِ نقاشی، خوشنویسی، خطاطی اور اسی قسم کی دوسری صنعتوں میں ظہور پذیر ہوئی۔ جن میں وہ دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، قلمی کتابوں کے بے شمار نمونے فارس و ترکی قالینوں کے ڈزائن مثال کے طور پر اس قول کے شاہد ہیں مزید براں یہی وجہ ہے کہ جو کامیابی فنِ تعمیر میں مسلمانوں نے حاصل کی وہ شاید کسی دوسری قوم کو نصیب نہیں ہوئی کیونکہ بڑے پیمانے پر چل کر اُن کی حُسن آفرینی کی امنگ کا بھی ایک جولانگاہ تھا۔ مابہ الامتیاز مسلمانوں کی مصوری اور دوسری اقوام کی مصوری میں یہ رہا ہے کہ مسلمان پہلی وہ قوم تھے جس نے جمالیات کو آرٹ میں معیارِ اوّل اور معیارِ آخر قرار دیا اور نہایت دانستہ، اور پورے احساس کے ساتھ حسن آفرینی میں سرگرداں ہوئے۔ تصویر میں خدا پرستی چونکہ مذہبًا ناممکن تھی اس لئے انہوں نے حسن پرستی اپنا مسلک ٹھیرا لیا۔ مسلمان نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے فنی نقاطِ نظر میں سے خالص جمالیاتی نقطۂ نظر کے بانی ہیں یہی اُن کا تمغۂ امتیاز ہے اور یہی فن کی رو سے اُن کے وجود کا کفارہ ہے لیکن اس کل کی بات کو خود ہندوستان کے اکثر تنگ نظر نقاد زبان پر لانے سے گریز کرتے ہیں اور آج وہ دنیا کے لئے ایک بھولا ہوا خواب ہیں اور اس سے زیادہ نہیں +

"جامعہ"

جاؤ میدانِ زندگی میں سرگرمِ عمل ہو جاؤ

اے میرے بیٹو! تم امیر باپ کے لختِ جگر ہو۔ اُس کی آنکھوں کا نور اور سرور ہو، عیش کرو۔ خوشی کی زندگی بسر کرو تمہارے باپ کا دل مردہ ہو چکا ہے۔ سفید بالوں کی سپیدی نے اُس کے جذبات کی گھنگھور گھٹا کو روشن کر دیا ہے۔ آہ! یہ دل جو کبھی عیش و عشرت کی جولانگاہ تھا آج اس میں خاک اڑ رہی ہے، تم مجھے نہ چھیڑو۔ میرا خون سرد ہو چکا ہے اور تمہارا خون گرم ہے، جاؤ تم زندگی کی سردی میں اپنے خون کی گرمی کو آزماؤ۔ یہ تمہارا وقت ہے۔ میں تمہیں نہیں روکتا جاؤ میدانِ زندگی میں سرگرمِ عمل ہو جاؤ۔ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو میں اسی میں خوش ہوں۔ وہ وقت اب خواب و خیال ہو گیا جب ہم عطر میں بس کر نکلا کرتے تھے۔ لوگوں کی انگلیاں ہماری طرف اٹھا کرتی تھیں وزدیدہ نگاہوں سے کسی کا دیکھنا اور دیکھ دیکھ

کر مسکرانا دل میں ایک قیامت برپا کر دیتا تھا۔ اب مجھے پھولوں سے نفرت ہے، خوشبو سے نفرت ہے۔ دوستوں کی محفلوں سے نفرت ہے۔ بلکہ مجھے خود اپنے سے بھی نفرت ہے۔

اب میں اپنے باقی دن سادگی میں گزارنا چاہتا ہوں۔ جاؤ۔ جاؤ مجھے نہ ستاؤ۔

"ادبی دنیا"

باجا

پڑوس میں کسی بچّے نے باجا بجایا۔

بچّے نے اپنی ماں سے کہا "ماں! مجھے بھی ویسا ہی ایک باجا دے"!

غریب ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے اپنے دل کے ٹکڑے کو چھاتی سے لگا کر کہا۔ "یہ گیت نہ سنو گے بیٹا؟"

بچّے نے کہا "نہ ماں! مجھے بھی ویسا ہی ایک باجا لا دے۔ میں بجاؤں تب تُو گا"!

ماں نے کہا "وہ تو امیروں کا باجا ہے"!

بچّے نے "اوں" "اوں" کر کے کہا "نہ ماں! مجھے تو وہی باجا دے۔ میں "ٹھاکر" جی کے "مندر" میں بجاؤں گا"!

وہ زمین پر لوٹ لوٹ کر رونے لگا۔ غریبنی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

یکایک بچہ جیسے سوتے سے چونک کر بول اٹھا ـــــ "ماں! ماں! "میلا" باجا دیکھے گی؟"

وہ دوڑ کر سامنے سے ایک آم کی گٹھلی اٹھا لایا۔ پتھر پر گھسنے کے بعد پھونکتے ہی اُس کی روح بیدار ہو گئی دل کی گہرائیوں سے آواز نکلی اور ساری فضا گونج اٹھی۔

"اب گاؤ ماں! میرے اس باجے پر گاؤ" یہ کہتا ہوا بچّہ اور زور سے گٹھلی میں اپنی جان ڈالنے لگا۔

مامتا کی ماری ماں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلکنے لگے۔ وہ محبت آمیز نظروں سے اپنے بچے کو دیکھتی رہی اُس کے دل میں نہ جانے کتنے گیتوں کے بھاؤ رس برسا رہے تھے لیکن اس باجے سے وہ اپنی آواز کیسے ملائے!

مہارتھی

دوست

دوست! ہماری روح کا آئینہ ہے۔ وہ ہماری آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز ہے۔ سچا دوست خدا کی نعمت ہے۔

جس کو ایک سچا دوست مل گیا اُس کے سامنے تمام دنیا کی نعمتیں کچھ بھی نہیں۔

بحرِ حیات کے تھپیڑے کھائی ہوئی روح دوستی کی آغوش میں لپٹ کر جنت کی خوشی حاصل کرتی ہے۔ باپ کے دروازے سے دھتکارے ہوئے بچے کو مامتا کی ماری ماں کی گود جتنی پیاری لگتی ہے، جیٹھ کی دوپہر میں سفر کرنے والے مسافر کو درخت کا سایہ جتنا طراوت بخش ہوتا ہے اُتنی ہاں اتنی ہی راحت دوست کی دوستی میں ملتی ہے۔

دوست ماں ہے۔ دوست باپ ہے۔ دوست بھائی ہے۔ دوست بہن ہے۔ دوست استاد ہے۔ دوست کا رشتہ عالمگیر ہے لیکن دیکھو دوست دوست میں فرق ہے ـــــ اِس سے بھی زیادہ فرق ہے جتنا دوست اور دشمن میں ہو سکتا ہے۔ سچا دوست خدا ہے تو جھوٹا دوست شیطان ہے۔

میدانِ جنگ میں تلوار کا زخم کھانا ایک بات ہے لیکن ـــــ بستر میں سے سوئی یا کانٹے کا چُبھنا بالکل دوسری بات ہے۔ دوست کی چوٹ دشمن کی چوٹ سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ آہ مت پُوچھو اُس شخص کی بدقسمتی کو جس نے کسی جھوٹے دوست سے دوستی کی۔

دوست کی چوٹ میں بھی ایک قسم کی لذت ہے۔ جان لے دوست کی چوٹ کھا کر بھی اگر تُو نہ سنبھل سکا تو اے دل! تیرا دوست کہلانا فضول ہے۔

سنسکرت

دیپک

اے دمکتے ہوئے دیپکو تم کس کو تلاش کرتے ہو ـــــ تم ضرور آنکھیں ہو ـــــ رات رات بھر جاگ کے صبح کر دینے والے کسی فرقت زدہ کی ـــــ یا کسی مہجورِ الم، ناکام تمنا عاشق کی!

میں نے باغ میں جا کر دیکھا کہ پھول اپنی خوشبو سے کسی کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ درختوں کے جھرمٹ میں چھپی ہوئی کوئل پنچم سُر میں کسی کو پکار رہی ہے اور اب میں دیکھتا ہوں کہ اس گھر کے اندھیرے کونے میں دیپک کسی کو تلاش کر رہا ہے۔

دیپک نے جو کچھ کیا وہ صرف تیاگ (فنا) کے لئے جل کر دنیا کو روشن کرنے کے لئے!

دیپک تیاگ کی مورتی ہے۔ یہ بہت سے پتنگے اُس کے پاس درسِ فنا پڑھ رہے ہیں۔

اے محبت کے دیوانے دنیا میں تو ہی اکیلا تکلیف میں نہیں ہے دیکھ دل میں محبت کی آگ روشن کرنے کی وجہ سے مٹی کے دیپک کو بھی جلنا پڑتا ہے۔

اے دل اگر تو یوں ہی رہ رہ کر بجھے گا تو پھر کسی کو کس طرح پائے گا سنیہی (عاشق) کسے کہتے ہیں جو مزہ ہے وہ اس جلنے والے دیپک سے پوچھ۔

یہ نغمۂ حسن ہے یا پریم کا گیت؟ یہ مٹی کا بے زبان دیپک بھی کیسی دل گداز شاعری کر رہا ہے!

ہندی

تبصرہ

خمکدۂ سرور منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی کا مجموعۂ کلام ہے جسے قاضی محمد غوث صاحب قضا حیدرآبادی نے ترتیب دے کر شائقینِ سرور پر خصوصاً اور دوسرے ادبی ذوق رکھنے والوں پر عموماً بڑا احسان کیا ہے۔ یہ مجموعہ سرور کے تقریباً جملہ مضامینِ نظم اور ایک مضمونِ نثر پر مشتمل ہے۔ حجم تین سو صفحے، کاغذ اچھا اور لکھائی چھپائی معمولی ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے مقرر کی گئی ہے۔

سادگی، روانی، خلوص، درد اور جوش سرور کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ دورِ گزشتہ کی جھوٹی شاعری سے انہیں کوئی واسطہ نہیں، اُن کا ہر خیال اصلیت اور احساس پر مبنی ہے۔ اُن کے کلام میں انتخابِ مضامین کا حیرت انگیز تنوع ہے۔ توحید و فلسفہ، وطنیت و قومیت، جذبات و اخلاقیات، مظاہرِ قدرت و فطرت، غرض کون سا موضوع ہے جس پر انہوں نے نہیں لکھا۔ اگر گنگا اور جمنا جیسی عظیم الشان نہریں اُن کی آنکھوں میں بسی ہوئی ہیں تو "بیر بہوٹی" جیسی حقیر اور نظر انداز ہو جانے والی مخلوق کو بھی وہ نہیں بھولے۔ اگر وہ "تلاشِ حقیقت" میں سرگرداں ہیں تو "بچہ اور ہلال" کے کھیل سے بھی غافل نہیں ہیں۔

انہوں نے ایک طویل نظم "جمنا جی" کے عنوان سے لکھی ہے۔ ذرا اس کے پہلے ہی دو شعروں کی دل کشی اور روانی ملاحظہ ہو۔

دھیمی دھیمی بہنے والی ایک نہرِ دل نشیں
آ بجو چھوٹی سی اک نازک خرام و نازنیں

تشنگیٔ شوقِ گنگا میں بجھانے کے لئے
جا رہی ہے اپنی ہستی کو مٹانے کے لئے

اُن کے اشعار میں ہندی اور ایرانی دونوں رنگ جھلکتے ہیں۔ یہ امتزاج صرف الفاظ و تراکیب تک محدود نہیں بلکہ اس حد سے گزر کر احساسات اور مناظر تک پہنچتا ہے اور بعض مقامات پر بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً اسی نظم میں

یہ وہ جمنا ہے کہ رادھا سی حسین نے مدتوں
برج کی اک پاک دامن نازنیں نے مدتوں

بنسی والے کی جدائی میں اڑا کر سر پہ خاک
اپنے اشکوں سے کیا ہے دامنِ ساحل کو پاک

یہ وہ جمنا ہے جہاں اک بانوِ پردہ نشیں
آگرہ میں محوِ آسائش ہے جو زیرِ زمیں

رُخ سے آہستہ اُلٹ کر چادرِ آبِ رواں
دیکھتی تھی مسکرا کر منظرِ آبِ رواں

حُسن کے داخلی اور معنوی پہلو کی بجائے اُس کے خارجی اور مادی پہلو پر اُن کی نظر بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ لکھنؤ کی شاعری کے انداز میں اُن کا کلام بھی زلف و رخ اور نقاب اور آنچل کے ذکر سے پُر ہے۔ مثال کے طور پر "عروسِ برشگال" سے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

اودی اودی اب گھٹاؤں کا وہ آنچل ہے کہاں
ہلکی پھلکی اب کہاں ہے وہ نقابِ شبنمیں

آسماں پر اب کہاں وہ لکّۂ ابرِ سیاہ
دوشِ نازک پر کہاں اب آہ زلفِ عنبریں

اب کہاں آنکھوں میں ڈورے وہ شفق کے سرخ سرخ
اب وہ مستانہ نگاہیں ہیں نہ چشمِ سرمگیں

ہلکی ہلکی آہ وہ ساون کی جھڑیاں اب کہاں
اُبھرے سینے پر پسینے کے وہ چھینٹے اب نہیں

نیلگوں آنکھوں میں سرمے کے وہ ڈورے اب کہاں سرمگوں اودی گھٹا سے اب کہاں چرخ بریں

سرور کے اُن شعروں میں جو مشہور و مقبول ہیں ضرور کوئی سحر ہے جو ہر خاص و عام کے دل کو یکساں طور پر موہ لیتا ہے۔ کون شخص ہے جس نے اُن کے اِن اشعار کو کئی کئی بار نہیں پڑھا ــــ یا کم از کم نہیں سنا!

نہ وہ کیتکی کی پھبن رہی نہ وہ موتیا کی ادا رہی نہ وہ نسترن نہ سمن رہی نہ وہ گل رہے نہ فضا رہی

نہ گلوں کے اب ہیں وہ قہقہے نہ وہ بلبلوں کے ہیں چہچہے نہ غزل سرا وہ کوئی رہے نہ وہ قمریوں کی صدا رہی

کسی مستِ خواب کا ہے عبث انتظار سو جا کہ گزر گئی شب آدھی دلِ بے قرار سو جا

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غمگسار سو جا

غرض سرور کا کلام واقعی ایک خمکدہ ہے جو پڑھنے والے پر ایک کیفِ سرور کی سی حالت طاری کر دیتا ہے لیکن اس کے باوجود جیسا کہ حضرت جوش ملیح آبادی نے تمہید میں لکھا اس میں اکثر و بیشتر خامیاں موجود ہیں۔ مگر ان کی اس رائے سے بھی ہمیں اتفاق ہے کہ سرور کے سے شاعر کم پیدا ہوا کرتے ہیں ملنے کا پتہ یہ ہے: قاضی محمد غوث صاحب فضا آڈیٹر انجمنہائے اتحادی، سنگاریڈی ضلع میدک (علاقہ حیدرآباد دکن)

فراست الید مصنفہ اشفاق احمد صاحب زاہدی۔ اس کتاب میں ہاتھ کے خطوط کے ذریعہ سے انسان کی سیرت اور زندگی کے گزشتہ موجودہ اور آئندہ حالات دریافت کرنے کے طریقے لکھے ہیں۔ فراست الید ایک قدیم علم ہے جس کی ابتدا حضرت مسیح سے تین ہزار برس پہلے ملکِ چین میں ہوئی۔ جنابِ مصنف نے پہلے اسّی صفحات میں چند مدلل اور مبسوط مضامین میں قوانینِ فطرت، تشریح الابدان اور نفسیات کی رُو سے ثابت کیا ہے کہ گو یہ علم قیافے ہی سے تعلّق رکھتا ہے لیکن پھر بھی اس سے بڑی حد تک معرفتِ نفس حاصل ہوتی ہے اور اُن لوگوں کی سیرت معلوم ہوتی ہے جن سے انسان کو اپنی زندگی میں سابقہ پڑتا ہے۔ اس سے آگے خاص فنّی ابواب شروع ہوتے ہیں جنہیں ایسے آسان اور سہل پیرائے میں لکھا گیا ہے کہ محض ایک دفعہ پڑھ جانے سے ہر شخص بلا تکلف ہاتھ دیکھنے لگتا ہے۔ مزید آسانی پیدا کرنے کے لئے جا بجا نقشے بھی دیئے ہیں حجم ساڑھے تین سو صفحات کے قریب ہے اور کتاب مجلد ہے قیمت درج نہیں کی گئی

پتہ: اشفاق احمد صاحب زاہدی، کوچہ پنڈت، دہلی

گلدستۂ کشیدہ کاری رسالہ "ہمایوں" کی تقطیع پر چالیس صفحات کا مرقع ہے جس میں کئی قسم کے پھولوں پتّوں اور بیلوں کے نقشے دیئے گئے ہیں۔ تمام نقشے نہایت خوبصورت اور صاف ہیں۔ جو بہنیں کشیدہ کاری کا شوق رکھتی ہیں انہیں یہ کتاب ضرور منگانی چاہیئے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ مینیجر دی کشیدہ ڈپو شملہ سے منگائیے۔

سالنامۂ نیرنگِ خیال اس دفعہ تقریباً دو سو صفحات مضامین اور دو درجن چھوٹی بڑی سہ رنگہ و یک رنگہ تصاویر پر مشتمل ہے۔ بعض چیزیں اس میں بہت اچھی ہیں۔ مثلاً مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی کا مضمون "پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر" نور الٰہی محمد صاحبان کا ڈراما "نہمہ خانہ آفتاب" اور جناب حنیف ہاشمی کا مضمون "مضامین کس طرح لکھے جاتے ہیں" حضرت جوش ملیح آبادی کی نظم "فرشتے کی سیر" اور حضرت آرزو لکھنوی کی ایک ہندی غزل قابلِ ذکر ہیں۔ ہم کارپردازانِ نیرنگِ خیال کو ایک اچھا پرچہ مرتب کرنے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اس پرچے کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہے۔ مینیجر نیرنگِ خیال، بارود خانہ لاہور سے طلب فرمائیے۔

تصاویر

ہندی خاتون کی تصویر میاں سر محمد شفیع صاحب بالقابہ کے گول کمرے کی زینت ہے یہ صوبہ بمبئی کی ایک نوجوان خاتون مس منجولا بھنڈارکر کے سحر کار موقلم کا ایک دلاویز نقش ہے جسے انہوں نے بمبئی کی ایک نمائش میں پیش کیا۔ ہم اپنے محترم میاں صاحب کی اس نوازش کے ممنون ہیں کہ انہوں نے یہ تصویر ہمیں "ہمایوں" میں شائع کرنے کے لئے مرحمت فرمائی۔

میاں عبدالعزیز حضرت اعجاز دہلوی کا قول ہے کہ اگر ہمایوں صرف ایک ہی غرض سے ظہور میں آتا کہ فلک پیما کے مضمون دنیا کے سامنے پیش کرے تو اس کی یہی اک ادبی خدمت اُس کی ہستی کی اہمیت کو کافی تھی۔ آج "ہمایوں" کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ وہ بالآخر اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا ہے کہ اس کا "فلک پیما" بزم ہمایوں میں جو عموماً زمین پر منعقد ہوتی ہے عبدالعزیز بن کر بنفس نفیس موجود ہے۔ میاں صاحب دنیا کے لئے ڈپٹی کمشنر، مہتمم بندوبست، ممبر لیجسلیٹو اسمبلی وغیرہ سب کچھ ہوں اور بزم ہمایوں میں فلک پیما، آکاش کا جوگی پرستار حسن، وغیرہ بنتے رہیں لیکن حق یہ ہے کہ وہ خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ وہ سب ہیں ہر دلعزیز نہیں مگر حیثیت میں نگاہوں کو عزیز ہوں اور بس۔

متین و شریر کی تصویریں کتاب "چائیلڈ ان آرٹ" انڈ نیچر" سے لی گئی ہیں۔ پہلی تصویر متانت اور فراست کا مجسمہ ہے اور اُس کی پیشانی سے ذہنی امارت اسی طرح جھلک رہی ہے جس طرح غریبوں کے بچوں کے چہروں سے عسرت نمایاں ہوا کرتی ہے۔ دوسرا بچہ مسرت کا خزانہ معلوم ہو رہا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی اور خوشی ہم معنی الفاظ ہیں۔ اسے کوئی غم نہیں ہے۔

سمندر کی چڑیاں نظارہ کرنے والی آنکھ کے لئے سمندر کے ان پرندوں کی اڑان ایک نہ ختم ہونے والا سحر ہے۔ مصور مسٹر آرتھر ہرنگٹن نے یہاں انہیں ایک کشتی کے گرد چکر کاٹتے ہوئے دکھایا ہے۔ پرندوں کی وضعوں اور حالتوں میں ایک غیر معمولی تنوع ہے لیکن کسی وضع اور کسی حالت میں بھی مصور کے ہاتھ سے لطافت کا دامن نہیں چھوٹا۔

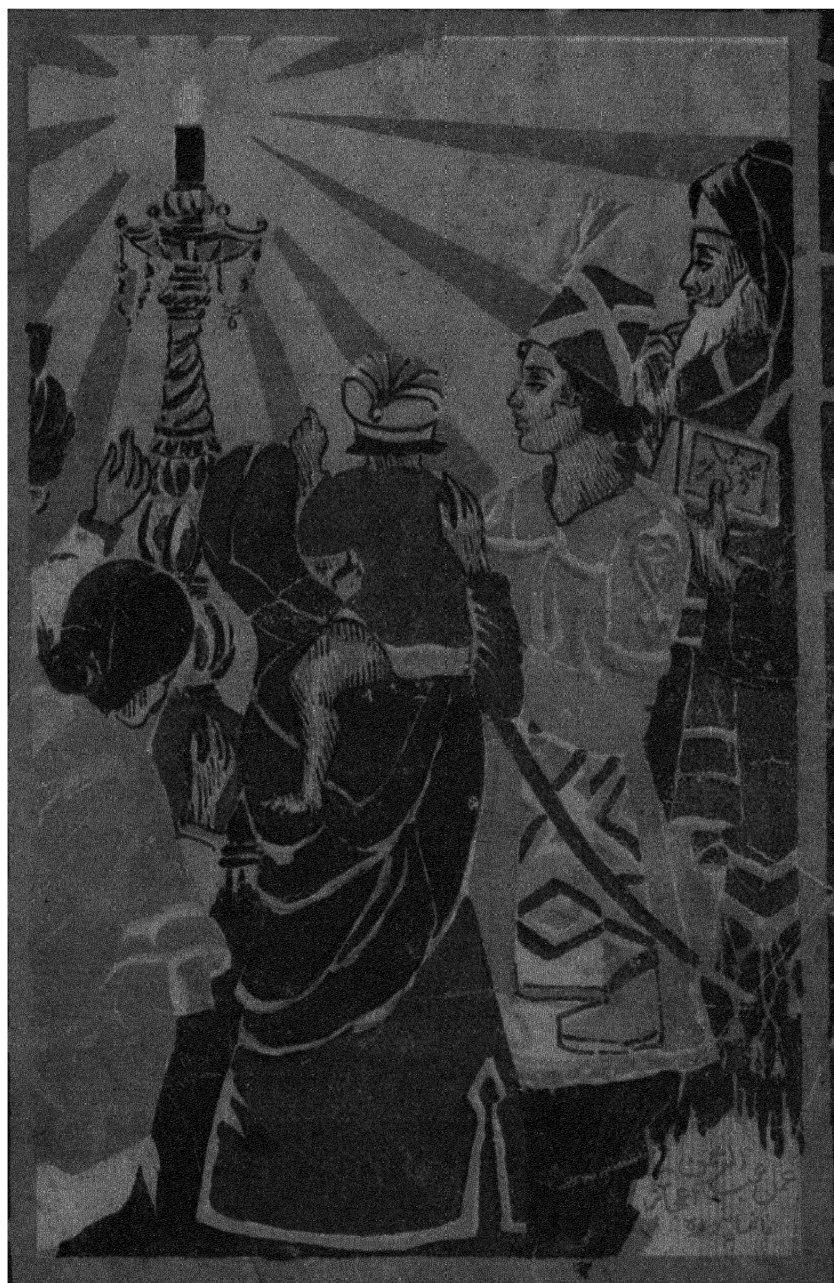
وہ جس نے ڈال رکھا ہے زمانے کو تحیر میں یہ تصویر سی ایم کیو آر ڈسن کی بنائی ہوئی ہے جو انہوں نے رائل اکاڈمی کی ایک سو چالیسویں نمائش میں پیش کی۔ یہ مصور کے فن کا کمال ہے کہ اُس نے تحیر کی ایک کامل فضا پیدا کرنے کے لئے سامنے آئینہ رکھ کر اپنے موضوع کے دونوں رخ دکھا دیئے۔

عالم خیال میں سیونج کوپر کی مصوری کا ایک اثر آفریں نمونہ ہے۔ یہ تصویر رائل اکاڈمی کی ایک سو اٹھائیسویں نمائش میں پیش کی گئی تھی بہار کی فراوانی اور تصور کی موجوں کا زیر و بم قابل دید ہے۔

قبر کا بھید عفریت قبر کے راز کی حفاظت کر رہا ہے۔ یہ مجسمہ لکسم برگ (پیرس) کے عجائب خانے میں رکھا ہوا ہے۔ فرانس کے مشہور سنگ تراش ... کے ہاتھ کا بنایا ہوا ہے۔

مقبرۂ زبیدہ کی تصویر کے لئے ہم میاں محمد اکبر صاحب کے ممنون ہیں، جو ایک عرصہ تک بصرہ اور بغداد میں اقامت پذیر رہے ہیں۔ یہ عمارت اسلامی فن تعمیر کا ایک انوکھا نمونہ ہے۔

سرورق میاں عبدالرحمٰن صاحب اعجاز ساندوی کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے ہم اُن کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ایک قابل مصور ہو کر اس قدر اچھا نقشہ بنا کر دیا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی ہر بیل اور ہر پھول طبعزاد ہے اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو کسی مصور کی سب سے بڑی خوبی سمجھی جا سکتی ہے۔



جسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامۂ فصیحِ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر۔ بشیر احمد۔ بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر۔ منصور احمد

فہرستِ مضامین

جلد ۱۸   بابت ماہِ فروری سنہ ۱۹۳۰ء

تصویر: سرما کی پری

مشہور مصوّر جان میک ورٹر کی یہ تصویر ۱۸۹۸ء میں رائل اکیڈمی کی ایک سو تیسویں نمائش میں پیش کی گئی

چند باتیں

جی چاہتا ہے کہ آپ سے جو آج ہمایوں کو پڑھ رہے ہیں چند باتیں کروں اور آپ سے یا کسی اور سے جو بھی ہمایوں کو پڑھا کرے کبھی نہ کبھی چند باتیں کیا کروں! خشک وعظ سے، نرے مضمونوں سے، جی گھبرا جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ کبھی نہ کبھی باتیں بھی کیا کروں۔ ہمیشہ یہی محسوس نہ کروں کہ کسی علمی مجلس میں، قابل نکتہ چینوں کے سامنے کھڑا تقریر یا تحریریں، اُن کے اور اپنے علم وفضل کی داد دے رہا ہوں۔ فضا میں قابلیت کا سماں ہے، ہوا میں علمیت کی بُو ہے، لیکن عام انسانیت دبک کے کونے میں بیٹھی ہے یا چپکے سے اپنے گھر کو چل دی ہے۔ انجمن آرائیاں تو آج کل ہوتی ہی رہتی ہیں خواہ ہم انہیں چاہیں نہ چاہیں لیکن اس سے یہ بھی نہ ہو جائے کہ دوستوں میں مل بیٹھنے، دل سے دل کی باتیں ہونے کا دستور ہی اٹھ جائے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ بزم ہمایوں کی شان وشوکت سے بھی کچھ الگ ہی الگ ہیں آپ سے جو آج ہمایوں کو پڑھ رہے ہیں چند باتیں کرلوں، گویا آپ یہیں آ گئے یا میں بے تکلفی سے آپ کے ہاں چلا گیا!

کل جب میں "المنظر" سے نکل کر، سامنے کے اس جنت رنگ و بُو کے سبزہ زاروں میں سے گزرتا ہوا پرے کے اُن سرکاری بنگلوں کو پیچھے چھوڑ نہر کنارے جا پہنچا تو اور بیسیوں نہ جانے بُوجھے خیالوں کے جھرمٹ میں، ایک اِس خیال نے بھی پہلی بار سر نکالا کہ اپنے ہمایوں کے پڑھنے والے سے کبھی نہ کبھی چند باتیں کیوں نہ کیا کروں؟ کیوں نہ اُسے بھی اپنے دوستوں کے حلقے میں شامل کرلوں؟ کیوں نہ زندگی کے تالاب میں روزمرہ کی باتوں کا ننھا سا سنگریزہ پھینک کر اس حلقے کے دائرے کو زیادہ ہی زیادہ وسیع کرتا جاؤں؟ کتنے دلوں تک یوں جا پہنچوں! وحدت کو کثرت میں کھو دوں کہ وحدت شاید کچھ سمجھ میں آجائے! اب آج صبح نیند سے جاگا، مشرق کی روشنی دھیرے دھیرے آئی، روح میں کسی وجُود نے حرکت کی، کسی اَن دیکھے نے کان میں کچھ کہا، میں اُٹھ بیٹھا، منہ ہاتھ دھویا، ہاتھ پاؤں اٹھائے پھیلائے پھر دن بھر کے اوقات کی تقسیم کی کہ یہ کچھ کرلیا تو بہت ہے۔ پھر کمرے سے نکلا ننھی کو گود میں لیا، نیچے باغ میں گیا اور مٹر پھولوں کی دورویہ مسکراہٹ کے بیچوں بیچ ہم دونوں نے اک زندگی بسر کی۔ پھر دھیان آیا کہ ابھی دو ایک گھنٹے میں گھنٹی بجنے والی ہے کہ میرے "ساتوں" میں کا ایک آج آئے گا کہ نہ آئے گا۔ اب اوپر آیا ہوں تو اسی شیریں انتظار میں گھڑیاں گذر رہی ہیں! سو باقی اے دوست پھر!

جمعہ ۲۴۔ جنوری ۱۹۳۰ء
صبح ۹½ بجے

ل ب

بہار اور آندھی

(پیشکش بخدمت مسز سروجنی نیڈو صاحبہ)

کہنے لگی سروجنی گاندھی سے ایک دن
یعنی بہارِ پریم کی آندھی سے ایک دن

"اے اِس زمیں پہ حق کی محبّت کے دیوتا
دشمن مسرّتوں کے مشقّت کے دیوتا!

اے تُو کہ تیری رُوح کو سچ کی تلاش ہے
اے تُو کہ تیرے آگے خوشی پاش پاش ہے!

سب پھُول میرے تیرے تھپیڑوں سے جھڑ گئے
جتنے درخت تھے ترے دم سے اُکھڑ گئے

پروا نہیں ہے تجھ کو کہ ناشاد ہوں سبھی
تجھ کو فقط یہ دُھن ہے کہ آزاد ہوں سبھی

پردیسی باغباں کو چمن سے نکال دیں
دیسی زمیں میں دیس کی ہی کھاد ڈال دیں

کہتی ہوں تجھ سے مَیں مرے پیارے مہاتما!
سُن لے مری بھی میرے دُلارے مہاتما!

کم مایہ نوجواں ابھی ہندوستاں کے ہیں
نازک سے پھُول پھل ابھی اِس گلستاں کے ہیں

آہستہ رکھ قدم ابھی اِس باغ میں ذرا
سُن لے ذرا مری مرے پیارے مہاتما!"

بولے حضور "اے مری نیڈو شریمتی!
تو شاعری کی جان ہے لذّت مٹھاس کی

مجھ پر مگر مٹھاس کا تیری اثر نہیں
عورت کے حُسن کا مری آنکھوں میں گھر نہیں

جادو تُو نونہالوں پہ اپنا یہ آزما
آندھی ہوں میں لحاظ مجھے کیا بہار کا!"

آ اور اے سروجنی پھولوں سے کھیل تُو!
جا اور گاندھی اپنے اصولوں سے کھیل تُو!

بشیر احمدؔ

جہاں نما

موسیو کلیمنشو

موسیو کلیمنشو جن کا انتقال گزشتہ نومبر میں ہُوا فرانس کے ایک بہت بڑے سیاسی مدبر تھے۔ انہوں نے کئی سال سے عزلت گزینی اختیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ اُن کا انتقال بھی ایک سادہ اور تنہا مکان میں ہُوا جہاں اُن کا رفیق صرف ان کا شوفر فرینکو برابانت تھا جو زمانۂ جنگ میں بارہا انہیں میدانِ کارزار تک لے گیا تھا۔

زندگی کے چند آخری عرفانی لمحوں کے درمیان انہوں نے کہا: "میں اپنے بسترِ مرگ کے آس پاس عورتوں کو نہیں دیکھنا چاہتا ——— ہاں، نہ عورتوں کو اور نہ آنسوؤں کو۔ میں مردوں کے روبرو مرنا چاہتا ہوں۔" یہاں تک کہ انہوں نے اُس نرس کو بھی جو نہایت توجہ سے اُن کی تیمارداری کرتی رہی تھی اپنے پاس سے ہٹا دیا۔

موسیو کلیمنشو کا آخری اور نیک دلانہ عمل یہ تھا کہ انہوں نے اپنے وفادار خدمت گذار اور شوفر کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ اخبارات کے نمائندوں کو وہ عموماً نہیں ملا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ارجنٹائن کا ایک جریدہ نگار اُن سے ملنے میں کامیاب ہو گیا۔ جریدہ نگار نے پوچھا "آپ سیاسی زندگی کو اس قدر خشک مزاجی سے کس طرح نباہ رہے ہیں؟" کلیمنشو اس سوال کو سُن کر خوش ہوئے اور کہا "سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے والد کی مصائب کو یاد کر کے اس زندگی پر قابو پا لیتا ہوں۔ جب میں کسی سے برسرِ پیکار ہوتا ہوں، یا جب کبھی میں اپنے جمہوری خیالات کو کمزور ہوتے دیکھتا ہوں تو انہیں یاد کر لیتا ہوں۔ بس یہ کافی ہوتا ہے۔ مجھ میں ایک تغیر رونما ہو جاتا ہے اور میں کچھ اَور ہی ہو جاتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں وہی ہوں۔

"میرا باپ بنجمن کلیمنشو ڈاکٹر تھا جیسا کہ میں بھی اس کے بعد ہُوا۔ ایک دن وہ لوگوں کے مصائب کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہُوا کہ غم سے وہ نڈھال ہو گیا۔ اُس نے اپنا دفتر بند کر دیا اور اپنے بیوی بچوں کو لے کر نانٹیز چلا گیا۔ اُس نے اپنی زندگی زراعت اور جمہوری خیالات کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کر دی۔ ۱۸۵۲ء کے شہنشاہیت پرست فرانس میں، نپولین ثالث جیسے شخص کے عہد میں جس نے مجلسِ شوریٰ کو منتشر کر کے خود شہنشاہیت کا تاج زیبِ سر کر لیا، صرف اس بنا پر کہ اُس نے ایک خانگی گفتگو کے دوران میں کہا تھا کہ فرانس کی بہتری کی آخری امید اب صرف جمہوریت

وہ ربطِ عشق، جس کو خبطِ عرضِ حالتِ دل تھا — اُسے بیزارِ عرضِ حالتِ دل دیکھتے جاؤ
وہ ضبطِ شوق، جو کل تک دلِ شیدا کو مشکل تھا — اُسے خوئے دلِ شیدا میں داخل دیکھتے جاؤ

وہ امیدِ وفا، جو باعثِ تسکینِ پنہاں تھی — اُسے شکلِ بلائے یاس نازل دیکھتے جاؤ
وہ ارمانِ لقا، جس کی بدولت زیست آساں تھی — اُسے مہلک بسانِ سمِّ قاتل دیکھتے جاؤ

وہ شوقِ وصل، جو اک دن علاجِ غم میں کوشاں تھا — اُسے فکرِ علاجِ غم سے غافل دیکھتے جاؤ
وہ دردِ ہجر، جو اک دن ضرورت مندِ درماں تھا — اُسے سوئے سکونِ تام مائل دیکھتے جاؤ

وہ نظریں، جو کبھی اک بے وفا سے لڑکے نازاں تھیں — اب اُن کو اپنی بدبختی کا قائل دیکھتے جاؤ
وہ آنکھیں، جو کبھی پروانۂ رخسارِ تاباں تھیں — اب اُن کو گریۂ حسرت میں شاغل دیکھتے جاؤ

وہ اُلفت جس کے استحکام پر دنیا کو حیرت تھی — اب اُس کو مثلِ رنگِ خام زائل دیکھتے جاؤ
وہ بدبختِ محبت جس کی فطرت ہی محبت تھی — اب اُس کو "صبر کر لینے کے قابل" دیکھتے جاؤ

وہ آزادِ حزیں، جو آج تک آزادِ ناقص تھا
اُسے "نازانِ آزادیٔ کامل" دیکھتے جاؤ

حکیم آزاد انصاری

صاحب بہادر

آنکھیں بڑی نعمت ہیں، مگر خدا بھلا کرے ہم ہندوستانیوں کا کہ خدا کی اس نعمت کی کبھی قدر نہیں کرتے۔ سمجھتے ہیں کہ مفت کا مال ہے جس طرح جی چاہے کام میں لاؤ۔ رات کو پڑھو۔ دن کو پڑھو۔ صبح کو پڑھو۔ شام کو پڑھو۔ یا تو ان سے اتنا کام لو کہ بے کار ہو جائیں۔ یا اس طرح چھوڑ دو کہ یہ خود نکمی ہو جائیں۔ دوسروں کو کیا کہوں خود میں نے ان کو تباہ کر لیا۔ جب دیکھو کتاب ہاتھ میں ہے۔ روشنی ہے تو کچھ پروا نہیں۔ اندھیرا ہے تو کچھ پروا نہیں۔ کتاب ہے اور میں ہوں۔ آنکھیں آخر کہاں تک کام دیتیں۔ کمزور ہونی شروع ہوئیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پڑھا۔ آنسو آئے پونچھ لئے۔ ذرا دھندلا دکھائی دیا۔ دھو ڈالا۔ غرض جب ساری ترکیبیں ختم ہو گئیں اور کتاب کے حرف نگاہ کے سامنے سے بھاگنے لگے سامنے بھنگے سے اڑنے لگے اُس وقت خیال آیا کہ آنکھیں گئیں۔ اور گئی نہیں تو کمزور ضرور ہو گئیں۔ اب علاج کی سوجھی۔ سب نے کہا کہ کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ دوستوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے مدراس جانے کی رائے دی۔ بستر باندھ سیدھا مدراس پہنچا۔ آنکھوں کے مریضوں کا جو دواخانہ ہے اس میں جا کر معائنہ کرایا۔ فیسیں بھریں۔ تین چار روز تک دیکھنے کے بعد ڈاکٹروں نے کہہ دیا "ہندوستان میں علاج نہیں ہو سکتا۔ جرمنی جاؤ۔" واپس آیا۔ پھر مشورے ہوئے۔ سب نے کہا کہ "میاں جاؤ۔ آنکھوں سے زیادہ کہیں روپیہ ہے؟" مرتا کیا نہ کرتا۔ بنک کا حساب دیکھا۔ ٹکٹ کا انتظام کیا۔ چلنے کی تیاری کی۔ یار دوستوں سے رخصت ہونے گیا۔ ایک صاحب نے کہا "اجی حضرت کیوں روپیہ تباہ کرتے ہو۔ اگر ولایت جانے کا شوق ہے تو خیر اسی بہانہ سے جاؤ۔ ہاں اگر بال بچوں کے لئے کچھ چھوڑ مرنا ہے تو یہیں علاج کراؤ۔ ولایت والوں میں کونسا سرخاب کا پر لگا ہے۔ ہم لوگ خود اپنے ہندوستانی بھائیوں کو ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ ورنہ جو وہ کر سکتے ہیں وہ ہم کر سکتے ہیں۔ ہاں وہ غیر سمجھ کر لوٹتے ہیں۔ ہم اپنا سمجھ کر ہمدردی کرتے ہیں۔ لو۔ مجھے ہی دیکھ لو۔ میری آنکھوں میں کیا رہا تھا۔ میں تو نہ فرانس گیا نہ جرمنی۔ یہیں علاج کیا اور اچھا ہو گیا۔ اگر روپے سے دشمنی نہیں ہے تو بھائی صاحب بمبئی جائیے۔ ڈاکٹر ڈگن سے ملئے۔ ہاں وہ جواب دے دیں تو پھر آپ کو اختیار ہے۔ کچھ بات تو ہے جو انگلستان کے ماہرانِ فنِ چشم نے اس کو اپنی کانفرنس کا صدر نشین بنایا تھا۔ ہمارا کام سمجھانا تھا سمجھا دیا۔ اب تم جانو تمہارا کام جانے مانو یا نہ مانو۔" میں نے بھی سوچا کہ ہاں بیچارا سچ تو کہتا ہے۔ لاؤ ڈاکٹر ڈگن کو بھی دیکھ لیں کہ کتنے پانی میں ہیں۔ گھر آیا۔ صبح ہی بستر باندھ ریل پر سوار ہو گیا۔ میں بیچارا

ہندوستانی آدمی - سامان بھی کچھ واجبی ہی واجبی ساتھ تھا - لباس کے ساتھ پان دان اور لوٹا صاف ظاہر کرتا تھا - کہ اول نمبر کا قدامت پرست آدمی ہے - انگریزی جانتا ہوں - انگریزوں کے ساتھ مدتوں رہا ہوں - انگریزی کپڑے بھی پہنتا تھا - مگر وہ زمانہ گیا - اب تو کچھ اپنے ہی ملک کے لباس میں آرام آتا ہے - سیکنڈ کلاس میں بیٹھ ٹوپی اتاری شیروانی اتاری - جوتا اتارا جرابیں اتاریں - بچھونا بچھایا - پان دان کھول کر پان کھایا - بچھونے پر لیٹ تکیہ گھٹنوں میں دبا - آرام سے لوٹ ماری -

اس زمانہ میں بعض ایڈیٹروں کے تقاضے نے ناک میں دم کر رکھا تھا - مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا لکھوں پنسل اور کاغذ سرہانے رکھ لیا تھا کہ کچھ سوجھ جائے گا تو لکھ لوں گا - مگر گاڑی کے چکروں میں کچھ ایسا مزا آیا کہ آنکھ لگ گئی - نیند تو ایسی مزے کی آئی تھی کہ شاید بمبئی ہی میں جا کر آنکھ کھلتی - مگر کیا کروں ایک صاحب بہادر کی کرخت آواز نے نیند میں خلل ڈال دیا - آنکھیں تو میں نے نہیں کھولیں - ہاں ذرا ابھی بھی آنکھوں سے گاڑی کا رنگ دیکھا - کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سیاہ فام جوان سے آدمی - نہایت عمدہ سوٹ پہنے - منہ میں سگار دبائے قلیوں سے انگریزی لہجہ کی اردو میں لڑ رہے ہیں - لڑائی ایک ٹین کے لوٹے پر تھی - قلی کہتے تھے کہ حضور کا ہے - صاحب کہتے تھے کہ "ہمارا نہیں ہو سکتا" قلیوں کو شاید یہ ڈر تھا کہ چوری کا الزام نہ لگ جائے - ورنہ اُن کو جھگڑنے کی کیا ضرورت تھی - لوٹا اٹھا کر چلتے بنتے - گھر میں کام آتا - میں سمجھ گیا کہ اِن ہمارے ہندوستانی بھائی کو انگریزیت کا نیا شوق چرّایا ہے - گھر سے لوٹا ساتھ کر دیا ہو گا - یہاں سوٹ پہن کر لوٹا ساتھ رکھتے شرم آتی ہے - اس لئے اس کی ملکیت سے انکار کیا جا رہا ہے - گھڑی گھڑی اُن کا ہاتھ موچھوں پر جاتا اور خالی آتا - اس سے صاف ظاہر تھا کہ موچھیں پہلی دفعہ منڈائی گئی ہیں - رہ رہ کر ٹائی درست کرتے - کوٹ اور واسکٹ کی سلوٹیں نکالتے - یہ اس بات کی دلیل تھی کہ سُوٹ پہننے کی عادت نہیں ہے - ہاتھ میں موٹی سی انگریزی آدابِ مجلس کی کتاب تھی - اس سے سمجھ لیجئے کہ عالم ہو کر یہ کہیں اس پر عمل کرنے جا رہے ہیں - ٹکسوں کی زیادتی بتا رہی تھی کہ سفر کرنے کے عادی نہیں - اس لئے بے ضرورت سامان سمیٹ لائے ہیں - ان خیالات کا دل میں آنا تھا کہ میں جھٹ اُٹھ بیٹھا - سوچا کہ چلو اللہ نے مفت کا ایک مضمون دیا - خدا کرے کچھ عرصہ ساتھ رہے مزا آجائے گا - سب سے پہلے تو میں نے قلیوں کو سمجھایا کہ "بیوقوفوں کہیں صاحب لوگوں کے پاس لوٹا ہوتا ہے جو ان کے پاس ہو گا - چلو - ہٹو - لوٹا پولیس میں دے دو - کوئی دوسرا مسافر چھوڑ گیا ہو گا" صاحب یہ سُن کر مسکرائے اور "تھینک یو" سے میری عقلِ رسا کی داد دی - اس کے بعد نہایت فراخ دلی سے قلیوں کو انعام دیا - بے ترتیب سامان کو بے وجہ ٹٹول ٹٹول کر اور بے ترتیب کر دیا - بندھا ہوا بستر ایک سیٹ پہ

رکھا اس سے تکیہ لگا کر بیٹھے۔ اور اپنی کتاب "آداب مجالس" پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ میں نے پھر لمبی تانی۔ لیکن کن انکھیوں سے اُن کو دیکھتا رہا۔ وہ بھی کبھی کبھی میری طرف دیکھ لیتے تھے کہ سو گیا یا جاگتا ہے۔ میں پہلے سے ان کو دھوکا دینے کے لئے تیار تھا کہ ان کا اصلی رنگ دیکھوں۔ آہستہ آہستہ خراٹے لینے شروع کئے۔ وہ سمجھے کہ چلو یہ تو سو گیا۔ اب اپنا کام کرو۔ چپکے سے ٹفن باسکٹ کھولا۔ چھری، کانٹے اور چمچے نکالے۔ کتاب کو دیکھ کر اسی موافق سامنے جمائے۔ اب تھوڑی دیر کتاب پڑھتے اور تھوڑی دیر خالی چھری کانٹے چلاتے۔ کبھی کبھی انگریزوں کی طرح شکریہ کے طور پر ادھر اُدھر گردن بھی جھکاتے۔ غرض اسی طرح کوئی دو گھنٹے گزار دیئے۔ میں نے کروٹ لی اور انہوں نے آہستہ سے سب سامان ٹفن باسکٹ میں رکھ دیا۔ اسٹیشن آیا۔ گارڈ نے کھانے کے متعلق پوچھا۔ میں نے کھانے کے ٹکٹ کے روپے دے دیئے۔ انہوں نے صاحب بہادر سے بھی دریافت کیا۔ پہلے تو انہوں نے دماغ پر زور ڈالا کہ سبق پر عمل کروں یا نہ کروں۔ پھر شاید خیال آیا کہ کہیں اوروں کے سامنے ہتک نہ ہو جائے۔ نہایت ڈانٹ کر "نو" (نہیں) کہہ دیا۔ گارڈ نے مجھے لا کر ٹکٹ دے دیا۔ اور ہمارے دوست اپنی کتاب کے سرہانے میں اُٹھا ہاتھ منہ دھویا۔ کپڑے پہنے۔ ذرا بھلا آدمی بنا۔ پان کھایا۔ صاحب سے انگریزی میں پوچھا "آپ تو پان نہ کھاتے ہونگے" کہا "نہیں۔ اِس سے دانت خراب ہوتے ہیں"۔ میں نے پوچھا "شاید ولایت کا قصد ہے"۔ کہنے لگے "نہیں۔ اس وقت تو صرف بمبئی تک جا رہا ہوں"۔ میں نے کہا "بمبئی میں کچھ عرصہ تک قیام رہے گا"۔ فرمایا "نہیں صرف چار دن"۔ اس کے بعد ذرا کھلے اور خود سوال شروع کئے۔ پہلا ہی سوال مطلب کا تھا۔ کہنے لگے "بمبئی بہت بُری جگہ ہے۔ کھانا اچھا نہیں ملتا۔ کوئی ہوٹل اچھا نہیں ہے"۔ میں نے کہا "یہ تو نہ فرمائیے۔ تاج محل ہوٹل کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ وہاں آرام نہیں ملتا یا کھانا اچھا نہیں ملتا۔ ہاں خرچ ضرور زیادہ ہوتا ہے"۔ کہنے لگے "اوہ خرچ کی ہمیں پروا نہیں۔ ہم اینگلو انڈینز کو پسند نہیں کرتے۔ ہم ایسی جگہ ٹھہرنا چاہتے ہیں جہاں سب مہذب ہندوستانی ہوں یا سب یورپین"۔ بھلا ایسا موقع ملے اور میں ہاتھ سے جانے دوں۔ میں نے کہا "ایسٹرن ہوٹل میں ٹھہریئے۔ وہاں آپ کو آرام بھی ملے گا اینگلو انڈینز بھی نظر نہ آئیں گے"۔ میرا مطلب دوسرا ہی تھا۔ میں خود اسی ہوٹل میں ٹھہر رہا تھا۔ سمجھا کہ یہ ٹیر ساتھ رہا تو میرا مضمون پورا ہو جائے گا۔ وہ بھلا اس ہیٹر کو کیا سمجھتے جھٹ راضی ہو گئے۔ پھر میری ذات کے متعلق انہوں نے سوالات کی بھرمار شروع کی۔ کیا نام ہے، کہاں پڑھا ہے، کہاں تک پڑھا ہے، کہاں نوکر ہو، کیا تنخواہ ملتی ہے، کتنے بچے ہیں، کیوں بمبئی جا رہے ہو، کب تک رہو گے، کب واپس آؤ گے، انگریزوں میں رہنے سہنے کا اتفاق ہوا ہے، انگریزی آداب مجلس سے واقف ہو، تم خود کس ہوٹل میں ٹھہرو گے، غرض ہزاروں سوال

کر ڈالے۔ جب اُن کو معلوم ہوا کہ باوجود ہندوستانی لباس کے میں انگریزی طرز معاشرت سے بے بہرہ نہیں ہوں اور ایسٹرن ہوٹل میں ٹھہر رہا ہوں تو اُن کے چہرہ پر ذرا ابشاشت سی آگئی۔ سمجھے ہونگے کہ چلو کتاب کے مضمون پر عمل کرنے میں کچھ تو اس سے مدد ملے گی۔

دوسرے اسٹیشن پر میں تو اُتر کھانا کھانے چلا گیا اور ہمارے صاحب بہادر نے معلوم نہیں کیونکر اسٹیشن پر سے پوریاں اور مٹھائی خریدی اور خوب تن تازہ کر شب خوابی کے کپڑے پہن بستر بچھا روشنی گل کر سو گئے۔ ان کا بھانڈا نہ پھوٹتا اگر حمام میں ترکاری اور مٹھائی کے پتّے پڑے ہوئے مجھے نہ ملتے۔ پتّے دیکھ کر میں نے دو نتیجے نکالے۔ اول یہ کہ انہوں نے جو کچھ بھی کھایا حمام میں کھایا تاکہ کوئی یہ دیکھ کر تعجب نہ کرے کہ ایک صاحب بہادر بیٹھے پوریاں کھا رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یا تو گھبراہٹ میں یہ پتّے باہر پھینکنے بھول گئے۔ یا انہوں نے پھینکے تھے اور وہ ہوا کے زور سے پھر الٹے اندر گھس آئے۔ خیر معلوم ہو گیا کہ بمبئی میں اچھی کٹے گی۔

دوسرے دن صبح ساڑھے چھ بجے بمبئی پہنچ گئے۔ یہ تو اسباب سمٹولنے میں رہے اور میں کرایہ کی موٹر لے ایسٹرن ہوٹل پہنچا۔ بیسیوں دفعہ وہاں ٹھہرا ہوں۔ سب سے ملاقات ہے۔ مینیجر صاحب سے ملاقات کیا دوستی ہے۔ پہلے انہی سے ملا۔ اور کہا ایک صاحب آرہے ہیں میرے کمرے کے برابر ہی اُن کو کمرہ دینا۔ اور ذرا اِدھر اُدھر جائیں تو مجھ کو اطلاع کر دیا کرنا۔ اس وقت تو بس اتنا ہی سُن لو۔ باقی پھر کہوں گا۔" خیر میں تو ان سے یہ کہہ تیسری منزل کے کمرہ نمبر ۳۶ میں جا ٹکا۔ اوپر سے دیکھا تو صاحب بہادر کی لدی پھندی دو موٹریں نیچے دروازہ کے سامنے آکر ٹھہریں۔ اسباب چلنا شروع ہوا۔ تھوڑی دیر میں آگے آگے مینیجر صاحب اور پیچھے پیچھے ہمارے دوست آئے۔ کمرہ نمبر ۳۵ کھولا گیا اور اس میں انہوں نے قیام فرمایا۔ مینیجر صاحب اِن سے فارغ ہو میرے پاس آئے اور کہنے لگے "یہ کیا بات ہے جو آپ نے کہا تھا بجنسہ وہی انہوں نے کہا۔ آتے ہی پوچھا کہ ابھی جو صاحب آئے ہیں وہ کون سے کمرے میں ٹھہرے ہیں"۔ میں نے کہا "کمرہ نمبر ۳۶ میں" انہوں نے فرمایا "ہمیں ان کے برابر والا کمرہ دو اور جب وہ میز پر آئیں ہم کو اطلاع دیا کرو"۔ میں نے مینیجر صاحب سے کہا "ذرا تم نیچے جاؤ ابھی میں آکر سارا قصّہ بیان کرتا ہوں۔ اور ہاں میرے کمرے کے سامنے جو ہندوستانی پیخانہ ہے اُس کا لوٹا اٹھوا دو۔ صاحب کو لوٹوں سے بڑی نفرت ہے۔ اسٹیشن پر قلیوں سے لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی"۔ بچارے مینیجر پریشان تھے کہ یہ خاصا بھلا چنگا آدمی دیوانہ تو نہیں ہو گیا۔ کچھ بڑبڑاتے ہوئے رخصت ہوئے۔ تھوڑی دیر میں مَیں نے جا کر اُن کو سب کچھ سمجھا دیا۔ کہنے لگے "بھئی ذرا دیکھنا ایسی کوئی بات نہ ہو کہ ہوٹل بدنام ہو جائے۔ لطف تو ضرور آئے گا۔ مگر یہ بیوپار کا معاملہ ہے"۔ میں نے کہا آپ خاطر جمع

رکھئے۔ بٹلروں سے کہہ دیجئے کہ میں جو مانگوں وہ مجھ کو بلا عذر لا دیا کریں۔ اس میں آپ کا کیا نقصان ہے اور آپ کے ہوٹل کی کیا بدنامی ہے۔ میں شکر کی بجائے اگر کافی میں نمک ڈال کر پیتا ہوں تو آپ کو واسطہ۔ آپ کو اپنی رقم سے کام"۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے اتنا کہنے پر کچھ سمجھ گئے۔ اور خود بھی صاحب بہادر کے آداب مجلس کی عملی تعلیم کا لطف اٹھانے پر تیار ہو گئے۔

ہاتھ منہ دھو کپڑے بدل میں نیچے اترا۔ اور دوسری منزل میں جو کھانے کا کمرہ ہے اس میں داخل ہوا۔ جتنے بٹلر تھے وہ مجھے پہچانتے تھے۔ دیکھ کر ذرا مسکرائے میں سمجھ گیا کہ منیجر صاحب نے ضروری ہدایتیں دے دی ہیں سڑک کے رخ جو میز بچھی ہوئی تھی میں اس پر جا بیٹھا۔ میرے سامنے ایک بڑا آئینہ تھا۔ پیچھے دو میزیں اور تھیں۔ سیدھے ہاتھ پر سڑک تھی۔ اور بائیں طرف اور بہت سی میزیں کرسیاں اور سامان کا کمرہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے صاحب بہادر کو بھی میرے میز پر پہنچ جانے کی اطلاع ہوئی۔ وہ نئے سوٹ میں ٹوپی اتارے سگار پیتے بڑے ٹھاٹھ سے کمرے میں داخل ہوئے۔ ادھر ادھر دیکھا اور کچھ دل میں سوچ کر میری پشت کی جانب جو میزیں بچھی ہوئی تھیں ان میں سے ایک پر بیٹھ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اس طرح بیٹھنا چاہتے ہیں کہ وہ مجھ کو دیکھ سکیں کہ میں کس طرح کھانا کھاتا ہوں اور میں ان کو نہ دیکھ سکوں۔ لیکن شاید ان کو اس کا خیال نہ رہا۔ کہ میرے سامنے یہ بڑا آئینہ لگا ہوا ہے اور ان کے سب حرکات مجھ کو اس میں دکھائی دیتے ہیں۔ جب وہ میرے پاس سے گزرے تو مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ان کے کوٹ کے کالر میں پیچھے کی طرف ایک پرچہ پن سے لگا ہوا ہے۔ بہت غور کیا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر یہ کیا معمّا ہے۔ اتنے میں بٹلر نے پوریج[1] کی رکابی، شکر اور دودھ سامنے لا رکھا۔ میں نے اس سے کہا کہ "منیجر صاحب کو بلاؤ"۔ وہ دروازہ ہی تک گیا ہوگا کہ منیجر صاحب خود مسکراتے ہوئے آئے اور میرے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے آہستہ سے ان سے کہا "مسٹر ذرا چپکے سے یہ تو دیکھ آؤ کہ ہمارے صاحب کے کالر پر یہ کاغذ کیا لگا ہوا ہے"۔ وہ میرے پاس سے اٹھ صاحب کے پاس پہنچے اور پہلو میں کھڑے ہو کر پوچھا "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ اگر کسی انتظام کی ضرورت ہو تو کر دیا جائے"۔ صاحب نے فرمایا "نہیں سب ٹھیک ہے"۔ یہ باتیں کرتے کرتے منیجر صاحب نے اس کاغذ پر بھی نظر ڈال لی۔ مگر کچھ چہ می گوئم میں ہو گئے۔ وہاں سے ٹہلتے ہوئے میرے پاس آئے۔ اور وہی سوال مجھ سے کیا۔ میں نے بھی وہی جواب دیا۔ اور آہستہ سے پوچھا "آپ نے کاغذ

---

[1] پوریج کو بس دلیہ سمجھئے۔ فرق یہ ہے کہ دلیہ کو دودھ اور شکر ملا کر پکاتے ہیں۔ پوریج میں شکر اور دودھ کھانے والا اپنے حسب خواہش ملا لیتا ہے۔

دیکھا" کہا "ہاں دیکھا" اس میں کیا لکھا ہے "ساڑھے سات سے ساڑھے دس تک۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے کیا معنی ہیں" میں نے کہا "آپ نہ سمجھے ہوں میں تو سمجھ گیا۔ صاحب نے نئے سوٹ بنوائے ہیں اور اپنی کتاب دیکھ کر ہر سوٹ پر اُس کے پہننے کا وقت لکھ دیا ہے۔ یہ ساڑھے سات سے ساڑھے دس تک پہننے کا سوٹ ہے۔ گھبراہٹ میں کاغذ نکالے بغیر سوٹ پہن آئے چلو ان کی صاحبیت کا کچھ تو رنگ معلوم ہو گیا۔ اب دیکھو دوسرا تماشا دکھاتا ہوں" صاحب بہادر اس وقت اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ میں نے اپنی رکابی اس طرح رکھی کہ وہ دیکھ سکیں کہ میں پورج کس طرح کھاتا ہوں۔ میں نے نمک کا چمچا بھر ا رکابی تک لایا اور اس طرح الٹا کہ نمک بجائے رکابی کے میرے نپکن[۵] میں گرا۔ اس طرح دو تین چمچے بھر بھر کر ڈالے۔ بعد میں سرکہ کی بوتل لی۔ اس کے منہ پر انگلی رکھ کر اس طرح الٹی گویا سرکہ ملا لیا۔ صاحب اخبار کی آڑ سے میری ان حرکات کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد رکابی میں نے ذرا سرکا کر اپنے سامنے کر لی اور جلدی جلدی شکر کے دو تین چمچے ڈال دودھ انڈیل چمچے سے ملا پھر رکابی ذرا اُن کی طرف کر کے کھانا شروع کیا۔ وہ پورج کھانے کی ترکیب سمجھ گئے۔ نہایت اطمینان سے دل کھول کر نمک اور سرکہ ملایا اور چمچہ سے کھانا شروع کیا۔ منیجر صاحب اور بٹلروں کو ہنسی آئی۔ بچاروں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا اور ایک ایک کر کے سب سرک گئے۔ اس کے بعد میں نے جو چیز کھائی ذرا سلیقہ سے کھائی اور صاحب نے بھی ہو بہو نقل اتاری۔ یہ میں نے اس لئے کیا کہ کہیں کھٹک نہ جائیں اور مزا کرکرا ہو جائے۔

اس کے بعد میں جے جے اسپتال میں ڈاکٹر ڈگن سے ملنے کا وقت دریافت کرنے کے لئے چلا گیا۔ پھر پھرا کر کوئی ایک بجے واپس آیا۔ دیکھا کہ صاحب بہادر اپنے کمرے میں براج رہے ہیں۔ شاید اُن کو میرے آنے کا ہی انتظار تھا۔ کیونکہ ادھر میں کھانے کے کمرے میں آیا اور اُدھر وہ بھی آ پہنچے۔ لنچ شروع ہوا۔ پہلے تو صحیح صحیح کارروائی ہوتی رہی۔ اس کے بعد میں نے توس اٹھایا چھری سے اس پر مکھن ملا۔ رائی کی بوتل میں چھری ڈال تھوڑی سی رائی نکالی اور ذرا پہلو بدل اس طرح ہاتھ چلایا گویا توس پر رائی مل رہا ہوں۔ بہلا نقل را چہ عقل۔ انہوں نے بھی کچھ انتظار کر کے پوری نقل اتاری۔ ادھر میں نے توس منہ میں رکھا اور اُدھر انہوں نے اپنے توس پر منہ مارا۔ خبر نہیں بچارے کے حلق پر کیا گزری۔ ہاں آئینہ میں یہ ضرور دیکھا کہ ایک دفعہ ہی اُن کے چہرے کی حالت کچھ بدل سی گئی۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ منہ سے نوالہ نکال کر پھینک دیں مگر میں ایک دفعہ ہی اُن کی طرف مڑ گیا۔ اب بچارے کو نہ نوالہ اگلتے بنتی ہے نہ نگلتے۔ آخر کسی نہ کسی طرح حلق سے اتار ہی لیا۔ اس کے بعد میں نے

---

[۵] نپکن رومال جیسا چوکور موٹا کپڑا ہوتا ہے جو کھاتے وقت گود میں پھیلا لیتے ہیں تاکہ کھانا گرنے سے کپڑے خراب نہ ہوں۔

اُن سے باتیں شروع کیں۔ باتیں کرتا جاتا اور توس کھاتا جاتا۔ انہوں نے بھی ڈرتے ڈرتے توس کا دوسرا ٹکڑا منہ میں رکھا اور سوڈے کے سہارے نیچے اتارا۔ خدا خدا کر کے توس ختم ہوا میں نے بھی اس سے زیادہ کارروائی کرنی مناسب نہ سمجھی۔ نیپکن پلیٹ میز پر ڈالا اور اُٹھ کھڑا ہوا تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی اپنے کمرے میں آ گئے۔ اور حمام میں جا کر کلیاں کرنی شروع کیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہزاروں ہی کلیاں کر ڈالیں جب کہیں جا کر کچھ ٹھنڈک پڑی۔ مجھے افسوس بھی ہوا، اور ہنسی بھی آئی۔ افسوس تو اس لئے ہوا کہ بیٹھے بٹھائے ایک غریب کا منہ جھلنی کر دیا۔ اور ہنسی اس بات پر آئی کہ اِس بیوقوف کو صاحب بننے کی کیا ضرورت تھی۔ خیر لنچ بھی خاصہ مزے سے گزر گیا۔

سہ پہر کو میں ڈاکٹر ڈگن سے ملا۔ تمام کیفیت بیان کی۔ اپنے مدراس جانے کا ذکر کیا۔ وہاں والوں کی رائے ظاہر کی کہ کس طرح کئی گھنٹے آنکھوں کا امتحان کرنے کے بعد مجھے صاف جواب دے دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے دو باتیں ایسی کہیں کہ میرے دل کو لگ گئیں۔ کہنے لگے "میں کسی کی برائی نہیں کرتا۔ ہاں یہ ضرور کہتا ہوں کہ آنکھوں کا زیادہ دیر تک امتحان کرنا کچھ مفید نہیں ہوتا۔ مریض کی آنکھیں گھورتے گھورتے پتھرا جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد صحیح نتیجہ نکالنا دشوار ہوتا ہے۔ اب رہی تمہاری حالت تو اس کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ آنکھوں کا تم کو کوئی مرض نہیں ہے۔ صرف صحیح نمبر کی عینک کی ضرورت ہے۔ ولایت جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔ مگر یہ سمجھ لو کہ جو کچھ میں کر سکتا ہوں اس سے زیادہ کی وہاں بھی تم کو توقع نہ رکھنی چاہئے۔ یورپ والوں کی یہ کیفیت ہے کہ بچپن ہی سے آنکھوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ذرا کچھ فرق آیا اور آنکھ کے ماہر فن کے پاس پہنچے۔ علاج کیا۔ عینک لی چلو چھٹی ہوئی۔ ہمارے ہاں لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جب آنکھیں بالکل تباہ ہو جاتی ہیں اُس وقت علاج کا خیال آتا ہے۔ خیال آنے اور اُس پر عمل کرنے میں بھی برسوں گزر جاتے ہیں۔ آخر خدا خدا کر کے ڈاکٹر کے پاس آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آج ہی اچھے ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ روزانہ جتنے رنگ برنگ کے مریض ہمارے دیکھنے میں آتے ہیں ویسے ولایت کے ڈاکٹروں کو برسوں میں بھی نہیں ملتے۔ اور جتنے آپریشن ہم ایک ہفتہ میں کر لیتے ہیں وہاں کے ماہرین فن کو سال بھر میں بھی نہیں کرنے پڑتے۔ اس لئے یہ خیال تو بے کار ہے کہ ولایت جا کر تم یہاں سے کچھ زیادہ فائدہ حاصل کر سکو گے۔ ہاں اپنے اطمینان کے لئے جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ" میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب اندھا کیا چاہے دو آنکھیں جب یہیں مجھ کو آرام ہو جاتا ہے تو پھر میں کوئی دیوانہ ہوا ہوں کہ خواہ مخواہ روپیہ خرچ کر کے جرمنی یا فرانس جاؤں۔ اچھا اب آپ عینک کے نمبر نکالئے" اس میرے شیر نے دس

منٹ میں نمبر نکال میرے حوالہ کئے۔ اس کے بعد کچھ سوچ کر کہا "خیر ٹھہرو۔ میں دوا ڈال کر بھی نمبر دیکھ لیتا ہوں۔ اگر تھوڑی بہت کچھ غلطی ہوئی ہے تو وہ بھی نکل جائے گی" یہ کہہ میری آنکھوں میں انہوں نے دوا ڈالی۔ اور دوسرے روز سہ پہر کو آنے کی ہدایت کی۔ یہاں سے نکل میں پھرتا پھراتا شام کو ہوٹل پہنچا۔ دوا پڑنے سے ذرا آنکھ میں پردہ سا آگیا تھا۔ اس لئے رات کا کھانا میں نے اپنے کمرے ہی میں کھایا۔ صاحب بہادر نے بھی میری تقلید کی۔ دوسرے دن بھی میں کھانے کے کمرے میں نہیں گیا۔ مگر چونکہ ہمارے صاحب ان دو وقت کے کھانوں سے واقف ہو چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے ناشتا اور لنچ کھانے کے کمرے ہی میں جا کر کھایا۔ مینجر صاحب میری خیریت پوچھنے آئے۔ ان سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ صاحب نے کل کا سبق پوری طرح دہرایا۔ ہاں اس روز توس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ سہ پہر تک میری آنکھیں صاف ہو گئیں۔ میں نے جا کر ڈاکٹر ڈگن کو دکھائیں۔ معائنہ کے بعد انہوں نے کہا کہ "میرے پہلے اور اب کے نمبروں میں فرق نہیں ہے۔ آپ شوق سے انہی نمبروں کی عینک خرید لیجئے بہت دنوں کام دے گی مگر جب اتر جائے تو مجھ سے آکر ضرور ملئے۔ کہیں اترے ہوئے نمبروں کی عینک نہ لگائیے بیٹھئے۔ آنکھیں ستیاناس ہو جائیں گی"۔ وہاں سے نمبرے میں دنشا ایم دستور کی دوکان پر پہنچا نمبر دیئے۔ انہوں نے دوسرے روز عینک دینے کا وعدہ کیا۔ اور میں چوپاٹی، اپالو بندر اور ہار نبی روڈ کی سیر کرتا ہوا رات کو کوئی ساڑھے سات بجے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ چونکہ میرے قیام کا یہ آخری دن تھا۔ اس لئے مجھے شرارت سوجھی۔ کھانے کے کمرے میں جو سامنے الماری تھی اس میں سلفر بٹرز[۱] کی بوتل خبر نہیں کیوں رکھی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ صاحب کو آج یہ پلا دو۔

رات کو کھانے کے لئے کمروں میں سے ہم دونوں ساتھ نکلے۔ میں نے صاحب سے پوچھا "فرمائیے کچھ پینے کا بھی شوق ہے"۔ کہنے لگے "ہاں پیتا ہوں مگر کم۔ زیادہ پینا صحت کو مضر ہے"۔ میں سمجھ گیا کہ یہ پینے پلاتے نہیں۔ صرف انگریزی کپڑوں کی لاج رکھنے کے لئے پینے کے دعوے دار ہو گئے ہیں۔ خیر نیچے آکر وہی اپنی اپنی نشستوں پر دونوں بیٹھ گئے۔ کھانا شروع ہوا میں نے بٹلر کو آواز دی۔ کہ سلفر بٹرز کا ایک پگ لاؤ"۔ وہ بیچارا گھبرایا کہ میں کہیں اس بھلے آدمی کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ سیدھا مینجر صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ سمجھ گئے کہ کچھ تماشا ہونے والا ہے۔ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے بٹلر دونوں کمرے میں آئے۔

---

[۱] سلفر بٹرز فساد خون کی دوا ہے۔ شاہترہ چرائتہ اور چند اور تلخ ادویات کے عرق میں گندھک کو حل کر کے بنائی گئی ہے ایسی تلخ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔

بٹلر نے الماری کھول سلفر بٹرز کی بوتل سے ایک پگ نکال میرے گلاس میں لاڈالا۔ میں نے سوڈا منگوا کر گلاس بھر لیا۔ اور کھانا شروع کیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گلاس اٹھا تا منہ تک لے جاتا۔ اور پھر گلدان کی آڑ میں رکھ دیتا کہ کہیں صاحب یہ نہ دیکھ لیں کہ بھرے کا بھرا گلاس ہے۔ میرے دیکھا دیکھی انہوں نے بھی سلفر بٹرز کا ایک پگ لے کر اُس میں سوڈا ملوایا۔ اس کے بعد جو ایک گھونٹ لیا تو قیامت آگئی۔ میرے ہاں تو برابر گھونٹ پہ گھونٹ چل رہا تھا۔ وہ بھلا ہاتھ روک کر کیوں اپنی ہتک کراتے۔ کسی نہ کسی طرح پتے ہی گئے۔ بٹرز ایک قسم کی شراب بھی ہوتی ہے۔ سمجھے ہونگے کہ جس بٹرز کا ذکر اُن کی کتاب آداب مجلس میں ہے شاید وہ یہی ہوگی۔ غرض گلاس ختم کرنا مشکل ہوگیا۔ بڑا گھونٹ لیں تو حلق سے اترنا مشکل۔ چھوٹے گھونٹ لیں تو گلاس کا ختم ہونا دشوار۔ آخر بصد خرابی بصرہ کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد گلاس ختم ہؤا۔ مگر صاحب بہادر کی طبیعت کچھ ایسی بگڑ گئی کہ میٹھا کھائے بغیر میز پر سے اٹھ گئے۔ کمرہ میں جاکر اُن پر کیا گذری یہ تو خدا کو معلوم ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ دوسرے دن بیچارے نے دو وقت کا فاقہ کیا۔ میں دوسرے دن دوپہر کو دنشا کی دوکان پر گیا اور عینک لے آیا۔ ایسی ٹھیک بیٹھی کہ دل خوش ہوگیا۔ اب گھر چلنے کی سوجھی اور شام ہی کو روانہ ہوجانے کا ارادہ کرلیا۔

جب دوسروں کی ہنسی اڑائی تو اپنی بیوقوفی کو کیوں چھپاؤں۔ ایک مسلمان بھائی نے مجھے بھی بیوقوف بنایا اور خوب بنایا۔ دنشا کی دوکان سے میں ٹریم میں سوار ہؤا۔ میرے ساتھ ساتھ ایک بھلے آدمی ٹریم میں داخل ہوئے۔ اُن کی شکل اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ چھریرا بدن۔ سفید رنگت۔ میانہ قد۔ بھورے بال۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ جسم پر خاکی کوٹ پتلون۔ کوٹ کے اوپر بغیر ہاتھوں کی کیپ دار برساتی۔ جب ٹریم میں وہ میرے پاس سے گذرنے لگے تو مجھے ایسا معلوم ہؤا کہ میری شیروانی کی جیب میں سے روپوں کا بٹوا کچھ خود بخود اُوپر کو اٹھا چلا آرہا ہے۔ میں نے ایک دفعہ ہی جیب پر ہاتھ ڈالا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بٹوا جیب سے آدھا باہر آگیا۔ خیر بٹوے کو اندر کیا اور اُن صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرایا کہ آپ تیز ضرور ہیں۔ مگر میں آپ سے بھی کچھ زیادہ تیز ہوں۔ انہوں نے شرما کر گردن نیچے کرلی۔ تھوڑی دیر میں ٹریم ٹھہری۔ دو آدمی اندر آئے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ان صاحب سے ان کی کچھ باتیں ہوگئیں۔ اس وقت تو میں نہیں سمجھا تھا مگر ہاں بعد میں سمجھ میں آیا کہ یہ دونوں ان حضرت کے ساتھی تھے۔ خیر یہاں سے چل کر ٹریم کرافورڈ مارکٹ پر رُکی۔ ترکی ٹوپی والے صاحب پہلے اتر گئے۔ اور اُن کے دونوں یار بھی اترنے کو ایک ساتھ بڑھے۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ دونوں دروازہ میں پھنس گئے۔ مجھے اترنے کی جلدی تھی۔ میں ان دونوں کو چیر کر نیچے اتر گیا۔ جو صاحب پہلے نیچے اُترے تھے اُن کو دیکھ کر میں

مسکرایا کہ جناب ہر شخص کی جیب میں سے بٹوا نکالنا آسان کام نہیں ہے۔ مگر بجائے شرمندہ ہونے کے وہ بھی مسکرائے اور ایک طرف کو چل دیئے۔ اب جو جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو بٹوا غائب۔ اس وقت اُن لوگوں کی ترکیب سمجھ میں آئی کہ ایک صاحب نے نیچے اتر کر مجھے مطمئن کر دیا۔ دو نے اس طرح راستہ روکا کہ مجھے ان کو دونوں ہاتھوں سے ہٹانا پڑا۔ ان میں سے ایک نے اس کشمکش میں بٹوا غائب کر دیا۔ غنیمت یہ ہوا کہ جتنے روپے میں لے کر گیا تھا وہ عینک والے کو دے آیا تھا۔ شاید پانچ روپے کا ایک نوٹ اور کچھ آنے رہ گئے تھے۔ ہاں ڈاکٹر ڈگن نے عینک کے جو نمبر دیئے تھے وہ بٹوے کے ساتھ گئے۔ واقعی کسی نے سچ کہا ہے مَنْ ضَحِکَ ضُحِکَ (جو دوسروں پر ہنستا ہے اس پر دوسرے ہنستے ہیں) بہرحال میں ہوٹل میں سے جا کر اور روپے لایا۔ دوسرا بٹوا خریدا۔ دنشا کے ہاں جا کر نمبروں کی نقل لی۔ لیکن اس کارروائی نے کچھ ایسا کھسیانا کر دیا کہ پھر اپنے صاحب بہادر کو بھی بھول گیا۔ سات بجے کمرے ہی میں کھانا منگا کر کھا لیا۔ اور ساڑھے آٹھ بجے کے میل سے روانہ ہو گیا۔ بلا سے روپے گئے تو گئے ایک مزے دار مضمون تو مل گیا۔ ہاں یہ کہے دیتا ہوں کہ پڑھنے والے حضرات براہِ کرم حتی المقدر اس کو فرضی قصہ سمجھنے کی کوشش کریں تو زیادہ مناسب ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

میرا دل

میرا دل ایک موسیقی نواز پرندے کی مانند ہے
جس کا نشیمن ایک شاداب اور سرسبز شاخ پر ہے۔
میرا دل ایک سیب کے درخت کی طرح ہے
جس کی ٹہنیاں پھلوں کے بوجھ سے جھکی پڑتی ہیں۔
میرا دل ایک قوسِ قزح کی مثال ہے
جو خاموش سمندر کے پانی سے کھیلتی رہتی ہے۔
میرا دل اِن تمام چیزوں سے زیادہ مسرور ہے
کیونکہ میرا محبوب میرے پاس آ گیا ہے۔

(سی۔ جی۔ روزیٹی)

محشر عابدی

غزل

ملیں عدم کی حدوں سے حدیں زمانے کی
کہاں پہنچ کے کڑی ٹوٹی اِس فسانے کی

یہ جذب کیا ہے کہ تصویر خانۂ دل میں
ہر ایک نقش کو حسرت ہے بیٹھ جانے کی

جو آنکھ والے ہیں دنیا کی سیر کیا دیکھیں
وہ دیکھتے ہیں ادا تیرے منہ چھپانے کی

یہ کس کی زلفِ سیہ تاب کے کرشمے ہیں
چمکتی جاتی ہیں تاریکیاں زمانے کی

در ایسے وقت میں زندانِ شش جہت کے کھُلے
کہ جب نہیں رہی طاقت قدم اُٹھانے کی

فلک نہ ٹوٹ پڑے سر پہ دیکھ او غافل
سنبھل کے چل کہ بنا سُست ہے زمانے کی

ہمیں سے دامنِ محشر کی گود بھرتی ہے
نہ جانیں خاک ہیں ہم کس کے آستانے کی

وہ چند سُوکھے ہوئے تنکے یوں تو کیا تھے مگر
قفس میں آ ہی گئی یاد آشیانے کی

جو تیرے دیکھنے والے ہیں اُن کی نظروں میں
نظر فریبیٔ دنیا نہیں سمانے کی

بیانِ حالِ پریشاں میں تیرا نام آیا
کچھ اَور بڑھ گئیں بے ربطیاں فسانے کی

کرشمے سارے دلِ خوں شدہ کے ہیں ہمدم
اسی کے دم سے ہیں نیرنگیاں زمانے کی

ہوئی ہے پردے میں حسنِ چمن کی پردہ دری
دغا نزاکتِ پیراہنِ صبا نے کی

اب اہلِ درد کو یہ تیری یاد آتی ہے
کہ حسرتیں ہیں انہیں تجھ کو بھول جانے کی

وہ بے نیاز کہ جذبِ نہاں پہ اپنے فراقؔ
نثار کرتے ہیں دلچسپیاں زمانے کی

فراقؔ گورکھپوری

پُجاری سے

پجاری جی

مجھ پاپی کے من میں بھی تپسیّا کی بڑی اچھیا ہے پر مہاراج مُورتی کوئی بڑی من موہنی سی ہو۔ مہاراج جی جس طرح تم ماتھا ٹیکنے کے بَلی وان ہو، گنّو ہو کہ ناگ ہو، تمہارا ماتھا جُھک جاتا ہے اسی طرح مہاراج جی یہ پاپی بھی پریم کی پوجا پاٹ میں چوکس ہے پرماتما نگر میں پریت کی جمنا بہتی ہے اور یہ کرشن جی کا چیلا بن دیکھے بھالے اشنان کا دھنی ہے۔ مہاراج جی اس ندی میں جو بہہ گیا سو جی گیا۔

پجاری جی

تم ملیچھوں کی کتھا پر نہ جاؤ۔ وہ جو مُسلا کہتا ہے

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدے کے بُت ہوگئے پرانے

انت جھوٹ ہے۔ مہاراج جی بُت پرانے اچھّے پر تپسّیا نئی بھلی۔ مہاراج! میں سوتی مورتیوں کو جگاتا ہوں کہ شور ہو۔ تم جاگتی مورتیوں کو سُلاتے ہو کہ شانتی ہو۔ تم مہاراج، کاشی جی چل کے جاؤگے یا جل کے پہنچوگے مگر اس پاپی پاس کاشی جی چل کے آئے! مہاراج! میری مانو، گلے ملو، ملاؤ اور بنو

پاپی



دنیائے اسلام اور آزادیٔ نسواں

(اس مضمون کی اکثر تفصیلات فرانسیسی "مجلّۂ اسلامیات" سے ماخوذ ہیں)

گذشتہ پچاس سال کے اندر دنیا کی اطراف وجوانب میں جو سیاسی اور معاشرتی انقلابات ظہور پذیر ہوئے ہیں ان کا مطالعہ تاریخ عالم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نہایت بصیرت افروز ہے۔ ان انقلابات کا مرکز کرۂ ارض کا کوئی خاص خطّہ نہ تھا بلکہ ہر ملک نے بقدرِ استطاعت اس میں حصّہ لیا اور ہر قوم بقدرِ امکان اس میں شریک ہوئی۔ اس عالمگیر جدوجہد کا مطمحِ نظر کسی خاص ملک وقوم کی آزادی نہیں بلکہ بنی نوعِ انسان کی آزادی تھا جس کے وسیع اثر نے عورتوں کو جو ایک مدتِ مدید سے مردوں کی محکوم ہو چکی تھیں اُن کے دوش بدوش لاکر کھڑا کردیا۔ عورتوں نے اپنی پیہم مساعی سے وہ اقتصادی ومعاشرتی اقتدار حاصل کیا جس کے فقدان نے ایک عرصے سے انہیں سر اُٹھانے نہ دیا تھا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ طبقۂ نسواں کی یہ آزادی اور مردوں کے مقابلے میں حریفانہ پیش قدمی مفید ہے یا مضر لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ آج یہ چیز مغربی تہذیب کی نمایاں شان سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کا اثر رفتہ رفتہ مشرقی اقوام اور بالخصوص دنیائے اسلام پر پڑ رہا ہے۔ ٹرکی، افغانستان، عرب، اور بالخصوص روس کی عورتیں نہایت سرعت کے ساتھ اس آزادی کو قبول کر رہی ہیں، اور قرآن وشریعت کے احکام کے باوجود بڑی جرأت و بے باکی کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہو رہی ہیں۔

اس آزادی میں سب سے اہم اور قابلِ غور شئے پردے کا اٹھ جانا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ قرآن کی رُو سے پردے کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اتنا تسلیم ہے کہ مسلمان عورتیں (جیسا کہ لفظِ مستورات سے ظاہر ہے) صدیوں سے بالکل خلوت میں زندگی بسر کرتی رہی ہیں، اور انہیں خانگی امور کے علاوہ تمام قومی اور معاشرتی مہمّات سے محروم رکھا گیا ہے۔ سوائے کرد، ترکمان، اور دیگر خانہ بدوش اقوام کی عورتوں کے جن کا بے پردہ ہونا اُن کی خاص طرزِ زندگی اور معاشرت کا لازمی نتیجہ تھا دنیائے اسلام میں عورتیں ہر جگہ محجوب ومستور رہی ہیں۔ ان متذکرہ بالا امور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے موجودہ انقلاب کی اہمیت بہت کچھ بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ ہم ذیل میں مختلف ممالکِ اسلامیہ کی عورتوں کا ذکر کرتے ہیں اور سب سے پہلے ایران کو لیتے ہیں۔

ایرانی عورتوں کی موجودہ حالت تقریباً وہی ہے جو آج سے چند صدیاں پیشتر تھی۔ انہوں نے جب کبھی سیاسی یا معاشرتی حقوق حاصل کرنے کی کوشش کی، تو وہ کوشش مردوں کی شدید مخالفت کے باعث کامیاب نہ ہو سکی۔ آج سے کچھ عرصہ پیشتر طہران میں عورتوں کی ایک مختصر سی جماعت نے مغربی تعلیم حاصل کر کے حقوقِ نسواں کے لئے جدوجہد شروع کی، چنانچہ ۱۹۲۱ء میں "عالمِ نسواں" کے نام سے چند پڑھی لکھی عورتوں کی سرپرستی میں ایک رسالہ جاری کیا گیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ کیونکہ اُس کے اغراض و مقاصد شعائرِ اسلام کے خلاف سمجھے گئے، مگر اس کے فوراً بعد ایک اور رسالے کا اجرا ہوا جس کا نام "زبانِ نسواں" تھا۔

اِس رسالے کی بانیہ صدیقہ دولت آبادی تھی، جو اپنے آزادانہ خیالات کے باعث ایران بھر میں مشہور ہے۔ اُس نے جس ایثار و فدویت کے ساتھ اپنی زندگی اور اپنے محدود وسائل کو اپنی ایرانی بہنوں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کیا وہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔ یہ عورت نہایت عالی نسب تھی۔ اس کا والد اصفہان کا مجتہد تھا اور اس کے دو بھائی "مجلس" کے ممبر تھے۔ وہ اپنے ہفتہ وار اخبار کی ادارت کے فرائض خود ہی انجام دیتی تھی۔ اس رسالے میں تعلیمی و تدریسی مسائل کے علاوہ ایران کے سیاسی حالات و امور پر بھی بحث ہوتی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اخبار بھی حکومت کی طرف سے بند کر دیا گیا۔

صدیقہ کے خیالات کی نشر و اشاعت کا ذریعہ محض اخبار ہی نہ تھا۔ اُس نے طہران میں خواتینِ ایران کی ایک انجمن بھی قائم کی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ایران کی عورتوں کو یورپ کے طرز پر تعلیم حاصل کرنے کی رغبت دلائی جائے، چنانچہ وہ اِس غرض سے ۱۹۲۳ء میں پیرس پہنچی اور وہاں سے امریکہ چلی گئی، اور واشنگٹن میں اُس نے ایرانی خواتین کی طرف سے زنانہ "مجلسِ بین الاقوامی" میں شرکت کر کے نمائندگی کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے۔ واپسی پر وہ پیرس پہنچی اور وہاں ۱۹۲۷ء تک مطالعہ میں مشغول رہی۔ چنانچہ اُس نے جب دوبارہ ایران کی سرزمین پر قدم رکھا تو وہاں کی حکومت نے اُسے زنانہ مدارس کی افسرِ معائنہ مقرر کر دیا۔ اس کی ابتدائی کوششیں تمام تر اس امر میں صرف ہوئیں کہ عورتوں کو آزادی کے جائز حقوق مل جائیں۔

ٹرکی اور افغانستان کے مقابلے میں ایران میں تبدیلئ لباس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ اس ملک میں مختلف طبقوں کے لوگوں کا لباس جداگانہ تھا۔ سوداگروں کی پوشاک کی وضع پیشہ وروں سے علیحدہ تھی۔ غرض ہر قبیلے اور گروہ کا لباس ایک امتیازی خصوصیت رکھتا تھا۔

گزشتہ ستمبر میں رضا شاہ نے مختلف طبقوں اور جماعتوں کے نمایندوں کو بلا کر اعلان کیا کہ وہ اپنی اپنی جماعتوں

میں جاکر تبدیلئ لباس کی تلقین کریں۔ اور لوگوں کو ایرانی لباس چھوڑ کر انگریزی لباس زیب تن کرنے پر اکسائیں لیکن سر پر انگریزی ٹوپی کی جگہ کلاہِ پہلوی کا استعمال کیا جائے۔ اس اعلان نے اہلِ ایران پر بہت گہرا اثر کیا، اور لباس میں یک گونہ تغیر ہوگیا۔ چنانچہ مجلّہ "ایران" کے نامہ نگار مقیم اصفہان نے لکھا کہ اس شہر کے چار ہزار اساتذہ اور تلامذہ نے انگریزی لباس پہن لیا ہے۔ اسی سلسلے میں مازندران کے حاکم کا وہ اعلان بھی دیکھنے کے قابل ہے جو اُس نے وہاں کے درزیوں کے نام جاری کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ انگریزی سوٹ کے علاوہ کوئی اَور کپڑا تیار نہ کریں، اور کلاہِ پہلوی کے علاوہ کوئی ٹوپی نہ بنائیں۔ ہاں علماء کو اپنا قدیم مقدس لباس پہننے کا حق بدستور حاصل ہوگا۔

یہ حالات ایسے نہ تھے کہ ان سے پردے کے مسئلہ پر اثر نہ پڑتا۔ چنانچہ کلاہِ پہلوی کو زیبِ سر کرنے کے لئے جو کوشش ہو رہی تھی اُس کے دوش بدوش یہ مسئلہ بھی معرضِ بحث میں آگیا، اور عورت کے حقوقِ آزادی پر بحث کا بازار گرم ہوا۔ حکومت کو دبی زبان میں اِس بات کا اعلان کرنا پڑا کہ عورتوں کو ہر جگہ بے پردہ آنے جانے کی اجازت ہے۔

یہاں یہ بیان کردینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ گذشتہ سال سابق ملکہ ثریا کا دورانِ سفر میں طہران سے ہوکر وطن جانے کا بھی بے حد اثر ہوا۔ اس کو بے پردہ دیکھنے پر بے شمار ایرانی عورتوں نے اپنا نقاب اتار پھینکا اور اپنے خاوندوں کے ساتھ ہر جگہ گھومنے لگیں۔ چونکہ سرکاری طور پر پولیس کو ہدایت کردی گئی تھی کہ کوئی عورت بازار میں نقاب اوڑھے ہوئے نہ گزرے اس لئے بہت سے ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے جن سے حکومت کو حکم واپس لینا پڑا۔ مگر اس تردید کے باوجود عورتوں کی ایک کثیر تعداد بازاروں میں آزادی سے گردش کرتی نظر آتی رہی۔

گذشتہ ستمبر سے حصولِ آزادی کے لئے جو جدوجہد ایرانی عورتوں نے کی وہ بہت کچھ قابلِ غور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت نے ان کی مساعی کو کامیاب بنانے میں بہت مدد دی، اور یہی وجہ ہے کہ یہ زبردست انقلاب اتنی قلیل مدت میں ظہور پذیر ہوا۔ آج انہیں حق حاصل ہے کہ وہ تھیٹر، سنیما اور قہوہ خانوں میں بے پردہ آئیں اور سیرگاہوں میں آزادانہ پھریں۔ عورتوں کی اس مکمل آزادی کی ابتدا اُس روز سے ہوئی جب کہ طہران کی پولیس کا افسرِ اعلیٰ اپنی بیوی سمیت شہر کے ایک قہوہ خانے میں جلوہ افروز ہوا۔ ایران کے خاص ترقی یافتہ حلقوں میں اس بات کو محسوس کیا گیا کہ عورتوں میں رسمِ پردہ کے ارتفاع کے لئے سرکاری قانون کی اشد ضرورت ہے۔ چنانچہ تبریز کے اخبار "فریاد" نے مفصلۂ ذیل شذرہ لکھ کر حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔

"جو قوم ترقی کی راہ میں دوسروں سے آگے بڑھتی ہے، صرف وہی تاریخی عظمت کی مستحق ہؤا کرتی ہے۔ اس مسئلہ پر (یعنی پردہ) تمام قوم کے افراد متفق ہیں اور اُن کا اجتماع اور ہم آہنگ ہونا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ اب اس بارے میں کسی زائد بحث وتمحیص کی ضرورت نہیں۔ یہ چیز ہماری عورتوں سے جہالت کے پردے کو دُور کرے گی، اور مستقبلِ قریب میں وہ صبحِ درخشاں نمودار ہوگی جس کا نام آزادیٔ مستورات ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ میں اب چون وچرا کی گنجائش نہیں۔"

۷ فروری ۱۹۲۹ء کو مسٹر پطرین نے طفلس کے اخبار "زاریہ وسٹوکہ" میں اس پر حسبِ ذیل نوٹ لکھا۔

"زیاد" کی یہ رائے مبالغہ آمیز ہے اور حکومتِ ایران کے صحیح منشا اور مفاد کے خلاف ہے۔ حکومتِ ایران کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایرانیوں کی معاشرتی زندگی کی اصلاح کی جائے، اور مغربی تہذیب سے صرف اُن چیزوں کو اخذ کر لیا جائے جو مفید ہوں اور جن سے ایرانی تمدن کے بنیادی اصولوں میں بھی فرق نہ آئے"

مسٹر پطرین نے یہ بھی لکھا کہ تبریز، شیراز، افغانستان، اور ٹرکی میں جو معاشرتی اصلاحات نہایت سرعت کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی ہیں وہ ایرانیوں کے صحیح مفاد کے خلاف ہیں۔ چنانچہ وہاں کی گورنمنٹ اُن کے بعض قبیح نتائج سے واقف ہو چکی ہے۔ اس لئے ایرانی حکومت کے نزدیک جو کام بالتدریج اور خوش اسلوبی سے کیا جائے وہ نہایت موثر ہوگا۔

ستمبر ۱۹۲۸ء میں جب "افغانی جرگہ" نے چند اصلاحات عورتوں کے بارے میں رائج کیں تو حکومتِ ایران کو بھی فی الفور انگریزی لباس اختیار کرنے کا حکم دینا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی عورتوں کو بھی چند رعایات دی گئیں۔ مگر دسمبر میں افغانستان میں چند ایسے انقلابات رونما ہوئے جن سے حکومتِ ایران کو اعلان کرنا پڑا کہ جہاں تک پردے کا تعلق ہے یہ چیز حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ پبلک کی طرف سے عمل میں آنی چاہئے چنانچہ عوام الناس کے خیالات کی تبدیلی سب سے اہم چیز خیال کی گئی۔

ایران کی عورتیں بے پردہ ہونے سے پہلے بھی بازاروں میں نقاب اوڑھے ہوئے نکلتی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مردوں اور عورتوں کے لئے دو علیحدہ راستے مقرر تھے اور اس تقسیمِ راہ کے لئے پولیس متعین ہوتی تھی، مگر آبادی کے بڑھنے اور لوگوں کی کثرتِ ہجوم نے اس کو ناقابلِ عمل بنا دیا۔ ایک اور بھی دقت تھی اور وہ یہ کہ بعض عورتیں اپنے خاوند بھائی یا دیگر قریبی رشتہ داروں کے ہمراہ آیا جایا کرتی تھیں۔ اُن کو روکنے کا پولیس کو کوئی حق نہ تھا۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ ایک بانقاب عورت کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کا ساتھی کوئی اقربا سے ہے

یا غیر مرد۔ چنانچہ اسی سلسلے میں بہت سی شکایات پولیس کے پاس پہنچیں۔ جن سے بسا اوقات اغماض کیا گیا۔ ان تمام امور کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں اور مردوں کو مشترکہ سیر گاہوں میں چلنے پھرنے کا موقع مل گیا۔ عورتوں نے قدیم نقاب کے بدلے ایک نہایت باریک سیاہ ریشمی نقاب استعمال کرنا شروع کیا، جو بعض کے نزدیک ایک بے پردہ چہرے سے بھی زیادہ جاذبِ نظر تھا۔ اور وہ بازاروں میں نوجوان ملازموں کے ہمراہ خرید و فروخت کے لئے نکلنے لگیں۔ اس چیز کو ملک کی بوڑھی عورتوں نے نہایت حقارت کی نظر سے دیکھا اور فتویٰ دیا کہ یہ نوجوان بے پردہ عورتیں خدا سے نہیں ڈرتیں (از خدا نمی ترسند) مگر اس صریح مخالفت کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ ہوا کہ ملک کی چند تعلیم یافتہ اور سر بر آوردہ عورتیں بالکل بے پردہ پھرنے لگیں۔ انہوں نے ایک "زنانہ کلب" قائم کیا اور ہفتے میں ایک روز باہر بے پردہ آنے کے لئے عہد باندھا۔ آج ایسی عورتوں کی ایک کثیر تعداد ملک میں موجود ہے جو ہوٹلوں قہوہ خانوں اور سیر گاہوں میں انگریزی لباس پہنے ہوئے بے پردہ نظر آتی ہیں۔

عورتوں کی آزادی میں سب سے زیادہ حصہ لینے والے مختلف اخبارات اور رسائل کے مدیر تھے لیکن وہاں کے شعرا کی سعی و کوشش بھی کسی حالت میں کم نہیں۔ سب سے اہم کام ایران کے ملک الشعرا، اور ایک اور نوجوان شاعر "شہریاری" کا ہے۔ ملک الشعرا کی غزلیں گراموفون ریکارڈوں میں بھر کر سنی گئیں "شہریاری" نے اپنی ایک نظم جریدۂ "ناہید" میں شائع کرائی جس کا یہ اثر ہوا کہ چند روز میں اس کے اشعار بچے بچے کی زبان پر جاری ہو گئے، اور گلی گلی میں اسی کا چرچا ہونے لگا۔

حقوقِ نسواں کی جد و جہد کے علاوہ اس وقت ایران کی عورتوں کی تعلیمی حالت میں بہت ترقی ہوئی ہے چنانچہ گذشتہ مئی میں اخبار "ایران" کی اطلاع کے مطابق خاص طہران میں پرائمری مدارس میں لڑکیوں کی تعداد ۴۰۶ تھی اور ثانوی مدارس میں ۳۴۴ علاوہ بریں بعض نوجوان لڑکیوں نے امتحان پاس کر کے سند بھی حاصل کر لی ہے۔

غلام مصطفیٰ

سرورِ عشق

بزمِ جہاں ہے مےکدۂ جم مرے لئے | ہے دورِ جام گردشِ پیہم مرے لئے

چھیڑا ہے کس کے حسن نے تارِ ربابِ عشق | رقصاں ہی ایک نغمۂ پیہم مرے لئے

تیری نگاہِ لطف ہے موجِ مئے نشاط | اب ہوگئی حرام مئے غم مرے لئے

ہے دستِ شوق زلفِ معنبر میں شانہ کش | نکہت کدہ ہے محفلِ عالم مرے لئے

ہے کائنات تیری ضیا سے حسیں، کہ تو | ہے آفتاب [illegible] مرے لئے

ہر گل میں تیرا رنگِ تبسم ہے موجزن | آئینۂ جمال ہے شبنم مرے لئے

راحت سے ہم کنار ہوں پہنائے کائنات | گلپوش و زرنگار ہی ہر دم مرے لئے

تو ہم کنار ہے، تو خزاں بھی بہار ہے | کیا ہوگا پھر بہار کا موسم مرے لئے!!

غرقِ سرورِ عشق ہوں شام و سحر اثر

ہے اُس کی یاد عشرتِ پیہم مرے لئے

اثر صہبائی

الماس

ہال مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ مگر وہ سب سے علیحدہ ——— دُور کونے میں ——— ایک صوفے پر خاموش بیٹھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے اپنے چاروں طرف خیالات کا ایک نہایت دبیز حلقہ بنا لیا ہے جس نے باقی دنیا سے اس کا تعلق بالکل قطع کر دیا ہے۔ گفتگو کی بھنبھناہٹ، لوچدار بلند قہقہوں اور نوجوان پارسی عورتوں کے قدموں کی آواز اُس کے کونے کی خاموشی اور سکون میں مخل نہیں ہو سکتی تھی۔ آگ تاپتے ہوئے کبھی کبھی پہلو بدلنا یا وہ پُر سکون اور مطمئن تبسّم جو اُس کے لبوں پر کھیل رہا تھا بس یہ دو چیزیں تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کونے میں بھی کوئی جان دار شے موجود ہے۔ ——— اُس کا نام **الماس** تھا۔

ہال کے دوسرے کونے میں ایک خوبصورت ریشمیں پردہ لٹک رہا تھا اور اُس کے ساتھ "معصومیت" وہ شہرۂ آفاق تصویر رکھی تھی جس نے تمام بمبئی میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ تصویر کے گرد مدّاحوں نے نصف دائرہ باندھ رکھا تھا۔ اور اُن کے درمیان ایک بلند قامت، چوڑے شانوں والا، نوجوان شخص زبان سے، ہاتھ سے اشاروں سے، بچّوں کے سے جوش کے ساتھ تصویر کے مختلف پہلوؤں پر تقریر کر رہا تھا۔ یہ اُس کی تصویر کشی کا سب سے آخری اور سب سے بہتر نمونہ تھا ——— اُس کا نام سہراب تھا۔

سہراب کو معلوم تھا کہ وہ مشہور ہے اور اُس کی مصوری ایک زمانے سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ وہ یہ محسوس کر کے ——— یہ خیال کر کے کہ دنیا اُس کی تصویروں کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے بچّوں کی طرح خوش ہوتا تھا۔ اخباروں میں اپنا نام پڑھ پڑھ کر وہ جوشِ مسرت سے بے خود سا ہو جاتا تھا۔ "معصومیت" کی تکمیل کے بعد جب اُس نے اُس کو ہندوستان کی سب سے بڑی نمائش میں بھیجا تو ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اسی کامیابی کی خوشی میں سہراب نے آج رات اپنے احباب کو ڈنر پر مدعو کیا تھا۔

الماس اپنے کنجِ عافیت میں سے سہراب کو نہایت اطمینان اور سکون سے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ وہ اُس کی بیوی تھی لیکن عمر میں اس سے برسوں بڑی تھی۔ اُس کے بال اب کہیں کہیں سے چاندی کی طرح چمکنے لگ گئے تھے مگر اُس نے یہ کوشش نہ کی تھی کہ اُن کو سیاہ کر دے۔ اُس نے اپنی صاف اور سادہ ساڑھی ایسی بے پروائی سے باندھ

رکھی تھی گویا وہ عمر کے موجودہ اثرات سے بالکل بے خبر ہے۔ اور اگر اُس کو خبر بھی ہے کہ وہ بوڑھی ہوتی جا رہی ہے، تو اُس کی یہ خواہش نہیں کہ وہ اس حقیقت کو چھپائے اور اپنے جسم میں مصنوعی جوانی کی کیفیت پیدا کر کے صرف زمانے کو نہیں بلکہ نفس کو بھی دھوکا دے۔ لیکن وہ حسین تھی اور اُس کے خدوخال نہایت متناسب اور خوبصورت تھے بعض وقت اُس کی عمر کا اندازہ دشوار ہو جاتا تھا۔

الماس اپنے گردوپیش کے ہنگامے سے بالکل بے خبر تھی۔ وہ سب کچھ دیکھتی اور سنتی تھی مگر ان تمام رنگینیوں اور دلفریبیوں میں اپنے لئے کوئی دلچسپی نہ پاکر سب سے علیحدہ بےحس و حرکت اور خاموش بیٹھی تھی۔

سہراب تیز تیز قدم اٹھاتا ہوُا اُس کے پاس سے گزرا۔ نوجوان فیروزہ اُس کے ساتھ تھی۔ "الماس آج تم کیسی ہو؟" سہراب نے گذرتے ہوئے پوچھا "بہت اچھی طرح" الماس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ اور جب تک سہراب اُس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا اُس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی مسکراہٹ کھیلتی رہی۔

سطحی نظر میں الماس اور سہراب میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ تصویر تھی سنجیدگی اور متانت کی اُس کی ہر حرکت اور ہر بات سے جن میں بلندبینی اور حسن مذاق کوٹ کوٹ کر بھرا تھا صاف معلوم ہوتا تھا کہ الماس کسی نہایت اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسری طرف نوجوانی کی دلفریبیوں میں سرشار شوریدہ سر سہراب تھا، جس کے لئے زندگی گویا نام تھا عیش و مسرت کا۔ اُس کی طبیعت میں ابھی تک لڑکپن موجود تھا۔

لیکن باوجود اس بُعدالمشرقین کے اُن دونوں میں ایک قسم کی مشابہت بھی پائی جاتی تھی۔ الماس کی آنکھوں کی چمک ــــــ شبابِ ازل کی وہ چمک اور نور تھا جس میں وہ دونوں برابر کے شریک تھے!

سہراب خوش تھا، الماس مطمئن تھی۔ اُس کی تسکینِ قلب اسی میں تھی کہ وہ خاموشی سے سہراب کو، اُس سہراب کو جس کو اُس نے خود تعمیر کیا تھا، خود بنایا تھا، جو اُس کی اپنی تخلیق تھا چُپ چاپ گوشۂ عزلت میں سے دیکھتی رہے۔

اُن لوگوں میں سے جو سہراب کو جانتے تھے الماس اور صرف الماس ہی تھی جو اُس کی تصویروں کی سب سے کم داد دیا کرتی تھی۔ سہراب اپنی تصویروں کے متعلق مبالغہ آمیز کلمات سن کر خوش ہوُا کرتا تھا۔ لیکن الماس وہی کچھ کہا کرتی تھی ــــــ اُس کی رنگ آمیزیوں کی اُسی قدر تعریف کیا کرتی تھی جس کا سہراب اہل تھا۔ اس لئے کہ سہراب کی ــــــ اُس سہراب کی جس کے قلم کی ہر جنبش الماس سے لی گئی تھی ــــــ تعریف کرنا الماس کے لئے ایسا ہی تھا جیسا وہ خود اپنی تعریف کرے۔

الماس آج سہراب کے کمال کو دیکھ کر نشۂ کامیابی سے مخمور ہو رہی تھی لیکن آج سے آٹھ سال پیشتر جب اُس

نے سہراب سے شادی کی تھی تو وہ یہ سوچ کر کہ وہ کیا کر رہی ہے اور کس قدر خطرناک طریقِ عمل اختیار کر رہی ہے خود بخود کانپ اٹھا کرتی تھی۔ اُس وقت اُس نے اپنی تمام حسیات اور جذبات کو سہراب سے پوشیدہ رکھا۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ اُس کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ ایک نوجوان مرد کی آیندہ زندگی کو اپنے ہاتھ میں لے کر موم کی طرح جس شکل میں چاہے تبدیل کر دے۔ کیا محبت اور عشق کے اصول اُس کو اس بات کی اجازت دیتے تھے کہ وہ اپنے محبوب کو اُس روشِ حیات پر جس پر کہ اُس کی اپنی خواہش ہو چلنے کے لئے کہے۔

بہرحال اُس نے سر آنے والی ناکامی کو نظر انداز کر کے وہ کیا جو وہ چاہتی تھی۔ اور سہراب بدہوشی اور بےخبری کے عالم میں، الماس کی محبت کے زبردست اثر کے ماتحت، اُس کی خواہش کے مطابق بنتا گیا، بدلتا گیا اور آہستہ آہستہ اُس نے وہی شکل اختیار کر لی جو الماس کی ایک دیرینہ آرزو تھی:---- سہراب فرامرزجی بمبئی کا مشہور ترین مصوّر۔

الماس بمبئی کے ایک اعلیٰ پارسی خاندان میں سے تھی۔ وہ ایک بہت بڑی جائداد کی تنہا مالک تھی بہت سے امیر اور دولت مند نوجوانوں نے اس کے حصول کی کوشش کی لیکن الماس کی بےتوجہی نے سب کو مایوس کر دیا اور عین اُس وقت جب وہ اپنے نیازکیشوں کے مطالبات سے آزاد ہو چکی تھی اُس نے اچانک سہراب جیسے مفلس اور بےزر شخص کے ساتھ جو عمر میں اُس سے چھ سال چھوٹا تھا شادی کر کے ایک عالم کو ورطۂ تحیر میں ڈال دیا۔

جس طرح آج رات بہت سے لوگ، جو سہراب کے ہاں جمع تھے، حیران ہو رہے تھے کہ یہ ساکن و راکد طبیعت والی عورت جو کونے میں ایک سائے کے مانند بیٹھی تھی کون ہے اسی طرح آج سے آٹھ سال پیشتر بھی لوگ متعجب تھے کہ الماس ---- بمبئی کی وہ حسین ترین عورت ---- آزاد اور دولت مند الماس سہراب جیسے بےمایہ اور قلاش شخص کے ساتھ کیوں شادی کر رہی ہے۔ لیکن الماس خوب جانتی تھی کہ وہ کیوں اُس سے شادی کر رہی ہے۔ اور آج کی رات اُسی ڈرامے کا جس کی ابتدا الماس نے آٹھ سال ہوئے کی تھی آخری سین تھا۔

آٹھ سال کے اس طویل عرصے میں الماس نے اپنی دولت، اپنا حسن، اپنا شباب، اپنی محبت سب کچھ سہراب کے لئے قربان کر دیا تھا۔ اِس لئے قربان کر دیا تھا کہ سہراب کو ایک کامیاب مصوّر بنا سکے۔ اور اِس مقصد کے لئے اُس نے اپنی روح سہراب میں پھونک دی ---- اپنا خونِ حیات اُس کو دے دیا۔ چنانچہ سہراب وہ خوش باش نوجوان اپنے اندر الماس کی روح، الماس کا حسن، الماس کی مصوری، الماس کے جذبات لئے پھرتا تھا۔ اور وہ عورت

میں لے لیا۔ فیروزہ کے تمام جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ اُس کا ہاتھ الماس کے ساتھ مس ہوتے ہی شل ہو گیا۔ اُس کو ایسا معلوم ہوا کہ ابھی کوئی ایسی زبردست ضرب لگائی جائے گی جو اُس کو کچل دے گی۔ لیکن الماس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور جب وہ بولی تو اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"فیروزہ میں تمہاری شکرگزار ہوں۔ ایسی چیز جو ہیں مدت سے کھو چکی تھی مجھے آج واپس مل گئی ہے" اور پھر سہراب کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی "تم دونوں خوش رہو گے"۔ الماس کی آواز سنسان خاموشی میں بن سُنے ڈوب گئی۔ سہراب نے کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ اُس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ اُس نے اُس انسانی پیکر کو جو سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی موجودگی کو بھی بھول چکا تھا۔

مگر فیروزہ سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ اِن چند الفاظ میں اُس نے اپنی زندگی کا فیصلہ سُن لیا تھا۔ ایک خواب کی سی حالت میں اُس نے الماس کی سیڑھیاں اترنے کی آہٹ سنی۔ الماس اُن کی زندگیوں میں سے بالکل نکل گئی تھی۔

"تم دونوں اکٹھے خوش رہو گے" کی آواز فیروزہ کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اُس نے خود کو مجبور کر کے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھا اگر وہ دیکھنے سے پہلے ہی سمجھ چکی تھی بلکہ وہ مدت سے جانتی تھی لیکن اس کو حقیقت خیال کرتے ہوئے خوف کھاتی تھی۔

اُس نے الماس جیسی عظیم الشان عورت کا مقابلہ کرنا چاہا تھا جو سہراب کی رگ رگ میں سرایت کر گئی تھی، جو اُس کی روح پر حاوی ہو گئی تھی، جس نے سہراب کو خرید لیا تھا۔ فیروزہ نے اس جنگ میں شکست کھائی تھی اور یہ اُس کی سزا تھی کہ اس راز کا خوفناک انکشاف اُس کی عین نظروں کے سامنے ہو۔ وہ سہراب کو برباد ہوتا دیکھے۔ اُس کے حسن کو پامال ہوتا، اُس کے شباب کو لٹتا، اُس سے اُن تمام خوبیوں کو جن کا وہ آج تک مرکز تھا چھنتا ہوا دیکھے۔

وہ اُس پر جھک گئی، ایک فوری ناقابلِ ضبط جذبہ کے ماتحت جھک گئی، اگرچہ وہ جانتی تھی کہ خرمنِ ہستی کے اس خاکستر کو مشتعل کرنا اُس کے لئے غیر ممکن ہے۔

فیروزہ کو معلوم ہو گیا کہ اس کی فتح کس قدر لاحاصل تھی۔ اس پیکارِ محبت میں وہ نہیں بلکہ الماس کامیاب رہی تھی۔ وہ سہراب کو ـــــ اصل سہراب کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اور ایک بے جان چیز کو چھوڑ گئی تھی اور فیروزہ کو یقین تھا کہ سہراب کی یہ راکھ بھی جو باقی رہ گئی ہے، سورج مکھی کے پھول کی طرح اپنے سورج الماس کا تعاقب کرے گی۔

خادم بٹالوی

(ماخوذ)

حُسنِ خوابیدہ

ہے خواب میں محو اک حسینہ   دل جس کا ہے عشق کا خزینہ
آنکھیں کچھ کچھ کھلی ہوئی ہیں   سوتا فتنہ بنی ہوئی ہیں
رقصاں ہونٹوں پہ ہے تبسّم   گویا ہے مائلِ تکلّم
دیکھو سوتے میں اس کا ہنسنا   دیکھا ہوگا کلی بکسنا
دیکھو دیکھو وہ شرم آئی   چھائی سرخی وہ رخ پہ چھائی
جنبش ہونے لگی لبوں کو   چھیڑا وہ نسیم نے گلوں کو
ہونٹوں سے وہ حرفِ آہ نکلا   اک تیر خدا گواہ نکلا
اے کاش فقط مجھے بتا دے   اپنے جذبات کا پتا دے
یہ پھول سا جسم کانپ اٹھا کیوں   آنسو یہ آنکھ سے گرا کیوں

سینے پر ہاتھ کیوں یہ آیا
تخئیل نے خواب کیا دکھایا

اب پھر خاموش سو رہی ہے   غارت گرِ ہوش سو رہی ہے
اب بند ہیں آنسوؤں کی راہیں   ٹھنڈی سانسیں نہ گرم آہیں
کروٹ بائیں طرف جو لی ہے   کیسی سُکھ نیند سو رہی ہے
بھولا بچّہ کب ایسے سوئے   معصوم فرشتہ جیسے سوئے

سو چین سے میٹھی نیند سو ہاں
زیبا کی نیند تجھ پہ قرباں

زیبا
(ردولوی)

انجامِ محبّت

(یہ ڈراما برنرڈ شا کی کتاب "مزخرفات" سے ماخوذ ہے)

(بمبئی کا ایک خوشنما حصّہ۔ ایک خاتون اپنی سنگھار میز کے سامنے بیٹھی خادمہ سے بال کندھوا رہی ہے۔ رات زیادہ گزر چکی ہے کمرے میں متعدد بجلی کے قمقمے روشن ہیں۔ سنگھار میز کے مخالف سمت والی دیوار کے قریب ایک چوبی چیز رکھی ہے، جو کتابوں کی الماری کے مشابہ ہے، اسی کے قریب مردانہ جوتوں کی ایک قطار لگی ہوئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خاتون شادی شدہ ہے۔ سامنے کی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ ہے، اور اُس کے عین اوپر ایک خوبصورت گھنٹہ لٹک رہا ہے۔ دروازہ سے ملا ہوا ایک ستون نما پتھر پر اسی خاتون کا مجسمہ رکھا ہے۔ سنگھار میز پر ایک پنکھا پڑا ہوا ہے۔ دروازے کے قریب ہی کھونٹی پر ایک کپڑے کا تسمہ لٹک رہا ہے۔ کمرے کا جملہ سامان ایک ایسا اثر پیدا کر رہا ہے، جس میں معاشرتی اولوالعزمی کے ساتھ ساتھ کم مائیگی کا عنصر بھی غالب ہے۔ مکمل خاموشی طاری ہے، صرف خاتون کے بال ٹوٹنے سے کبھی کبھی چٹ چٹ کی آواز آتی ہے۔ گھنٹے نے گیارہ بجائے)

خاتون:۔ کیوں سوسن بھلا گھنٹے نے کے بجائے؟

سوسن:۔ بیگم صاحبہ! گیارہ بجے تھے۔

خاتون:۔ اوہ! گیارہ بج گئے! ذرا میرا بستر کر دو تو سو رہوں۔ آنکھیں جھکی پڑتی ہیں۔

(سوسن کتابوں کی الماری کی طرف جاتی ہے، اور ایک بٹن کو دباتی ہے، الماری کا بالائی حصہ نیچے آ پڑتا ہے، اور ایک پلنگ کا ہم شکل بن جاتا ہے۔ دور بادل کی گرج سنائی دیتی ہے)

سوسن (کانپ کر) اُف آج کی رات کس قدر ڈراؤنی ہے۔ خدا معلوم غریب جہازوالوں پر کیا گذرتی ہوگی۔ میرا آقا ابھی تک گھر نہیں آیا۔ خدا کرے بخیریت ہو۔ بیگم بستر تیار ہے۔

خاتون:۔ شاباش! سوسن تو بڑے کام کی لڑکی ہے، (اُٹھ کر بستر کی طرف بڑھتی ہے)۔

سوسن:۔ کیا بیگم تبدیلِ لباس نہ کریں گی؟

خاتون:۔ نہیں، سوسن، آج نہیں (دروازے کی طرف دیکھ کر) ان حالات میں نہیں۔

سوسن:- (بے اختیاری کے ساتھ خاتون سے لپٹ جاتی ہے) میری پیاری بیگم - خدا معلوم آج میرا دل کیوں بیٹھا جارہا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں پھر کبھی اپنی پیاری بیگم کو زندہ نہ دیکھ سکوں گی - اس فضا میں قتل کی بُو آرہی ہے -

خاتون:- ہاں! سوسن، آج خدا خیر ہی کرے، ابھی میں کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی کہ یکایک میں نے فرشتوں کے نغمے سُنے - خدا معلوم وہ کیا گا رہے تھے - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی شخص کو بلا رہے ہیں - مگر میرا نام تو فیروزہ ہے - وہ تو کوئی دوسرا نام لے رہے تھے -

سوسن:- فیروزہ نہیں مسز سہراب کہو، یہ زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے (پھر اپنی مالکہ سے چمٹ جاتی ہے)

خاتون:- اچھا سوسن، اب سو رہو - اور اگر مجھے زندہ پاؤ تو صبح ۷ بجے جگا دینا -

(سوسن چلی جاتی ہے - فیروزہ روشنی گل کرتی ہے - فرشتوں کی آواز پھر آتی ہے - اُن کا نغمہ اس قدر دلکش ہے کہ فیروزہ ہمہ تن گوش بن جاتی ہے - کچھ دیر بیٹھی سنتی رہتی ہے، پھر اسی محویت کے عالم میں جوتے اتارے بغیر لیٹ جاتی ہے - اور ان نغموں کی شیریں ہم آہنگی اُسے تھپک تھپک کر میٹھی نیند سلا دیتی ہے - ایک سفید روشنی اُس کے چہرے پر پڑکر اُس کے حسین خدوخال کو منور کر دیتی ہے - بادل پھر گرجتا ہے - ایک سرخ شعاع دروازہ پر پڑتی ہے - یکایک دروازہ آہستگی کے ساتھ کھلتا ہے اور ایک شخص سیاہ لبادہ پہنے ہوئے داخل ہوتا ہے - اُس کے لرزتے ہوئے ہاتھ میں ایک چوڑے پھل کا خنجر چمک رہا ہے اور اُس کی آنکھوں میں ایک غیر فطری روشنی ہے - وہ آہستہ قدموں سے فیروزہ کے پلنگ کی طرف بڑھتا ہے - خنجر والا ہاتھ فیروزہ کی طرف اُٹھتا ہے، اور قریب ہے کہ اُس کے قلب میں پیوست ہو جائے، فیروزہ کو اتفاقاً چھینک آجاتی ہے - قاتل گھبرا کر پلنگ کے نیچے چھپ جاتا ہے - اُس کا دل زور زور سے دھڑکتا ہے -)

قاتل:- (پلنگ کے نیچے سے آہستہ آہستہ نکل کر) اُف اب مجھ میں اتنی تاب نہیں کہ پلنگ کے نیچے لیٹا ہوا اپنے دل کی نزع خیز دھڑکن کو سنتا رہوں - (فیروزہ کی طرف دیکھتا ہے) نہیں، وہ تو بے خبر سو رہی ہے - (ایک بار خنجر اٹھاتا ہے - فرشتے پھر گاتے ہیں - قاتل چھپ جاتا ہے) اُف یہ کیا ہوا؟ کیا اس چھینک کی آواز فلک کے نیلے گنبد کو چیر کر جنت کے نیم وا دروازوں تک پہنچ گئی ہے؟

فیروزہ - (یکایک اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے) میرے مالک! (قوس قزح کے تمام رنگ یکے بعد دیگرے سہراب کے چہرے پر دوڑنے لگتے ہیں) کیوں؟ کیوں؟ تمہارا رنگ کیوں اڑا جارہا ہے؟ اور ہائیں! تم خنجر سے یہاں کیا کر رہے تھے؟

ہرمز:۔ ن ...... ن ...... نہیں، میں ڈرتا تو نہیں، مگر پھر بھی ———

سہراب:۔ پھر بھی اگر زہر مہرہ مل جائے تو

فیروزہ:۔ (فوری امید سے متاثر ہو کر) زہر مہرہ؟

ہرمز:۔ (پلنگ سے کود کر) زہر مہرہ! خدا کے لئے جلد بتاؤ کہ وہ کونسا زہر مہرہ ہے۔

سہراب:۔ اس زہر کا بہترین بدرقہ چونا ہے۔

ہرمز:۔ چونا! ——— مذاق کرتے ہو۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ میں اپنی جیب میں چونے کی ڈلیاں ڈالے پھرتا ہوں؟

سہراب:۔ مگر چھت کا پلاسٹر تو ہے۔

(سب چھت کی طرف جوتے پھینکتے ہیں۔ پلاسٹر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نیچے گرتے ہیں۔ ہرمز بدحواسی سے انہیں نگلتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چونے کی تلخی اور بدمزگی زندگی کی محبت پر غالب آجاتی ہے)

فیروزہ:۔ (ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھا کر) لو ہرمز لو۔ یہ سب سے بڑا ٹکڑا ہے (اُس کے منہ میں ٹھونس دیتی ہے)

ہرمز:۔ ٹھہرو، ٹھہرو۔ خدا کے لئے ٹھہرو۔

فیروزہ:۔ ٹھہرو نہیں۔ ٹھہرنا تمہارے لئے موت ہے! (ایک اَور ٹکڑا ٹھونسنے کی کوشش کرتی ہے)

ہرمز (مستقل مزاجی سے) میں موت کو اس مصیبت پر ترجیح دیتا ہوں۔

فیروزہ:۔ تمہیں میری جان کی قسم، کھاؤ۔

ہرمز:۔ ناممکن۔ اگر ایسا ہی ہے تو پانی میں چونا ڈال کر دو۔ پلاسٹر کو ختم کرو۔ میں اَور نہیں کھا سکتا۔

سہراب:۔ فیروزہ! میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے ——— تمہارا مجسمہ اَور کس دن کام آئے گا۔

(سہراب جھپٹ کر مجسمہ اٹھاتا ہے۔ ہرمز مجسمہ کی پشت پر سے کچھ حصہ چباتا ہے، حالت زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔)

ہرمز:۔ نہیں، فیروزہ تمہارا مجسمہ بھی نہیں، مجھے مرنے دو۔

سہراب:۔ (مجسمہ اُس کے منہ میں ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے) کھاؤ! کھاؤ! ہرمز! دل پر جبر کر کے کھاؤ۔ تمہاری زندگی اسی پر منحصر ہے

ہرمز:۔ بے کار! بالکل بے کار! حلق سے تو اترتا ہی نہیں۔ پانی! ارے پانی لاؤ۔ میرے اللہ (سر پٹخنے لگتا ہے)

(فیروزہ گھنٹی بجاتی ہے، سوسن داخل ہوتی ہے)

سوسن:۔ آہ! آہ! پیاری بیگم، میں ایک دفعہ پھر تمہیں زندہ دیکھ رہی ہوں! (سہراب کو دیکھتی ہے اور چیخ کر بھاگنے کی کوشش کرتی ہے۔

سہراب:۔ (سوسن کا دامن پکڑ کر) باولی ہوئی ہے دیکھتی نہیں ہرمز کا کیا حال ہو رہا ہے۔

سوسن:۔ (متردد ہو کر) واقعی ؟ تو پھر کیا کروں ؟

فیروزہ:۔ (مجسمہ دے کر) اسے فوراً کسی برتن میں حل کر کے لا۔ کتے کی چال جا اور بلی کی چال آ۔ ہرمز کی زندگی تیری جلدی پر منحصر ہے۔

سوسن (ہچکچا کر) مگر بیگم تمہارا خوبصورت مجسمہ ــــــ

ہرمز:۔ ہشت، دیر نہ کر، دیکھ میں مر رہا ہوں۔ (اسے دروازہ سے باہر دھکیل دیتا ہے) پانی، پانی، اُف میرا حلق خشک ہو گیا۔ میرا جسم پھنکا جا رہا ہے۔ (دیوانگی کے ساتھ سوڈے کی بوتل کی طرف دوڑتا ہے۔)

سہراب:۔ پاگل! بھولا جا رہا ہے اُس میں زہر ہے۔

ہرمز:۔ پانی! پانی! اُف! ہائے ہائے (پھر بوتل کی طرف بڑھتا ہے۔ سہراب روکنے کی کوشش کرتا ہے کُشتی ہوتی ہے، جدوجہد میں بوتل کا سوڈا گر جاتا ہے۔ ہرمز سہراب کو پٹخ دیتا ہے، اور بوتل اٹھا کر اپنے منہ میں لٹ لیتا ہے) خالی! آہ خالی! (ایک چیخ کے ساتھ گر جاتا ہے۔ سوڈے کی بوتل ہاتھ میں ہے۔ بچوں کی طرح روتا ہے۔ فیروزہ دوسری سوڈے کی بوتل کھولتی ہے)

ہرمز:۔ شکریہ! پیاری فیروزہ شکریہ! (پیتا ہے گیس نکلنے سے سرسر کی آواز آتی ہے۔ ہرمز اُٹھ کر چیخنے لگتا ہے) مدد کرو! مدد! اُف پلاسٹر اُبل رہا ہے۔ ارے میرا پیٹ پھٹا جاتا ہے۔ ہائے (کرب کی حالت میں بستر پر لوٹنے لگتا ہے)

سہراب۔ جلدی کرو۔ فیروزہ، تسمہ کہاں ہے؟ (دونوں اُسے کمبلوں میں لپیٹتے ہیں، اور پیٹ کے قریب کس کے تسمہ باندھ دیتے ہیں۔) کیوں ٹھیک بندھ گیا نا؟

فیروزہ:۔ (تردد سے) ہرمز کیا حال ہے؟

ہرمز:۔ خطرہ گذر گیا۔ سوڈا کام کر رہا ہے۔

فیروزہ اور سہراب۔ اللہ تیرا شکر!

(سوسن بالٹی لئے ہوئے داخل ہوتی ہے)

سہراب:۔ بچ گئے۔ لو پیو۔

(سہراب بالٹی کا کنارہ ہرمز کے منہ سے لگا دیتا ہے اور رفتہ رفتہ اُس کا پیندا بلند کرتا جاتا ہے۔ ہرمز گھبرا کر پیتا ہے۔ کبھی کبھی پھندا لگتا ہے تو سوسن کمر ٹھونکتی ہے، فیروزہ آہستہ آہستہ تسمہ ڈھیلا کرتی جاتی ہے۔ آخر ہرمز مطمئن ہو کر آہ بھرتا ہے اور عورتوں کی گود میں گر جاتا ہے۔ سہراب بالٹی کو ہرمز کے منہ میں جھاڑتا ہے)

ہرمز:۔ سینہ میں کس قدر آرام آرہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام جسم میں ایک فرحت بخش سنسناہٹ دوڑ رہی ہے۔ میں سوتا ہوں۔

فیروزہ }
سوسن } :۔ (سرگوشی میں) سونے دو!
سہراب }

(وہ سوتا ہے۔ سردی گیتوں کی آواز پھر آتی ہے۔ مالکِ مکان، ایک بازاری آدمی میلا کچیلا پاجامہ پہنے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ تمام نغمے ساکت ہو جاتے ہیں)

مالکِ مکان :۔ ہے! ہے! یہ کیا ہے؟ کیا شور مچا رکھا ہے؟ بھلا نیند کیسے آوے؟ (فرش اور چھت کی طرف دیکھتا ہے) ارے یہ چھت کا کیا حال ہو گیا؟

سہراب :۔ خاموش رہو! کیا سمع خراشی کر رہے ہو، دیکھتے نہیں، کہ کمرے میں ایک مریض ہے؟

مالکِ مکان :۔ اگر اس غول میں نہیں جگا تو ہمارے بولنے سے کیسے جگے گا؟

فیروزہ :۔ نامعقول، شہدے، دیکھتا نہیں کہ نیر آلملفظ کان کے پردے پھاڑے ڈال رہا ہے چل دفع ہو۔

مالکِ مکان :۔ ارے باپ رے! یہ تو چند سے آدمی کی شکل نہیں (چلاتا ہے) پلس! پلس۔ خون! (نیلی روشنی کی ایک شعاع دروازہ پر پڑتی ہے۔ کواڑ کھلتے ہیں۔ سپاہی برآمد ہوتا ہے۔ بادل گرجتا ہے) سپاہی! سپاہی! خون! ارے اِن تینوں نے اس مانس کا خون کر دیا۔

سپاہی :۔ (ناراض ہو کر) سپاہی! ابے سپاہی کیا؟ بدتمیز کہیں کا۔

سہراب :۔ حولدار صاحب ـــــــــــــ

سپاہی :۔ (بہت جھک کر) جناب عالی؟

سہراب (بہت ادب سے) میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں، کہ ایک گھنٹہ قبل میرے عزیز دوست پر سوءِ ہضمی کا ایک شدید دورہ ہُوا۔ چونکہ اُس وقت کوئی اور چیز موجود نہ تھی، اور تکلیف بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس شخص کی چھت کا کچھ حصہ کھا لیا۔ (ہرمز کی طرف اشارہ کر کے) نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

سپاہی : چھت زہر آلود تھی۔ واللہ خوب چالاکی کی۔ (مالکِ مکان کی گردن پکڑ لیتا ہے) میں تم کو قتلِ عمد کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔

مالکِ مکان :۔ (روبفلک) ہے پرمیشور! برٹش راج میں بھی اب ایسا ہونے لگ گیا۔ بھلا حولدار جی مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ میری چھت کھا لیوے گا؟

سپاہی :۔ ہاں! واقعی۔ واردات بہت پیچیدہ معلوم ہوتی ہے۔ (ہرمز کا بازو اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے مگر کامیابی نہیں ہوتی) ارے یہ تو بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔

مالکِ مکان:۔ (ہرمز کی ٹانگ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے) اور بھاری کتنا ہوگیا ہے۔

سہراب:۔ (بستر کی طرف بھاگتے ہوئے) کیوں؟ کیوں! خیریت تو ہے؟

فیروزہ:۔ سوسن ذرا بھاگ کر ڈاکٹر کو تو بلا، سہراب! سہراب! دیکھو ابھی تو جان باقی ہے نا؟ جگانے کی کوشش کرو۔ ہلاؤ۔ جلدی کرو۔

سپاہی:۔ (دوبارہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے، مگر پسینہ پسینہ ہوکر رہ جاتا ہے) پناہ بخدا! یہ آدمی ہے یا پتھر!

(فیروزہ چیخ کر ہرمز کے جسم کی طرف بڑھتی ہے)

فیروزہ:۔ واقعی! پلاسٹر رگ و پے میں سرایت کرچکا ہے۔ حوالدار کا کہنا ٹھیک ہے، یہ تو پتھر سے زیادہ بھاری ہے۔

(ہرمز کے مردہ جسم پر گر پڑتی ہے، سہراب چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کر ہچکیاں لیتا ہے۔ سوسن اور ڈاکٹر داخل ہوتے ہیں)

سوسن:۔ بیگم ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں۔

سپاہی:۔ جناب ایک شخص کو زہر دے دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر:۔ کیا کہا؟ میرے علاقہ میں قانون کی خلاف ورزی کرکے کسی دوسرے شخص سے زہر خریدا گیا۔

سپاہی:۔ (فیروزہ کو آہستگی سے اٹھا کر) واقعہ تو اسی قسم کا معلوم ہوتا ہے! بیگم ذرا اٹھو تو۔

ڈاکٹر:۔ وقت ضائع نہ کرو۔ مریض کو بیدار رکھنا چاہیئے۔ شدید اور مستقل حرکت نہایت ضروری ہے۔

(فیروزہ کو سپاہی کے ہاتھوں میں سے چھین لیتا ہے، اور بری طرح چکر دیتا ہے)

سہراب:۔ ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ وہ مریض نہیں ہے۔

ڈاکٹر:۔ اچھا تم ہو۔ تو پہلے سے کیوں نہ کہا؟

(سہراب کو پکڑ کر کمرے میں دوڑانے لگتا ہے)

مالکِ مکان:۔ نہیں! نہیں! وہ نہیں،

ڈاکٹر:۔ تو تم ہو۔

(مالکِ مکان کو پکڑ کر زور زور سے ہلاتا ہے، مالکِ مکان رکنے کی کوشش کرتا ہے دونوں گرنے میں، سپاہی دونوں کو علیحدہ کرتا ہے)

سپاہی:۔ اچھا! اٹھانے چلو! اب میرے پیچھے پیچھے آؤ۔

(بادل گرجتا ہے)

فیروزہ :- کیا اس لرزہ خیز طوفان میں ؟

(کھڑکیوں پر موٹے موٹے قطرے گرتے ہیں -)

سوسن :- بارش ہو رہی ہے -

(اندھیاؤ چلتا ہے، بجلی چمکتی ہے)

سہراب :- اِس وقت تو باہر نکلنا خطرہ سے خالی نہیں -

سپاہی (سیٹی نکالتے ہوئے) اگر تم فوراً نہ چلے تو ـــــــــــــ

(سیٹی بجاتا ہے - یکایک آسمانی توپیں چلنے لگتی ہیں - شدید روشنی نظر آتی ہے اور بجلی کمرے میں داخل ہو کر سپاہی کی پگڑی پر گرتی ہے - وہاں سے ڈاکٹر کی واسکٹ کی طرف جاتی ہے، باقی ماندہ مالکِ مکان کے بھدّے اور ناہموار جسم میں جذب ہو جاتی ہے - سوسن، سہراب، اور فیروزہ، خوف وہراس سے تمام منظر کو دیکھتے ہیں - بجلی کے تینوں شکار تڑپتے ہیں، تلملاتے ہیں، پھر مردہ ہو کر غالیچہ پر گر جاتے ہیں - کچھ دیر گزر جاتی ہے)

فیروزہ :- زندگی کے ہذیان خیز بخار کے بعد تینوں آرام سے سو رہے ہیں - سوسن، دیکھو کتنا کوڑا ہو گیا ہے، ذرا فرش صاف کر دو -

(سوسن پنکھا اٹھا کر آہستہ آہستہ جھلتی ہے - یہ تینوں جسم اڑ اڑ کر دیوار کے قریب ہو رہتے ہیں)

سوسن :- کیوں، بیگم؟ ٹھیک ہے، یا جھاڑو سے سمیٹ کر باہر پھینک دوں؟

فیروزہ :- نہیں! اس وقت تو رہنے دو - صبح کو دیکھا جائے گا، جاؤ سو رہو -

(سوسن جاتی ہے)

فیروزہ :- سہراب، اپنے دوست کی آخری رسم ادا کرو - وہ خود اپنی یادگار بن گیا ہے - آؤ اسے ستون پر نصب کر دیں - گو جسم بہت بھاری ہے، مگر محبت اور دوستی بہت کچھ کر سکتے ہیں؟

(کوشش کر کے اُسے اٹھاتے ہیں اور ستون پر کھڑا کر دیتے ہیں)

فیروزہ :- (ستون کے دائیں طرف دو زانو ہو کر) پیارے ہرمز! خدا کو سونپا -

سہراب :- (مجسمہ کے بائیں جانب جھک کر) ہرمز میرا قصور معاف کرنا! الوداع -

(فرشتے گاتے ہیں، ہرمز کا مجسمہ دونوں ہاتھوں کو جنبش دیتا ہے، اور بے جان چہرہ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے - پردہ گرجاتا ہے)

معین الحق حقی

محفلِ ادب

فرشتے کی سیر

اک پاک فرشتے نے آکر در کھولا اک تارے کا
مشتاق تھا جو اک مدت سے اس دنیا کے نظارے کا

پہلے تو اسے کچھ دھندلا سا اک داغ دکھائی دیتا ہے
پھر موجِ ہوا میں ہلکا سا اک شور سنائی دیتا ہے

اول تو یہ دھبوں کی طرح میدان نظر آتے ہیں اُسے
جب خوب نظر جم جاتی ہے انسان نظر آتے ہیں اُسے

کیا دیکھتا ہے وہ دنیا میں نفرت کا نشاں لہراتا ہے
انسان کا انساں دشمن ہے اک ایک کو کھائے جاتا ہے

"انسان" یہ کیسی ہستی ہے کیا کرتا ہے کیا کہتا ہے
اُس تارے سے بھی ناواقف جس تارے میں یہ رہتا ہے

دنیا میں طرب کی تدبیریں کیا خوب نکالی جاتی ہیں
فولاد گلایا جاتا ہے تلواریں ڈھالی جاتی ہیں

قوموں پہ فلاکت لانے کو شاہوں کے خزانے کھلتے ہیں
درس امن و اماں کا دینے کو توپوں کے دہانے کھلتے ہیں

بیگانہ ہے نقلِ انسانی کونین کی دل آویزی سے
اس خون کے پیاسے حیواں کو مطلب ہے فقط خونریزی سے

سنجیدہ تریں افراد میں بھی انداز ہیں یاں اوباشوں کے
وجد آتا ہے خونی انساں کو حلقے میں تڑپتی لاشوں کے

فاتح کو تبسم آتا ہے جب پسپا قومیں روتی ہیں
ایوانِ طرب کی قبروں پر بنیادیں قائم ہوتی ہیں

معصوم فرشتہ روتا ہے تقدیر پہ ان نادانوں کی
تاریک نظر آتی ہے اُسے گردوں سی جبیں انسانوں کی

اک امر ہے لیکن غور طلب اے نوعِ بشر کے چارہ گرو
فطرت ہی میں ہے خود اس کا جواب آئینِ جہاں پر غور کرو

عیبوں پہ فرشتے کی تھی نظر وہ عیب سے باہر جا نہ سکا
تھی معترضانہ اُس کی روش خوبی کا خزانہ پا نہ سکا

قانون یہ ہے اس دنیا کا جو ڈھونڈو گے سو پاؤ گے
گرنے کا تصور کرتے ہو ہر گام پہ ٹھوکر کھاؤ گے

دیکھو تو فرشتے نے اب کے تحقیق کی دل میں ٹھانی ہے
اب منظرِ عالم روشن ہے اب بزمِ جہاں نورانی ہے

اس مرتبہ وہ کیا دیکھتا ہے ہر ذرۂ عالم تاباں ہے
موتی کی طرح ہر آنسو میں مہتابِ تبسم غلطاں ہے

اس جنگ و جدل کے حیلے سے بے چین ہیں قومیں ملنے کو
پژمردہ دلی کے سینے میں بیتاب ہیں غنچے کھلنے کو

جتنی بھی یہ دنیا اپنی شرارت حد سے بڑھاتی جاتی ہے
اُتنی ہی عدوِ نیکی سے نزدیک تر آتی جاتی ہے

سینے سے اندھیری راتوں کے نبتی ہے ضیا انسانوں میں
ہر نقص کی بزمِ ظلمت میں تکمیل کا شعلہ لرزاں ہے
بادل کی گرج ہو یا نغمۂ شب ہو کہ صباحِ نورانی
ہر حلقہ اپنی خدمت پر مامور ہے زلفِ برہم میں
سرگرم ہے روحِ جنگ و جدل تیغوں کے معطل کرنے میں
دُھن سادگیٔ امروز کو ہے گلکاریٔ فردا بننے کی
رہ جائیں گے قتل و غارت کے اذکار فقط افسانوں میں
مٹ جائیں گے نقشِ ظلمت کے آثار ضیا رہ جائیں گے
دیکھو وہ فلک سے طیارے غاروں میں اترتے آتے ہیں
کہتا ہے حوادث کو جو برا ہمدرد نہیں ہے ظالم ہے
المختصر ان ہنگاموں کو جب خوب فرشتہ دیکھ چکا

فطرت کا نظامِ تعمیری ہے گرمِ عمل طوفانوں میں
ہر موجِ تباہی کے اندر جبروتِ حیاتِ انساں ہے
ہر چیز میں ہے سرگرمِ تپش خورشیدِ عروجِ انسانی
ہر ذرّۂ خاکی رکھتا ہے اک خاص مقام اس عالم میں
مصروف ہیں سارے نقص یہاں انساں کے مکمل کرنے میں
زہرآب کے دل میں خواہش ہے تریاق کا دریا بننے کی
تلواریں رکھی رہ جائیں گی پُرہول عجائب خانوں میں
قلعوں کے یہ گنبد سرِ فلک آنسو کی طرح بہ جائیں گے
پستی کے دھوئیں سے چمکیلے مینار ابھرتے آتے ہیں
در اصل وہ روحِ عالم کی ہمت شکنی کا مجرم ہے
پرواز کو بازو پھیلائے اور بامِ فلک سے دی یہ ندا

انساں کو خبر دو فطرت کے ارمان نکلنے والے ہیں
لوہے کی جبیں سے چاندی کے فوارے چلنے والے ہیں

"نیرنگِ خیال"

ترجمہ

یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ جب کوئی قوم علوم و فنون میں ترقی کا پہلا قدم اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے علمی زبانوں کے تراجم سے اپنی زبان کو سرمایہ دار بناتی ہے۔ اور زندہ اقوام کی سعی و کوشش کے نتائج کو اپنے اندر جذب کر کے اپنے علمی خزانوں کو معمور کرتی ہے۔ چنانچہ قدمائے عرب نے اپنی ترقی کے زمانے میں یہی کیا کہ دوسری اقوام کے علمی خزانوں کو اپنی زبان میں منتقل کر لیا اور اُن کے جواہر ریزوں کو اپنی زبان کے نقش و نگار میں برتا۔ یہی باعث ہے کہ علومِ قدیمہ میں کوئی علم ایسا نہیں ہے جس سے عربی کا خزانہ خالی ہو۔

ہمارے نزدیک ترجمے کی تعریف یہ ہے کہ کسی مصنف کے خیالات کو لیا جائے، ان کو اپنی زبان کا لباس پہنایا جائے ان کو اپنے الفاظ و محاورات کے سانچے میں ڈھالا جائے اور اپنی قوم کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے

کہ ترجمے اور تالیف میں کچھ فرق معلوم نہ ہو۔

اس تعریف کی رُو سے یہ امر بلا شائبۂ شک ثابت ہوتا ہے کہ ترجمے میں مترجم پر مصنف کے خیالات کی پابندی فرض ہوتی ہے، اس کے الفاظ و محاورات اور اُس کے اسلوبِ بیان کی تقلید فرض نہیں ہوتی۔ اگر ان باتوں کی پابندی ضروری ہوتی تو اصل زبان میں کیا برائی تھی کہ زحمتِ ترجمہ گوارا فرمائی جاتی۔

مترجم اور مصنف میں کچھ فرق نہیں، دونوں کی حدیں ایک مقام پر جا ملتی ہیں۔ کامیاب اور قابلِ تقلید مترجم وہی شخص ہو سکتا ہے جس میں مصنف بننے اور تصنیف کرنے کی صلاحیت مضمر ہوتی ہے اور ترجمے کی گوناگوں ذمہ داریوں سے وہی شخص عہدہ برا ہو سکتا ہے، جس نے اندازِ بیان پر اس درجے قدرت حاصل کر لی ہو کہ جس مطلب کو جس پہلو سے چاہے ادا کر جائے۔ بہترین مترجم وہی بزرگ ثابت ہوئے ہیں جن میں یہ قوت بوجہ اتم موجود تھی، لیکن جن لوگوں میں یہ قوت کم تھی وہ کامیابی اور شہرت کے میدان میں اسی قدر پیچھے رہ گئے جس قدر اس قوت میں کمی تھی۔ جو لوگ مصنف کے اندازِ بیان کی تقلید سے انحراف کرنے اور ترجمے میں تصرّف سے کام لینے کی قوت نہیں رکھتے اُن کی ادبی زندگی محض عارضی اور چند روزہ ہوتی ہے، بلکہ مرنے سے پہلے ہی اُن کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حیاتِ ابدی اور شہرتِ سرمدی اُن ہی بزرگوں کا حصّہ ہے جو منظرِ عام پر جلوہ گر ہونے سے پہلے کمالاتِ صوری و معنوی سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں اور شب و روز کی متواتر اور جانکاہ محنت سے اپنے اندر وہ قابلیت پیدا کر لیتے ہیں جو ادائے فرض کے لئے ضروری اور لابدی ہوتی ہے۔

"اردو"

خدائے محبّت کے حضور میں

جس طرح زمین کو منوّر کرنے کے لئے سورج کی کرنیں ہوا کی ہزاروں چادروں کو چیرتی ہوئی اُس تک پہنچ جاتی ہیں اسی طرح اے میرے مہرِ درخشاں مجھے اُجاگر کرنے کے لئے تیری محبت کی نورانی موجیں میری سینکڑوں مادی کثافتوں کے پردوں کو چھلنی کرتی ہوئی میری روح تک آگئی ہیں۔

مجھے تیری محبت دے دی جائے۔ اور حوادثِ زمانہ کے سپرد کر دیا جائے۔

مجھے تیری محبت دے دی جائے۔ اور ہزار ہا روح فرسا واقعات سے دوچار کر دیا جائے۔

مجھے تیری محبت دے دی جائے۔ اور مصائب کے طوفان میں پھینک دیا جائے ـــــــ میں ذرا دیر کے لئے

آنکھیں بند کر کے تمام پریشانیوں کو مسرتوں میں تبدیل کر سکتا ہوں۔ میں دل پر صرف ایک دفعہ اپنا کانپتا ہُوا ہاتھ رکھ کر شادات کے تمام خوفناک اثرات کو فراموش کر سکتا ہوں اور کر لوں گا۔

میرے سینے کو تلوار کی تیز دھار سے چاک کر کے اس میں سے تمام چیزیں نکال لی جائیں اور ہر چیز کی بجائے تیری تمنائیں بھر دی جائیں۔ میں اپنی ان چیزوں کو کبھی واپس لینے کی خواہش نہ کروں گا ——— میری رگ رگ کو نوکِ نشتر سے کھول کر اس میں سے تمام خون نکال لیا جائے اور اس کی بجائے تیری شرابِ محبت کی موجیں دوڑا دی جائیں۔ میں لہو کی ایک بوند بھی کبھی کسی سے نہیں مانگوں گا ——— میری آنکھوں کے پردوں پر تیری تصویریں کھینچ کر قائم کر دی جائیں۔ میری زبان کے ہر حصہ پر تیرا نام کھدوا دیا جائے میں پھر دنیا کے رنگیں سے رنگیں منظر کو بھی دیکھنے کی تمنا نہ کروں گا۔ میں پھر دنیا کے شیریں سے شیریں گفتگو کرنے والے سے بھی بولنے کا آرزومند نہ ہونگا۔

"علی گڑھ میگزین"

پشتو کی تشبیہیں

اِدھر یار ہے اور اُدھر غیر ہے ——— یہ گل ہے اور وہ خار ہے

اِدھر حبیب ہے اور اُدھر رقیب ہے ——— یہ گنج ہے اور وہ مار ہے

اِدھر عشق ہے اور اُدھر عقل ہے ——— یہ غم ہے اور وہ غم خوار ہے

اِدھر ہجر ہے اور اُدھر وصال ہے ——— یہ خزاں ہے اور وہ بہار ہے

اِدھر طاعت ہے اور اُدھر معصیت ہے ——— یہ نُور ہے اور وہ نار ہے

اِدھر عالم ہے اور اُدھر جاہل ہے ——— یہ خفتہ ہے اور وہ بیدار ہے

اِدھر رحماںؔ ہے اُدھر جاناں ہے ——— وہ طبیب ہے اور یہ بیمار ہے

دیوان عبدالرحمان

نئی کتابیں

مطلعِ انوار۔ یہ منشی مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ شروع میں چودھری جگت موہن لال صاحب رواں کا ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں مصنف کے حالات اور اُن کے کلام کے محاسن سے روشناس کرایا ہے اس کے بعد حضرتِ اصغر گونڈوی کا دیباچہ ہے جس میں کلامِ برق کی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے نظمیں تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ تمام کتاب اڑھائی سو صفحات پر ختم ہوئی ہے مصنف کی تصویر بھی شاملِ کتاب ہے۔ کتابت طباعت کاغذ اور سرورق عمدہ ہیں قیمت ایک روپیہ مقرر کی گئی ہے۔

مطلعِ انوار میں صرف وہ نظمیں درج ہیں جن کا تعلق مظاہرِ قدرت، اخلاقیات، قومیت اور تاریخ سے ہے۔ اس کے علاوہ ایسی نظمیں بھی ہیں جو دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ غزلیں اس مجموعہ میں شامل نہیں۔

حضرتِ برق کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ اُن کی ادائے بیان میں صفائی اور بندش میں چستی ہے تشبیہات و استعارات اُن کی خصوصیت ہے اور وہ جس بات کو لکھتے ہیں محسوس کر کے لکھتے ہیں "حسنِ فطرت" "جلوۂ سحر" "مٹی کا چراغ" "کرمکِ شب تاب" "گنگا جی" "جوشِ بہار" وغیرہ ایسی تاباں و درخشاں نظمیں ہیں کہ یہ مجموعہ حقیقت میں مطلعِ انوار بن گیا ہے۔ ذوقِ ادب رکھنے والوں کو اس کی پوری قدر کرنی چاہئے۔ ملنے کا پتہ: منیجر آریہ بک ڈپو نئی سڑک، دہلی۔

ہندی اردو مالا۔ پنڈت ہری ہر صاحب شاستری، پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کالج حیدر آباد دکن کی تالیف ہے، جسے ہندی اردو کی پہلی کتاب کہنا چاہئے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اردو جاننے والے اس کو پڑھ کر خود بخود ہندی سیکھ لیں۔ یوں تو ہندی کی متعدد کتابیں طبع ہو چکی ہیں لیکن اب تک اس انداز کی کوئی کتاب نہیں شائع ہوئی۔ اسے حروفِ ہجا سے لے کر چھوٹی چھوٹی کہانیوں تک ایسے پیرایہ میں لکھا گیا ہے کہ ہندی الفاظ کی پہچان، تلفظ اور معانی بغیر کسی دقّت کے سمجھ میں آ جاتے ہیں، اور انسان چند روز میں معمولی ہندی پڑھ لکھ سکتا ہے۔ پروفیسر صاحب اس سلسلہ کی اَور کتابیں بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لئے جو حضرات بلا استاد ہندی سیکھنا چاہیں ہم اُن سے یہی کہیں گے کہ انہیں پروفیسر صاحب کی کتابوں کے علاوہ کسی اَور کتاب کے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ "ہندی اردو مالا" کی قیمت چھ آنے ہے۔

شرح اللہ۔ اسی صفحہ کا یہ رسالہ مولانا مولوی احمد علی صاحب نے تحریر فرمایا ہے اور اسے شعبہ تالیف و اشاعت انجمن خدام الدین لاہور نے شائع کیا ہے۔ فاضل مولف نے اس میں حضرت رب العزت کے اسماء الحسنیٰ کی شرح فرمائی ہے۔ شرح مختصر اور جامع ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے انسان کو خدا تعالیٰ کی سچی اور اصلی پہچان حاصل ہوتی ہے۔ دو آنے کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے۔

عرض حال

مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شرر میرے محترم بزرگ دوست تھے۔ آپ کے بیش بہا مضامین میں سے مضامین شرر کے نام سے سات جلدوں میں شائع کئے ہیں۔ جن دنوں مولانا مرحوم انگلستان تشریف لے گئے آپ کی غیر حاضری میں ہندوستان کے اکثر مطابع نے ان کی پہلی تصنیفات کو بلا اجازت چھاپنا شروع کر دیا۔ گو یہ بھی ایک بڑا بھاری اخلاقی اور قانونی جرم تھا مگر اس پر مزید غضب یہ کیا کہ کاغذ لکھائی اور چھپائی کا کچھ خیال نہ کیا بلکہ غلط سلط چھاپ کر روپے بٹورنے شروع کر دیئے۔ مجھے کتابوں کو اس طرح غارت ہوتے دیکھ کر سخت رنج ہوا۔ اس لئے میں نے باجازت ان کتابوں کو چھاپنا شروع کیا ہے اور قیمت بھی معمولی رکھی ہے۔ اب جبکہ آپ کو یہ کتابیں عمدہ صورت میں اور بازاری مطابع کے نرخ پر ہی ملیں گی تو ردی غلط کتابوں کے خرید سے احتراز فرمائیں۔

(آپ کا دعاگو۔ سید مبارک علی شاہ گیلانی مولوی فاضل منزنگ لاہور)

مضامین شرر

(ادب و علم کے بیش بہا جواہر ریزے) (ادب و علم کے بیش بہا جواہر ریزے)

مولانا عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم لکھنوی اُردو زبان کے ایک نامور مشاق اور مستند اہل قلم تھے۔ وہ اپنے علمی و ادبی ذوق اور کارناموں کی وجہ سے ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ اور ہر ایک علمی مجلس میں ان کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ غالباً وہ سب سے پہلے شخص تھے جنہوں نے اسلامی تاریخ کے اکثر واقعات کو دلکش افسانوں کے سانچے میں ڈھالا۔ شرر مرحوم کے ناول اہل علم کے علاوہ عوام کی بھی دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کا موجب ہوئے۔ مناظر فطرت کی تصویر کشی اور واقعات کا نقشہ اتارنے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ ماہ ملک، حسن انجلینا، ملک العزیز اور ورجنا وغیرہ ناولوں میں مناظر فطرت، میدان جنگ، مجالس عیش و طرب اور دوسرے واقعات اس انداز سے بیان کئے ہیں کہ پڑھنے والے کی نگاہوں کے سامنے اصل واقعہ اپنی حقیقت شکل و صورت میں آجاتا ہے۔

مولانا شرر مرحوم کی مستقل تصانیف شائع ہو کر ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ چکی ہیں اور تعلیم یافتہ طبقہ میں کوئی ایسا شخص مشکل ہی سے ملیگا جس نے ان کے ایک دو ناولوں کو نہ پڑھا ہو۔ مگر مولانا مرحوم کے وہ علمی و ادبی مضامین اور تاریخی جواہر پارے جو زیادہ تر "گداز" اور کمتر دوسرے ملکی رسائل میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے تھے۔ ایک مدت تک منضبط و مرتب صورت میں نہ لائے جا سکے بلکہ رسائل کے اوراق پریشاں ہی میں منتشر رہے۔ ایسی صورت میں عام شائقین کو ان کے مطالعہ سے استفادہ کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ ضرورت تھی کہ ان تمام متفرق مضامین کو ایک جگہ جمع کیا جاتا۔ اور خوشی کا مقام ہے کہ سید مبارک علی شاہ صاحب گیلانی نے اس مفید مگر کار عظیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا۔ اور مولانا شرر کے تمام متفرق جواہر ریزے حسن ترتیب کے ساتھ ایک سلک میں منسلک کر کے اُردو زبان کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی۔ سید صاحب موصوف کی یہ مبارک کوشش اور بلند حوصلگی رسمی داد سے مستغنی ہے۔ ان مضامین کی ترتیب و تدوین بجائے خود ایک بہت بڑا کام تھا۔ اور پھر ان کی طباعت میں ہزار ہا روپیہ کا صرفہ برداشت کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہر اہل علم کا فرض ہے کہ وہ سید صاحب کی اس علمی خدمت کی کما حقہٗ قدر کریں اور اس کی بہت آسان صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس مجموعہ مضامین کو خرید کر ہم خرما و ہم ثواب کا لطف اٹھائیے۔ مولانا شرر کے مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے متعدد جلدوں اور حصوں میں منقسم ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:-

جلد اول (شاعرانہ و عاشقانہ مضامین) اس جلد کے تین حصے ہیں جن کی قیمت علیحدہ علیحدہ عا؍ - عا؍ - عہ؍ ہے۔

جلد دوم۔ (تاریخی اور جغرافی مضامین) اس جلد کے بھی تین حصے ہیں۔ قیمت علی الترتیب عا؍ - عہ؍ - عا؍ ہے۔

جلد سوم۔ (سیر و سوانح) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس جلد میں (جس کے تین حصے ہیں) نامور مردوں اور عورتوں کے حالات ہیں پہلے حصہ میں صرف مردوں کے سوانح حیات ہیں۔ دوسرے اور تیسرے حصہ میں عورتوں کے قیمت علی الترتیب ہے؍ ، عہ؍ ، عہ؍ ہے۔

جلد چہارم۔ (ادب و تحقیق مسائل) یہ محققانہ علمی و ادبی مضامین کا ایک بیش بہا مجموعہ ہے۔ قیمت ... ... عہ؍

جلد پنجم۔ (اصلاح قوم و ملت) اس میں وہ مضامین ہیں جو قوم و ملت کی اصلاح کیلئے لکھے گئے ہیں۔ اس کی قیمت صرف عہ؍ ہے۔

جلد ششم (تاریخی واقعات پر خیال آرائی) جیسا نام ہے ویسے مضامین بھی ہیں۔ قیمت ایکروپیہ دس آنہ ... ... عہ؍

جلد ہفتم۔ (نظم و ڈرامہ) اس جلد میں مولانا کی مستقل نظمیں۔ ڈراما اور بعض دوسرے متفرق مضامین ہیں۔ قیمت ... ... عہ؍

مذکورہ بالا سات جلدیں جو تیرہ حصوں میں منقسم ہیں تقریباً چار ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ ہر ایک جلد اور ہر حصہ پر علیحدہ علیحدہ تبصرہ کرنے کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ پھر بھی ان کی خوبیوں کا احاطہ کرنا دشوار ہے لہذا قیاس کن زگلستان من بہار مرا کو مد نظر رکھ کر مندرجہ بالا تفصیل ہی کافی سمجھنی چاہئے۔

آخر میں ہم ایک بار پھر سید مبارک علی شاہ صاحب گیلانی کو اُن کی اس اہم و قابل قدر علمی و ادبی خدمت پر مبارکباد دیتے ہیں اور ناظرین زمانہ سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس بے بہا خزانہ کو جلد از جلد حاصل کر کے مستفید ہوں۔

(ریویو رسالہ "زمانہ" کانپور)

دیگر تصانیف مولانا محمد عبد الحلیم صاحب شرر مرحوم

تاریخ سوانحعمری اور لیکچر وغیرہ

جنید بغدادیؒ۔ حضرت جنید کے حالات ۔۔۔ ۳/
ابوبکر شبلیؒ۔ حضرت شبلی کے حالات ۔۔۔ ۳/
حسن بن صباح۔ بانی فرقہ باطنیہ کے حالات ۔۔۔ ۶/
خواجہ معین الدینؒ۔ خواجہ اجمیری کے حالات ۔۔۔ ۶/
ملکہ زنوبیہ۔ سلف کی ایک عربی نژاد ملکہ ۔۔۔ ۳/
سکینہ بنت حسینؓ۔ جناب سکینہ بنت امام حسینؓ کے حالات ۔۔۔ ۶/
قرۃ العین۔ ایران کی مشہور مجتہد زادی کے حالات ۔۔۔ ۲/
ولادت سرور عالمؐ۔ مولد شریف مصنفہ علامہ ابو الفرج ابن جوزی کا ترجمہ نثر کا نثر میں نظم کا نظم میں } مجلد ۔۔۔ ۸/
سفرنامہ امام شافعیؒ۔ امام ممدوح کے سفر کے حالات ۔۔۔ ۴/
سید کی دینی برکتیں ۔۔۔ ۲/
قانون وراثت اسلام پر مولانا کا ایک لیکچر ۔۔۔ ۴/
ہندوستان کی موسیقی ۔۔۔ ۴/
ثانی اثنینؓ۔ حضرت صدیق اکبر کے حالات ۔۔۔ ۶/
ذی النورینؓ۔ حضرت عثمانؓ کے حالات ۔۔۔ ۱۰/
ابو الحسنینؓ۔ حضرت علیؓ کے حالات ۔۔۔ ۸/

تاریخی ناول

عزیزہ مصر۔ عہد بنی طولون کا تاریخی ناول ۔۔۔ ۱۲/
فتح اندلس۔ اسپین پر عربوں کا حملہ ۔۔۔ ۱۱/
رومتہ الکبریٰ۔ روم پر گاتھ لوگوں کا حملہ ۔۔۔ ۱۲/
مفتوح فاتح۔ ایک نہایت دلچسپ تاریخی ناول ۔۔۔ ۱۲/
فلپانا۔ ارض طرابلس الغرب پر صحابہ کا حملہ ۔۔۔ ۱۲/
فلورا فلورنڈا۔ ہسپانیہ کے عہد خلافت کے واقعات ۔۔۔ ۱۲/
قیس ولبنیٰ۔ مشہور عاشق عرب اور اس کی معشوقہ لبنیٰ ۔۔۔ ۱۲/
لعبت چین۔ عہد صحابہ کا تاریخی ناول ۔۔۔ ۳/
مقدس نازنین۔ ایک حسینہ کا پوپ بن جانا ۔۔۔ ۱۲/
ماہ ملک۔ عورتوں کا عروج اور فتوحات ۔۔۔ ۱۱/
یوسف نجمہ کامل۔ جگ بیتی نہیں آپ بیتی ۔۔۔ ۱۲/
ایام عرب۔ جاہلیت عرب کی مکمل تصویر ہر دو حصہ ۔۔۔ ۱۱/
جویائے حق۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانحعمری بطور ناول حصہ اول ۱۲/ دوم ۱۱/ کامل ۔۔۔ للعہ
زوال بغداد۔ شیعہ سنیوں کی نااتفاقی کا عبرتناک نتیجہ بغداد کی تباہی ۔ ۱۲/
شوقین ملکہ۔ دوسری صلیبی لڑائی ۔۔۔ ۱۲/
طاہرہ۔ نہایت دلچسپ تازہ ناول ۔۔۔ ۱۲/
مینا بازار۔ مولانا کا سب سے اچھا ناول ۔۔۔ ۳/
نیکی کا پھل۔ نہایت دلچسپ آخری تصنیف ۔۔۔ ۳/
الفانسو۔ ایک عاشقانہ ناول ۔۔۔ ۱۲/
بابک خرمی۔ سلطنت عباسیہ کے حالات ہر دو جلد ۔۔۔ ۱۲/

تصانیف مصور غم علامہ راشد الخیری دھلوی

سمرنا کا چاند } پہلی بار چھپتے ہی اتنی جلدی ختم ہوئی کہ چھ ماہ کے اندر اندر دوسری مرتبہ طبع کرانے کی وقت اٹھانی پڑی۔ اب پھر تھوڑی سی جلدیں باقی ہیں جلد طلب فرمائیے۔ یہ کتاب تربیت نسواں کے لئے ایک سبق آموز اضافہ ہے۔ **قیمت** ۱۲/

آفتاب دمشق } عہد صدیقی کا اسلام۔ ایک حسینہ کا اسلام پر شیدا ہو کر مسلمان ہونا۔ قید کیا جانا اور فصیل کے کنگوروں پر سے گرائے جانے پر بھی اسلام سے سرتابی نہ کرنا۔ جوش اسلامی، حمیت اسلامی، عدل اسلامی کا نمونہ آپ کو اس کتاب کے مطالعہ سے ملیگا۔ دوبارہ چھپی ہے۔ لکھائی چھپائی سرورق نہایت دیدہ زیب **قیمت** ۔۔۔ ۱۲/

محبوبہ خداوند	۱۲/	شام زندگی	۱۲/
یاسمین شام	۱۲/	شب زندگی	۳/
صبح زندگی	۱۲/	نوحۂ زندگی	۱۲/

بنت الوقت	۸ر	جوہر قدامت	عـہ۸ر	ماہ عجم	عـہ۸ر	منازل السائرہ	عہر
سراب مغرب	۸ر	طوفان حیات	عہر	سنجوگ	۱۰ر	گوہر مقصود	۶ر
سات روحوں کے اعمالنامے	۶ر	موؤدہ	۸ر	سوکن کا جلاپا	۶ر	دُرِشہوار	۱۰ر
الزہرا یعنی بتول بنت رسولؐ کی لائف	۱۲ر	شب زندگی حصہ دوم	عہر	جوہر عصمت	۶ر	فسانہ سعید	۱۰ر
عروس کربلا	عـہ۸ر	تائید غیبی	۸ر	روئداد قفس	۶ر	اُمت کی مائیں	عہر
انگوٹھی کا راز	۸ر	لڑکیوں کی انشا	۱۲ر				

نامور مصنفینؒ کی مقبول تصنیفات

سیرت النعمان مصنفہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم جیسی یہ کتاب علامہ مرحوم نے اعلیٰ درجہ کی تصنیف فرمائی ہے۔ اور کروڑوں حنفی مذہب مسلمانوں کو امام اعظمؒ اور ان کے نامور و ممتاز شاگردوں کے حالات اور مسائل سے آگاہ کیا۔ ویسے ہی یہ کتاب مختلف مطابع نے چھاپ کر ایسی ردی کر دی تھی کہ دیکھ کر دماغ پریشان ہوتا تھا۔ ہم نے اسکی نہایت عرقریزی سے صحت کی اور اس پر حاشیے بھی تحریر کئے۔ اور دو قسم کے کاغذ پر چھپوائی **قیمت** قسم اول دو روپے (عـہ) قسم دوم ۔ ۔ ۔ (عـہ۸ر)

مستقبل اسلام پروفیسر وامبری جو بہت عرصہ تک اسلامی دنیا میں رہا۔ اور سیاسی و مذہبی معلومات سے مستفید ہو کر ایک معرکۃ الآرا تصنیف مغربی تمدن اور مشرقی ممالک شائع کی۔ اس کا مسٹر ظفر عمر صاحب بی اے (علیگ) مؤلف نیلی چھتری و بہرام کی گرفتاری نے نہایت مقبول ترجمہ فرمایا۔ اور حاشیے بھی لکھے۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ اسلام کی آئندہ حالت مغربی نقطۂ نظر سے دیکھنا ہو تو اس کو ملاحظہ فرمایئے۔ آجکل اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ **قیمت** ۔ ۔ ۔ عـہ۵ر

ذکر فتح اندلس یہ کتاب نایاب تھی اور حالات قابل مطالعہ تھے۔ مسٹر محمد جمیل الرحمٰن صاحب پروفیسر حیدرآباد دکن نے ترجمہ کر دیا اور اصل متن عربی کو بھی منسلک کر دیا۔ واقعی قابل دید مختصر تاریخ ہے **قیمت** صرف بارہ آنے ۔ ۔ ۔ (۱۲ر)

حسنیہ عربی صرف و نحو میں اردو کتاب۔ عوامل کی تشریح اور توضیح جو کہ مصنف نے اس کتاب میں فرمائی۔ بڑی بڑی کتابوں میں بھی یکجا نہ پائی جاوے گی **قیمت** ۔ ۔ ۔ ۶ر

رہنمائے قانون المعروف وکیل کا منشی وکلا کے لئے بہت سی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن منشی صاحبان جن کو کم دماغ سوزی نہیں کرنی پڑتی ان کیلئے ایک کتاب بھی نہ ہو کتنی افسوس کی بات ہے۔ یہ کتاب منشی صاحبان کیلئے خصوصاً اور عرائض نویسوں ثالثوں۔ ساہوکاروں وغیرہ وغیرہ کیلئے عموماً مفید ہے اس کتاب میں قانون مروجہ ہند کو نہایت آسان عام فہم زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ ناظرین منگائیں اور قانونی الجھاؤں سے مخلصی پائیں **قیمت** ۱ روپیہ

یوسف پاشا مصنفہ میر ارشد دہلوی عشق و محبت رزم و بزم اور اسلامی جوش۔ مجاہدین اسلام اور مسیحیوں کی معرکہ آرائیاں۔ نہایت عجیب و غریب نظارے جن میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ ترک ڈاکو نہیں تھے۔ بلکہ در اصل ڈاکو وہ تھے جو اسلامیوں کو ڈاکو بتاتے تھے اس کا ثبوت بھی تاریخی حوالہ سے دیا گیا ہے۔ طرز بیان ایسا دلچسپ کہ بغیر ختم کئے چھوڑنے کو دل نہ چاہے **قیمت** صرف ایک روپیہ آٹھ آنے (عـہ)

سکھیا بھارت المعروف بہ دولتمند ہندوستان

جو ملک ہندوستان کی گذشتہ عظمت اور سابقہ شان و شوکت کا زندہ فوٹو ہے اور ہندو مسلم اتفاق کا جیتا جاگتا نمونہ ہے مصنفہ خان شیر محمد خانصاحب بی اے (علیگ) وکیل۔ قیمت (عـہ) رعایتی بارہ آنے (۱۲ر)

سیرۃ الشافعی یعنی حضرت امام محمد بن ادریس شافعی علیہ الرحمۃ کی سوانح عمری۔ ان کے نام و نسب ولادت تعلیم تربیت سفر حجاز و عراق آپ کی مخالفت و عداوت آپکا شہید ہونا وغیرہ تمام حالات درج ہیں ۔ عـہ۸ر

ملنے کا پتہ۔ **منیجر گیلانی الیکٹرک پریس بکڈپو ہسپتال روڈ لاہور**

تصنیفات احمد حسین خانصاحب ایڈیٹر رسالہ شباب اُردو لاہور

سیرۃ احمدیؐ یعنی حضور سرور عالم رحمۃ للعالمین کی سوانحعمری اس کتاب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانحعمری کے علاوہ ازواج اور اولاد کا تذکرہ بھی ہے۔ حضور کے طبعی عادات و حالات حضور کی تعلیم اور اس کی فلاسفی نبوت اور معجزات اور انکی فلاسفی تکثیر ازواج طلاق غلامی اسلام مذہب سیف نہ تھا نہ ہے، ان عنوانات پر تفصیلاً بحث کی ہے جو اس کتاب کی خصوصیت ہے۔ نہایت دیدہ زیب کتابت اور طباعت البتہ کاغذ دو طرح کا لگایا گیا ہے۔ قیمت درجہ اول ۲ روپے درجہ دوم عہ/ عاشقان حضور کے قابل مطالعہ ہے جلد طلب فرمایئے تا دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

نظیر بیگم یہ اپنے رنگ کا بے نظیر ناول ہے جس میں ایک بیاہتا کی وفاداری اور رنڈی کی بیوفائی دکھائی گئی ہے۔ شوہر کی جدائی وجہ اتفاقی سے عورت مرجاتی ہے۔ آخر میں رنڈی کے مظالم سے شوہر تنگ آکر مجنون ہوجاتا ہے اور بیوی کی قبر کی تلاش میں قبرستان جاتا ہے۔ وہاں ایک نقاب پوش عورت کو پاتا ہے جو دراصل اس کی بیوی ہے مرجانے کے بعد اسے بیوی کیونکر زندہ مل گئی؟ یہ راز کتاب پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ عہ/

حسرت یہ ایک اسم بامسمیٰ ناول ہے جس میں گردش زمانہ تنگی اور اقبال اور ادبار کے دلکش سین اور ایک جان نثار شوہر کی وفاداری اور مستقل مزاجی کو ایسے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ حسرت کی زندہ تصویر آنکھوں کے روبرو پھر جاتی ہے۔ ایسے ناول بہت کم لکھے گئے ہیں۔ قیمت عہ/

سوز عورت کی کیا دی اور مکاری کی داستان۔ عورت کی بیوفائی۔ دوستوں کی عہد شکنی۔ خود غرضی اور خودکامی کے نتائج۔ رنج اور اندوہ کا افسانہ، درد و غم کی کہانی، زمانہ کی ناساعدت، دنیا کے نشیب و فراز، دوستوں پر بھروسہ کا انجام، بیوفائی اور بے مہری کی داستان، عورت کی کرتوت، اور اس کا کیفر کردار ضبط و تحمل کی کامیابی بہت ہی دلچسپ اور دلکش انداز میں دکھائی گئی ہے اس کو پڑھکر انسان مبہوت ہوجاتا ہے۔ قیمت ۔ ۔ ۔ عہ/

گیتی آرا بُری صحبت کا انجام۔ بدچلنی اور بدمعاشی کے نتائج شراب خانہ خراب کی کرتوت۔ ایک رئیس کی تباہی۔ یورپین تہذیب کے تباہ کن کرشمے۔ ایک مظلوم عورت کی کامیابی، بیوفا بدچلن شوہر کی بدکرداریوں کا انجام شروع سے اخیر تک سوز و گداز اور درد و اندوہ سے معمور ہے۔
قیمت صرف بارہ آنے ۔ ۔ (۱۲/)

آہ یہ فاضل مصنف کے بہترین ناولوں میں سے ایک اعلیٰ پایہ کا دردانگیز ہوشربا اور نتیجہ خیز افسانہ ہے۔ یہ ناول مستورات کو خاص شوق سے پڑھنا چاہیئے تاکہ معلوم ہو کہ وہ لڑکیاں جو خودسر ہوجاتی ہیں اور ناعاقبت اندیش ہیں۔ اور والدین کے حکم سے باہر جاتی ہیں اپنی زندگی برباد کرتی ہیں ۱۲۰ا/

شمع سحر ایک انگریزی ناول کا قابل قدر اُردو ترجمہ مترجم نے کوشش کرکے قصہ کو ایشیا کے مذاق کے مطابق بنا دیا ہے۔ اصل کتاب انگلستان کے ایک مشہور معروف ناولسٹ کی تصنیف ہے اس کتاب کی خوبی کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی فہرست میں شامل ہے جس پایہ کی یہ کتاب ہے اسی پایہ کا یہ ترجمہ ہے۔ پڑھنے سے ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اوریجنل تصنیف معلوم ہوتی ہے ۱۲۰ا/

پری بانو قابل دید عجیب و غریب ناول ہے۔ خصوصاً مگر اگر عورت کی محبت، ایثار، ایمانداری، امانت کا تذکرہ نہایت مؤثر پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ قیمت ۔ ۔ ۔ ۱۲/

آپ بیتی ایک لڑکے کا باپ فوت ہوجاتا ہے ماں دوسرا نکاح کرلیتی ہے۔ بچے کو اس موقعہ پر جو سختیاں اور تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں انکو پڑھکر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں آخر میں خداوند تعالیٰ کے فضل سے کامیاب لائق گریجویٹ بن جاتا ہے۔ نہایت مزیدار لکھا ہے۔
قیمت صرف بارہ آنہ ۔ ۔ (۱۲/)

آئینہ روزگار بچوں کو زیور پہنانا گویا بچہ کی جان ضائع کرنا ہے۔ چور چوری کس طرح سیکھتا ہے اور مال کو کس طرح اڑاتا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ کہیں کہیں عیاشی کے بدنتائج بھی معلوم ہوتے جائیں گے۔ یہ مصنف کا پہلا ناول ہے جس میں نانا اور ناول کا مزا آتا ہے۔ واقعی آئینہ روزگار ہے۔ قیمت صرف ۔ ۔ عہ/

نازنین مہ جبین ایک عورت کا آگ میں غسل کرکے دوہزار سال تک زندہ رہنا اور پھر غسل آتشین سے ہی زندگی کا ختم ہونا نہایت رقت خیز اور حیران کرنے والا بیان ہے۔ پڑھیں اور متعجب ہوں۔ وحشیانہ زندگی اور وحشیوں کے رسم و رواج بھی اس سے معلوم ہوجائیں گے یہ نہایت ہی دلچسپ اور قابل دید کتاب ہے۔
قیمت صرف نو آنے ۔ ۔ (۹/)

سادھو کی کرتوت } فقیری کے لباس میں عیاشی، قزاقی، ظلم و ستم کا نظارہ قابل دید ناول **قیمت** ۔ ۸ر

گلبدن } ایک غریب کا اتفاقاً لاٹری میں دولت پاکر دولتمند ہو جانا پھر دولت کے نشہ میں آکر اعزا اقربا سے نفرت کرنا اپنی لڑکی کی نسبت اپنے بھتیجے سے کرکے اس سے پھر جانا۔ نتیجہ کے لئے ناول دیکھو۔ سراغرسانی کا بہت ہی دلچسپ ناول ہے **قیمت** ۱۲ر

مکافات عمل } ایک سنسنی خیز اور پُر درد فسانہ، محبت کی باتیں عشق کے چوچلے۔ وصال و فراق کی داستان راز و نیاز کی باتیں اور محبت کی کرشمہ سازیاں نیکی کی جزا بدی کی سزا قابل دید ناول ہے **قیمت** ایک روپیہ ... عہ ر

پارۂ دل } ایک دلگداز فسانہ۔ گردش تقدیر کے کرشمے۔ جدائی اور نامرادی کی داستان حسن و عشق کا معاملہ بہت ہی دلسوز اور جگر دوز فسانہ ہے **قیمت** ایک روپیہ ... عہ ر

درد } ایک لاجواب ڈی ٹیکٹو ناول جس کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ پری بانو کے بعد یہ سب سے بہتر ناول ہے۔ اسکو پڑھکر انسان ہمہ تن درد و سوز بن جاتا ہے پڑھکر دیکھئے **قیمت** ایکروپیہ چار آنہ عہ ر

وہ عورت جس نے کرکے دکھایا } کیا کرکے دکھایا۔ قابل دید ایک عجیب غریب ناول ہے اس کو پڑھ کر دیکھئے **قیمت** .. ۱۲ر

واہ } سراغرسانی کے ناولوں میں سب سے بہتر ناول ہے۔ انسپکٹر محمود صاحب ہندوستان کے شرلاک ہومز کے کارنامے جو جناب مسٹر ٹامکنس صاحب بہادر ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کے ایماء سے لکھا گیا ہے۔ اور انہی کے نام نامی پر معنون ہے۔ **قیمت** ایکروپیہ چار آنہ ... عہر

سرخ حرف } بعض کا خیال ہے کہ یہ فلسفی ناول جو سراپا سوز و گداز ہے بہترین تصنیف ہے۔ اور یہ بالکل سچ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دیو انتقام شوہر نے عبرت خیز انتقام کس طرح لیا نتیجہ خیز اور قابل دید ناول ہے **قیمت** صرف بارہ آنہ ... ۱۲ر

ابلیس و حمیلہ } شیطان کے انسانوں سے ہتھکنڈے لائق دید اور قابل عبرت ناول **قیمت** صرف ۔ ۱۲ر

اسرار امرتسر } ٹائٹیل اور طباعت وغیرہ دیدہ زیب واقعات نہایت دلربا **قیمت** صرف ... ۹ر

کوہ شملہ } یہ ناول بھی دیکھنے کے لائق ہے اسے پڑھ کر دنیا کے نشیب و فراز انسان خوب سمجھ سکتا ہے **قیمت** ۸ر

تصویر رسوائی } یعنی سردار بیگم کی بیوفائی۔ نہایت دلچسپ ناول ہے **قیمت** آٹھ آنہ ... ۸ر

تصنیفات عدیم المثال فسانہ نویس منشی پریم چند صاحب بی اے لکھنوی

منشی صاحب کے افسانے اور ناول ہمیشہ اصلاح خلق پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کا مقصد شریفانہ جذبات کا برانگیختہ کرنا ہوتا ہے۔ ان کتابوں میں فطرت کا دلچسپ مطالعہ نازک ترین جذبات و احساسات کا بیان ہے۔ زندگی کے معموں کو نہایت خوبی سے سلجھایا ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ منشی صاحب کی تصنیف آپ پڑھیں اور ان کی جادو بیانی اور سحر نگاری کے قائل نہ ہو جائیں۔ پڑھ کر دیکھئے۔

پریم پچیسی حصہ اول و دوم } ادیب فطرت نگار کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ مقبول تصنیف جو پہلا ایڈیشن تمام ہونے کے بعد کہیں سے دستیاب نہ ہوسکتی تھی اب چھپ گئی ہے کاغذ طباعت کتابت قابل دید حصہ اول عہ حصہ دوم عہر

پریم بتیسی حصہ اول و دوم } منشی صاحب کے بتیس بے نظیر افسانوں کا مجموعہ۔ یہ وہ قصے ہیں جنہیں پڑھ کر ہندوستانی زندگی کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ جیسے بے نظیر قصے ہیں ویسے ہی بے مثل اہتمام سے چھپے ہیں۔ **قیمت** حصہ اول عہ ۱۲ر حصہ دوم دو روپیہ ... عاؔر

خاک پروانہ } منشی صاحب کے تازہ افسانوں کا مجموعہ جن کی شہرت و قبول کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جینی زبان میں بھی اس کے ترجمے ہوئے ہیں **قیمت** ۔۔ عہ ر

مطبوعہ [illegible] گیلانی الیکٹرک پریس۔ میکلوڈ ہسپتال روڈ۔ لاہور

خواب و خیال } مختلف افسانوں کا مجموعہ۔ ہر افسانہ پختگی خیالات اور شستگی تحریر کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہے ضخامت ۲۰۴ صفحہ۔ ٹائٹل رنگین **قیمت** ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عمر

بازارِ حُسن } منشی صاحب کا پہلا ضخیم ناول اردو میں ایک حسین اور نازو نعم میں پلی ہوئی لڑکی کی سرگذشت ہے۔ اس کے باپ کی گرفتاری کے بعد اس کے عزیزوں نے ایک ایسے غریب شخص سے بیاہ دیا جو کسی لحاظ سے اس کیلئے موزوں نہ تھا۔ اس شادی کا کیسا اندوہناک نتیجہ ہوا وہ اسے پڑھ کر دیکھئے۔ **قیمت** حصّہ اوّل عمر حصّہ دوم ۔ ۔ عمر

چوگانِ ہستی } ہندی میں منشی صاحب کا یہی ناول (رنگ بھومی) کے نام سے اس قدر مقبول ہوا کہ تمام پریس نے باتفاق رائے اسے طبعزاد ہندی ادب کا اور منشی پریم چند صاحب کا بہترین ناول قرار دیا ہے منشی پریم چند صاحب نے اس شاہکار کا خود اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ معاشرت کی صحیح مصوری اور کردار نگاری نکتہ رسی اور فلسفیانہ غور و خوض میں منشی صاحب کو ید طولیٰ حاصل ہے اور اس ناول میں انکی یہ تمام خصوصیات اپنے پورے شباب پر ہیں۔ ابھی چھپکر تیار ہوا ہے۔ مایوسی سے بچنے کیلئے فوراً طلب کیجئے۔ **قیمت** حصّہ اوّل عہ حصّہ دوم عہ

رامِ چرچا } ہمارے دوست پریم چند صاحب نے یوں تو اُردو زبان کو اپنی بے نظیر تصانیف سے مالا مال کر دیا ہے لیکن ان کی یہ کتاب خاص طور پر بچوں کے پڑھنے کے واسطے لکھی گئی ہے۔ اسکی زبان خاص طور پر سلیس و سادہ ہے۔ طرز بیان ایسا ہے کہ رامائن کے تمام واقعات ننھے ننھے بچے بھی اسے پڑھ کر ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ "رام چرچا" میں مریادا پرشوتم سری رام چندر جی مہاراج کی لاثانی زندگی کے پورے حالات اور واقعات قلمبند کئے ہیں۔ پیدائش، شادی، بن باس، سیتاجی کا ہر جانا، لنکا پر حملہ، اجودھیا میں واپسی، بھرت ملاپ، سیتاجی کا بن باس وغیرہ۔ تمام واقعات نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ بچوں کے علاوہ کم استعداد اصحاب اور عورتوں کے لئے بھی اس کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ چھوٹی تقطیع حجم ۲۴۶ صفحات۔ سرورق رنگین و مصوّر۔ **قیمت** ۔ ۔ ۔ ۔ عمر (زمانہ کانپور)

نرملا } یہ ناول منشی صاحب کی تازہ تصنیف ہے جس میں ہندوستان کی معاشرتی زندگی پر نتیجہ خیز انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک وکیل صاحب اور انکی بیوی اور لڑکوں کا نہایت دلچسپ قصّہ ہے۔ وکیل صاحب گھر سے نکلتے کچھ سوچکر ہیں اور نتیجہ کچھ اور نکل آتا ہے جسکا بیان خصوصیت سے دلچسپ اور عبرت خیز ہے۔ ٹائٹل رنگین **قیمت** عہ

گوشۂ عافیت } اس ناول میں نہ فارسی ترکیبیں ہیں اور نہ عربی کے پُر رعب الفاظ بلکہ تمام مسائل کو نہایت سیدھے سادے الفاظ اور روزمرہ کی بول چال میں ادا کیا گیا ہے۔ **قیمت** حصّہ اوّل عہ حصّہ دوم عہ

سوزِ وطن } حُبِّ وطن کے قصّے۔ اس کیساتھ **سیر درویش** ایک نہایت معنیٰ خیز قصّہ بھی منشی صاحب کا مصنفہ شامل کیا گیا ہے۔ **قیمت** ۔ ۱۲ر

پریم چالیسی ۔ اعلیٰ کہانیاں۔ ادبی دنیا میں قابل قدر اضافہ (زیر طبع)

تصنیفات بابو تیرتھ رام صاحب فیروزپوری مشہور ناول نویس

فسانۂ بنگال } بنگلہ زبان کی چیدہ اور پسندیدہ کہانیوں کا ترجمہ شستہ و رفتہ اُردو میں کوئی کہانی ایسی نہیں کہ آپ اسے شروع کر کے نامکمل چھوڑ سکیں ۱۳۵ صفحے **قیمت** ۔ ۔ ۱۲ر

نقلی نواب } بڑا دلچسپ اور قابل دید جاسوسی ناول ہے۔ اور نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے **قیمت** عہ

سنبلستان } بنگالہ کی پندرہ نہایت دلکش اور مقبول کہانیوں کا مجموعہ جن میں سے ہر ایک پبلک سے تحسین خراج حاصل کر چکی ہے ۱۷۶ صفحے **قیمت** ۔ ۔ ۔ ۔ عہ

مصنوعی انسان } (اور دوسرے افسانے) نہایت دلچسپ اور مقبول اور سبق آموز کہانیوں کا مجموعہ **قیمت** ۔ ۱۲ر

تصنیفات مہاشہ سُدرشن

فطرت نگار سدرشن صاحب دور حاضرہ کے بہترین قصہ نویسوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شہرت محتاج تعریف نہیں رہی۔ انکی کتابیں پڑھ کر آپ خوش ہوں گے آپ کو فخر ہوگا کہ مادر ہند بھی ایسے مصنف پیدا کرنے لگی ہے۔ ان کی کتابیں عورت مرد بچے سب کے پڑھنے کے لائق ہیں۔

ملنے کا پتہ ۔ منیجر [illegible]

اکثر کا ترجمہ گجراتی، سندھی، اور مرہٹی زبانوں میں ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے۔

بنگال بتیسی پہلا حصہ یہ ۳۰۴ صفحات کی کتاب نہایت عمدہ کاغذ پر نفیس لکھائی چھپائی کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ اس حصہ میں بنگالی زبان کے بہترین کہانیاں لکھنے والے اصحاب کی ۳۱ کہانیوں کا ترجمہ ہے۔ یہ کہانیاں اس قدر پُر لطف پُر سبق اور دلچسپ ہیں کہ پڑھ کر پرندہ دل رقص کرنے لگتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اردو دان اصحاب کو معلوم ہوگا کہ فن قصہ نویسی کیا ہے اور بنگالیوں نے اس فن کو کس قدر عروج پر پہنچا دیا ہے۔ یہ کتاب ہر ایک عورت مرد کے دیکھنے کی چیز ہے اور اس میں کوئی فقرہ یا سطر ایسی نہیں جو چال چلن پر بُرا اثر ڈالنے والی ہو۔ جو اصحاب کہانیاں لکھنا سیکھنے کے خواہشمند ہوں ان کو اس کتاب کا ضرور بالضرور مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ غلط راستے پر ہولیں۔ اور لکھنے کی عادت انہیں ایسی پڑ جائے کہ پھر بدلنا ناممکن ہو جائے۔ ذیل میں ان اصحاب کے اسمائے گرامی درج کرتے ہیں جن کی کہانیاں اس حصہ میں ترجمہ کر کے داخل کی گئی ہیں تاکہ ان کی اہمیت کا احساس لوگوں کو ہو سکے اور وہ کچھ اندازہ کتاب کی خوبیوں کا لگا سکیں۔

شاعر رابندر ناتھ ٹیگور، بابو پربھات کمار چیٹرجی ایم اے بیرسٹر، شریمتی ان پورنا دیوی بی اے۔ بابو شرت چندر چیٹرجی، بابو شرچند گھوشال ایم اے۔ بابو کیشو چندر گپتا، ایم اے بی ایل۔ بابو جلدھر سین، بابو اپیندر ناتھ گانگولی، بابو سریندر موہن مکرجی، شریمتی نروپما دیوی۔ بابو سیم ناتھ سرکار، بابو گرجا کمار گھوش۔ **قیمت** ۔ ۔ ۔ عہ

بنگال بتیسی دوسرا حصہ یہ اسی کتاب کا دوسرا حصہ ہے۔ اس کی لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ ہے اس کے ۲۷۶ صفحے ہیں اور اس میں ۹ کہانیاں ہیں ہم تو نہیں سمجھتے مگر لوگوں کا خیال ہے کہ اس حصہ کی کہانیاں پہلے حصہ کی کہانیوں سے بدرجہا افضل و برتر ہیں۔ ان میں فصاحت ہے۔ ان میں بے ساختہ پن ہے۔ ان میں حسن ہے اور ان سب سے بڑھ کر ان میں تاثیر ہے جو نہایت ضروری عنصر ہر ایک عمدہ اور مفید کتاب کا ہے۔ بہت عمدہ کتاب ہے۔ کہانیوں کی یہ کتاب کہانیوں کے ہر ایک شوقین کو پڑھنی چاہیے۔ **قیمت** ایک روپیہ بارہ آنہ ۔ ۔ ۔ عہ ۱۲/

گناہ کی بیٹی یہ پورے ایک سو صفحے کا ناول ہے جسے فطرت نگار سدرشن نے بنگالی زبان کے ایک نادر ناول سے ترجمہ کیا ہے۔ اس میں ایک آوارہ عورت کی بیٹی کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ اور بتایا گیا ہے کہ نیک جذبات ایسے سینوں میں بھی کروٹیں بدلتے ہیں جہاں انسان کو گناہ کے سوائے کسی دوسری شے کی توقع نہیں ہوتی۔ اور روشنی وہاں بھی اپنے جلوے دکھاتی ہے جہاں بظاہر سراسر تاریکی کی حکومت سمجھی جاتی ہے اور کہ دنیا میں نیکی بھی تکلیف پاتی ہے۔ اگر وہ گناہ کے پیٹ سے پیدا ہو اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نیکی کرنا کیسا مشکل اور بدی کرنا کس قدر آسان ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ حسن و عشق کی داستان کے ساتھ معرفت کے ایسے ایسے عقدے مصنف نے حل کئے ہیں کہ انسان عش عش کر اٹھتا ہے اس کتاب کا آغاز عشق مجازی سے ہوتا ہے۔ مگر آخر میں وہی عشق عشق حقیقی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ **قیمت** ۔ ۔ ۔ ۔ ۸/

وجے سنگھ یہ بنگال کے مشہور ڈرامائسٹ بابو ڈی۔ ایل رائے کا ناٹک ہے جسے فطرت نگار نے اردو جامہ پہنایا ہے لکھائی چھپائی عمدہ اور کاغذ نفیس ہے اور حجم ۲۰۸ صفحے ہے۔ اس میں سوتیلی ماں کی خصلت بد کا، باپ کی محبت کا، عورت کی جانبازی کا اور شریف جذبات کا بیان ہے۔ پہلا ہی منظر اس قدر ہوشربا ہے کہ پڑھ کر طبیعت پر اثر ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ہر ایک منظر ایسا دلچسپ ہے کہ جب تک کتاب ختم نہ ہو جائے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ ناٹک بازاری ناٹکوں کی طرح نہیں ہے۔ اس میں انسانی دل کی گہرائیوں اور روحانی بلندیوں کا بیان ہے۔

آپ نے اُردو ناٹک بہت دیکھے ہوں گے مگر بنگالی دماغ نے ناٹک کیا بنا دیا ہے یہ دیکھنا ہو تو وجے سنگھ دیکھئے۔ آپ دنگ رہ جائیں گے۔

قیمت اس کی ایک روپیہ ہے جو اس کی خوبیوں کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔

عورت کی محبت ۳۰۴ صفحے کا ناٹک ہے کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ اس کے مصنف بھی وہی بابو ڈی۔ ایل رائے ہیں۔ اور مترجم فطرت نگار سدرشن یہ کہنے کو تو ایک ناٹک ہے۔ مگر سچ پوچھا جائے تو وعظ و پند کا ایک دفتر ہے اور خوبی یہ کہ جی اکتاتا نہیں۔ طبیعت کہانی میں بکھنی رہتی ہے اور دل پر شرافت کا اثر ہو جاتا ہے۔ آپ نے اُردو میں آجتک جتنے ناٹک دیکھے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو اس ناٹک کا مقابلہ کر سکے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ اصلی محبت کیا ہے۔ اور سفلی جذبات کیسے ہوتے ہیں۔ ایک نقاد کی رائے ہے کہ شیکسپیر نے کنگ لیر میں لیر کا کیرکٹر بنانے میں جو کمال دکھایا ہے اس سے زیادہ کمال ڈی۔ ایل رائے کا ہے جنہوں نے لالہ سکندر لال جیسا محبت کا فرشتہ دنیا کی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(ہمایوں)

بیادگارِ علامۂ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد

فہرستِ مضامین

جلد ۱۸ — بابت ماہِ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء

تصویر:- حرم —— ایک زرّیں قفس

چند باتیں

پچھلے مہینے جو میں نے چند باتیں کہیں تو میرے عزیز دوست کا خط آیا کہ "اپنی باتوں کو قدرے بالاتر بناؤ۔ شخصی جو چیز ہو وہ تب تک ادب نہیں بنتی جب تک کہ وہ Universal (کُلّی) سے شانہ بشانہ نہ ہو۔" میں حیران ہؤا کہ ابھی دو ایک دن پہلے ہی پنجاب کے ایک نو آباد شہر سے مجھے انہیں باتوں کے متعلق شکریہ کا خط آیا تھا اور اس کے علاوہ میرے ایک نہایت قابل نوجوان دوست نے انہیں بہت پسند کیا تھا اور اب یہ عزیز دوست یوں لکھتے ہیں! مجھے کچھ مایوسی سی ہوئی کہ لیجئے میں نے تو اپنے دل کی اک کلی سی بزمِ ہمایوں میں پیش کرنی چاہی تھی لیکن بعض ارکان کو منظور نہ ہوئی۔ دوسرے دن پھر یاد آیا تو خیال کیا کہ محض اک عزیز دوست نہیں اک ہمدرد دل کا اشارہ اور اک قابل دماغ کی رائے ہے۔ اس پر کم از کم غور کیا چاہئے لیکن خود پسندی نے زیادہ پیش نہ چلنے دی۔ خط جوں کا توں پڑا رہا۔ نہ اس کا جواب دیا نہ اس پر عمل کیا۔

چند روز کے بعد دماغ نے سوچا کہ اک قابل دوست کی رائے نایاب شئے ہے۔ اگر مجھے اختلاف ہے، تو تبادلۂ خیالات کے بعد معاملہ صاف ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کچھ میں سمجھ لوں کچھ وہ مان لیں۔ ارادہ کیا کہ ان کو ضرور لکھوں گا کہ بھائی یہ بات ہے اور یوں ہے۔ اب آپ کیا کہتے ہیں؟

اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ایک صبح جو کاروباری نوٹ بک اٹھا کر دیکھی تو معلوم ہؤا کہ "رمضان کے عین بعد" مجھے "شبلی کی منفرد حیثیت" پر ایک لکچر دینا ہے۔ طوعاً و کرہاً وعدہ کر چکا ہوں۔ اتفاق سے معارف نظر سے گذرا تو اس میں بھی دوسرے لکچروں کے ساتھ اس کا اعلان پایا۔ دل جو کچھ کھسیانا ہو کر میرے جانے بوجھے بھی چرا رہا تھا ایک عام اشتہار دیکھ کر گویا کانپ گیا کہ اب تو خواہ کچھ ہو یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ پھر یہ بُری عادت اک عرصے سے سر پر بھوت کی طرح سوار ہے کہ جو کام کرنا ہو۔ جلد کرنا ہو یا دیر میں، اسے ابھی سے شروع کر دو شاید اس لئے کہ جو مصیبت ٹل جائے وہی اچھی۔ غرض نیچے اپنی لائبریری میں گیا اور شبلی کی جتنی کتابیں ملیں انہیں گھسیٹ کر الماریوں سے نکالا اور لادے لادے اوپر لے آیا۔ اب شبلی

تو آ گیا۔ باقی رہی مصنفانہ حیثیت ۔ اس کا کیا علاج کیا جائے + خیال آیا کہ بڑے بڑے لکچر دینے والے اور اُن سے شاید بڑے لکچر سننے والے ہونگے ۔ اپنی عزت پہلے اپنے ہاتھ ہوتی ہے پھر دوسرے کے ہاتھ بہتر ہے ابھی اس کا کچھ بندوبست کرلوں + سمجھ میں آ گیا کہ تصنیف و تنقید کے متعلق کچھ مطالعہ کرنا چاہئے آج کل کے پتلون کوٹ پہننے والوں کے لئے انگریزی کتابیں تو قریب ہی ہوتی ہیں اور اردو کتابیں یا بالکل ناپید یا دور۔ ایک حد تک یہی حال میرا ہے "مطالعۂ ادب" پر ایک انگریزی کتاب اُٹھائی اور پڑھنے لگا (اب شکر ہے کہ اس کے بعد چند ایسی اردو کتابوں اور رسالوں کی راہ بھی دیکھ لی ہے) + کتاب کے آخری باب میں ادب کے تنقید و تخمینہ پر نظر دوڑا رہا تھا کہ اس عنوان پر پہنچا کہ ادب میں اعلیٰ معیار کا ثبوت کیا ہے اور معلوم ہُوا کہ اعلیٰ ادب وہ ہے جس کا اثر عالمگیر اور پائدار ہو۔ بہترین تصنیفات وہ ہیں جو اخلاقی و دماغی زندگی کی ہمیشہ نشوونما پاتے رہنے والی کیفیتوں سے "شانہ بہ شانہ" رہ سکیں، جن کا پیغام اور مفہوم صرف اپنے زمانے کے لئے نہ ہو بلکہ سب آنے والے زمانوں کے لئے ہو۔ اور یہ اس لئے کہ ہر ایسی تصنیف اپنی ترکیب و ترتیب میں انسانی فطرت اور تجربے کی اولین بنیادی اور یکساں یعنی تمام اُن خصوصیتوں سے مطابقت رکھتی ہے جو مقام و وقت سے آزاد ہیں اور پائدار ہیں۔ ہر ایسی عظیم الشان تصنیف میں مقامی اور وقتی چیزوں کو اس انداز سے مس کیا جاتا ہے ایسی بصیرت اور گرفت اور قوت سے اُن کو ادب کے کام میں لگایا جاتا ہے کہ "کلّی اور پائدار" کے مفہوم کی جھلک اُن میں صاف طور پر نظر آنے لگتی ہے

میں کتاب کے سامنے ہی شرمانے لگا جس عزیز دوست کی تنقید سے میں بھاگا بھاگا پھر رہا تھا اُس نے مجھے کہاں کون سی کتاب کے صفحات میں کس طرح آن پکڑا کہ ہتھیار ڈالتے ہی بنی +

ابھی یہ مغلوبی پُوری طرح بروئے کار نہ آئی تھی کہ اک نقّاد دوست نے ملاقاتی پیغام بھیجا لیکن اب میں کچھ تجربہ حاصل کرچکا تھا۔ فوراً انہیں بلالیا اور بلاتے ہی کہا کہ جنوری نمبر میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اُس پر بے رحمی سے تنقید کردو۔ اس کے لئے تو وہ بھی تیار نہ تھے۔ سر جھکا کر بولے کہ اچھّا ذرا پھر ایک غور کی نظر ڈال لوں تو سہی ۔ دو روز کے بعد آئے ذبیحہ نے خود ہی کہا گردن حاضر ہے۔ جو کچھ گذری اس کے بیان کے لئے کم از کم آج تو نہ وقت ہے نہ گنجائش + لیکن چلتے وقت کہا کہ فروری نمبر کی "چند باتیں" البتہ مجھے بہت پسند آئیں ۔ اب مجھے اک اور مصیبت پڑگئی ۔ میرے دماغ میں اک نئی جنگ ٹھن گئی ۔ اُدھر عزیز فلسفی

دوست کی کچھ ناپسندیدگی اِدھر تنقیدی دوست کی قطعی پسندیدگی۔ میں نے سمجھا اعتراف ہی خوب ہے۔ کہہ دیا کہ بھائی وہ دوسرے پیر بھائی تو یوں فرماتے ہیں اب سوچ سمجھ لو۔ بولے نہیں میرا یونہی خیال ہے مگر آخر انہوں نے لکھا کیا ہے میں نے بتایا اُس کر جیسے کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ کل آخری سرمائی ملاقات کے لئے آئے تو کہہ گئے کہ میری رائے تو وہی ہے۔ شخصی و ذاتی کو بیچ سے نہ نکالو ورنہ باتیں باتیں نہ رہیں گی اور تصنّع آجائے گا۔ میں نے کہا اچھا آپ دونوں کے درمیان میں ہو کر غور کروں گا۔ اصرار کرنے لگے کہ نہیں لکھے جائیے اُسی طرح۔

اب جو سوچتا ہوں تو کبھی یہ شک ہونے لگتا ہے کہ شاید عزیز دوست کا خیال ہو کہ اس بھلے آدمی سے بہت سے شخصی و ذاتی تعلقات ہیں اگر اس نے اُن کو ہمایوں میں بیان کرنا شروع کر دیا تو مشکل ہی پڑ جائے گی اور کبھی یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید نقّاد دوست کا خیال ہو کہ اس کم سم آدمی سے علمی و ادبی تعلقات ہیں اگر یہ کتابی و اکتسابی باتیں ہی ہمایوں میں لکھتا رہا تو ہماری باہمی ادبی زندگی میں کوئی نیا لطف پیدا نہ ہوگا! لیکن نہیں یہ شک شبہ محض اس لئے ہے کہ میں نے پچھلے چند سالوں میں فلسفے کی تقریباً سوا تین ابتدائی کتابیں پڑھ لی ہیں جن سے مجھے شک و شبہ کی بابت میں کچھ شُدبُد ہونے لگی ہے۔ اُدھر بے تکلف فلسفی دوست اِدھر متین تنقیدی دوست سچ یہ ہے کہ دونوں وہی کہتے ہیں جو اُن کے جی میں ہے۔ اب اس علم و فضل کے تیر و تفنگ میں میری نیم جہالت حیران کھڑی ہے کہ جب میری ہی زبان کو کہنا ہے وہ جو میرے ہی دل کے اندر ہے اُن چیزوں کے متعلق جو مجھ سے باہر ہیں تو جو چند باتیں میں نے آج کی ہیں اُن میں میں اور میرے عزیز دوست کا خط اور نو آباد شہر والے مدرس کا مکتوب اور قابل نوجوان دوست کی زبانی رائے اور شبلی اور اُس کی مصنفانہ حیثیت اور تصنیف و تنقید کی وہ کتاب اور اس میں وہ مقامی کُلّی کی بحث اور پھر میرے نقاد دوست سے وہ ملاقات اور گفتگو اور پھر میری یہ چند باتیں ان سب چیزوں کا مفہوم کہاں تک شخصی ہے اور کہاں تک کُلّی؟ اور کہاں تک یہ شخصیتیں کل کا جز ہیں اور کہاں تک میری ان باتوں میں جو عبارت ہیں انہیں کے بیان سے ادب ہے؟ میں حیران ہوں سوا اے دوست اُو اے دوست مدد!

ب ل

جہاں نما

ہندوستانی مدرسوں کے لئے نئے طریقِ تعلیم کی تجویز

پچھلے دنوں لاہور کے ایس پی ایس کے ہال میں پنڈت دنستہ پرشاد صاحب نے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے ہندوستانی مدرسوں کے لئے ایک نئے طریقِ تعلیم کی تجویز پیش کی۔ موجودہ طریقِ تعلیم کے متعلق انہوں نے کہا کہ اس کو وضع ہوئے اتنا ہی زمانہ گزرا ہے جتنا آج غدر کو گزر چکا ہے۔ اُس وقت تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو انگریزی زبان سکھائی جائے کیونکہ عدالت کی زبان کی تبدیلی کے باعث انگریزی جاننے والے کلرکوں کی بڑی ضرورت تھی۔ اُس وقت سے آج تک بہت سی ماموریات کا تقرر عمل میں آیا کہ وہ تعلیم کا معیار بلند کرنے کی سفارش کریں لیکن حیرت کی بات ہے کہ مدرسوں کے اندرونی انتظامات اور اُن کے اُن درجوں میں جو ہنٹر کمیشن نے مقرر کئے تھے کوئی حقیقی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ ملکِ معظم کے قابلِ توجہ الفاظ پر بھی کوئی التفات نہ کی گئی جو انہوں نے ۱۹۱۲ء کے دربار کی تقریر میں فرمائے تھے۔

سر مائیکل سیڈلر پانچ باتوں کو اس دور کی اہم خصوصیات بتاتے ہیں اور ان میں سے رسل و رسائل کے ذرائع پر سائنس کے اطلاق، دولت کے حصول کے طریقوں، آرام و آسائش اور جنگ، اور دوسرے مزدوروں کے اس مطالبہ پر کہ انہیں دولت میں زیادہ حصہ ملنا چاہیئے خاص طور پر زور دیتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تعلیم صرف کتابوں کے پڑھنے تک محدود نہ ہو بلکہ وہ ایسے مواقع پیدا کرنے والی ہو جن سے علم عمل میں منتقل ہو سکے۔

اس کے بعد فاضل مقرر نے جرمنی کے طرزِ تعلیم پر ایک تبصرہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ جرمن بچے چھ سال تک اپنے گھروں میں تعلیم پاتے ہیں۔ یتیم بچے اور غربا کے بچے کنڈرگارٹن سکولوں یا تربیت گاہوں میں بھیج دیئے جاتے ہیں جن کا انتظام بلدیہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ چھ سے دس سال تک ہر لڑکے کے لئے تعلیم لازمی ہے۔ ان مدرسوں میں مفت تعلیم دی جاتی ہے اور غریب لڑکوں کو کھانا کپڑا اور لکھنے پڑھنے کی ضروریات بغیر کسی معاوضے کے مہیا کی جاتی ہیں۔ دس سال کی عمر میں، لڑکوں کو تین مختلف قسم کے مدرسوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ ان میں سے دو تہائی چودہ برس کی عمر تک جو لازمی تعلیم کی عمر ہے تحتانی مدرسوں میں شامل رہتے ہیں

جس کے بعد مدرسے کے آخری امتحان میں کامیابی حاصل کرکے وہ جامعات میں داخل ہو سکتے ہیں، اور باقی وسطانی مدرسوں میں جاتے ہیں جہاں چھ سال کا نصاب ہے۔

چنانچہ چودہ سال کی عمر کے بعد ہر طالب علم آزاد ہوتا ہے کہ زندگی کے جس شعبے میں چاہے داخل ہو جائے، جس کام کو چاہے امیدوار کی حیثیت سے سیکھے اور ساتھ ہی ساتھ تین سال تک کسی صنعتی و حرفتی مدرسے میں تعلیم بھی حاصل کرے۔ اس کے بعد ایک ماہر فن اُس کا امتحان لیتا ہے، اور اگر ممتحن اُس کے کام سے مطمئن ہو جاتا ہے تو اسے فوراً روزگار مل جاتا ہے اور اس کا مشاہرہ مقرر ہو جاتا ہے۔ ہر دوکاندار لڑکا اور ہر کسان لڑکا چودہ سے سترہ سال کی عمر تک مجبور ہے کہ کوئی نہ کوئی ہنر سیکھے۔

انگلستان میں بھی ایک نیا طرز تعلیم طے پایا ہے۔ اس کے مطابق ہر بچے کو اپنی عمر کے دسویں یا گیارھویں سال تک ایک ابتدائی مدرسے میں حاضر ہونا پڑے گا اور پھر ان کو دو قسم کے مدرسوں میں بھیجا جائے گا مرکزی مدارس جو ان کثیر التعداد بچوں کو پندرہ یا سولہ سال کی عمر تک تعلیم دیں گے، اور اعلیٰ مدارس جن میں اٹھارہ یا انیس سال کی عمر تک تعلیم دی جائے گی۔ مرکزی مدارس میں صنعتی و حرفتی تعلیم بھی مہیا کی جائے گی۔

اس کے بعد پنڈت صاحب نے ڈاکٹر ضیا الدین احمد صاحب کی تجاویز بیان کیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ دس سال کی عمر تک تعلیم لازمی ہو۔ دیہاتی مدرسوں میں زراعتی تعلیم کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ مدرسے مرکزی مدرسوں کے اصول پر چلائے جائیں اور بچوں کو چار فریقوں میں تقسیم کیا جائے۔ نصاب تعلیم چار سال پر مشتمل ہو (۱) عام (۲) زراعتی (۳) تجارتی اور (۴) صنعتی و حرفتی۔ اس طور پر چودہ سال کی عمر میں ان میں سے اکثر کام میں لگ جانا چاہیں گے لیکن اُن کے لئے ایسے سامان بھی مہیا کر دینے چاہئیں کہ وہ زراعت تجارت اور صنعت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ علاوہ بمبئی کے کوئی سکول بہترین قسم کے زراعتی سکول ہیں۔ تجارتی مدارس اُنہیں اصولوں پر قائم ہونے چاہئیں جن اصولوں پر اس وقت انگلستان اور فرانس کے تجارتی مدارس چل رہے ہیں۔

فوقانی مدارس میں جن کی نسبت ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کا خیال ہے کہ یہ صرف امیروں کے لڑکوں کے لئے ہونگے۔ نصاب تعلیم چھ سال کا مقرر کیا جائے۔ انگریزی زبان کی تعلیم لازمی ہو لیکن اکثر مضامین میں ذریعۂ تعلیم دیسی زبان ہونی چاہئے۔ لڑکیوں کے لئے لڑکوں کے نصاب تعلیم سے مختلف نصاب مقرر کیا جائے۔

تقریر کو مختصر کرتے ہوئے پنڈت صاحب نے کہا کہ موجودہ طریق تعلیم کی ناموزونیت بیان کرنے کے علاوہ

ابوالفضل

(فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا گیا)

مغل شاہنشاہ اکبر کے عہد، یعنی ہندوستان میں سولھویں صدی عیسوی کے اخیر میں انتظام حکومت (Administration.) کا علم خوب ترقی پاچکا تھا۔ ابوالفضل نے جو اس بادشاہ کا دوست اور وزیر تھا، اس مبحث پر ایک عظیم الشان کتاب چھوڑی ہے، جس کا نام "آئینِ اکبری" یعنی احوالِ حکومتِ اکبر بادشاہ ہے۔ دربار کی ترتیب، مختلف فوجی اور سول عہدوں کے انتظامات، سرکاری محاصل متعیّن کرنے کے متعلق عمدہ رواجات، ہر قسم کی ترقیات کے متعلق فکر و غور، اعداد کا مسلسل استعمال، نظر کی وسعت جس کے ذریعہ سے ایک وسیع اور مختلف العناصر حکومت کا متحد رکھنا ممکن ہوا، اور رحم و آزادی کی روح جو تمام کتاب میں پائی جاتی ہے، یہ ایسی خصوصیات ہیں، جن کی وجہ سے یہ کتاب سیاسی علم کی ایک جمیل ترین یادگار بن گئی ہے اور دنیا بھر کے لٹریچر میں عزّ امتیاز رکھتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بمقابلہ اُن تصانیف کے جن کا ہم اب تک تذکرہ کر چکے ہیں٭ اس کتاب کا زمانہ بعد کا ہے لیکن اس دوران میں جو ترقی ہوئی وہ بہت زیادہ ہے۔ اگر ہم اُن خیالات کا جو آئینِ اکبری میں پائے جاتے ہیں، مغرب کے مماثل خیالات سے مقابلہ کرنا چاہیں تو میرے خیال میں فرانس میں کولبرٹ (Colbert) کے انتظامات، اور جرمنی میں لائبنز (Leibniz) کے سیاسی خیالات کا اُن سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں بڑے مصنف اکبر کے عہدِ سلطنت سے ایک صدی بعد کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں +

شیخ ابوالفضل بمقام آگرہ ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں بعہدِ سلطنتِ اسلام شاہ پیدا ہوا تھا۔ اُس کا باپ شیخ مبارک بھی ایک نہایت طبّاع اور مشہور علّامہ تھا۔ شیخ مبارک خود بھی سیاسیات و مذہب میں وسیع المشرب خیالات رکھتا تھا، جو اُس نے اپنے دونوں بیٹوں ابوالفضل اور فیضی کو بھی تعلیم کئے۔ اور جن کی وجہ سے بعض تنگ خیال مسلمان

٭ اس سے قبل کرادے وو (Carra de Vaux) نے جس کی کتاب "مفکرینِ اسلام" (Le Penseurs de l'Islam) سے یہ مضمون ترجمہ کیا گیا ہے، امام ماوردی صاحب کتابِ احکام السلطانیہ، و ابن خلدون اور الجاحظ و نظام الملک طوسی کا تذکرہ بحیثیت مفکرینِ سیاسی کیا ہے۔

اُن دونوں کو دہریہ یا ہندو، یا شمس پرست سمجھتے تھے۔ اُس وقت اسلام کے ہزار سال ختم ہو رہے تھے، مہدوی خیالات پھیلے ہوئے تھے، اور چند مہدی ہندوستان کے مسلمانوں میں دعوائے مہدویت کر چکے تھے۔ شیخ مبارک نے بھی اِس تحریک میں کچھ حصّہ لیا تھا۔ اس کے باعث اُسے اسلام کے بعض ذی اقتدار علما کی زیادتیاں سہنی پڑیں، اور اُن کے اثر سے اُس کے اور اُس کے بیٹوں کے دلوں میں رواداری کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ ابوالفضل نے نہایت محنت کے ساتھ تحصیلِ علم کی۔ بہت سے مشرقی طالب علموں کی طرح وہ بھی کم سنی ہی سے تیز تھا۔ اولاً فیضی کو جو ابوالفضل سے بڑا تھا، اکبر نے طلب کیا۔ سنہ ۹۸۱ھ میں ابوالفضل بحیثیت فیضی کے بھائی کے پیش ہوا۔ اُس کی طبیعت جس وقت کہ وہ اکبر کی خدمت میں داخل ہوا، ایسی تھی جیسی کہ بعد خود اکبر نے اختیار کی۔ وہ لکھتا ہے:-

"میں اپنی راتیں تنہائی کی جگہوں میں اُن لوگوں کے ساتھ جو خلوصِ دل کے ساتھ صداقت کے جویا ہیں گذارتا ہوں، اور اُن لوگوں کی صحبت اختیار کرتا ہوں، جن کے ہاتھ کشادہ اور دل و دماغ مالامال ہیں۔ اس طرح میری آنکھیں کھلتی ہیں، اور میں اُن لوگوں کی جو اپنے آپ کو عالم بناتے ہیں، خودغرضی و طمّاعی کو پہچان لیتا ہوں۔ میرے دل کو کسی وقت قرار نہیں۔ وہ نیکدلانِ منگولیا، وفقرائے لبنان کی طرف کھنچتا ہے۔ میں جوش کے ساتھ تبت کے لاماؤں اور پرتگال کے پادریوں سے ملاقاتیں کرتا، او پارسیوں کے موبدوں اور زندواوستا کے مفسروں کے ساتھ بحثیں کرتا ہوں۔ میں اپنے ملک کے علماء سے تھک گیا ہوں"+

اکبر ابوالفضل سے اُس وقت ملا جب کہ اول الذکر بہار و بنگال کی فتح سے واپس آیا تھا۔ اُس کے بعد فتح پور سیکری میں جمعہ کی شب میں وہ مجلسیں منعقد ہونے لگیں، جن کا مورخ بدایونی نے ایسا زندہ مرقع کھینچا ہے۔ ابوالفضل اکبر کی جماعت کا امام بن گیا۔ اُس نے پادشاہ کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے آپ کو نہ صرف دنیاوی تاجدار ہی تصور کرے، بلکہ دینی حیثیت سے بھی اپنے آپ کو خلیفہ سمجھے، یعنی پادشاہی کو مذہبی اختیارات پر فوقیت دی جائے۔ جب اکبر نے یہ خیال سنہ ۹۸۶ھ میں جمعہ کے خطبہ کے وقت پیش کیا، تو ایک طوفان بپا ہوگیا۔ لیکن بظاہر اس کی کچھ تائید پبلک میں موجود تھی، چنانچہ سنّیوں نے اُس کی تائید کی۔ انہوں نے ایک تحریر پر جسے شیخ مبارک نے تیار کیا تھا دستخط کردیئے۔ اس تحریر میں امامِ عادل کو مجتہدوں یعنی شارحانِ قوانین نیز علما پر فوقیت دی گئی تھی+

اس اعلان کے شائع ہوتے ہی کامل رواداری کے اصول سلطنت میں نافذ ہوگئے۔ سنہ ۹۸۷ھ میں ان مجالس کے بعد دونوں بھائیوں کو مختلف عہدوں پر مقرر کیا گیا۔ فیضی سنہ ۹۸۸ھ میں ملک الشعرا مقرر ہوچکا تھا۔ اکبر

شاعری کا بہت زیادہ دلدادہ نہ تھا، لیکن سرکاری طور پر اپنے دربار میں اُس کے لئے ایک محل ومرتبہ قائم رکھنا چاہتا تھا۔ فیضی کو مسلمانانِ ہند کے شعرا میں دوسرا درجہ اور امیر خسرو دہلوی کو اوّل درجہ حاصل ہے +

چند ادبی وعلمی تصانیف مذہبی تالیفات کے بعد شائع ہوئیں۔ ابوالفضل، فیضی، اور بدایونی نے بعض سنسکرت ہندی اور فارسی کتب کے تراجم کئے۔ فیضی نے جو بیک وقت شاعر ومہندس تھا، لیلاوتی کا، جو کہ علمِ ریاضیات میں ہے ترجمہ کیا۔ ابوالفضل نے کلیلہ ودمنہ کو فارسی میں لکھا۔ اُس نے مہابھارت کے ترجمہ اور تاریخِ الفی کی ترتیب میں مدد دی۔ تاریخ الفی ایک ہزار برس کی تاریخ ہے، اور ہزار سالہ میعاد کے خیال کو مہدوی تحریک سے تعلق تھا +

شیخ مبارک نے ۱۰۰۱ھ میں بعمر ۹۰ سال وفات پائی۔ دو برس بعد فیضی کا بھی انتقال ہوگیا۔ ابوالفضل نے جو اپنے بھائی سے بڑی محبت رکھتا تھا، اپنے بھائی کی وفات سے پیشتر اُس کی منتشر نظموں کو یکجا کرنے کا وعدہ کیا تھا جسے باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے جلد ہی پورا کردیا +

فلسفی، متبحر عالم اور باتدبیر وزیر ہونے کے علاوہ ابوالفضل نے ایک فوجی خدمت بھی سرانجام دی۔ اُس نے دکن میں جاکر بحیثیت سپہ سالار جنگ میں حصہ لیا، اور کچھ کامیابی بھی حاصل کی۔ لیکن اکبر بغیر اس کے بمشکل رہ سکتا تھا۔ اکبر نے ابوالفضل کو دکن سے واپس بلایا۔ راستہ میں شاہزادہ سلیم نے، جو بعد میں جہانگیر کہلایا، اور ابوالفضل سے دلی بغض رکھتا تھا، اُسے قتل کرادیا۔ یہ ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) کا واقعہ ہے +

شیخ ابوالفضل کی شاندار تصنیف اکبرنامہ (یعنی اکبر کی کتاب) مسلمانوں کی تاریخ ہند میں اہم ترین کتاب ہے۔ وہ تین حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ پہلی جلد میں تیمور کے خاندان کے، سلاطینِ ہند، بابر وہمایوں، اور سوری بادشاہوں کے حالات ہیں۔ دوسری جلد میں اکبر کے چھیالیس برس کی تاریخ درج ہے۔ تیسری جلد میں جو بجائے خود ایک بہت بڑی جلد ہے اور جس کا نام آئینِ اکبری ہے اکبر کے عہدِ سلطنت کے حالات ہیں جو تاریخی واقعات کے طریق پر نہیں لکھے گئے ہیں، بلکہ جن میں انتظاماتِ سلطنت اور انتظامی معلومات اور اعداد سے بحث کی گئی ہے +

یہ تیسری جلد پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ سب سے پہلی جلد میں بادشاہ کی ذات سے بحث کی گئی ہے، جس سے اُس کی سیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اُس کے محل ودربار کے حالات درج ہیں۔ دوسرے حصہ میں اُن عہدہ داران سلطنت کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جو فوجی اور سول خدمات پر متعین تھے۔ نیز اُن اشخاص کا تذکرہ ہے، جن کی ادبی لیاقت یا موسیقی کی مہارت کو پادشاہ کی قدرافزائی نے چار چاند لگادیئے تھے، اور جن کی بدولت اُس کا عہدِ سلطنت درخشندگی پارہا تھا۔ آئینِ اکبری کے تیسرے حصہ میں دیوانی وانتظامی محکموں، ایک جدید اور زیادہ مفید سنہ کی ایجاد، اراضی کی پیمائش، اقسامِ اراضی کی تقسیم اور محاصلِ سلطنت کے اعداد وجداول کا تذکرہ ہے۔ چوتھے

حصہ میں ہندوؤں کے تمدنی حالات نیز اُن کے فلسفہ اور شاستر کا تذکرہ ہے۔ اسی حصہ کے چند ابواب میں ہندوستان کے حملہ آوروں، مشہور سیاحانِ ہند، نیز بعض مسلمان بزرگانِ دین اور اُن کے مختلف طرائق کا بیان ہے۔ اخیر کے پانچویں حصہ میں اکبر کے وہ اخلاقی جملے، امثال و خیالات و احکامات لکھے گئے ہیں۔ جو ابوالفضل ہر روز اس طرح جیسے ایک شاگرد اپنے استاد کے ملفوظات کو جمع کرتا ہے، قلمبند کرتا رہا تھا۔ اس بڑی کتاب سے حسبِ ذیل اقتباس پیش کئے جاتے ہیں:۔

شاہی خزانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:۔

"دنیا جانتی ہے کہ عبادتِ الٰہی کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آفاتِ زمانہ کو دور کیا جائے اور خلق اللہ کی حالت اچھی بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہ بات زراعت کی ترقی، شاہی محل کے انتظامات، سلطنت کے عہدیداروں کی ترتیب، اور فوج کی تربیت سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ سب اس پر منحصر ہے کہ یہ پادشاہ ان تمام معاملات میں ذاتی دلچسپی لیتا، اپنی رعایا کے ساتھ محبت رکھتا اور محاصلِ سلطنت اور اخراجاتِ ملکی کو دانشمندی کے ساتھ کام میں لاتا ہے"۔

ابوالفضل اس کے بعد اراضی کے محاصل سے، جو اُن کے اقسام و حیثیت سے متعین ہوتے ہیں نیز سرکاری محاصل کے وصول کرنے والوں اور خزانچیوں سے بحث کرتا ہے۔ سکوں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ نہایت فصیح عبارت میں سونے کی تعریف کرتا ہے۔ وہ اس کی خاصیتیں بیان کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ یہ دھات "اصلِ اعظم اور محافظِ عدل" کہلاتی ہے۔ چاندی اور تانبا اس کے معاون ہیں۔ ہمارا مصنف سونے کے صاف کرنے چاندی کو خالص بنانے، چاندی کو سونے سے جدا کرنے کا تذکرہ ایسے الفاظ میں کرتا ہے، جن الفاظ میں ایک اچھا ماہر کیمیا کریگا وہ رائج الوقت سکوں کی کیفیت اور قدیم سکوں کی قیمتیں بتاتا ہے۔ وہ ماہرانِ کیمیا کی طرح کچھ ذکر کانوں میں "دھاتوں کی اصل" کے متعلق کرتا ہے، لیکن جدید علمائے کیمیا کی طرح وہ قیمتی دھاتوں اور جواہرات کے مخصوص اوزان کی جدولیں بھی پیش کرتا ہے۔

بعد ازاں وہ شاہی محلات اور اُن کے اخراجات کی طرف متوجہ ہوتا ہے پھر وہ سفر اور کیمپ کے حالات لکھتا ہے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے بارے میں اُس کے آقا نے خود بہت کچھ کیا ہے، وہ لکھتا ہے: "بادشاہ نے "گلبار" کا خیال ایجاد کیا، جو ایک قسم کی بارگاہ ہے، جو چاروں طرف سے گھری ہوئی ہے، اور جس میں مضبوط دروازے لگے ہوئے ہیں، اور... اگر مربع زمین اس سے گھر جاتی ہے۔ اُس نے اُس میں حصے کر دیئے ہیں۔ اخیر میں

شامیانہ لگتا ہے، جہاں بادشاہ اور دربار کے عہدہ دار بیٹھتے ہیں"۔ ابوالفضل فوجی کیمپوں اور روشنی کے قواعد و آئین بھی بیان کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز اُس کی نظر سے نہیں بچتی۔ اُس کے بعد ہی وہ شاہی مطبخ اور کھانوں کا ذکر لکھتا ہے۔ مختلف اشیا کے نرخ نامے دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "یہ قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں، مثلاً دیہات میں یا بارش یا دوسرے اسباب سے"۔ وہ ایک جدول پھلوں کی قیمتوں اُن کے اجناس اور خوبیوں کے لحاظ سے دیتا ہے۔ کچھ جدولیں ہیں جن میں شیریں و ترش و خشک ہونے کے لحاظ سے پھل تقسیم کئے گئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ پھلوں کو خدائے تعالیٰ کی بہترین نعمت قرار دیتا، اور اُن کی پیداوار میں نہایت دلچسپی لیتا ہے بعض پودے ایران و توران کے اس ملک میں اگائے جاتے ہیں، اور درخت بکثرت لگائے جاتے ہیں۔ خربوزے اور انگور عمدہ بافراط ہوتے ہیں۔ تربوز، سیب، بادام، پستہ، کیلا بخوبی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ کابل، قندھار و کشمیر کے فتح ہونے کے بعد سے پھلوں کے ڈھیر کے ڈھیر ہندوستان میں لائے جاتے ہیں ہر سال تاجروں کے گودام اور بازار ان چیزوں سے پٹے رہتے ہیں +

پھلوں کے بعد عطریات اور خوشبودار پھولوں کا ذکر ہے اُن کی قیمتوں کی جدولیں دی ہیں۔ وہ ہر عطر کی تیاری کا حال لکھتا ہے۔ یہ بجائے خود علمِ کیمیا کی تاریخ کے لئے ایک دلچسپ تحریر ہے۔ وہ اُن پھولوں کے حالات بھی بیان کرتا ہے جن سے یہ عطر تیار ہوتا ہے۔

بعد ازاں کپڑوں اور شالوں کا تذکرہ ہے۔ ہندوستان کے متعلق یہ باب بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ ابوالفضل لکھتا ہے:۔ بادشاہ نے اس شعبہ میں چار طرح ترقی بخشی ہے۔ اول ہر قسم کی شالوں میں ترقی دکھائی دیتی ہے۔ شال ایک جانور کا نام ہے اسی کے پشم سے شال تیار ہوتے ہیں۔ پشم کا قدرتی رنگ سیاہ سفید و سرخ اور بیشتر خالص سیاہ اور کبھی کبھی بالکل سفید ہوتا ہے۔ اس قسم کے شال نہایت سبک و خوش رنگ و دل پسند ہوتے ہیں لوگ بالعموم اصلی رنگ تبدیل نہیں کرتے۔ بادشاہ نے انہیں رنگوانا شروع کیا ہے۔ بادشاہ نے اور دوسرے کپڑے اس طرح بنوائے ہیں کہ ایک تھان میں پورا لباس بن جاتا ہے"۔ فی الواقع اس قسم کی عملی تفصیل کا ایک ایسے شخص کی کتاب میں پایا جانا، جو ہمیشہ الٰہیات و دینیات کے اعلیٰ خیالات میں منہمک رہتا ہو، نہایت حیرت انگیز و قابلِ ستائش ہے۔ معلومات و ضوابط کی بہم رسانی اور انہیں ترقی دینے میں ابوالفضل ہمارے (فرانسیسی مدبر) کولبرٹ (Colbert) کو یاد دلاتا ہے۔ پارچہ جات کا باب مختلف قسم کے کپڑوں کی فہرستوں اور نرخوں پر ختم ہوتا ہے +

یہ عجیب و غریب جامع علوم و فنون کتاب ابھی ختم ہونے سے بہت دور ہے۔ آگے چلئے تو کتابت و مصوری کے متعلق معلومات ہیں۔ پھر پادشاہ کے کتب خانہ و دفتر تراجم کا تذکرہ ہے۔ مصنف ہمیں بتاتا ہے کہ کون کون سی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ یہ تفصیل خاص طور پر دلچسپ ہے۔ وہ اُن کتابوں کے نام بھی بتاتا ہے، جو بادشاہ کو پسند تھیں۔

فنونِ صلح کے بعد فنونِ جنگ کا تذکرہ ہے۔ بہت سے اصطلاحی مسائل اور فوجی انتظامات و اسلحہ بجائے خود اس پادشاہ اور اُس کے وزیر کے نزدیک کم توجہ کے مستحق نہیں۔ بلکہ اُس کے برخلاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی توجہ اور انتظامی لیاقت نے اُن کی اہمیت کو دوبالا کر دیا ہے اور ترقی کی تلاش اور اس کا جذبہ جو اس مسئلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا اظہار اس موقع پر کیا گیا ہے ایسے قوی ہیں جیسے کہ ہمارے زمانہ میں پائے جاتے ہیں۔ اسلحہ خانہ کے متعلق لکھتا ہے :-

"اسلحہ خانوں کے کاروبار کو بادشاہ نے کمال توجہ سے ملاحظہ فرمایا ہے۔ اُس نے ہر قسم کے نئے طریقوں پر غور کیا اور اُن کے عملی امکانات کو مطالعہ کیا ہے۔ مثلاً ایک زرہ جس پر تختیاں دھات کی جڑی ہوئی تھیں پادشاہ کے سامنے پیش ہوتی ہے۔ اُسے نشانہ کے طور پر رکھ کر امتحان کیا جاتا ہے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تمام فوج کے لئے اس قسم کی زرہیں کثیر تعداد میں تیار کرائی جاتی ہیں" اس کے بعد ان اسلحہ کو شمار کرایا گیا ہے جو کہ اُس زمانہ میں مستعمل تھے، اُن کی تعداد ۷۷ ہے، جو ایک بڑی تعداد ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی تفصیلی کیفیت بیان کی ہے اسی کتاب میں توپوں کی تعریف اس طرح عمدہ الفاظ میں کی گئی ہے :-

"توپیں سلطنت کی عظیم الشان عمارت کی حفاظت کے لئے بمنزلہ قفل، اور فتوحات کے دروازے کھولنے کے لئے عمدہ کنجیاں ہیں" ابو الفضل لکھتا ہے کہ بجز ترکی کے کوئی ملک نہیں ہے جہاں ہندوستان کے مقابلہ میں حفاظتِ ملکی کے لئے اتنی توپیں مہیا کی گئی ہوں۔ اس باب میں بھی پادشاہ کے تصوّرات شامل تھے "بعض توپیں ایسی ہیں جن سے بارہ من کے گولے پھینکے جاسکتے ہیں۔ پادشاہ نے بعض ایسی ایجادیں کی ہیں جو دنیا کو حیرت میں ڈالتی ہیں۔ ایک ایسی توپ بنوائی ہے، جو حسب ضرورت راستے میں بآسانی اتاری چڑھائی جاسکتی ہے۔ ایک اور ایجاد یہ ہے کہ سترہ توپوں کو اس طرح یکجا کر دیا ہے کہ سب کی سب ایک ہی فتیلہ سے چلائی جاسکتی ہیں۔ بعض ایسی توپیں بنوائی ہیں، جو ایک ہاتھی سے کھنچ سکتی ہیں۔ محاصروں اور بحری جنگوں کے لئے خاص قسم کی توپیں ہیں"

الغرض یہ غیر معمولی تصنیف زندگی، خیالات اور علم سے مالامال ہے۔ اس میں زندگی کے تمام شعبوں پر نظر

ڈالی گئی ہے، معلومات کو خوب مرتب کیا گیا ہے اور ہر گھڑی بھڑکتے رہنے والی ترقی کا خیال اُس میں پایا جاتا ہے یہ ایک ایسی تصنیف ہے جس پر مشرقی تمدّن بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔ جن لوگوں کے دماغوں کو یہ کتاب ہمارے روبرو پیش کرتی ہے وہ حکومت کے عملی فن و نیز فلسفۂ مذہبی میں اپنے زمانہ سے بہت آگے تھے۔ یہ شعرا اور یہ اہلِ خیال مادی مسائل میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ اگر اُن کے ذہن میں کوئی خیال آتا تھا، تو اُسے واقعات کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھتے تھے۔ وہ فصاحت کے ساتھ اپنے خیالات کو ظاہر کرتے تھے، لیکن اُن کی تائید اعداد و معلومات سے کی جاتی تھی۔ مغرب میں ہم لائبنز (Leibniz) کی تعریف کرتے ہیں کہ اُس نے اعداد اور اُن کے فوائد واستعمال سے لوگوں کو رُوشناس کیا۔ ہم اس علم کو قطعاً جدید سمجھتے ہیں، حالانکہ اکبر کی گورنمنٹ میں اب سے تین سو برس پہلے یہ موجود تھا، اور انتظامِ سلطنت میں اس سے پُورے طور پر کام لیا جاتا، اور اس کے پہلو بہ پہلو رواداری انصاف اور ہمدردیٔ بنی نوعِ انسان کے اصول پر عملدرآمد ہوتا تھا۔

سیّد حسن برنی

ہندوئیت: ربّانی صورت،

بدھیّت: ربّانی سیرت،

زرتشتیّت: ربّانی ثنویّت،

عیسائیت: ربّانی اخلاقیت،

اسلام: ربانی تقویت،

اور دہریت: ربّانی بغاوت ہے۔

دعوے صرف فضول نہیں مضر ہیں اور جھگڑے بھی اور چرچے بھی یہ صرف لاحاصل نہیں تباہ کن ہیں۔ انسانیت میں جہاں ربانیت نہیں وہاں شیطنت ہے۔

خدا کو کیا میں خوبصورت نہ کہوں جو شب و روز کی نعمتوں میں مجھے یوں اپنا آپ دکھاتا رہتا ہے۔

ب

غزل

کیوں روتے ہو، بے حال ہو، گھبرائے ہوئے ہو

کیا تم مری کیفیتِ دل پائے ہوئے ہو

غنچے ہیں تو دلگیر ہیں، گل ہیں تو دل افگار

کیا خوش ہو کوئی تم ہی جو کملائے ہوئے ہو

دیدار سے محروم ہیں آنکھیں، تو گلہ کیا؟

اِس راہ سے تم دل میں اُتر آئے ہوئے ہو

ہے پھول کے چہرے پہ عرق، اوس کہاں ہے؟

پردے میں ہو تم اس پہ بھی شرمائے ہوئے ہو

قدموں میں جگہ دیتے ہو جس سر کو، قسم ہے

اُس سر کو پرے عرش سے پہنچائے ہوئے ہو

حامد علی خاں

روحِ جذبات

انہیں نصیب کہاں شان بے نیازی کی
ہے سچ تو یہ کہ بتوں نے زمانہ سازی کی

کمالِ عشق میں نیرنگِ حسن ہوتا ہے
ہوا ہے یوں بھی کہ محمود نے ایازی کی

مری خموشی کو وحشت سے بے نیاز نہ کہہ
کہ ایک یہ بھی ادا ہے جنوں نوازی کی

مہِ دو ہفتہ کی کرنوں میں کانپ اُٹھے نغمے
یہ کس نے شب کی خموشی میں نے نوازی کی

بڑھا کے ریش تو مسجد کو کیا چلا افسر
یہ شکل اب کہیں ہوتی نہیں نمازی کی

حامد اللہ افسر

ترے لئے

دل ہے ہجوم زارِ تمنا ترے لئے
آباد کر رہا ہوں یہ دنیا ترے لئے

افتادگی ہے راہِ طلب میں نمازِ شوق!
اُٹھ اُٹھ کے لاکھ بار گروں گا ترے لئے

سنتا ہوں کفرِ عشق ہے افشائے رازِ عشق
یہ کفر بھی مجھے ہے گوارا ترے لئے!

مانا طلسمِ وعدۂ فردا فریب ہے
کھاؤں گا بار بار یہ دھوکا ترے لئے

میں تارکِ رہِ حرم و دیر ہو چکا
اے بے نیازِ صورت و معنیٰ ترے لئے

بے سود اب نمائشِ تمکینِ ناز ہے
میں ہو چکا خرابِ تمنا ترے لئے!

جو آج تک کسی سے گوارا نہ ہو سکا
اے دوست! وہ کروں گا گوارا ترے لئے

روش صدیقی

کیڈور کا مصوّر

لڑکے کی آنکھیں اُن پھولوں کے قلوب کی طرح سیاہ تھیں جن کا ایک انبار وہ اٹھائے ہوئے تھا، اور وہ مشتاقانہ اُس سوار پر جمی ہوئی تھیں جو اپنے گھوڑے کو شاہراہ پر اڑائے لئے جا رہا تھا۔

اُس نے کہا "کیٹرینا ذرا دیکھنا! یہ شخص شہر کو جا رہا ہے، حیرت انگیز شہر کو!"

کیٹرینا نے اپنے بھائی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ اُس کی بات نہیں سمجھی۔ اُس سڑک پر جو اُن کے گاؤں سے جنوب کی طرف جاتی تھی بہت سے قصبے آباد تھے جنہیں یہ پہاڑی لڑکی کافی بڑا سمجھتی تھی لیکن اُس نے اپنے بھائی کی طرح انہیں حیرت انگیز کبھی خیال نہ کیا تھا۔

لڑکی نے کہا "حیرت انگیز شہر؟ ٹیزیانو، حیرت انگیز شہر کہاں ہے؟"

اُس نے متعجب ہو کر کہا "کیوں، تمہیں معلوم نہیں؟ اور کیا سینٹ مارک کے عظیم الشان شہر وینس کے علاوہ بھی کسی شہر کو حیرت انگیز کہا جا سکتا ہے؟"

مگر وینس کے نام نے سیاہ چشم کیٹرینا پر کچھ زیادہ اثر نہ کیا۔ وہ عمر میں اپنے بھائی سے بڑی تھی اور اُس کی طرح موہوم باتوں کے خواب نہ دیکھا کرتی تھی۔ اُس نے سنا تھا کہ شہر میں اکثر خوفناک واقعات رونما ہو جایا کرتے ہیں اور بعض اوقات لوگوں کو وہاں فاقے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس اس پہاڑی علاقے میں کھانے پینے کا سامان کافی سے زیادہ تھا، اور اگرچہ کوئی بھی یہاں اتنا امیر نہ تھا جس کے قبضے میں خوبصورت محلات اور پُرتکلف سازوسامان ہو لیکن بہت غریب بھی کوئی نہ تھا۔ اُس نے اپنے کندھوں کو ذرا سکوڑ کر جواب دیا "وینس! میں نہیں جانتی تم کیوں اسے حیرت انگیز کہتے ہو۔ گریزیانو چلا ہا بہت دفعہ وہاں گیا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ اس میں ہمارے کیڈور سے آدھا حسن بھی نہیں ہے۔ نہ وہاں پہاڑ ہیں اور نہ مرغزار جہاں پھول کھلتے ہوں۔ ٹیزیانو کیا تم یہاں سے تنگ آ گئے ہو؟"

"آہ، نہیں! یہ نہیں! لیکن شہر میں مصوّر رہتے ہیں اور اگر میں وہاں جا سکوں تو میں اُن کے فن کا مطالعہ کروں اور بعض ایسی تصویریں بناؤں جن کی آرزو میرے دل میں ہے۔"

کیٹرینا ایک عملی دیہاتی لڑکی تھی جس کا خیال تھا کہ اگر کسی کے پاس کھانے اور پہننے کے لئے کافی ہو تو اُسے

مطمئن ہو جانا چاہیئے۔ اسی لئے جب وہ بولی تو اُس کا لہجہ ملامت آمیز تھا اور ذرا تیز بھی۔

"یہ جو تم ہر وقت مصوّری کی باتیں کرتے رہتے ہو اور اُن چیزوں کو دیکھنے کے لئے بیتاب رہتے ہو جنہیں اَور کوئی بھی نہیں دیکھتا، تو لوگ کہتے ہیں کہ جب تک تم یہ دن دہاڑے خواب دیکھنے نہ چھوڑو گے تم کوئی کام نہیں کر سکو گے اسی لئے والد تمہیں لوئگی موچی کے پاس شاگرد کرانے کا دھیان کر رہے ہیں۔ کم از کم وہ تمہیں اپنے فن کا ماہر تو بنا سکتا ہے اور یہ تمہارے لئے ہر وقت وینس کے متعلق سوچتے رہنے سے بدرجہا بہتر ہوگا۔"

ٹیزیانو نے اپنے سر کو جنبش دی لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔ اُسے اپنے مقصد کے سامنے کسی دوسری بات کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ اکثر راتوں کو جب گھر کے سب لوگ سو جاتے وہ اپنے بستر میں جاگ جاگ کر سوچا کرتا کہ کس طرح وہ اپنے باپ کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اُسے مصوری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے شہر جانے کی اجازت دے دے۔

گاؤں میں سب جانتے تھے کہ وہ تختوں، پتھروں اور ہر اُس چیز پر جو اُس کے سامنے آجاتی تصویریں بنانے میں گھنٹوں صرف کر دیا کرتا ہے، اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ گاؤں کا نیک دل پادری اُس کے کام کی تعریف کیا کرتا ہے۔ لیکن اِس کی اُن کے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہ تھی۔ کیڈور کے دوسرے لڑکے بھی اسی طرح تصویریں بناتے تھے اور انہیں کوئی نہ پوچھتا تھا۔ آخر اسے کیوں شہر بھیجا جائے؟ صرف اِس لئے کہ وہ ایک پہاڑ کا نقشہ کامیابی کے ساتھ اتار سکتا ہے یا جنگل کی تصویر کسی حد تک بنا لیتا ہے؟ اُن کی اس بے توجہی کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی طرح بھی انہیں یہ سمجھانے میں کامیاب نہ ہوتا تھا کہ رنگ ہی وہ چیز ہے جس نے اُس کی روح میں ایک آگ لگا رکھی ہے، اور سرمے کے قلم سے اُس کا اظہار ناممکن ہے۔

نیچے سڑک پر ایک سیٹی کی آواز سنائی دی اور کیٹرینا نے دیکھا کہ اُس کا بھائی فرانسسکو انہیں جلد اپنے پاس بلا رہا ہے۔

کیٹرینا نے کہا "وہ شاید ہار گوندھنے کے لئے تیار ہو چکے ہیں"

اس کے بعد وہ دونوں گاؤں کی سرائے کی طرف دوڑ پڑے۔

کوہستانِ اطالیہ میں یہ جون کا روشن اور عطر بار مہینہ تھا جب ڈولومی کی زرخیز وادی کے ٹیلے اور میدان رنگا رنگ پھولوں کا ایک گلدستہ بن جاتے ہیں۔ کل پھولوں کا میلہ آرہا تھا، اسی لئے آج انہوں نے پھول چننے میں کئی گھنٹے گزار دیئے تھے اور اب، کہ غروب ہوتا ہوا آفتاب چوٹیوں کو ارغوانی رنگ دے رہا تھا وہ اپنی تاخت و تاراج کو لے کر واپس جا رہے تھے تاکہ اس سے اپنے عیش و مسرت کی تیاری میں مدد لیں۔

ذراسی دیر میں وہ اپنے نوخیز ساتھیوں سے جا ملے۔ سب نے ہار بنانے شروع کر دیئے اور کل کے کھیلوں کے متعلق تجویزیں سوچنے لگے۔ کیڈور کا گاؤں اُن دنوں ذرائع آمدورفت کی کمی کے باعث دنیا سے بہت دور تھا اور جب کبھی کوئی تیوہار آتا تھا تو وہاں کے باشندے اپنے سیدھے سادے کھیلوں میں اتنے ہی خوش ہوتے تھے جتنے کہ وینس کے رہنے والے اپنے نئے نئے تماشوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہوں۔ ہر طرف سے گیتوں اور قہقہوں کی آوازیں آتی تھیں اور مشتاق سامعین کے لئے جھوٹی سچی دلچسپ باتیں کہی جاتی تھیں۔

ایک لڑکی نے جس کی زبان اُس کی چالاک اُنگلیوں سے بھی تیز چلتی تھی کہا "کچھ تم نے سنا، چکّی والے کا لڑکا سالویٹر سنگ تراشی کا فن سیکھنے کے لئے وینس جا رہا ہے! جب سے اُس کا باپ امیر ہو گیا ہے اُس نے اُس سے اپنا کاروبار کرانے کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ پہلے تو سالویٹر نے اس طرف دھیان ہی نہ کیا لیکن جب اُسے بتایا گیا کہ ایک سنگ تراش کسی بہت بڑے نواب کا مقرب بھی ہو سکتا ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اگر وہ ایک بڑا آدمی بن گیا اور ایک نفیس مکان میں رہنے لگا تو یہ کیسی شان دار بات ہو گی! پھر ہم کہا کریں گے 'ہاں، ہاں وہ ہمارے ہی گاؤں کا آدمی ہے!'"

سیبسٹیانو جس کا چچا برگیمو میں کسی وکیل کا منشی تھا اور جو شہر کی باتوں سے دوسرے بچّوں کی بہ نسبت زیادہ واقف تھا بولا "میں تو نہیں سمجھتا کہ اسے سنگتراشی کا کچھ شوق ہو۔ میرے خیال میں صنّاع بننے کے لئے امیر باپ کے علاوہ کسی اَور چیز کی بھی ضرورت ہے۔"

بانونی لڑکی نے اپنے سر کو ہلایا۔ پھر بولی "یہ سچ ہے۔ اگر روپیہ بھی نہ ہو اور استاد بھی نہ ملے تو بتاؤ کوئی کیسے کچھ کر سکتا ہے؟"

کیٹرینیلا نے کہا "سو اب اگر ٹیزیانو نے مصوّری سیکھنے کے لئے شہر جانے کا نام لیا تو میں اُس سے کہہ دوں گی کہ والد اتنے امیر نہیں ہیں کہ تمہارا خرچ برداشت کر سکیں، اس لئے بہتر یہی ہو گا کہ تم لوئگی سے موچی کا کام سیکھنے کا خیال کرو۔"

اس پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے، اور کسی نے کہا "ٹیزیانو! اُس نے تو کبھی کسی سے ایک دفعہ بھی اصلاح نہیں لی۔ وہ تو بنیاد اُٹھائے بغیر قلعے کے برج بنانے شروع کر دیتا ہے۔"

ٹیزیانو کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یہ سچ تھا کہ اُسے کبھی استاد میسر نہ آیا لیکن اُسے یقین تھا کہ اگر اُسے موقع دیا جائے تو وہ اپنے آپ کو اس قابل ثابت کرے گا کہ اُس کے لئے ایک اُستاد کی خدمات حاصل کی جائیں۔

اُس نے دل میں سوچا "کاش مجھے کچھ رنگ مل جائیں! ممکن ہے پھر یہ لوگ مجھے وہمی نہ سمجھیں کیونکہ مجھے یقین ہے

کہ میں اِن سے ایک اعلیٰ درجہ کی تصویر بنا سکوں گا، اور پھر شاید میں اپنے مقصد کے حصول کے لئے وینس جا سکوں"۔
لیکن رنگ کم یاب اور بیش قیمت تھے، اور گو اُس کا باپ ایک آسودہ حال شخص تھا تاہم وہ ایک ایسے لڑکے کے لئے رنگ خرید کر اپنا روپیہ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا جسے کبھی ان کا استعمال نہ سکھایا گیا ہو۔

دوسرے دن نوخیز مصوّر کو راستے کے پتھروں پر کچھ داغ نظر آئے، جو پھولوں کے روندے جانے سے وہاں پڑ گئے تھے۔ یہ داغ ایسے صاف اور روشن تھے جیسے کسی مصوّر نے انہیں بڑی احتیاط سے بنایا ہو۔ ان کو دیکھ کر اسے ایک خیال سوجھا۔ اُس نے یہ خیال کسی پر ظاہر نہ کیا۔ وہ اس میں اتنا محو تھا کہ سبزہ زار پر رنگ برنگ کے لباس پہن کر رقص کرنے والے دیہاتی بھی اُسے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔ اور جیسے ہی اسے موقع ملا وہ چپکے سے اُن میں سے نکل کر پھولوں کے کھیتوں کی طرف چل دیا۔

کیٹرینا نے اُسے جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ حیران تھی کہ اُس مسرت و انبساط کے مجمع میں سے کون سی چیز اُسے لے جا رہی ہے۔ جب اُس کی حیرت تفریح کی خواہش سے بڑھ گئی تو وہ بھی اُس کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ جب وہ اس کے پاس پہنچی تو وہ ایک ایسی پہاڑی پر کھڑا تھا جسے پھولوں نے روشن کر رکھا تھا۔

وہ بولی "ٹیزیانو، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"
لڑکے نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں شک جھلک رہا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ گو میری بہن کو میری بلند پروازیوں پر اعتراض ہے پھر بھی وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور وہ میرے راز کو فاش نہیں کرے گی۔
اُس نے جواب دیا "میں ایک رنگین تصویر بنا رہا ہوں"۔
ایک لمحہ کے لئے وہ کھڑی اُسے دیکھا کی۔ پھر یہ سوچ کر کہ وہ اسے بہکا رہا ہے وہ کہنے لگی "ہاں، کیوں نہیں! رنگوں کے بغیر!"

لیکن اُس کا متین چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا ہے۔
اُس کی آنکھیں ایک عجیب روشنی سے چمک رہی تھیں جب اُس نے کہا "میں رنگوں کی جگہ پھولوں کو استعمال کروں گا۔ دیکھو، اِن میں سب رنگ موجود ہیں، اور مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ میں نے ان کے نشان راستے کے پتھروں پر دیکھے ہیں"۔
کیٹرینا اپنے بھائی کی طرح موہوم خیالات میں کھو نہیں جایا کرتی تھی، اور کہیں رنگ کے ایک دھبّے کو دیکھ کر اُسے تصویریں نظر نہیں آیا کرتی تھیں، لیکن اُس نے سمجھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے ناممکن نہیں ہے، کیونکہ اُس نے خود

بھی پتھروں پر رنگ کے نشانات دیکھے تھے۔ اب اُسے یہ بھی خیال آیا کہ اُس کا بھائی ضرور ایک ہشیار اور زیرک لڑکا ہے کیونکہ عام لڑکوں کو یہ بات ذرا بھی نہیں سوجھی، اور اُس نے سوچا کہ شاید اُس کی وینس جانے کی خواہش کوئی بے سروپا خیال نہیں ہے۔ اگر چکّی والے کے بیٹے سالوبیٹر کے لئے سنگ تراش بن جانا ایک شاندار بات ہوسکتی ہے تو کیا ٹیز یانو کا ایک مصوّر بن جانا شان دار نہیں، اور کیا کیڈور اس پر فخر نہیں کرسکتا؟ پادری کو اُس نے اکثر کہتے سنا تھا کہ کوئی کام ایسا نہیں جس کی دھن انسان کو لگی ہوئی ہو اور پھر اُسے صبر، حوصلے اور استقلال سے کیا جائے اور ناکامی ہو، اور یہ کہ مدد ہمیشہ اُن کو ملتی ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں۔ چنانچہ اُس نے ٹیز یانو کو مدد دینے کا فیصلہ کرلیا، خواہ وہ اسی قدر کیوں نہ ہو کہ اُس کے راز کی حفاظت کی جائے اور اُس کے کام کے لئے ضروریات مہیّا کی جائیں۔

سو مہکتے ہوئے خطوں میں سے وہ رنگ رنگ کے پھول اکٹھے کرتے پھرے ـــــ سرخ، گلابی، نیلے، ارغوانی جیسے کوہستان کی شفق کا رنگ ہوتا ہے، اور پیلے اور سنہری جیسے وہ اکثر اپنے تصوّر میں دیکھا کرتا تھا۔ پھر وہ اس پرانے پتھر کے بنے ہوئے مکان کی طرف اُٹھ بھاگے جو اُن کے باپ کی ملکیت تھا یہ بالکل خالی رہتا تھا۔ اُن کے اپنے گھر کے لوگ بھی یہاں شاذونادر ہی آیا کرتے تھے اور گاؤں کے رہنے والے تو اس میں کبھی داخل نہ ہوتے تھے۔ اور یہیں ہر دست اندازی سے محفوظ ہوکر اُسے وہ تصویر بنانی تھی جس کے متعلق دونوں بہن بھائیوں کو امید تھی کہ اُسے وینس لے جانے کا ایک ذریعہ ثابت ہوگی۔

کیٹرینا پاس رہ کر تصویر کو بنتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی لیکن ٹیز یانو کو اس پر اعتراض تھا۔ اُس نے کہا "جب تک یہ ختم نہ ہولے میں نہیں چاہتا کہ تم بھی اسے دیکھو، کیونکہ اول اول اس کی شکل تصویر جیسی نہیں ہوگی"

چنانچہ وہ اسے کوئلے کے ایک ٹکڑے سے خاکہ بناتے ہوئے چھوڑ کر چلی گئی۔

کئی دن تک لوگوں سے چھپ چھپا کر وہ اس مکان میں جاتا رہا اور پھولوں کے رنگوں سے تصویر بناتا رہا۔ کیٹرینا پرندوں کی طرح اڑتی ہوئی گلزاروں میں جاتی اور پھر اِدھر اُدھر نگاہ ڈال کر کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا اُس کھڑکی میں سے پھول اپنے بھائی کے حوالے کردیتی جس کے قریب بیٹھ کر وہ کام کررہا تھا۔ اور اگرچہ پھول کی ہر پتّی تصویر پر صرف ایک ننھا سا دھبّا بنا کر خشک ہوجاتی، اور اگرچہ ٹیز یانو ایک ملہمِ غیبی کی سی تیزی کے ساتھ تصویر پر رنگوں کو پھیلاتا جاتا لیکن اُسے ایک مرتبہ بھی پھولوں کے انتظار میں ہاتھ روکنا نہ پڑا۔

تصویر اُس کے سحر آسا قلم کے نیچے بتدریج نمایاں ہوتی گئی اور اُس نے اور کیٹرینا نے اپنے راز کی خوب پاسداری کی۔ صرف ڈھوروں کے گلے مہکتی ہوئی چراگاہوں میں چرتے ہوتے کبھی کبھی اس سنسان مکان تک جا پہنچتے

چنانچہ کسی کو بھی علم نہ ہوسکا کہ یہاں وہ لڑکا مصروفِ کار ہے جو اٹلی کے نام کو چار چاند لگائے گا۔ گاؤں کے لوگوں کو خواب وخیال بھی نہ تھا کہ یہ پھول جو کیٹرینا چن رہی ہے ایک غیر فانی کام میں استعمال ہو رہے ہیں۔

ایک شام جب سورج پہاڑ کی چوٹیوں کے پیچھے غائب ہو رہا تھا اور گھروں کو واپس جاتے ہوئے گڈریوں کی خوشی سے لبریز آوازیں بلندیوں سے نیچے گونج رہی تھیں ٹیزیانو نے اس مکان کے دروازے سے باہر قدم رکھا، اور بہن کو اپنے پاس بلا کر کہا

"کیٹرینا تصویر ختم ہوگئی! اور یہ میری بہترین تصویر ہے"

وہ خوشی سے اچھلتی ہوئی اندر گئی، لیکن جب وہ تصویر کے سامنے جاکر کھڑی ہوئی تو مسرت اُس کے چہرے سے رخصت ہوگئی اور وہ احترام آمیز لہجے میں بولی "او ٹیزیانو، یہ تو مقدس مریم کی تصویر ہے!"

اُس نے کہا "ہاں، مریم اور بچے کی، اور ایک میری طرح کا لڑکا تحفہ پیش کر رہا ہے۔ کیٹرینا یہی تصویر میرے دل میں تھی"

چند لمحوں کے لئے وہ تصویر کے حسن میں ایسی محو ہوئی کہ اُسے اور کوئی بات یاد نہ رہی۔ پھر یہ خیال کرکے کہ گاؤں والوں کے لئے اس حیرت انگیز کارنامے کا علم اُس کے بھائی کے حق میں کیسے کیسے شاندار نتائج پیدا کرے گا وہ خبر کو پھیلانے کی خاطر باہر نکل آئی۔

اور جب وہ لوگی کے گھر کے پاس سے جلد جلد گزر رہی تھی اُس نے کہا "آؤ، دیکھو! ٹیزیانو نے ہمارے پرانے مکان کی دیوار پر مقدس مریم کی تصویر رنگوں سے بنائی ہے"

کوئی خبر جب دیہاتیوں کی زبانوں پر چڑھ جاتی ہے تو بہت جلد مشہور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں لوگوں کا ایک مجمع اس مکان کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں ٹیزیانو اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس کا باپ جو تمام دن پہاڑوں میں شکار کرتا پھرا تھا اب گھر واپس آرہا تھا۔ جب اُس نے لوگوں کو اس جگہ جمع ہوتے دیکھا تو حیران ہوکر وہ بھی اسی طرف چل کھڑا ہوا۔ مگر اُس کے پہنچنے تک ہجوم اس قدر بڑھ چکا تھا کہ تصویر اُس کو نظر نہ آئی۔

ہر طرف سے یہی آوازیں آرہی تھیں "اُس نے یہ تصویر کیسے بنائی"! "اُس نے یہ رنگ کہاں سے لئے"!

اور ہر شخص میں اتنا جوش بھرا ہوا تھا کہ اُس کے باپ کو یہ بھی معلوم نہ ہوسکتا تھا کہ وہ کیوں یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ پھر اُس نے ٹیزیانو کی آواز سنی "میں نے اس تصویر کو پھولوں کے رس سے بنایا ہے۔ کیٹرینا انکو جمع کرتی رہی اور میں کام کرتا رہا۔

ہر طرف سے تعریف کا اظہار ہونے لگا، اور گاؤں کے پیشوا نیک دل پادری نے پُر احترام انداز سے کہا "پھولوں کے رس سے! مقدس ٹیزیانو کو دیکھو!"

انٹونیو ویسیلی سکتے کے عالم میں کھڑا دیکھ رہا تھا، کیونکہ جو کچھ وہ سن رہا تھا اُس پر اُسے یقین نہ آتا تھا۔ ایک دیہاتی سے جو پاس ہی کھڑا تھا اُس نے پُوچھا "کیا میں پاگل ہو گیا ہوں یا پادری نے سچ مچ میرے بیٹے کو "مقدس" کہا ہے؟"

اُس نے جواب دیا "نہیں تم پاگل نہیں ہو"۔

اور جب انہوں نے سارا ماجرا اُس سے کہہ سنایا اور ہجوم نے اُسے راستہ دیا تاکہ وہ بھی تصویر کو دیکھ سکے تو وہ حیران رہ گیا۔

چکی والے کا لڑکا سالویٹر سنگ تراشی سیکھنے گیا یا نہیں، یہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ لیکن ٹیزیانو گیا، اور کیڈور کا یہ لڑکا بعد میں وینس کا اعجوبہ بنا۔ وہاں بیلینی کی استادانہ اصلاح نے اُس کی رہنمائی کی، اور اُن موقلموں کو جو اس سے قبل تقریباً استی سال تک مصروفِ کار رہے تھے اُس نے خوب چلایا اور ان سے وہ وہ تصویریں بنائیں جن کے شگفتہ رنگوں کی نظیر پھر کبھی نہ مل سکی۔ اُس نے اپنے وطن کے لوگوں پر ثابت کر دیا کہ خیال پرستی کچھ بری چیز نہیں کیونکہ خیال پرستی کے ساتھ جب محنت مل جاتی ہے تو اُس سے حیرت انگیز باتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب کولمبس ابھی مغرب کے سفر کو روانہ نہ ہوا تھا۔ لیکن اُس کا باپ جو گاؤں کے پادری سے "مقدس ٹیزیانو" کے الفاظ سن کر اپنے آپ کو پاگل سمجھنے لگا تھا اگر آج پھر کوہستانِ اطالیہ کی گلزار وادی میں آئے تو اُسے یہاں کی فضا میں وہی الفاظ گونجتے ہوئے سنائی دیں جو اُس نے اُس شام پادری کی زبان سے سنے تھے۔

جب گاؤں کے لوگ اس عالی پایہ مجسمہ کے پاس آ کر کھڑے ہوتے ہیں جس کا رخ پھولوں کے اُن کھیتوں کی طرف ہے جن میں سے کیٹرینا اپنے بھائی کے لئے رنگ رنگ کے پھول توڑ کر لاتی تھی تو وہ اُس کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں "دیکھو، مقدس ٹیزیانو کو دیکھو!"

(ترجمہ) منصور احمد

ایک عزیزہ کی دائمی جدائی پر

ہزاروں آرزوؤں کا شجر مُرجھا کے گئی
دلوں کو خون کے آنسو بہت رُلا کے گئی

تمام ولولے سوئے ہوئے تھے جاگ اُٹھے
وہ سارے جاگے ہوئے ولولے سُلا کے گئی

خیال اُس کا نہاں تھا دماغ اور دل میں
وہ خود کو قیدِ خیالات سے چھُڑا کے گئی

ہم اُس کی یاد میں رہتے تھے مضطر اور بیکل
وہ دامن اپنا اِس آزار سے بچا کے گئی

وہ زیست ہی میں تھی اک پیکرِ وفا پرور
گئی جو زیست سے، راہِ وفا دکھا کے گئی

ہم اپنے بخت کی خوش کامیوں پہ نازاں تھے
وہ بدنصیبیٔ پنہاں پہ مسکرا کے گئی

پھر اُس سے ملنے کا تھا انتظار برسوں سے
وہ انتظار کی دنیا ہی سب مٹا کے گئی

"کلی" بہشت کی معصوم و نوشگفتہ "کلی"
کھِلی، پہ دل کی نہ میرے کلی کھِلا کے گئی

وہ خالی آئی نہ خالی مگر گئی محشر
کہ اپنے دل میں محبت ہی بسا کے گئی

محشر عابدی

مسمریزم کا عمل

حقیقتاً یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ اکرام کے غیر معمولی واقعہ نے بحث وتمحیص کا ایک طوفان کھڑا کردیا۔ بلکہ حالات وواقعات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اگر ایسا نہ ہوتا تو واقعی تعجب تھا۔ جو لوگ اس معاملہ میں شریک تھے، اُن کا خیال تھا کہ کم ازکم موجودہ صورت میں، یا جس وقت تک کہ ہمیں تحقیق وتجربہ کے آئندہ مواقع حاصل نہ ہوں، اس واقعہ کو منظرِ عام پر نہ لانا چاہئے، اور ہم نے اسی کی کوشش بھی کی لیکن اس کا یہ اثر ہُوا کہ عام طور پر تحریف شدہ یا مبالغہ آمیز اطلاعات پھیل گئیں، جو کئی مختلف النوّع ناخوشگوار غلط بیانیوں کا، اور اس لئے بہ کثرت بے اعتقادیوں کا مصدر ثابت ہوئیں۔

لہٰذا اب یہ ضروری ہوگیا کہ ان واقعات کو ۔۔۔۔۔ جہاں تک میں خود سمجھ سکا ہوں ۔۔۔۔۔ بیان کروں۔ یہ واقعات مختصر طور پر حسبِ ذیل ہیں۔

گذشتہ تین سال سے میری توجہ مسمریزم کے مضمون کی طرف متواتر منعطف کی جارہی تھی، اور تقریباً نو مہینے ہوئے کہ بالکل اچانک طور پر میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہُوا کہ اب تک جس قدر تجربات کئے جاچکے ہیں، ان میں ایک نہایت اہم اور ناقابلِ تشریح فروگذاشت ہوگئی ہے ۔۔۔۔۔ یعنی یہ کہ آج تک کسی شخص پر حالتِ نزع میں اس کا عمل نہیں کیا گیا۔ اس میں کئی مسائل دریافت طلب تھے۔ سب سے پہلے یہ کہ آیا مریض ایسی حالت میں اِس مقناطیسی قوت سے اثر پذیر ہونے کی قابلیت رکھتا ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ اگر رکھتا ہے تو اُس کی حالت اِس قابلیّت کو گھٹا یا بڑھا سکتی ہے؟ تیسرے یہ کہ مسمریزم کا عمل کس حدتک یا کتنی حدتک موت کے آنے کو روک سکتا ہے؟ ان کے علاوہ اور کئی مسائل قابلِ غور تھے، لیکن میرے دماغ میں ان تین کی اہمیت سب سے زیادہ تھی ۔۔۔۔۔ خصوصاً موخرالذکر کی، کیونکہ اس سے انتہائی اہم نتائج برآمد ہونے کی امید تھی۔

میں نے معمول کا انتخاب کرنے کے لئے اپنے گرد وپیش نظر ڈالی، تاکہ اُس کے ذریعہ سے میں ان مسائل کو حل کرسکوں۔ میرا ذہن صرف اکرام کی طرف منتقل ہُوا، جو "اخبار المشاہیر" کا مشہور ومعروف مرتب ہے، اور جس نے ابوالمکارم کے فرضی نام سے "حیاتِ انور پاشا" اور "رامائن" کا فارسی ترجمہ کیا ہے۔ اکرام، جو دراصل چاندنی چوک،

دہلی کا رہنے والا تھا، اپنے جسم کی انتہائی لاغری کی بنا پر مشہور تھا، اور اس وجہ سے بھی لوگ اُس کے چہرہ کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ اس کی سفید ڈاڑھی مونچھیں اس کے بالکل سیاہ سر کی ضد معلوم ہوتی تھیں، اور عام طور پر موخرالذکر کو مصنوعی بالوں کا خیال کیا جاتا تھا۔ اس کی طبیعت انتہائی کمزور واقع ہوئی تھی، اس وجہ سے وہ مسمریزم کے تجربات میں بہترین معمول کا کام دے سکتا تھا۔ دو یا تین موقعوں پر میں نے اس کو نہایت آسانی کے ساتھ سُلا دیا تھا، لیکن اس کے لاغر جسم کی وجہ سے میں قدرتی طور پر جن دیگر نتائج کی توقع کئے ہوئے تھا، اُن میں مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کی قوتِ ارادی جزئی یا کلّی طور پر کبھی میرے تابع عمل نہ ہوسکی، اور غیبی معاملات میں تو اس کے ذریعہ سے میں کوئی قابلِ اعتماد بات نہ معلوم کرسکا۔ میں نے اپنی اس ناکامی کا الزام ہمیشہ اُس کی صحت کی ابتر حالت پر رکھا۔ میری شناسائی سے چند ماہ قبل اس کے معالج مرض کو لازمی طور پر دق تجویز کرچکے تھے، اور یہ اُس کی عادت ہوگئی تھی کہ وہ اپنی موت کے متعلق اس انداز میں گفتگو کرتا تھا، گویا کہ یہ معاملہ ناگزیر اور ناقابلِ افسوس تھا۔

جس وقت یہ خیالات، جن کا میں اوپر تذکرہ کرچکا ہوں، میرے دماغ میں پیدا ہوئے تو قدرتی طور پر مجھے اکرام کا خیال آیا۔ میں اس کے غیر متزلزل فلسفیانہ دماغ سے خوب واقف تھا، لہٰذا اس کی طرف سے کسی چون وچرا کا اندیشہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں اس کا کوئی عزیز بھی قریب نہ تھا جو مداخلت کرسکتا۔ میں نے اس سے بے تکلف اس خیال کا تذکرہ کیا، اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب میں نے دیکھا کہ خود اُس کو بے حد دلچسپی پیدا ہوگئی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی، میں اس لئے کہتا ہوں کہ گو اس سے پیشتر بھی وہ میرے تجربات کے لئے اپنے جسم کو پیش کرچکا تھا لیکن اُس نے کبھی اس عمل سے دلچسپی کا اظہار نہ کیا تھا۔ اس کی بیماری اس قسم کی تھی کہ اس کی موت کے وقت کی بابت صحیح اندازہ کیا جاسکتا تھا، اور ہم نے آپس میں یہ طے کرلیا کہ اطبا موت کا جو وقت معین کریں، اس سے تقریباً چوبیس گھنٹے قبل وہ مجھے اطلاع دے دے۔

آج شاید سات مہینے سے زیادہ گزر چکے ہیں کہ مجھے خود اکرام کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ رقعہ ملا:۔

"مکرمی عزیز صاحب۔ بہتر ہے کہ آپ اس وقت تشریف لے آئیے۔ ڈاکٹر داور اور ڈاکٹر فرید کی بھی رائے ہے کہ میں کل نصف شب کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا، اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے وقت کا بہت صحیح اندازہ کیا ہے۔

"اکرام"

یہ رقعہ تحریر سے آدھ گھنٹہ بعد مجھے مل گیا، اور اس کے پندرہ منٹ بعد میں اکرام کے کمرہ میں تھا۔ میں نے تقریباً دس روز سے اُسے نہیں دیکھا تھا، اور اس مختصر عرصہ نے اس میں جو خوفناک تبدیلی پیدا کردی تھی، اسے دیکھ کر میں

بھونچکا سارہ گیا۔ اس کے چہرہ پر سیسے کا سا رنگ غالب تھا، آنکھوں سے چمک قطعی مفقود ہو چکی تھی، دبلا پن اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ رخساروں کی ہڈیاں کھال سے باہر نکل آئی تھیں، اور نبض بہت خفیف محسوس ہوتی تھی۔ تاہم سخت حیرت ہے کہ اس کی دماغی قوت اور کسی حد تک جسمانی قوت، دونوں برقرار تھیں۔ اس کی زبان صاف تھی، وہ بغیر کسی کی مدد کے سکون بخش دوائیں استعمال کر رہا تھا، اور جس وقت میں کمرے میں داخل ہوا ہوں، ایک نوٹ بک پر پنسل سے کچھ یادداشت لکھنے میں مصروف تھا۔ وہ بستر پر چاروں طرف تکیوں میں دبا ہوا تھا۔ ڈاکٹر داور اور ڈاکٹر فرید دیکھ بھال کر رہے تھے۔ اکرام سے مصافحہ کر کے میں ان دونوں حضرات کو علیحدہ لے گیا، اور ان سے مریض کی حالت کا مفصل حال معلوم کیا۔ اس کا بایاں پھیپھڑا اٹھارہ مہینہ سے تقریباً ہڈی کی طرح سخت ہو چکا تھا، اور کسی کام کا نہ رہا تھا۔ داہنے کا بالائی حصہ بھی اگر بالکل نہیں تو تھوڑا بہت سخت ہو گیا تھا، درآنحالیکہ نچلا حصہ صرف گلٹیوں کا ایک مجموعہ رہ گیا تھا۔ جو ایک دوسرے میں دھنسی ہوئی تھیں۔ ان میں کئی بڑے بڑے سوراخ پڑ چکے تھے، اور ایک موقع پر پسلیوں کے ساتھ مستقل پیوستگی پیدا ہو گئی تھی۔ داہنے شُشش کی یہ خرابیاں حال ہی میں ظاہر ہوئی تھیں، اور پھیپھڑوں کی سختی نے غیر معمولی سرعت کے ساتھ ترقی کی تھی، کیونکہ ایک مہینہ پیشتر اس کی کوئی علامت موجود نہ تھی، یہاں تک کہ پیوستگی کا حال صرف تین روز قبل ہی معلوم ہو سکا تھا۔ دق کے علاوہ مریض کو اور مرض بھی لاحق تھے، لیکن پھیپھڑوں کی سختی نے کسی صحیح تشخیص کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا۔ دونوں ڈاکٹروں کی یہی رائے تھی کہ اکرام اگلے دن (اتوار کو) آدھی رات کے قریب ختم ہو جائے گا۔ یہ واقعہ ہفتہ کے دن شام کے سات بجے کا ہے۔

داور اور فرید مجھ سے بات چیت کرنے کے لئے مریض کے بستر سے اٹھتے وقت اُسے ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ چکے تھے۔ ان کا ارادہ پھر آنے کا نہ تھا، لیکن میری درخواست پر انہوں نے اگلے روز رات کو دس بجے پھر مریض کو دیکھنا منظور کر لیا۔

ان کے چلے جانے کے بعد میں آزادانہ طور پر اکرام سے اس کی موت کے متعلق، اور بالخصوص اپنے تجربہ کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ وہ اب تک نہ صرف قطعی رضامند تھا، بلکہ اس عمل کے کئے جانے کا خواہاں تھا، اور فوراً شروع کر دینے پر مجھ سے اصرار بھی کر رہا تھا۔ اس وقت ایک مرد اور ایک عورت تیمارداری کے لئے موجود تھے۔ لیکن میں نے اسے نامناسب سمجھا کہ اس قسم کا کام ایسے وقت شروع کر دوں، جب کہ کسی اچانک حادثہ کی صورت میں ان لوگوں کے علاوہ کوئی قابلِ اعتماد گواہ بھی موجود نہ ہو۔ اس لئے میں نے اپنے عمل کو آئندہ رات کے آٹھ بجے تک کے لئے ملتوی کر دیا۔ وقتِ معینہ پر طب کے ایک طالب علم حسن جمال، کی آمد نے جس سے میں بھی واقف تھا، میری پریشانیوں کا خاتمہ

کردیا۔ دراصل میرا ارادہ تھا کہ دونوں ڈاکٹروں کا انتظار کروں، لیکن ایک تو اکرام کی پُرزور التجاؤں نے، اور دوسرے میرے اس یقین نے کہ مجھے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہئے، کیونکہ وہ نہایت سرعت کے ساتھ ختم ہو رہا تھا، مجھے اپنا عمل فوراً شروع کردینے پر مجبور کردیا۔

جمال نے نہایت مہربانی کے ساتھ میری اس خواہش کو منظور کرلیا، کہ جو کچھ وقوع پذیر ہو اس کو تحریر کرتا جائے، اور جو واقعات مجھے اب بیان کرنا ہیں، وہ زیادہ تر اسی کی یادداشت سے لے کر کہیں مختصر کرکے اور کہیں بلاتصرف نقل کردیئے گئے ہیں۔

آٹھ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ میں نے مریض کا ہاتھ پکڑ کر اس سے درخواست کی کہ وہ حسن جمال سے وضاحت کے ساتھ یہ بیان کرے کہ آیا وہ (اکرام) اس بات پر قطعی آمادہ ہے کہ میں ایسی حالت میں اُس پر مسمریزم کا عمل کروں۔

اُس نے نحیف لیکن قابلِ سماعت آواز میں جواب دیا "ہاں میری خواہش ہے کہ مجھ پر مسمریزم کا عمل کیا جائے" پھر فوراً ہی اِن الفاظ کا اضافہ کیا "مجھے خوف ہے کہ آپ نے بہت دیر کردی"

اس گفتگو کے بعد میں نے اپنے وہ عمل شروع کئے جن کو اس سے پہلے اکرام کے مطیع کرنے میں زیادہ موثر پاچکا تھا۔ میرے ہاتھ کے پہلے ہی یک طرفہ وار نے، جو اس کی پیشانی کی طرف کیا گیا تھا، اس پر بیّن اثر کیا، لیکن اس کے بعد میرے تمام قوت صرف کرنے کے باوجود بھی اس پر کوئی اثر ظاہر نہ ہوسکا، یہاں تک کہ دس بج کر کچھ منٹ پر داور اور فریدی بھی حسبِ وعدہ آپہنچے۔ میں نے چند الفاظ میں اُن سے اپنا طریقِ عمل بیان کیا، جو میں اختیار کرنے والا تھا، اور چونکہ انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور مریض کو موت کی تکالیف میں مبتلا بتایا، لہذا میں نے بلاپس وپیش اپنا عمل جاری رکھا البتہ کبھی کبھی یک طرفہ عمل کو تختی عمل سے بدل دیتا تھا، اور اپنی نگاہ کو پورے طور سے مریض کی صرف داہنی آنکھ پر جمارکھا تھا۔

اب اس کی نبض غیر محسوس ہوچکی تھی، سانس خراٹوں میں تبدیل ہوچکا تھا، اور آدھے منٹ کے وقفہ سے آرہا تھا۔

پندرہ منٹ تک اُس کی اِس حالت میں تقریباً کوئی تبدیلی نہ ہوئی، البتہ اس عرصہ کے بعد ایک قدرتی لیکن بہت گہرا سانس مرنے والے کے سینہ سے نکلا، اور خراٹے کا سانس بند ہوگیا ―――― یا یُوں کہنا چاہئے کہ اس کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وقفوں میں البتہ کوئی کمی نہ ہوئی۔ مریض کے ہاتھ پاؤں اس وقت برف کی طرح سرد ہورہے تھے۔

گیارہ بجنے میں پانچ منٹ پر میں نے مسمریزم کے اثرات کی علامات دیکھیں۔ آنکھوں کی شفافیت اُس تکلیف دہ اندرونی امتحان کی علامتوں سے تبدیل ہوگئی، جو سوائے مسمریزم کے عمل کے اَور کہیں نہیں دیکھی جاتیں، اور جن میں غلطی کا مطلق احتمال نہیں۔ میرے چند فوری یک طرفہ واروں سے اُس کی آنکھوں کے پردے ہلنے لگے، جیسے کہ نیند کے ابتدائی لمحات میں ہلا کرتے ہیں، پھر چند اور رواروں کے بعد میں نے انہیں بالکل بند کردیا۔ بہرحال مجھے اس سے اطمینان نہیں ہؤا، اور میں برابر اپنی قوتِ ارادی کا پورا زور لگا کر عمل کرتا رہا، یہاں تک کہ معمول کے اعضا کو ظاہرا آرام دہ حالت میں رکھ کر میں نے اُن کو بالکل سخت کردیا۔ ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں، یہی کیفیت ہاتھوں کی تھی، جو بستر پر کمر سے ذرا فاصلے پر پڑے تھے۔ صرف سر ذرا سا اُٹھا ہؤا تھا۔

جس وقت میں نے اس عمل کو ختم کیا ہے، پوری آدھی رات گذر چکی تھی، اور میں نے حاضرین سے اکرام کی حالت کا اندازہ کرنے کی درخواست کی۔ چند تجربات کے بعد انہوں نے اقرار کیا کہ وہ غیر معمولی سکون کی حالت میں قطعی مسمریزم کے زیرِ اثر ہے۔ دونوں ڈاکٹر بے حد دلچسپی لینے لگے، یہاں تک کہ ڈاکٹر داور نے تو اسی وقت تمام رات مریض کے پاس رہنے کا تہیّہ کرلیا، اور ڈاکٹر فرید علی الصباح آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگیا۔ حسن جمال اور تیماردار وہیں رہے۔

ہم نے صبح کے تین بجے تک اکرام کو بالکل پریشان نہ کیا۔ اُس وقت میں اس کے پاس آیا اور بالکل ویسا ہی پایا، جیسا فرید کے جانے کے وقت تھا، یعنی وہ اُسی صورت میں لیٹا ہؤا تھا۔ نبض غیر محسوس تھی، سانس بہت ہلکا چل رہا تھا اور ہونٹوں پر آئینہ لگائے بغیر معلوم نہ ہوسکتا تھا، آنکھیں قدرتی طور پر بند تھیں، اور اعضا سنگِ مرمر کی طرح سخت اور سرد تھے۔ تاہم اس کی عام ظاہری حالت سے موت کا اندازہ ہوسکتا تھا۔

اکرام کے پاس پہنچ کر میں نے یہ کوشش کی کہ اُس کے داہنے ہاتھ پر اثر ڈال کر اس کو اپنے ہاتھ کے ساتھ ساتھ ہلاؤں، چنانچہ میں نے اپنا ہاتھ اُس کے جسم کے اُوپر اِدھر اُدھر آہستہ آہستہ ہلانا شروع کیا۔ ان تجربات میں اکرام کے ساتھ مجھے پہلے کبھی پُوری کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی، لہٰذا اس وقت بھی مجھے اپنی کامیابی کا بہت کم خیال تھا۔ لیکن مجھے سخت تعجب ہؤا کہ اکرام کا ہاتھ فوراً، مگر ذرا ضعف کے ساتھ، اسی طرف کو حرکت کرنے لگا، جس طرف میں اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتا تھا۔ میں نے چند سوالات دریافت کرنے کا تہیّہ کرلیا۔

"اکرام!" میں نے کہا "کیا سو رہے ہو؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا، لیکن اس کے ہونٹوں پر مجھے کچھ تھرتھراہٹ سی معلوم ہوئی، لہٰذا میں نے اس سوال کو بار بار دہرانے کا ارادہ کیا۔ تیسری مرتبہ دہرانے پر اس کے تمام جسم میں ایک ہلکی ارتعاشی کیفیت پیدا ہوئی،

آنکھوں کے پردے خودبخود اس قدر کھل گئے کہ ان میں سے ایک سفید لکیر نظر آنے لگی، ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے، اور نہایت نحیف آواز میں یہ الفاظ نکلے:-

"ہاں! اب سو رہا ہوں۔جگاؤ مت! ——— اسی طرح مرنے دو!"

اُس وقت میں نے اُس کے اعضا کو چھوا، اور پہلے ہی کی طرح سخت پایا۔داہنا بازو حسبِ معمول میرے ہاتھ کے اشاروں کی متابعت کر رہا تھا۔میں نے معمول سے پھر سوال کیا۔

"اکرام! کیا سینہ میں تمہیں اب بھی درد محسوس ہوتا ہے؟"

اس مرتبہ جواب جلد ملا، لیکن پہلے سے بھی زیادہ کمزور آواز میں۔

"کوئی درد نہیں ——— میں مر رہا ہوں"

میں نے اسے زیادہ پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا، اور ڈاکٹر فرید کے آنے تک خاموشی طاری رہی۔فرید طلوعِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے پہنچا، اور مریض کو اس وقت تک زندہ دیکھ کر انتہائی تعجب کا اظہار کیا۔اس نے نبض دیکھی، ہونٹوں پر آئینہ رکھا، پھر مجھ سے کہنے لگا کہ تم معمول سے گفتگو کرو۔میں نے ایسا ہی کیا، اور پوچھا۔

"اکرام! کیا ابھی سو رہے ہو؟"

پہلے کی طرح چند لمحات گذرنے کے بعد جواب ملا، اور اس عرصہ میں معلوم ہوتا تھا کہ مرنے والا بولنے کے لئے اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر رہا ہے۔سوال کو چوتھی مرتبہ دہرانے پر اُس نے نہایت کمزور تقریباً ناقابلِ سماعت آواز میں جواب دیا۔

"ہاں ابھی سو رہا ہوں ——— مر رہا ہوں"

اس وقت ڈاکٹروں کی رائے، بلکہ خواہش یہ تھی کہ اکرام کو اس کی موجودہ بظاہر پُرسکون حالت میں چھوڑ دیا جائے، اور جب تک موت مداخلت نہ کرے پریشان نہ کیا جائے ——— اور ہم سب کا یہ خیال تھا کہ موت کے آنے میں صرف چند لمحات باقی ہیں۔تاہم میں نے سوچا کہ اس سے ایک مرتبہ اور گفتگو کروں، اور اس غرض کے لئے پہلے سوال ہی کو دہرا دیا۔

میرے سوال پر معمول کے چہرہ پر ایک نمایاں تغیر نمودار ہوا۔آنکھیں گھوم کر آہستہ آہستہ کھل گئیں، پتلیاں بالکل اوپر چڑھ گئیں۔جلد پر عموماً مردنی سی چھا گئی، چہرے کا رنگ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا، اور دق کی وجہ سے جو گول دھبے اُس کے ہر رخسار کے بیچ میں بالکل صاف نظر آتے تھے، ایک دم بجھ گئے۔میں اِس فقرہ (ایک دم بجھ گئے) کو اس وجہ سے استعمال کرتا ہوں کہ اِن دھبوں کا اڑنا اتنی سرعت کے ساتھ ظہور پذیر ہوا، کہ گویا ایک شمع کو پھونک مار کر گل کر دیا گیا۔اوپر کا ہونٹ

ساتھ ہی ساتھ اینٹھ کر دانتوں سے علیحدہ ہوگیا، جن کو وہ اس سے پیشتر مکمل طور پر ڈھکے ہوئے تھا۔ نیچے کا جبڑا جھٹکے کی آواز کے ساتھ نیچے آپڑا، اور منہ اپنی پوری وسعت سے کھلا رہ گیا، جس کے اندر سوجی ہوئی سیاہ زبان صاف نظر آرہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہم میں کا کوئی شخص بستر مرگ کی خوفناکیوں سے واقف نہ تھا، لیکن اس وقت اکرام کی صورت اس قدر ناقابلِ قیاس طور پر ہیبت ناک ہوگئی تھی کہ ہم سب خوفزدہ ہو کر بستر کے پاس سے پیچھے ہٹ گئے۔

اب اکرام میں زندگی کی کمزور سے کمزور علامت بھی نظر نہ آتی تھی، اور اسے مردہ سمجھ کر ہم تیمارداروں کے سپرد کرنے والے تھے کہ اُس کی زبان میں ایک زبردست اہتزازی حرکت پیدا ہوئی۔ یہ حرکت شاید ایک منٹ تک جاری رہی، جس کے بعد اس کے پھیلے ہوئے بے حس و حرکت جبڑوں سے ایک آواز نکلی —— ایسی کہ اُس کے بیان کرنے کی کوشش کرنا میرے لئے جنون کے مترادف ہوگا۔ دو تین صفتیں ایسی ضرور ہیں، جو اس پر صرف جزئی طور پر صادق آسکتی ہیں —— مثلاً میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ صدا سخت تھی، بے ہنگم تھی کھوکھلی سی تھی —— لیکن اس کُل ہیبت ناک صدا کو بیان نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ آج تک کسی ایسی صدا نے انسانی کان میں خراش نہ پیدا کی ہوگی۔ بایں ہمہ دو باتیں ضرور تھیں، جن کی بابت میں نے خیال کیا، اور اب بھی خیال کرتا ہوں، کہ آواز کی خصوصیات میں شمار کی جا سکتی ہیں، اور انہیں سے اس کی غیر خلقی عجوبہ طرازی کا بھی کچھ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ ایسا معلوم ہؤا کہ وہ آواز ہمارے کانوں میں —— کم از کم میرے کانوں میں —— بہت دور و دراز فاصلہ سے، یا زمین کے نیچے کسی عمیق غار سے آئی ہے۔ دوسرے یہ کہ اُس نے مجھ پر ایسا اثر کیا (مجھے خوف ہے کہ شاید میں اپنے بیان کی توضیح نہ کرسکوں گا) جیسے کوئی چپکتا ہؤا لیس دار مادہ حسِ لامسہ پر اثر کرتا ہے۔

میں نے "صدا" اور "آواز" دونوں لفظ استعمال کئے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس صدا کا ایک ایک حرف صاف صاف —— حیرت انگیز طور پر مرتعش کن طور پر صاف صاف —— سنائی دیا۔ اکرام بولا، اور اُس سوال کے جواب میں بولا، جو چند لمحہ پیشتر میں نے اُس سے کیا تھا۔ میں نے دریافت کیا تھا کہ کیا وہ ابھی سو رہا ہے۔ اُس نے اب جواب دیا۔

"ہاں —— نہیں —— میں سو رہا تھا —— اور اب —— اب —— میں مرچکا ہوں۔"

ان چند الفاظ نے، جو اس حالت میں ادا کئے گئے تھے، ہم پر جو ناقابلِ بیان لرزا دینے والی دہشت طاری کر دی، اس سے نہ کوئی انکار کرسکا، نہ اسے دبا سکا۔ جمال (طالب علم) کو غش آگیا۔ تیماردار فوراً کمرہ چھوڑ کر بھاگ گئے، اور واپس لوٹنے پر کسی طرح رضامند نہ ہوئے۔ میں اپنے احساسات ناظرین کے سامنے بیان نہیں کرسکتا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک ہم نہایت خاموشی کے ساتھ —— ایک لفظ بھی زبان سے نکالے بغیر —— جمال کو ہوش میں لانے کی کوشش میں مصروف رہے۔

وہ ہوش میں آگیا، تو ہم نے پھر اکرام کی حالت کی تحقیق کرنی چاہی۔

اس کی حالت ہر صورت سے وہی تھی، جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں، سوائے اس کے کہ اب آئینہ سے سانس کی آمدورفت کا ثبوت نہ ملتا تھا۔ اس کے بازو سے خون نکالنے کی کوشش کی گئی، لیکن ناکام رہی۔ مجھے اس امر کا بھی اظہار کر دینا چاہیئے کہ اب اس کا ہاتھ میری قوت ارادی کے ماتحت نہ رہا تھا، اور میں نے کافی زور لگایا کہ وہ میرے ہاتھ کے اشاروں کی متابعت کرے مگر بے سود۔ اب مسمریزم کے اثرات کا اظہار صرف اس کی زبان کی اہتزازی حرکت سے ہوتا تھا، وہ بھی اس وقت جب میں اس سے کوئی سوال پوچھتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جواب دینے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن کافی طاقت نہیں رکھتا۔ میرے علاوہ اگر کوئی اَور شخص اس سے سوال کرتا، تو وہ بالکل بے خبر معلوم ہوتا تھا، حالانکہ میں نے اس کے ساتھ تمام حاضرین کو بھی مسمریزم کے حلقہ میں لے لیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ جو کچھ میں بیان کر چکا ہوں، اس سے معمول کی ایسے وقت کی حالت سمجھ میں آسکتی ہے۔ اس کے بعد دوسرے تیمارداروں کا انتظام کیا گیا، اور دس بجے میں، دونوں ڈاکٹر اور جمال وہاں سے رخصت ہو گئے۔

شام کے وقت ہم سب مریض کو دیکھنے کے لئے پھر جمع ہوئے۔ اس کی حالت بالکل ویسی ہی تھی، لہٰذا ہم نے اس امر پر بحث کی کہ آیا اس کو بیدار کرنا مناسب ہوگا، اور عمل پذیر ہو سکے گا یا نہیں۔ لیکن ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ ایسا کرنے سے کوئی فائدہ متصور نہیں ہو سکتا۔ یہ بات ظاہر ہو چکی تھی کہ اس وقت تک موت کو (یا جس کو عموماً موت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) مسمریزم کے عمل سے روک دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ بھی صاف سمجھ میں آسکتا تھا کہ اکرام کو جگانے کے یہ معنی ہونگے کہ اس کے یک لخت یا کم از کم فوری خاتمہ کا یقین کر لیا جائے۔

اُس وقت سے لے کر گذشتہ ہفتہ کے آخر تک ——— تقریباً سات مہینہ کے عرصہ میں ——— ہم اپنے متفرق دوست احباب کے ساتھ روزانہ اکرام کے مکان پر جاتے رہے۔ اس تمام مدت میں معمول قطعی اسی طرح رہا، جیسا کہ میں آخر میں بیان کر چکا ہوں۔ تیماردار برابر توجہ سے کام کرتے رہے۔

لیکن گذشتہ جمعہ کو بالآخر ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ اس کو جگانے کا، یا جگانے کی کوشش کرنے کا تجربہ کرنا چاہیئے اور یہ اسی آخری تجربہ کے نتائج بد کا اثر ہے، جس نے مختلف طبقوں میں بحث و تمحیص کا ایک طوفان بپا کر رکھا ہے ——— ایسی بحث و تمحیص، جس کو میں نامناسب بازاری جذبات کے نام سے پکارے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اکرام کو مسمریزم کے اثرات سے نکالنے کے لئے میں نے اپنے معمولی عمل استعمال کئے۔ ان میں کچھ عرصہ تک ناکامی، [illegible] سے ہوا کہ آنکھوں کی سیاہی کچھ کچھ نیچے اتر آئی۔ اس میں ایک خاص

بات یہ بھی دیکھی گئی کہ پتلی کے اترنے کے ساتھ ہی پلکوں کے نیچے سے زرد زرد مادہ بہت زیادہ مقدار میں بہنے لگا۔

اس وقت یہ تجویز ہوئی کہ میں پہلے کی طرح مریض کے بازو پر اثر ڈالنے کی کوشش کروں۔ میں نے کوشش کی اور ناکامیاب رہا۔ اس کے بعد ڈاکٹر فرید نے یہ خواہش کی کہ کوئی سوال کروں۔ میں نے سوال کیا۔

"اکرام! کیا تم ہمیں بتا سکتے ہو کہ تمہارے جذبات اور احساسات اب کیا ہیں؟"

اس کے رخساروں پر مرض کے وہی دھبے یکایک پھر نمودار ہو گئے، زبان تھرتھرانے لگی، بلکہ منہ کے اندر نہایت تیزی کے ساتھ ناچنے لگی، حالانکہ جبڑے اور ہونٹ پہلے کی طرح سخت اور بے حس وحرکت رہے، اور آخر کار وہی دہشت انگیز آواز جس کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں، سنائی دی:۔

"خدا کے واسطے! ——— جلدی! ——— جلدی! ——— مجھے سلا دو! ——— یا جلدی! مجھے بیدار کر دو! ——— جلدی! ——— میں تم سے کہتا ہوں کہ میں مر چکا ہوں!"

میرا دماغ بالکل پریشان ہو گیا، اور تھوڑی دیر تک میں قطعاً نہ سمجھ سکا کہ کیا کرنا چاہئے۔ پہلے میں نے مریض کو دوبارہ سکون میں لانے کی کوشش کی، لیکن قوتِ ارادی کے بالکل قابو میں نہ ہونے کی وجہ سے ناکامیاب رہا پھر میں نے وہی راہ اختیار کی، اور پوری قوت کے ساتھ اس کو بیدار کرنے کی جد وجہد کرنے لگا۔ اب مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس کوشش میں شاید میں کامیاب ہو جاؤں ——— یا کم از کم مجھے یہ نظر آنے لگا کہ میری کامیابی مکمل ہو گی ——— اور مجھے یقین ہے کہ کمرہ میں سب لوگ مریض کو بیدار دیکھنے پر آمادہ تھے۔

تاہم جو کچھ وقوع پذیر ہؤا، اسے دیکھنے کے لئے قطعی ناممکن ہے کہ کوئی انسان آمادہ ہوتا۔

میں جلد جلد اثر اتارنے کے عمل کر رہا تھا، درآنحالیکہ مریض کے ہونٹوں سے نہیں، بلکہ زبان سے "مرچکا! مرچکا!" کی خوفناک صدائیں متواتر نکل رہی تھیں، کہ یکایک ——— صرف ایک لمحہ یا اس سے بھی کم عرصہ کے اندر ——— میرے ہاتھوں کے نیچے اس کا تمام جسم سکڑ گیا ——— ریزہ ریزہ ہو گیا ——— بالکل گل کے رہ گیا۔ اور بستر پر، ہم سب کی نظروں کے سامنے مکروہ، نفرت انگیز سڑاند کا ایک تقریباً رقیق ڈھیر پڑا ہؤا تھا۔

(ماخوذ از ایڈگر ایلن پو) انیس الدین احمد

دل

عہدِ الفت کی داستاں ہے دل
داغِ حسرت کا اک نشاں ہے دل

پوچھتے کیا ہو تم کہاں ہے دل
ہم کو معلوم ہے جہاں ہے دل

غمِ الفت کا رازداں ہے دل
صرفِ بےتابیٔ نہاں ہے دل

یا گلہ ہے کوئی ندامت خیز
یا خموشی اثر فغاں ہے دل

اب وہ سودائے عرضِ حال کہاں
یعنی پہلے سا اب کہاں ہے دل

اب وہ الفت پرستیاں ہی نہیں
نہ وہ حسرت کشِ بتاں ہے دل

نہ وہ ہنگامہ ہائے شوق رہے
نہ وہ لذّت کشِ فغاں ہے دل

تجھ سے کیونکر کہے غمِ الفت
دلِ مضطر کہ بے زباں ہے دل

رام رتن مضطر

شہرت

میز کے اوپر، میز کے نیچے، فرش کے کونوں پر، ہر طرف دھندلی، بے رنگ تصویریں کس مپرسی کے عالم میں پڑی سڑ رہی تھیں۔ دیوار پر پرانے چوکھٹوں میں جو نئی تصویریں جڑوا کر ٹانگی گئی تھیں ان پر بھی گرد و غبار کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ہفتوں سے انہیں کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک پرانی بوسیدہ میز پر تصویر کشی کا سامان اِدھر اُدھر پھیلا پڑا تھا۔ تین چار چھوٹی چھوٹی پیالیاں، کوئی نصف درجن چھوٹے بڑے برش، کاغذات، رنگوں کا بکس، کریچ کے ٹکڑے الم غلم..........

اسی میز پر دونوں کہنیاں ٹیکے، سر کو ہاتھوں میں تھامے پرکاش چندر ہونٹ لٹکائے بیٹھا ہوا تھا، جیسے ابھی ابھی کسی سے خوب لڑ کر آیا ہو۔ وہ اس وقت دل میں اُس منحوس ساعت کو کوس رہا تھا جب اُس نے مصوری کی احمقانہ دُھن میں بیٹھے بٹھائے اپنی اچھی خاصی سرکاری ملازمت سے استعفاء دے دیا۔ اس گرانی کے زمانہ میں پچاسی روپیہ ماہانہ کوئی بڑی رقم نہیں۔ پھر بھی کفایت شعاری اور سلیقہ کی بدولت وہ اپنی اور اپنی بیوی کی تمام متوسط ضروریات کو پورا کر لیتا تھا۔ مقررہ رقم، مقررہ نرخ، مقررہ پروگرام۔ نہ بے جا کد و کاوش نہ ہر روز "کل کیا ہوگا" کی جان لیوا فکر۔ اس کی زندگی کی گاڑی ایک ایسے ہموار راستے پر دھیرے دھیرے چل رہی تھی جس میں مسافر کو ہچکولے کم لگتے ہیں اور نیند زیادہ آتی ہے۔ ایسے مستقل اطمینان، ایسے بے غل وغش راستے کو چھوڑ کر یکایک وہ زندگی کے اس نئے پُرخطر اور نامانوس سمندر میں کیوں کود پڑا؟ آخر وہ عسرت و تنگ دستی کی پھٹکار سے کب تک دست و گریباں رہے گا؟ ملازمت چھوڑے آج اسے پورا ڈیڑھ سال گذر چکا ہے۔ اس عرصہ میں اُس نے کتنی تصویریں بنائیں اور کتنی بیچیں؟ —— بنائیں درجنوں، لیکن بیچیں مشکل سے تین چار۔ یا زیادہ سے زیادہ آٹھ دس۔ وہ بھی اپنے ایک پرانے ہم جماعت کی عنایتوں کی بدولت جس نے اُس کے افلاس پر ترس کھا کر اس کی امداد کا یہ بہانہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ اپنی ہر تصویر پر پچھلی تصویر سے زیادہ موٹے حرفوں میں نیچے کے کونے پر "پرکاش چندر" لکھتا، اس موہوم امید پر کہ وہ لوگ جو اس کی ملازمت کے زمانہ میں اُس کی تصویروں کو دیکھ کر تعریف کے پل باندھ دیا کرتے تھے اسے معاوضہ دیئے بغیر تصویروں کی موقع بے موقع فرمائشوں سے اس کا ناک میں دم کر دیتے تھے اپنے پرانے ہیرو کی ان تازہ تصویروں پر اس کا نام دیکھ کر انہیں شوق و محبت سے بے تاب ہو کر خرید لیں گے۔ لیکن دن گذرتے گئے اور کسی آرٹ کے شیدائی نے اُس کی تصویروں کی طرف

رخ بھی نہ کیا۔ بجز تعریف کے چند رسمی فقروں کے، جن کی تہ میں حقیقی پسندیدگی کے بجائے اخلاقی دلدہی زیادہ ہوتی تھی اُسے اپنے ان پرانے مدّاحوں سے اَور کچھ نہ ملا۔

ملازمت چھوڑنے سے پہلے اُس کے لئے مصوّری کا پیشہ کیسے کیسے خوش آیند اور دل کش خوابوں سے معمور تھا! اُسے اپنے تخیل، اپنی رنگ آمیزی، اپنے انتخابِ موضوع پر کیسا کامل اعتماد تھا! اُسے ہمیشہ سے کامل یقین تھا کہ قدرت نے اُس کے وجود کو محض مصوّری کے لئے وضع کیا ہے۔ اگر وہ عمر بھر سرکاری عدالت کے محکمہ میں پڑا سڑتا رہا تو دنیا ایک پیدائشی آرٹسٹ کے عظیم الشان کارناموں سے محروم رہ جائے گی! ——— لیکن ملازمت چھوڑتے ہی زندگی کی تلخ، بے رحم حقیقتوں نے اُس کے اس خوبصورت خیالی شیش محل کو پاش پاش کر ڈالا اور اگر مایوسی کی اس ہیبت ناک تاریکی میں اُس کی ذہین بیوی لاجونتی کی شعاعِ حسن کا اجالا نہ ہوتا تو یہ ناکام مصوّر کب کا وہ ڈراؤنا کام انجام دے چکا ہوتا جسے عرفِ عام میں خودکشی کہتے ہیں اور جس کی مشفقانہ آغوش اُن تمام نامراد ناول نویسوں، فسانہ نگاروں ایکٹروں اور اُن مایوس عاشقوں کے لئے ہر وقت کھلی رہتی ہے جنہیں کامرانی کا دیوتا اپنے پاس سے دھکے دے کر نکال دیتا ہے۔

لاجونتی ایک لطافت پسند، وہم پرست، تخیلی لڑکی تھی جس نے پرکاش کے کمالِ مصوّری پر ریجھ کر، بلا سوچے سمجھے اُسے دل دے دیا تھا۔ اچھی تعلیم، بیسویں صدی کے دل و دماغ روشن کر دینے والی تربیت، سب سے بڑھ کر مرحوم باپ کی شہرۂ آفاق نقاشی، ان سب عناصر نے مل جل کر لاجونتی کے مذاق کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ اگر وہ خود تصویر نہیں بنا سکتی تھی تو اس کے لئے یہ فخر بھی کچھ کم نہ تھا کہ اس فن میں اس کی گہری، بے خطا نظر پر اچھے اچھے مصوّروں کو رشک آتا تھا۔ لاجونتی ایسی حسین، خوبصورت ہیرے کی طرح ترشی ترشائی دلربا کے اچھوتے دل پر فتح حاصل کر لینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اس کامیابی کے نشہ نے پرکاش کو اس آخری فیصلہ پر لا ڈالا کہ اس کی انگلیاں دفتر کے قلم کے لئے نہیں بلکہ مصوّر کے برش کے لئے بنی ہیں۔ لیکن زمانہ کی چال کیسی ٹیڑھی خطرناک چال ہوتی ہے! وہی کمال جس نے ڈیڑھ سال پہلے لاجونتی ایسی طرحدار لڑکی کو اس کے قدموں پر جھکا دیا تھا آج اُس کے گلے میں رسّی کا پھندا بنا ہوا لٹکا تھا۔ ایسا پھندا جسے کھول کر نکال دینے کی کوشش کرو تو اَور زیادہ کستا چلا جائے۔

اتنے دنوں کی پیہم ناکامیوں نے پرکاش کی خود اعتمادی کو بالکل کچل ڈالا تھا۔ اب وہ اکثر سنجیدگی کے ساتھ سوچا کرتا کیا واقعی مجھ میں ایک اعلیٰ درجے کا مصوّر بننے کی قابلیت تھی؟ یا شروع سے میں اپنے متعلق محض مغالطہ ہی مغالطہ

میں مبتلا رہا۔ ٹھیک جس وقت وہ اس طرح شک ویقین کے درمیان غوطے کھاتا ہوتا اُسے یکایک لاجونتی کے وہ دل بڑھانے والے فقرے یاد آجاتے جنہیں وہ صبح سے شام تک بیسیوں مرتبہ الٹ پھیر کر دہراتی رہتی:۔

"تم میں ایک حقیقی مصوّر کی روح بھری ہوئی ہے۔ دیکھ لینا کسی دن تمہارا نام سورج کی طرح چمک کر رہے گا"۔

"ہمت نہ ہارو۔ پہلے پہل یوں ہی دکھ اٹھانا پڑتے ہیں ـــ تم جیسا آدمی زیادہ دنوں تک گمنام نہیں رہ سکتا"

یہ اور اسی قسم کے سینکڑوں جملے پرکاش کی ٹوٹی ہوئی آس کو از سرِ نو جوڑ دیتے۔ یہی ہمت افزائی لے دے کر اب اس کی مایوس زندگی کا سہارا رہ گئی تھی۔ لیکن ان تمام ہمت افزائیوں محبت بھری تعریفوں، دلداریوں کے باوجود وہ اکثر تعجب کرنے لگتا کیا واقعی لاجونتی صحیح کہتی ہے کہ مجھ میں ایک حقیقی مصوّر کی روح بھری ہوئی ہے۔ یا اچھے اچھے خوشنگاروں کے ہوتے ایک گمنام بے مایہ مصوّر کو قبول کر لینے کی غلطی کو حق بجانب ثابت کرنے اور اپنے نفس کو تسکین پہنچانے کے لئے وہ ایسا کرتی ہے؛ پھر وہ نظر اٹھا کر لاجونتی کے بھولے چہرے کو، اس کی خلوص بھری آنکھوں کی دلفریب سیاہی کو، اُس کی پریم بھری مسکراہٹ کو دیکھتا تو اُسے لاجونتی کی صداقت کا یقین آجاتا۔ اُس کی نگاہوں میں محبت کا سرور چمک اُٹھتا اور اُس کے چہرے کے خطوط سے ٹپکنے لگتا:۔

"لاجونتی۔ تُو بالکل دیوی ہے دیوی! مجھ سا نکما آدمی کب اس قابل تھا کہ تو اس کی بیوی بنتی!"

اور بے خبر لاجونتی ایک میلی کچیلی، موٹے کپڑے کی ساری پہنے خوش خوش گھر کا تمام کام اپنے ہاتھ سے کرتی پھرتی۔ وہ میلے چکٹ کپڑوں میں کیسی معصوم کتنی خوبصورت معلوم ہوتی! اس کے الجھے ہوئے بال اس کی بلند پیشانی پر بکھرے رہتے اور اُس کے سرخ کنول ایسے نرم ونازک پاؤں صبح سے شام تک چھوٹے سے صحن کے ہزاروں چکر کر ڈالتے۔

ــــــــــــــ

سرکاری ملازمت کا بچا کھچا روپیہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔ اب گھر کا تمام خرچ اس قلیل رقم میں چلتا تھا جو ایک خوش حال بیرسٹر کے دو لڑکوں کو ڈرائنگ سکھانے کے صلہ میں مہینے کے مہینے پرکاش کو ملتی تھی۔ لاجونتی اچھی طرح جانتی تھی اب پانی سر سے اونچا ہوتا جاتا ہے۔ اب تک افلاس کے مہیب دیو کا صرف میاں بیوی مقابلہ کر رہے تھے۔ وہ دونوں نوجوان اور پُرجوش تھے۔ نوجوانی کے الھڑ قہقہوں اور کمسنی کی طفلانہ بے پروائیوں میں دنیا کی ہر چھوٹی بڑی مصیبت کو غرق کر سکتے تھے۔ لیکن یہ حقیر رقم اُس ننھے مہمان کی مہماں داری کا خرچ کیونکر پورا کرے گی جس کا نرم و نازک وجود عنقریب لاجونتی کی ممتا بھری گود کو آباد کرنے والا تھا؟ .... یہ فکر لاجونتی کو دن رات کھائے جاتی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے یہ خیال ہر وقت اس کی گردن پر سوار رہتا۔ یہاں تک کہ آج جی

کڑا کر کے اُس نے پرکاش سے دو باتیں کرنے کی ٹھان ہی لی۔

اُس نے آہستہ سے پرکاش کے میلے کچیلے نگار خانہ کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ پھر دھیرے دھیرے پرکاش کے پاس آ کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"پران ناتھ! کس فکر میں غرق ہیں؟"

پرکاش نے کہنیوں کے اندر سے اپنا سر اٹھایا۔ بہت دیر تک ایک ہی جگہ رکھے رکھے داہنا ہاتھ سُن ہو گیا تھا۔ اُسے زور سے دو تین بار جھٹکا۔ پھر مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بات بنائی۔

"کچھ نہیں۔ یوں ہی کچھ سر میں ہلکا ہلکا درد سا ہو رہا ہے...... تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائے گا"

لاجونتی جانتی تھی، پرکاش غلط کہہ رہا ہے۔ وہ دردِ سر میں نہیں بلکہ غمِ روزگار کے شکنجے میں مبتلا ہے مگر وہ یہ نہ چاہتی تھی اس کا چہرہ بے اعتباری کی چغلی کھائے۔ یقین بھرے لہجے میں بولی

"گرمی کی وجہ سے ہوتا ہوگا۔ لائیے سر میں تھوڑا چنبیلی کا تیل ڈال دوں.......... دماغ میں تازگی آ جائے گی"

یہ کہتے ہوئے لپک کر برابر کے کمرے سے تیل کی شیشی اٹھا لائی۔ پرکاش کے پیچھے کھڑے ہو کر اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور آہستہ آہستہ سر میں تیل تھپکنے لگی۔

"ایک بات آپ سے کہنا چاہتی ہوں۔ آج تک آپ نے کبھی میرا کہنا نہیں ٹالا۔ وعدہ کیجئے کہ مان جایئے گا"

پرکاش جیسے لاجونتی کے مخملی ہاتھوں کے لمس سے اتنی راحت مل رہی تھی کہ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اس طرح چونک پڑا جیسے کوئی اونگھتے اونگھتے چونک پڑتا ہے۔

"ضرور مانوں گا پہلے سے وعدہ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا میں تم سے کبھی انکار کر سکتا ہوں؟"

"پہلے سے وعدہ لینے کی ضرورت نہ ہوتی تو آپ سے پوچھتی کیوں؟......... مگر دیکھئے۔ آپنے میرا کہا نہ مانا تو مجھے بڑا رنج ہوگا"

پرکاش سمجھ گیا کوئی سنجیدہ معاملہ ہے "کہو تو۔ ماننے کی بات ہوگی تو کبھی انکار نہ کروں گا"

لاجونتی نے اپنی آنکھیں سامنے والی تصویر پر گاڑ دیں جس میں دریا کے کنارے برسات کے ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر دکھایا گیا تھا۔ پھر رک رک کر کہنے لگی

"بنارس میں تصویروں کا کاروبار نہایت مدھم پڑ گیا ہے۔ جانے دن بدن یہاں کا بازار اتنا بے رونق

کیوں ہوتا جاتا ہے؟ دہلی میں بڑے بڑے راجہ مہاراجہ آتے رہتے ہیں۔ وہاں کے لوگ ویسے بھی اس فن کے قدر دان ہیں۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔ اِس بے قدرے شہر کو چھوڑئیے ۔۔۔۔۔۔ میرے ساتھ دلّی چل کر رہئے۔ اپنا ذاتی مکان موجود ہے۔
وہاں جان پہچان کی بھی کوئی کمی نہیں۔ قسمت نے ساتھ دیا تو تھوڑے ہی دنوں میں کاروبار چمک اُٹھے گا۔۔۔۔۔۔"

پرکاش چندر کی بھویں سکڑ گئیں۔ چڑ چڑا کر بولا "تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی سسرال کی روٹیوں پر جا پڑوں۔ نہیں فاقوں مرجاؤں بلا سے۔ یہ ذلت گوارا نہ ہوگی"۔

پھر اپنے سخت جواب کے اکھڑپن کا احساس کرکے کسی قدر نرم آواز میں "برا نہ ماننا میں تمہارا دل دکھانا نہیں چاہتا۔ بات یہ ہے کہ میری غیرت کسی طرح گوارا نہیں کرسکتی کہ میں تمہاری ماتاجی پر اپنا بوجھ ڈال دوں۔ کاروبار چلتے چلتے بھی مہینوں درکار ہیں۔ اتنے دنوں تک میں دوسروں کا محتاج نہیں رہ سکتا۔ یہاں رہ کر کچھ نہیں تو بیس پچیس روپے کا سہارا تو لگا ہوا ہے"۔

لاجونتی پہلے ہی سے ڈر رہی تھی، پرکاش اس کی تجویز کو نامنظور کرے گا۔ پھر بھی اُس نے ایک مرتبہ اَور کوشش کی۔
"مہینوں کیوں درکار ہونے لگے۔ بنارس اور دلّی میں بڑا فرق ہے۔ وہاں معمولی معمولی مصوّر سینکڑوں روپیہ پیدا کرلیتے ہیں اور مہینے میں اُن کی درجنوں تصویریں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔ پھر آپ کی تصویروں اور اُن کی تصویروں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ جھوٹ نہیں کہتی آپ کا کام اُن سے دس گنا اچھا ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا اُن کی کامیابی کا بھید کیا ہے؟"

"کامیابی کا بھید! مجھ سے پوچھو۔ میں بتاتا ہوں۔ بھید وید کچھ بھی نہیں۔ سارا کھیل شہرت کا ہے۔ شہرت کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ بس ایک مرتبہ آرٹسٹ کا کسی طرح نام نکل جائے۔ چاہے وہ لاٹری کا روپیہ جیتنے کی وجہ سے مشہور ہو گیا ہو، چاہے چچا کے مرنے پر یکایک بہت سا روپیہ مل جانے کی وجہ سے ـــــــ یا پھر اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹر بڑے بڑے تعریفی مضامین لکھ لکھ کر تمام ملک میں اُس کا نام اچھال دیں۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح اسے مشہور ہو جانا چاہئے پھر دیکھو اس پر کیسی روپیہ کی بارش ہونے لگتی ہے!"

لاجونتی نے آپ ہی آپ زیرِلب پرکاش کے جملے کو دہرایا "شہرت کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔۔۔۔۔۔
بس ایک مرتبہ کسی نہ کسی طرح آرٹسٹ کا نام نکل جائے۔۔۔۔۔۔" اور پھر وہ کسی گہرے سوچ میں پڑ گئی۔ بہت دیر تک خاموش کھوئی کھوئی سی رہی۔ یہ چپ اسے کئی دن تک لگی رہی۔ جیسے اندر ہی اندر اپنے کو کسی عظیم الشان مہم کے لئے تیار کر رہی ہو۔ مگر منہ سے کچھ نہ کہتی تھی۔

ایک دن کوئی تین چار روز کی مسلسل خاموشی کے بعد وہ پھر پرکاش کے نگار خانہ میں گئی۔ پرکاش بیٹھا ایک اپنی تصویر کے رنگوں پر برش پھیر رہا تھا۔ اُس نے اِس انداز میں جیسے پرکاش سے ابھی ابھی اس مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی دھیمی آواز میں کہا "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ بالکل ٹھیک کہتے ہیں.......... واقعی شہرت کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے....... اچھا میں آپ کو ایک تدبیر بتاتی ہوں بالکل اچھوتی۔ بالکل نئی۔ دو ہی دن میں سارے بنارس میں آپ کا نام نہ نکل جائے تو میرا ذمہ۔"

پرکاش چندر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لاجونتی پھر بولی "آپ بہت عمدہ پیراک ہیں۔ طالب علمی کے زمانہ میں پیراکی کے بہت سے انعام جیت چکے ہیں...... کیوں ٹھیک ہے نا؟

اتنا کہہ کر وہ رک گئی۔ پرکاش حیرت میں تھا کہ لاجونتی کے اس فقرے کا ان کی موجودہ حالت سے کیا تعلق ہے۔ وہ جھنجھلا رہا تھا کہ لاجونتی ایک ہی سانس میں سب کچھ کیوں نہیں کہہ ڈالتی پہیلیاں کیوں بجھا رہی ہے۔ بالآخر کوئی آدھ منٹ پرکاش کو شدید انتظار میں رکھنے کے بعد لاجونتی نے زوردار لہجے میں کہا

"اچھا تو آپ کو گنگا میں ڈوبنا پڑے گا۔"

پرکاش اچھل پڑا "ڈوبنا پڑے گا!" اُس نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"ہاں ڈوبنا پڑے گا...... یا دوسرے لفظوں میں آپ کو ڈوبتے ہوئے بچایا جائے گا۔ سمجھے آپ؟"

"ہنہ! کیسی مہمل باتیں کرتی ہو۔ اچھا تو پھر اس سے فائدہ؟"

"فائدہ! فائدہ یہ ہوگا کہ دوسرے ہی دن تمام اخباروں میں یہ خبر تیزی کے ساتھ شائع ہو جائے گی۔ ایک اخبار سے دوسرے اخبار میں نقل ہوگی سینکڑوں لوگ حادثہ کے صحیح حالات معلوم کرنے آپ کے پاس دوڑے آئیں گے ہر طرف آپ کا چرچا ہوگا۔ اس طرح سارے شہر میں بلکہ دور دور تک آپ کا نام مشہور ہو جائے گا۔"

"یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا" پرکاش نے فیصلہ کن انداز میں ناگواری کا منہ بنا کر کہا۔

"پران ناتھ! میری خاطر آپ کو یہ بات کرنا پڑے گی........ کتنی اچھوتی تدبیر ہے۔ ذرا سوچئے تو یہ تیر کبھی خطا نہیں کر سکتا........ آپ سب لوگوں کی نظریں بچا کر اک دم دریا میں کود پڑیئے گا۔ پھر میں شور مچانے لگوں گی۔ ہر طرف سے لوگ دوڑ پڑیں گے۔ کوئی نہ کوئی تو آپ کو نکالنے کے لئے پانی میں پھاند ہی پڑے گا۔......"

"اور فرض کرو کسی نے مجھے بچانے کی ہمت نہ کی تو؟"

"واہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ دریا پر سینکڑوں آدمی نہانے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ بہت اچھا تیرتے ہیں۔

اس لئے کسی بات کا ڈر نہیں۔ پھر جب آپ کو کنارے لگایا جائے گا تو اخباروں کے نامہ نگار چاروں طرف سے جھپٹ پڑیں گے۔ رپورٹ لینے میں ہر رپورٹر دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرے گا۔۔۔۔۔۔۔۔ ان سے میں سمجھ لوں گی۔ دیکھئے کیسا کام نکالتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ دوسرے ہی روز تمام اخباروں میں سنسنی پیدا کر دینے والی موٹی موٹی سرخیاں شائع ہونگی۔

"دریائے گنگا سے ایک ڈوبتے ہوئے مصوّر کی جان بچائی گئی"

"مصوّر کی نوعمر بیوی کا بیان"

بڑا لطف آئے گا۔ یہ آخری جُوا بھی کھیل دیکھئے۔ آگے میری اور آپ کی قسمت"

پرکاش فکر میں پڑ گیا۔ اُس نے خیال کیا اخلاقی حیثیت سے یہ چال ایک چھچھوری سی بات معلوم ہوتی ہے۔ شہرت کے کارن اتنا بڑا فریب! مجھ سے تو دریا میں نہ کودا جائے گا۔ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ زندگی ہے تو کبھی نہ کبھی پرمیشر کی مہربانی ہو ہی جائے گی۔

لاجونتی پہلے تو تھوڑی دیر تک غور سے پرکاش کا چہرہ دیکھتی رہی۔ شاید قیافہ سے دل کا حال معلوم کرنا چاہتی ہو۔ پھر بیتاب ہوکر بولی "تو پھر کیا کہتے ہیں۔ میری خاطر آپ کو یہ ترکیب منظور ہے نا"

پرکاش اک دم اپنے انکار سے لاجونتی کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اب تک وہ خود تذبذب کے الجھاؤ میں الجھا ہوا تھا۔ اُس نے چبا چبا کر جواب دیا۔

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔۔۔۔۔۔۔۔ تم نے مجھے سخت الجھن میں ڈال دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ کل اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دوں گا"

وہ تمام دن لاجونتی کی تجویز پر غور کرتا رہا۔ رات کو سونے لیٹا تو بستر پر دیر تک کروٹیں بدلا کیا۔ عجب پس و پیش کی حالت میں مبتلا تھا۔ کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ پھر ٹھنڈا پانی پیتا۔ پھر ٹہلنے لگتا۔ اسی ادھیڑ بن میں بارہ بج گئے لاجونتی کا یہ معمول تھا کہ گھر کے کام کاج سے تھک کر پڑتی تو صبح کی خبر لاتی۔ اس غریب کو کیا خبر کہ اُس کا مجازی خدا اس وقت غور و فکر کے کیسے شدید کرب میں مبتلا ہے ــــــــــــ

آخر سوچتے سوچتے پرکاش اس فیصلہ پر پہنچا کہ وہ لاجونتی کی بات نہیں ٹالے گا۔ اس فیصلہ پر پہنچنے کے لئے اُس نے جو تاویلیں قائم کیں اُن میں سب سے پہلا مسئلہ جذبات کا تھا۔ وہ لاجونتی سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اسے بری طرح چاہتا تھا۔ اس لئے اُس کا کہنا ٹال کر اُس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے خیال

کیا اخلاقی نقطۂ نظر سے تو یہ بات اُس وقت معیوب ہوتی جب حکمت عملی کے اس داؤں سے کسی دوسرے شخص کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا۔ میں کوئی چوری نہیں کروں گا۔ ڈاکا نہیں ڈالوں گا۔ کسی کی جائداد پر ناجائز قبضہ نہیں کر بیٹھوں گا۔ دھوکے فریب سے کسی کا مال نہیں مارلوں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس یہی ناکہ ایک ذرا دیر کے لئے پانی میں گر کر اس طرح ہاتھ پیر چلانے لگوں گا جیسے کوئی ڈوب رہا ہو۔ شہرت حاصل کرنے کے لئے لوگ کیسی کیسی گھناونی چالیں چلتے ہیں۔ کیسی کیسی قابلِ نفرت دغابازیاں کرتے ہیں! پھر ان مکاریوں کے مقابلہ میں تو یہ سیدھی سادی تدبیر کچھ بھی نہیں ایک بے ضرر جرأت ہے جس کے بھلے بُرے نتائج سے سوا میرے کوئی دوسرا متاثر نہیں ہو سکتا ۔۔۔۔۔۔ یہ سوچتے سوچتے پرکاش کو دریا میں کودنے اور بچائے جانے کی پُرخطر لذت کا تصور بندھ گیا اور وہ دل ہی دل میں اس خوفناک، جرأت آزما مہم کے خیالی مزے لینے لگا جو اُسے عنقریب شہرت کے سنہرے پروں پر بٹھا کر لے اُڑے گی۔ وہ ایک جری نوجوان تھا۔ ہمیشہ سے ایسے کھیلوں کا شیدائی جن میں جان جوکھم کا ڈر ہو۔ اس وقت اس کی جوانمردی کی آزمائش تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ لاجونتی کو دکھا دے گا کہ وہ تنہا ایک ہونہار مصور ہی نہیں بلکہ ایک جانباز بہادر بھی ہے۔

لاجونتی ہلکے رنگ کی ایک نیلی ساری پہنے ہوئے تھی۔ پرکاش نے اس موقعے کے لئے بادامی رنگ کا بند کالر کا کوٹ اور نسنگ مہری کا پاجامہ منتخب کیا تھا تاکہ پانی کے اندر اُسے آزادی سے اِدھر اُدھر ٹانگیں چلانے کا موقع ملے۔ آنے والی مہم کے خیال سے لاجونتی کا رنگ کسی قدر زرد پڑ گیا تھا۔ پرکاش کے چہرے پر بھی کچھ کچھ بدحواسی کے آثار نمایاں تھے۔ پل کے اوپر سے کاروباری مصروف لوگ اِدھر سے اُدھر آجا رہے تھے۔ کسی نے اُس نوعمر جوڑے کی طرف توجہ بھی نہیں کی جو پل کے کنارے سمٹا سمٹایا بچوں کی طرح سہما ہوا کھڑا تھا۔ پرکاش نے پل کی بلندیوں پر سے نیچے پانی کو جھانکتے ہوئے کہا "بڑی لمبی جست ہے۔ ہوگی کوئی چالیس فٹ کے قریب۔"

پھر اس خیال سے کہ کہیں اس کی بیوی یہ نہ سمجھے کہ کودنے سے ہچکچا رہا ہے اس نے ذرا اکڑ کر کہا "مگر میں تو اس سے کہیں زیادہ اونچے اونچے مقاموں سے کود چکا ہوں۔ بھلا اس کی میرے سامنے کیا حقیقت!"

پل کے نیچے گھاٹ پر بیسیوں لوگ تھوڑی دور کے فاصلہ پر نہا رہے تھے۔ کوئی غوطہ لگا رہا تھا۔ کوئی دھوتی چھانٹ رہا تھا۔ بعض جٹا دھاری سادھو جن کے جسم پر بھبھوت ملا ہوا تھا دریا کے کنارے ریت پر آسن جمائے، آنکھیں بند کئے سورج دیوتا کی پوجا میں مشغول تھے۔

یکایک پانی میں کسی نہایت وزنی چیز کے جھم سے گرنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی پل پر سے ایک چیخ

کے ساتھ "دوڑو لوگو دوڑو! ارے میرے سوامی .... ہائے ہائے! ...." کی دلدوز صدائیں بلند ہونے لگیں۔

لاجونتی کی چیخ بالکل اصلی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی مدد جو اسی میں بناوٹ کا ذرہ برابر پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ پل کی برجی سے ایک دیوانی عورت کے مانند اس طرح چمٹی ہوئی تھی جیسے وہ عنقریب غش کھا کر پانی میں گر جائے گی۔ وہ مدد کے لئے چیخوں پر چیخیں مار رہی تھی۔ گو اب ان چیخوں کی بظاہر کوئی خاص ضرورت نہ تھی اس لئے کہ پرکاش کے گرنے کی آواز سنتے ہی چاروں طرف سے لوگ جھپٹ پڑے تھے اور لاجونتی کو ایک خاصے مجمع نے گھیر رکھا تھا۔ پل کے اوپر یہ مجمع لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جاتا تھا اور نیچے پانی میں پرکاش نہایت کامیابی کے ساتھ ایک ڈوبتے ہوئے انسان کی پوری پوری نقل اتار رہا تھا۔

لاجونتی نے کنکھیوں سے اس مجمع پر نظر ڈالی۔ یہ محسوس کر کے اس کا دل بیٹھنے لگا کہ اس عظیم الشان بھیڑ میں بہت کم ایسے لوگ تھے جو پرکاش کے ڈوبنے کو کوئی غیر معمولی واقعہ تصوّر کرتے ہوں۔ لوگوں کی زیادہ تر توجہ خود لاجونتی کی طرف تھی جو اس وقت مصنوعی سراسیمگی و پریشانی کے عالم میں بالکل کوہ قاف کی پری معلوم ہوتی تھی۔ ایک موٹی تازی ادھیڑ عمر کی مسلمان عورت لاجونتی کے پیچھے اس سے بالکل بھڑی ہوئی کھڑی تھی اور انتہائی سنجیدگی کے ساتھ سر ہلا ہلا کر کہہ رہی تھی

"ہا! بے چارے کے دن پورے ہو گئے تھے .... اللہ کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے!"

جو اکّا دکّا لوگ پرکاش کی طرف متوجہ بھی تھے ان کی دلچسپی کی ساری تگ و دو اس کوشش پر ختم ہو جاتی تھی کہ مجمع کے دوسرے لوگوں کو کہنیاں مار مار کر اپنے لئے ایسی جگہ حاصل کر لیں جہاں سے پرکاش کے ڈوبنے کا تماشا زیادہ اچھی طرح نظر آسکے۔ لیکن کوئی اللہ کا بندہ اُسے بچانے کے خیال سے اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔

لاجونتی کا دل دھڑکنے لگا "اگر پرکاش تیرنا نہ جانتا ہوتا تو غضب ہی ہو گیا تھا" اس نے خیال کیا اور پھر اک دم بپھر کر مجمع کی طرف پلٹ پڑی

"کیا اس بھرے مجمع میں کوئی مرد نہیں ہے؟ کیا کسی میں اتنی ہمّت نہیں ہے کہ ایک ڈوبتے ہوئے بھائی کو بچا لے؟"

ادھیڑ عمر کی موٹی تازی عورت پھر بول اٹھی "ان لوگوں سے کہنا بے کار ہے .... آج کل کے مرد عورتوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں ——— خدا کی مار ایسی مردانگی پر! اگر میں مرد ہوتی تو ...."

اُس کی احمقانہ بڑبڑاہٹ پر مجمع میں سے کسی بے فکرے نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور عورت کا فقرہ قہقہہ کی آوازمیں گم ہوکر نا تمام رہ گیا۔ اس پر دوسرے بے فکرے بھی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ تمام مجمع میں ہنسی دل لگی کی ایسی لہر دوڑ گئی جیسے ڈوبنے کے واقعہ کو سب نے یکلخت بھلا دیا ہو۔ لاجونتی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ تصنع اور بناوٹ کے آنسو نہ تھے۔ اپنی اسکیم کو ناکام ہوتے دیکھ کر اس وقت سچ مچ اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

یکایک مجمع میں کسی طرف سے ایک بلند، تحکمانہ آواز سنائی دی اور پلک جھپکاتے ایک لمبا تڑنگا نوجوان بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا آگے بڑھ آیا۔ ٹھیک جس وقت پرکاش پانی کے اندر سے بظاہر نیم غشی کی حالت میں اوپر ابھر رہا تھا اُس نے پھرتی سے اپنی ٹوپی اور کوٹ اتار کر ایک طرف دے مارا اور لوگوں کے دیکھتے دیکھتے برج پر سے جست لگا کر دریا میں کود پڑا۔

یہ تمام واقعہ اس سرعت سے ختم ہوگیا کہ لاجونتی کو اجنبی کا چہرہ بھی اچھی طرح دیکھنے کا موقع نہ ملا لیکن ایک اچٹتی ہوئی سرسری نگاہ سے اُس نے یہ اندازہ لگالیا کہ اس کے چہرے پر رئیسانہ جلال و شکوہ کی چمک ہے اور بحیثیت مجموعی وہ ایک خوبصورت نوجوان ہے۔

دخل در معقولات کرنے والی موٹی تازی بڑھیا نے پھر کچھ کہنا شروع ہی کیا تھا کہ ایک مرتبہ اور اس کی آواز مجمع کے ستائشی شور وغل میں کھوگئی۔ اجنبی نے پرکاش کے ڈوبتے ہوئے جسم کو دونوں ہاتھوں کے سہارے پانی کی سطح پر کرلیا تھا اور کنارے کی طرف آہستہ آہستہ تیرتا ہوا آرہا تھا۔

اجنبی اور پرکاش کے کنارے تک پہنچتے پہنچتے سارا مجمع پل پر سے چھٹ کر رفتہ رفتہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا لاجونتی بھی اسی مجمع کے اندر تھی۔

پرکاش کے تمام کپڑے بھیگ کر اُس کے جسم سے چمٹ گئے تھے وہ اس طرح آنکھیں بند کئے نڈھال ہورہا تھا گویا غرقابی کے حادثہ نے اُس کے ہوش و حواس کو زائل کردیا ہے۔ یا تو سب لوگ تھوڑی دیر پہلے، ہاتھ پر ہاتھ دھرے پرکاش کے ڈوبنے کا تماشا دیکھ رہے تھے یا اُس کے کنارے آتے ہی ہمدرد و مددگاروں نے ہر طرف سے اس پر یورش بول دی۔ کسی نے اُس کے پیروں سے موزے اور جوتے علیحدہ کئے۔ کسی نے کوٹ اتار کر الگ پھینک دیا۔ ایک شخص نے جو صورت سے کسی میڈیکل کالج کا طالب علم معلوم ہوتا تھا جھک کر اُس کی کلائی ہاتھ میں لے لی اور نبض دیکھنے لگا۔ جو لوگ کچھ نہیں کر رہے تھے وہ ایک دوسرے کو دھکے دے دے کر اس مقام پر پلے پڑتے تھے جہاں لاکر پرکاش کو ریت پر لٹا دیا گیا تھا۔

لاجونتی کو آگے بڑھنے کی کوشش کرتے دیکھ کر اجنبی نے اپنی ایک مردانہ ڈانٹ سے لوگوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ لاجونتی بھاری قدموں سے آگے بڑھی۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ دل دھک دھک کر رہا تھا لیکن پرکاش کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی اُسے اطمینان ہوگیا۔ سب معاملہ کیل کانٹے سے درست تھا۔ اُس کی انوکھی سکیم اپنی تمام تفصیلی جزویات کے ساتھ کامیابی سے نزدیک ہوتی جاتی تھی۔

اب لاجونتی کو ایک دوسری فکر لاحق ہوگئی۔ اس نے مجمع پر جستجو کی نظریں ڈالنا شروع کیں۔ اُس کی آنکھیں اخبار کے نامہ نگاروں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ انسانی بھیڑوں کے اس عظیم الشان گلّے میں جو سر سے سر ملائے، ایک ہی مرکز پر نگاہیں گاڑے تھا ایک متنفس بھی اپنی شکل و صورت وضع وقطع کے لحاظ سے اخبار کا رپورٹر نہیں معلوم ہوتا تھا ایک مرتبہ پھر لاجونتی کا دل بیٹھنے لگا۔ اُس کی تمام کی کرائی محنت بالکل برباد ہوئی جارہی تھی۔ وہ بھی اُس وقت جب بظاہر منزلِ مقصود دور نہ تھی۔

اتنے میں مجمع کے کنارے سے دو شخص آگے بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ جسم پر سفید بے داغ سوٹ۔ سروں پر دھوپ سے بچانے والی انگریزی ٹوپیاں۔ ہاتھوں میں لکھنے پڑھنے کا سامان رکھنے والے چھوٹے چھوٹے چمڑے کے بکس۔ دونوں ایک ہی قسم کا لباس پہنے ہوئے تھے اور بالکل بھائی بھائی معلوم ہوتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک کی عمر زیادہ تھی دوسرے کی کم۔

لاجونتی نے دیکھا ان لوگوں کی انگلیوں میں پنسل اور نوٹ بک بھی دبی ہوئی ہے۔ اکدم اُس کے چہرے پر اطمینان و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ ان میں سے ایک رپورٹر نے جو دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ معمر اور تجربہ کار تھا نوٹ بک اور پنسل جیب میں ڈالتے ہوئے اپنے ساتھی سے منہ بنا کر کہا

"اُنہہ۔ چلو کہیں اَور چلیں۔ بے کار وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ .... ایسے ایسے واقعات تو روز ہوتے رہتے ہیں"

ناتجربہ کار اور نوعمر رپورٹر کا چہرہ سراپا استفسار بن گیا۔ بولا "معاملہ کیا ہے؟ آئیے! آئیے پوچھ تو لیں"

"معاملہ وا ملہ کچھ بھی نہیں۔ وہی پرانی داستان ہوگی .... مایوسی .... زندگی سے بیزاری .... پھر خودکشی کی ناکام کوشش۔ اس طرح کے حادثے تو شہر میں سینکڑوں ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی کہاں تک ذرا ذرا سی باتوں کی رپورٹ لیتا پھرے۔"

اتنا کہہ کر دونوں پلٹنے ہی والے تھے کہ ان کی نگاہیں اکدم پرکاش کی جان بچانے والے نوجوان اجنبی کے

چہرے سے دوچار ہوئیں جو پرکاش پر جھکا ہوا اُس کے دُبلے تپلے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبائے انہیں گرم کر رہا تھا۔

"آہا! مسٹر اندرپال۔ آپ یہاں کہاں ہیں؟ ...... آداب عرض ہے" معمر رپورٹر نے انتہائی مسرت کے عالم میں بے اختیار ہو کر کہا۔ پھر اُس کا ہاتھ جلدی جلدی کوٹ کی جیب میں نوٹ بک اور پنسل تلاش کرنے لگا۔

"اخاہ۔ مسٹر چیٹرجی" مسٹر اندرپال بولے ..... "خوب اتفاقیہ ملاقات ہوئی۔ واقعی آپ لوگ بھی کمال کرتے ہیں! خبروں کی تلاش میں دنیا کا کوئی کونا آپ سے چھوٹ تھوڑی سکتا ہے"۔

دونوں رپورٹروں نے مسٹر اندرپال کے بھیگے ہوئے کپڑوں اور اُلجھے ہوئے بالوں کو دیکھتے ہی ایک ہی نظر میں سب کچھ بھانپ لیا تھا اور اب یہی لوگ جن کے نزدیک ایک منٹ پیشتر اسی واقعہ میں کوئی قابلِ ذکر اہم بات نہ تھی۔ مشین کی تیزی کے ساتھ اپنی اپنی کاپیوں کو رپورٹ کی عبارت سے سیاہ بنانے میں مصروف تھے کبھی کبھی مسٹر اندرپال سے کوئی مختصر سوال بھی پوچھ لیتے۔ مگر پرکاش کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ دونوں میں سے کسی نے اس کا نام تک نہ پوچھا۔

لاجونتی کا غصّہ کے مارے عجب حال تھا۔ جی چاہتا تھا ان ظاہر پرست، دنیا ساز کمینے رپورٹروں کی بوٹیاں نوچ ڈالے "مانا کہ مسٹر اندرپال کوئی بڑے آدمی ہیں۔ بے شک انہوں نے ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کی جان بچائی ہے لیکن یہ کیا اندھیر ہے کہ اتنے مجمع میں کوئی مسخرہ اس آفت کے مارے بدنصیب کا نام بھی نہیں پوچھتا جس کی بدولت مسٹر اندرپال کو جوانمردی کی نمائش کا موقع ملا .... اب یہ زر کے بندے خوشامدی رپورٹر اس واقعہ پر حاشیہ چڑھا چڑھا کر ملک بھر میں مسٹر اندرپال کی بہادری کے ڈھول پیٹیں گے۔ حالانکہ وہ تو خود پہلے سے مشہور ہیں۔ کوئی ان احمقوں سے پوچھے اُس شخص کے اوپر شہرت پر شہرت کیوں لادتے چلے جا رہے ہو جسے اس چیز کی ضرورت نہیں۔ .... مگر ان لوگوں کی کیا خطا؟ شہرت تو خود ایک جفا پرست بے رحم دیوی ہے۔ جو شخص ہاتھ پھیلا کر، گھٹنے ٹیک کر اس کی پُوجا کے لئے آگے بڑھتا ہے اس کا سر ٹھکرا دیتی ہے۔ جو منہ بنا کر خود اس کی طرف سے گردن موڑ لیتا ہے اس کا دامن پکڑے پیچھے پیچھے بھاگتی چلی جاتی ہے .... اندھی دنیا اور اس سے زیادہ اندھا قانونِ قدرت!" لاجونتی دل ہی دل میں یہ باتیں کر رہی تھی اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے اس کا سر چکرایا جاتا تھا۔ اردگرد کا تمام مجمع اُسے دھندلا نظر آ رہا تھا اور آدمیوں کا شور و غل اس کے کانوں میں اس طرح پہنچ رہا تھا جیسے شہد کی مکھیاں کہیں دور بھنبھنا رہی ہوں۔ اس کے بعد پرکاش کو جو مصنوعی غشی کے دورے سے صحت یاب ہو چکا تھا تانگے پر بٹھا کر گھر تک لانے کا واقعہ لاجونتی کو بالکل خواب کی طرح معلوم ہوا .... قسمت کے جوئے خانے میں اس کا یہ آخری داؤں بھی خالی گیا۔

اس واقعہ کے دوسرے روز ٹھیک جس وقت پرکاش اپنے میلے کچیلے تنگ و تاریک مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ دہلی جانے کے لئے اسباب درست کر رہا تھا اسی شہر کے ایک دوسرے کونے میں کسی شاندار ہوٹل کے آراستہ پیراستہ کمرے کے اندر مسٹر اندرپال اپنی چہیتی بیوی کے نام اپنے خط کے آخری فقروں کو پورا کر رہے تھے۔

"......... جہاں چاہتا تھا چلا جاتا تھا جس قسم کے لباس کو دل چاہتا تھا پہنتا تھا۔ اسکول کے بچوں کی سی آزادی حاصل تھی .... نہ ملاقاتیوں کا ہجوم نہ کانفرنس کی صدارتیں۔ نہ ڈنر پارٹیاں۔ بنارس میں ایک متنفس کو بھی میرے موجود ہونے کی خبر نہ تھی۔ سب سے بڑا امن یہ تھا کہ اخبار کے رپورٹروں کی داروگیر سے بالکل محفوظ تھا .... کل اس واقعہ نے سارا لطف کرکرا کر دیا۔ خیال تھا ایک آدھ ہفتے چین سے آزادوں کی طرح گھومتا پھروں گا۔ مگر اب وہ بات کہاں نصیب! کل صبح سے بری طرح گھرا ہوا ہوں۔ ملاقاتیوں کا یہ عالم ہے کہ دم مارنے کی فرصت نہیں۔ پھر رپورٹروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ بڑی مشکل سے تمہیں دو چار سطریں لکھنے کا وقت نکال رہا ہوں ...."

ذوقی

محبت جو خدا کا جوہر ہے فضول مصرف کے لئے نہیں بلکہ اُسے تو انسان کی ساری قدر و قیمت کا تقاضا ہے!

تن تنہا ہر شخص صادق ہے۔ ریاکاری کسی دوسرے کے آتے ہی داخل ہوتی ہے!

جب تم ختم کر چکتے ہو جو کچھ بھی کاروبار میں سیاست میں عیش و عشرت میں اور محبت وغیرہ میں ہے جب تم دیکھ چکتے ہو کہ ان میں سے آخر کار تسکین کسی سے نہیں ہوتی کوئی نہیں ان میں جو پائیدار ہو تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے؟ بس اک فطرت باقی رہتی ہے کہ انسانی دل کے تاریک کونوں میں سے اُس میلان و کشش کو آشکار کرے جو مرد یا عورت کو کھلی ہوا سے درختوں کھیتوں سے اور موسم کی تبدیلیوں سے ہے ـــــــ دن کو یہ چمکتا ہوا سورج اور رات کو وہ جھلمل جھلمل کرتے تارے!

گلچیں

تاثرات

بڑا مزا ہو جو یہ وقتِ خوش گوار آئے
کہ تُو بھی آئے مرے گھر میں جب بہار آئے

~~جو دردِ قابلِ درماں نہیں تو موت ہی دے~~
کسی طرح تو الٰہی مجھے قرار آئے

ہم اس کو عینِ عبادت کہیں محبّت میں
کسی کا نام جو ہونٹوں پہ بار بار آئے

محبّت اُس کی حقیقت میں ایک دھوکا ہے
جسے نہ راس محبّت میں انتظار آئے

تصوّرات سے یُوں وسعتِ نظر بڑھ جائے
جدھر نگاہ اُٹھاؤں خیالِ یار آئے

اگر نہ حیلہ پسندی ہو تیری فطرت میں
تو پھر نہ کیوں ترے وعدوں پہ اعتبار آئے

صلہ عجیب ملا دل کو نذر کرنے کا
امیدوار گئے اور سوگوار آئے

نشاط کوشیٔ دنیا نہ غم سے پھر بدلے
ظفر جو ہستیٔ فانی پہ اعتبار آئے

نذیر احمد ظفر

محفلِ ادب

قدیم ہندوستان اور مصوّری

روایاتِ قدیم کے مطابق فنِ تصویر کی ایجاد بھی دیگر علوم و فنونِ لطیفہ کی طرح اہلِ ہند کی دماغی کاوشوں کی شرمندۂ احسان ہے۔ لیکن اس بارے میں ہنوز کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہند میں مصوّری کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی۔ تاہم قدما کی یادگاریں جس حد تک ہماری رہنمائی کرتی ہیں متجسس نگاہوں کو فی الحال اُسی پر اکتفا کرنا پڑے گا۔

عموماً ہر فن و ہر صنعت کو ایک طاقتِ اولین سے منسوب کیا جاتا ہے۔ سنسکرت ادب کی ایک دلچسپ روایت سے مصوّری کی ابتدائی تاریخ بہت کچھ روشنی میں آ جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی راجہ کے دورِ حکومت میں خلافِ معمول کسی برہمن کے لختِ جگر نے اپنے پا بہ رکاب پدر کو داغِ مفارقت دے کر داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ راجہ نے اس منحوس واقعہ سے ملول و متاثر ہو کر "قضا و قدر" کی بے حد منّت سماجت کی مگر اس صاحبِ تاج کی بے لوث معروضات پر کوئی التفات نہ ہوئی آخر کار خالقِ علوم و فنون "برہما" نے عقیدت کیش راجہ کی حالتِ زار پر ترس کھا کر برہمن زادے کو حیاتِ ثانی عطا کرنے کا اقرار کیا، چنانچہ مرحوم کا مرقع تیار کرایا گیا اور اسی مرقع میں قادر و قیوم نے روحِ زندگی پھونک دی۔

ممکن ہے کہ یہ کہانی شاعرانہ نازک خیالی سے زیادہ وقیع نہ ہو۔ لیکن جزو اس کی تکوین بھی ایک عالمگیر مذہبی جذبہ مضمر ہے جس کی پاکیزگی کی آغوشِ تربیت میں پرورش پا کر یہ فنِ لطیف سنِّ بلوغ کو پہنچا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عرصۂ دراز تک ڈراما کی طرح فنِ تصویر بھی مذہبی اصول و عقائد کی تبلیغ و اشاعت کا ایک کارآمد و موثر ذریعہ بنا رہا۔ سنسکرت اور بعض دیگر ملکی زبانوں کے علم و ادب کے مطالعہ سے اِس خیال کی صحت پورے طور پر ثابت ہوتی ہے۔

ایسی تحریریں تو بکثرت دستیاب ہوتی ہیں جن سے اس فن کی قدامت قابلِ وثوق طریقے سے ثابت ہوتی ہے لیکن اُس مافوق الفطرت شخصیت کا نامِ نامی اب کسی کو یاد نہیں جو نہانخانۂ ازل سے روح کا پیامبر بن کر آیا اور جس نے اُس کے لطیف پیغامات کو مادی صُورت دے کر نہ صرف رنگینیوں اور دلفریبیوں کے سامان فراہم کئے بلکہ دنیا پر تخلیقِ عالم کا منشا واضح کیا۔

ہندوؤں کی مشہور کتاب مہابھارت جو حضرتِ مسیح کی ولادت سے صدہا برس پیشتر تصنیف ہوئی اس حقیقت کی

کاشف وضامن ہے کہ صنفِ نازک کے بلند پرواز تخیل کی رنگینیوں کو اول اول ایک دوشیزۂ پری جمال نے رنگ و روغن سے صفحۂ قرطاس پر نمایاں کر کے حسنِ صورت عطا کیا، عالمِ ایجاد میں جنسِ لطیف کی نازک خیالیاں وہ رنگ لائیں جو سنگ دل زمانہ کی لوحِ دل پر آج تک ثبت ہیں۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ شہزادی اوشا نے عالمِ خواب میں ایک جوانِ رعنا کو دیکھا اور اس پر فریفتہ ہو کر اُسے اپنا رفیقِ حیات بنانے کے انتہائی اشتیاق میں مبتلا ہو گئی۔ اس کی سہیلی چترلیکھا نے شہزادی کی دلجوئی اور اس کی دماغی پریشانی رفع کرنے کے لئے قوتِ متخیلہ کی مدد سے سارے دیوتاؤں اور اپنے زمانہ کے تمام مقتدر راجاؤں اور شہزادوں کے چربے اتار کر اُس کی خدمت میں پیش کئے تاکہ شہزادی اپنے منظورِ نظر کو بآسانی منتخب کر سکے۔ چنانچہ خواب میں جلوے دکھا کر نیند اڑانے والے انرودھ کی شبیہِ جمیل پر نگاہیں چار ہوتے ہی اوشا نے اپنے دل کا چور معلوم کر لیا۔ (دوار کا لیلا)

عہدِ قدیم کا تمام ادبی سرمایہ شاہد ہے کہ ہندی مصوّر اپنے مذہبی عقاید کو انواع و اقسام کے رنگوں میں اس کمال و خوبی کے ساتھ عیاں کرتے تھے کہ چشمِ بصیرت اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ تبت کے ایک معروف مقام یانتسی میں پرانے زمانہ میں دیواروں پر جو تصاویر منقوش تھیں اُن میں سے ایک اُس تصویر کی نقل بتائی جاتی ہے جو کسی بدھ مصوّر نے بغرضِ تبلیغ چین کے کسی فرماں روا کی خدمت میں بطورِ پیشکش ارسال کی تھی۔ تصویر اس درجہ موثر تھی کہ فرماں روا موصوف بلاتردد بدھ مذہب پر ایمان لے آیا۔

وسطِ ہند کے پہاڑی سلسلۂ کیمور کے کوہساروں کی خاک چھاننے کے بعد بعض سرگرم محققین نے چند ایسی شہادتیں حاصل کی ہیں جو زبانِ حال سے پکار رہی ہیں کہ زمانۂ قبل از تاریخ میں ہندوستان میں چاہے اور کچھ بھی نہ ہو لیکن فنِ تصویر کا سکّہ ضرور رواں تھا۔ پتھر کے زمانے کے لوگوں کی مصوّری کے عجیب و غریب نمونے اب بھی بندھیاچل کے کہنہ و پُر اسرار غاروں میں محفوظ ہیں۔

بندھیاچل کے کوہستانی علاقہ کے قرب و جوار میں کانچ اور شیشہ کی کچھ ایسی پیالیاں پائی گئی ہیں جن میں غالباً گیر اور دیگر مروجہ رنگ حل کئے گئے ہیں۔ زمانہ نے وہ علامتیں مٹا دینے کی ہزار کوشش کی مگر پھر بھی کچھ نشانات باقی رہ ہی گئے۔ اس کا ثبوت کہ ہندوستانی اس عہد میں شیشہ اور کانچ کے ظروف بنانے کا ہنر جانتے تھے۔ رشان تپھ برہمن او سپانکچیہ کے ارتھ شاستر کے مطالعہ سے ملتا ہے۔

صوبۂ متوسط کی معروف ریاست رائے گڈھ میں سنگھان پور ایک چھوٹا سا موضع ہے جسے دریائے مند سیراب کرتا ہے۔ اس دریا کی سمتِ مشرق جو پہاڑیاں واقع ہیں ان کے غاروں کے دہانوں کی چٹانوں پر انسانوں اور حیوانوں کی

نہایت بھونڈی تصویریں ثبت ہیں۔ یہ تصویریں جس حالت میں اس وقت موجود ہیں وہ ان کی انتہائی قدامت کا پتہ دیتی ہیں اور اُس گزرے ہوئے وقت کا نقشہ ہمارے پیشِ نظر کرتی ہے جب کہ آلِ آدم وحشی و خونخوار درندوں پر گذارہ کرتی تھی۔

رام گڈھ کی پہاڑیوں کے جوگی مارا نامی غاروں اور مرزا پور کے پتھریلے مقاموں سے چند ایسے زریں کتبے برآمد ہوئے ہیں جن کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ان ایام میں بھی یہ صنعت ہندوستان میں رائج تھی۔ بدھ مذہب کے عروج سے قدیم فنِ تصویر نے جس قدر فروغ پایا اس کا آئینہ اجنٹا کے غار ہیں جو ایک جدا تبصرہ کے محتاج ہیں۔ سترھویں صدی کے تبتی مورخ تارا ناتھ بدھوں کی صنعت و حرفت کے اجمالی تذکرہ میں رقمطراز ہیں کہ تمام ہندوستانی علوم و فنون ایک مدتِ نامعلوم سے سینہ بسینہ چلے آتے ہیں" اُن کی صائب رائے میں مہاتما گوتم (بدھ) کی وفات (۴۸۰ ق م) سے بہت پہلے بھی ہندوستانی فنِ تصویر کے ماہر تھے۔

تاریخ میں مذکور ہے کہ اشوک (۲۵۰ ق م) اور ناگر جونا (۲۰۰ ق م) کے عہدِ حکومت میں بڑے بڑے باکمال و چابک دست بت ساز و سنگ تراش ہندوستان میں موجود تھے۔ بدھ مذہب کے آغاز سے پیشتر ہی فنِ تصویر اس درجہ مکمل ہو چکا تھا کہ اس کے "سدانگ" (چھ اجزا) باقاعدہ طور پر مرتب ہو چکے تھے اور ہر جزو کے متعلق متعدد اصول قائم ہو گئے تھے جن کی پابندی لازمی و ضروری تھی۔

"وتسیہ یانا" کی مشہور کتاب "کام سوتر" میں جو تیسری صدی عیسوی کی تصنیف ہے ان چھ اجزا کا ایک مفصل و مبسوط تبصرہ درج ہے۔ وہ چھ اجزا یہ تھے:۔

(۱) روپ بھید	خط و خال اور نقش و نگار کا علم
(۲) پرمانم	قد و قامت اور تناسبِ اعضا کی تمیز
(۳) بھاو	علم النفس و نیز ادا و انداز کی تشخیص
(۴) لاوینہ یوجنم	سطح کی دلکشی اور ادراکِ حسن کی جلوہ گری
(۵) سدرشیم	تمثیلات
(۶) ورنِک بھنگ	ترتیبِ خطوط و قواعدِ رنگ آمیزی

درحقیقت فنِ تصویر کو اس قدر مکمل بنا دیا گیا ہے کہ اب تلاش کرنے پر بھی کسی رخ سے کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کا اہلِ دانش کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ کوئی علم و کمال منزلِ ارتقا کی دشوار گذار راہیں اتنے قلیل عرصہ میں ہرگز طے نہیں کر سکتا جتنا کہ قیاس کیا جاتا رہا ہے۔ ان چھ جزوں کو اپنے روبرو رکھ کر قدیم ہندی مصوروں

کے کمالِ فن کا اندازہ لگائیے۔

جن کتبِ قدیمہ سے "کام سوتر" کی تالیف میں استفادہ حاصل کیا گیا اُن کی مختصر کیفیت درج ذیل ہے

وشنو پران — اس کے زمانہ کا تعین کرنا قطعی محال ہے۔

شکر نیتی — اس کا وجود کام سوتر سے پہلے یقینی ہے

مایا شاستر — ایضاً

پرتی بھالکشنم — "

چتر لکشن — جو بدھ کی پیدائش سے پیشتر کی روایات سے پُر ہے اور تناسبِ اعضا اور مذہبی رنگت میں مصوّری کے موضوع سے بحث کرتی ہے۔

سن ۶ء کے ایک شہرۂ آفاق چینی مصوّر ہسی ہو نے سب سے پہلے اپنی کتاب میں ان چھ اجزا کو بعینہٖ نقل کر دیا ہے جو ہندوستانی دماغ کی کدوکاوش کا نتیجہ ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ چین اور جاپان نے ہندوستان ہی سے اس فن کی تعلیم حاصل کی ہے حالانکہ چینی صنّاعوں اور جاپانی مصوّروں کی نقاشی ہی اس حقیقت کی پردہ دری کرتی ہے اور باریک بین نگاہیں بیک نظر تبدّلِ اسلوب سے اس کے راز چھین لیتی ہیں۔

"زمانہ"

غالب کی دو غزلیں

پروفیسر سید سجاد صاحب نے "مجلّۂ عثمانیہ" میں غالب کی ایک غیر معروف تصنیف "قادر نامہ" شائع کرائی ہے یہ نظم کی وہی صنف ہے جسے عام طور پر "آمد نامہ" کہتے ہیں اور جس میں الفاظ و مصادر کے معنی بیان کئے جاتے ہیں۔ بہ قول سید سجاد صاحب "غالب کی کوئی بات لطف سے خالی نہ تھی"۔ چنانچہ اس نظم میں لکھتے لکھتے ایک جگہ فرماتے ہیں:-

ہے قلم کا فارسی میں خامہ نام — ہے غزل کا فارسی میں چامہ نام

کس کو کہتے ہیں غزل ارشاد ہو — ہاں غزل پڑھئے سبق گر یاد ہو

غزل

صبح سے دیکھیں گے رستہ یار کا — جمعہ کے دن وعدہ ہے دیدار کا

وہ چُرا وے باغ میں میوہ جسے — پھاند جانا یاد ہو دیوار کا

پُل ہی پر سے پھیر لاتے ہم کو لوگ — ورنہ تھا اپنا ارادہ پار کا

شہر میں چھڑیوں کے میلے کی ہے بھیڑ — آج عالم اور ہے بازار کا

لال ڈگی پر کرے گا جاکے کیا — پُل پہ چہل ہے آج دن اتوار کا

گر نہ ڈر جاؤ تو دکھلاؤں تمہیں — کاٹ اپنی کاٹ کی تلوار کا

واہ بے لڑکے پڑھی اچھی غزل — شوق ابھی سے ہے تجھے اشعار کا

اس "اچھی غزل" کے بعد پھر الفاظ اور اُن کے معانی شروع ہوجاتے ہیں اور "قادر نامہ" کے اختتام پر پھر ایک غزل نظر آتی ہے:۔

شعر کے پڑھنے سے کچھ حاصل نہیں — مانتا لیکن ہمارا دل نہیں

علم ہی سے قدر ہے انسان کی — ہے وہی انسان جو جاہل نہیں

کیا کہیں کھائی ہے حافظ جی کی مار — آج ہنستے آپ جو کھل کھل نہیں

کس طرح پڑھتے ہو رک رک کر سبق — ایسے پڑھنے کا تو میں قائل نہیں

جس نے قادر نامہ سارا پڑھ لیا
اُس کو آمد نامہ کچھ مشکل نہیں

افسردگی

دن نے ٹھنڈی سانس لی خورشید اوجھل ہوگیا — رنگ اڑا، صحرا ہوا خاموش دریا سو گیا

نور سمٹا، تیرگی پھیلی، ہوائیں رک گئیں — پھول کملائے، چمن شرمائے، شاخیں جھک گئیں

رنگِ گل، شورِ چمن، جوشِ صبا کچھ بھی نہیں — ایک غم انگیز خلوت کے سوا کچھ بھی نہیں

اڑ گیا غازہ شفق کا، آسماں سنولا گیا — رفتہ رفتہ روئے عالم پر اندھیرا چھا گیا

اِس دھوئیں میں اپنی رنگیں روشنی کھوتے ہوئے
روحِ انسانی کو دیکھا میں نے گم ہوتے ہوئے

"معارف"

خزاں کی شام

دفعتاً میری سہیلی نے اپنی لمبی اور موم بتی کے شعلے کی سی باریک باریک انگلیاں ساز کے تاروں پر رکھ دیں۔

کہنے لگی "دیکھو! فطرت نے ہر ایک کی زندگی کے ساتھ ایک شغلِ حیات بھی پیدا کر دیا ہے! آہ دیکھو تو ساز کس طرح گیت کے لئے کیسے بے تاب اور تیار رہتے ہیں۔ ان کو اپنا ابدی مشغلہ یاد ہے۔

اور خزاں کا آفتاب کیسی تیزی سے اپنا سفر ختم کر رہا ہے۔

اور سردیوں کی صبح میں ننھی ندی کیسے زور زور کے گیت گایا کرتی ہے!

اور رات کی تنہائیوں میں الّو اجڑے درختوں اور ویران دیواروں پر کیسے دل خراش لہجے میں بولتا ہے!

ان سب کو اپنی زندگی کے مشاغل یاد ہیں!

دیکھو روح کی آنکھیں تاریکی میں بھی فرشتۂ موت کو پہچان لیتی ہیں!

آہ فطرت نے ہر ایک کو ایک کام تفویض کر دیا ہے۔ ایک مشغلہ دے دیا ہے! پر افسوس میں نہیں جانتی کہ میرا ابدی مشغلہ کیا ہے؟"

اُس نے ایک الم انگیز آہ کھینچی۔

ہر طرف موت کا سناٹا تھا۔ وہ خزاں کی ایک اداس اور پژمردہ شام تھی! موسم کے گرد و غبار کے پیچھے دُور افق میں خزاں کا آفتاب ڈوب رہا تھا۔ بُرے موسم نے بلبل کی مسکراہٹوں کو غائب کر دیا تھا۔

اور دنیا ہمیں ایک بے راگ کا باجا معلوم ہوتی تھی۔ یا ایک ایسا شعر جس میں نغمہ نہ ہو۔

زندگی ایک بے مزہ کہانی معلوم ہوتی تھی۔

یا ایک ایسا خواب جس کی تعبیر نہ ہو!

اس اداس شام، ہم اپنی زندگی کے مشغلے کو بھول گئی تھیں۔

روح کے نغمے کو فراموش کر چکی تھیں!

آہ وہ خزاں کی شام ——— جب کہ زندگی ہمیں ایک بے مقصد سفر معلوم ہوتی تھی۔

دفعتاً میں نے دریچے سے باہر دیکھا۔ باغ کی دیوار کے پاس ایک چھوٹا سا گلِ نیلوفر خزاں کی ہواؤں میں جھوم رہا تھا ——— اور زندگی کی سانسیں لے رہا تھا۔

مجھے کچھ یاد آگیا۔

میں نے سہیلی سے کہا "مگر ——— سہیلی! زندگی بسر کرنا خود ایک مشکل مشغلہ ہے!"

یہ سن کر میری سہیلی کا چہرہ خزاں کے آفتاب کی طرح جگمگانے لگا!

"تہذیبِ نسواں"

تبصرہ

اردو زبان اور ادب ۔ تقریباً تین سال ہوئے الٰہ آباد میں چند اہلِ علم و ذوق حضرات کی کوشش اور صوبۂ متحدہ کی سرپرستی سے ہندوستانی اکیڈیمی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اکیڈیمی کی کونسل کے پہلے اجلاس میں یہ طے پایا کہ تصنیف و تالیف کا کوئی کام شروع کرنے سے پہلے موجودہ اردو اور ہندی ادب کی پڑتال کی جائے تاکہ معلوم ہو کہ دونوں زبانوں کو کس صنف کی کتابوں کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی۔ "اردو زبان اور ادب" اسی کمیٹی کی رپورٹ ہے جسے سیّد ضامن علی صاحب صدرِ مجلس نے بڑی محنت اور قابلیت سے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کے تین حصّے ہیں۔ پہلا حصہ چار ابواب پر مشتمل ہے (۱) زبانِ اردو کی ابتدا، (۲) زبانِ اردو کی تدریجی ترقی، (۳) سلاطینِ مغلیہ کے زمانے میں زبان کی ترقی اور (۴) سلطنتِ برطانیہ کے زمانے میں اردو کی ترقی۔ انہیں ابواب میں ہر زمانے کی بعض تصانیف کا ذکر اور ابتدا سے لے کر اب تک ہر صدی کی زبان کے نمونے بھی دیئے ہیں + دوسرے حصّے میں اردو ادب کی ضروریات، زبان کی حفاظت و ترقی اور اکیڈیمی کے لائحۂ عمل کے متعلق تجاویز ہیں۔ اِن تجاویز کا ماحصل یہ ہے کہ ادب کے جن شعبوں میں تصنیف یا تالیف یا ترجمہ کی ضرورت ہے اُن کے لئے ایک دارالتالیف قائم کیا جائے اور ملک کے فاضلین و کاملین سے معاوضہ دے کے کتابیں لکھوائی جائیں۔ نظم و نثر پر تاریخی و تنقیدی کتابیں تیار کرائی جائیں اور مستند کتابوں کو تصحیح و تشریح کے بعد اور مصنّفین کے حالات اور ان کی تصانیف پر تبصرہ کر کے اچھی طباعت کے ساتھ شائع کیا جائے۔ جامع اور مکمل لغات اور ایک انسائیکلوپیڈیا کے طرز کی کتاب تیار کی جائے جو انگریزی انسائیکلوپیڈیا کا ترجمہ نہ ہو بلکہ ہندی انسائیکلوپیڈیا ہو۔ درسی کتابیں یا تو اکیڈیمی خود تیار کرے یا جو کتابیں دوسرے ناشرین کی نصاب کے لئے تیار ہوں اُن پر ایک مجلسِ احتساب قائم کرے تاکہ بری کتابیں نصاب میں داخل نہ ہو سکیں۔ وظائف و انعامات کا سلسلہ جاری کیا جائے۔ اکیڈیمی کی طرف سے ایک اچھا کتب خانہ اور ایک سالہ جاری کیا جائے۔ ایک شاہی مجلس بنائی جائے جو ہندوستان کے باکمال شعرا اور فضلا پر مشتمل ہو اور زبان کے متعلق تمام اختلافات اس مجلس میں پیش ہو کر طے ہوں۔ رپورٹ کے تیسرے حصے میں ابتدا سے لے کر اس وقت تک جو کتابیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں اُن کا انتخاب ہے جس سے اردو ادب کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔

گویا ہندوستانی اکیڈیمی نے ایک عظیم الشان کام اپنے ذمے لیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس سے شاندار نتائج ظہور پذیر ہونگے۔

کامیاب زندگی ۔ اگرچہ ہندوستان کے اردو لٹریچر کا حلقہ روز بروز زیادہ وسیع ہو رہا ہے اور نئی کتابوں کے مصنف یا مترجم اردو دان پبلک کی علمی معلومات میں ایک قابلِ قدر اضافہ کر رہے ہیں۔ لیکن ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ملک میں ایسی کتابوں کی تعداد بہت قلیل ہے جو اقتصادی نقطۂ خیال سے پڑھنے والوں کی زندگی میں ایک نمایاں تغیر پیدا کرنے کی طاقت رکھتی ہوں۔ ہندوستان کا افلاس ضرب المثل ہوگیا ہے اور اس لئے وطن کی حقیقی خدمت اس امر کی متقاضی ہے کہ فرزندانِ ہند کی اُن مشکلات کے ازالہ کے لئے عملی تدابیر اختیار کی جائیں جن کی وجہ سے ان کی زندگی ناکامی کا ایک زندہ مرقع نظر آتی ہے۔

اس لحاظ سے ہم چودھری غلام حیدر خاں صاحب سابق مدیر صداقت کلکتہ کی جدید کتاب "کامیاب زندگی" کا خیر مقدم کرتے ہیں جو دراصل امریکہ کے ایک مشہور ماہرِ اقتصادیات کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اور جسے بجا طور پر اس کی زندگی بھر کے تجربات کا نچوڑ قرار دیا جاسکتا ہے۔ چودھری صاحب نے اس کتاب کے ترجمہ سے اپنے ابنائے وطن کی ایسی خدمت انجام دی ہے جسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ "کامیاب زندگی" کی طویل فہرستِ مضامین پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ جو نوجوان زندگی کی جدوجہد سے بوجہ احسن عہدہ برآ ہونے اور شہرت و عظمت کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کی تمنا رکھتے ہیں اُن کے لئے یہ کتاب ایک بہترین مشیر اور ایک مخلص رفیق کا حکم رکھتی ہے۔ کامیابی اور ترقی کے جو نکتے اور گُر اس میں بتائے گئے ہیں وہ اس قدر صحیح ہیں کہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص خواہ وہ کسی عمر یا درجہ کا ہو اُن پر عمل کرے اور پھر زندگی میں ناکام رہے۔ ترجمہ ایسا صاف اور سلیس ہے کہ ایک معمولی قابلیت کا شخص بھی اس کے مطالعہ سے مستفید ہوسکتا ہے۔ ہماری رائے میں ہر تعلیم یافتہ نوجوان کو اپنی زندگی کا عملی دور شروع کرنے سے پہلے ایک دفعہ "کامیاب زندگی" کو ضرور پڑھ لینا چاہیئے۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ کے لحاظ سے بھی کتاب دیدہ زیب ہے۔ قیمت مجلد دو روپے چار آنے غیر مجلد ایک روپیہ بارہ آنے محصول ڈاک بذمہ خریدار ملنے کا پتہ: مینجر صداقت بک ڈپو، رام کشن بلڈنگ، بیرون شیراں والہ دروازہ لاہور

ادبستان ۔ یہ کتاب حضرت خلیقی دہلوی کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے خلیقی صاحب سے ناظرینِ ہمایوں بخوبی واقف ہیں۔ پچھلے دور میں، اُن کے متعدد دلکش اور لطیف مضامین "ہمایوں" میں شائع ہو چکے ہیں خلیقی صاحب کی انشاء لطیف۔ اک خاص ادبی رنگ کی حامل ہے۔ اور ان کے تمام مضامین اس

دلچسپ خصوصیت سے لبریز ہوتے ہیں۔ ان کا ایک معرکۃ الآرا مضمون "ندرتِ ذوق و نظر" کے عنوان سے "ہمایوں" میں، بے حد دلچسپی اور قبولیت کی نظروں سے دیکھا گیا تھا، یہ مضمون بھی اس مجموعے میں موجود ہے بعض مضامین کے ساتھ تصویریں بھی دی گئی ہیں، جنہوں نے کتاب کی دلاویزی میں کافی اضافہ کر دیا ہے۔ شروع میں حضرت اختر شیرانی کا ایک طویل مقدمہ بھی شریک ہے، جس میں انہوں نے مختلف نقاطِ نظر سے، مصنف کی ادبی خصوصیات پر تنقیدی روشنی ڈالی ہے۔ مقدمہ بھی بجائے خود، دلچسپ ہے، ساتھ ہی مصنف، اور مقدمہ نگار کی تصاویر بھی دی گئی ہیں ——— طباعت و کتابت کے لحاظ سے بھی "ادبستان" قابلِ دید کتاب ہے ——— اور بحیثیتِ مجموعی اسے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ ہم مسٹر عبدالمجید مہتمم کتب خانہ "ناشر العلوم" لاہور کو ان کے ذوقِ انتخاب پر مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے خلیقی صاحب کے مضامین کو یکجا شائع کر کے ایک گراں قدر خدمت سرانجام دی۔ اور ناظرین "ہمایوں" سے ان کے مطالعے کی سفارش کرتے ہیں۔ قیمت مجلد عہ، بے جلد عہ ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ ناشر العلوم لاہور۔

دہقان یہ کتاب چودھری عبدالعزیز صاحب بیرسٹر ایم ایس سی نے زمینداروں کی موجودہ پست حالت سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ اس میں زمینداری اور زمینداروں کے مسائل و مشکلات کو نہایت سادہ اور عام فہم زبان میں حل کیا ہے اور ان کی فلاح و بہبود کی موثر تجویزیں پیش کی ہیں۔ زمینداروں کو تعلیم کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اشتمالِ اراضی کی اہمیت، کاشت کی حقیقت اور اس کے طریقے؛ کھاد کا مقصد، ماہیت اور اچھی کھاد تیار کرنے کی ترکیبیں؛ اچھے بیج اور اعلیٰ جنسوں کی کاشت کی اہمیت۔ زراعت کے تفہیمی مشاغل کی ضرورت، امدادِ باہمی کے فوائد، بچپن کی شادی کی خرابیاں، زمینداروں کے افلاس کے اسباب اور اس سے مخلصی کی تجاویز شرح و بسط سے لکھی ہیں۔ اس کتاب کا حجم ۷۰ صفحات ہے اور قیمت آٹھ آنے۔ اسی سلسلے کی دوسری کتاب

دیہاتی ہے۔ یہ بھی چوہدری عبدالعزیز صاحب کی گراں قدر تصنیف ہے۔ اس میں دیہات کے رہنے والوں کے تمدن و معاشرت اور جہالت کے نقائص بیان کئے ہیں، اور اس کے بعد ان لوگوں کو ان نقائص کے رفع کرنے کے نہایت آسان اور سہل الحصول ذرائع بتائے ہیں۔ یہ کتاب ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے قیمت آٹھ آنے مقرر کی ہے۔

دونوں کتابیں اس درجہ مفید ہیں کہ ہم ہر دہقان اور ہر دیہاتی سے اُن کے پڑھنے کی سفارش کریں گے۔ پہلی کتاب ملک نور الٰہی رحمت الٰہی پبلشرز کشمیری بازار لاہور سے دستیاب ہوتی ہے اور دوسری شیخ غلام علی برکت علی تاجرانِ کتب کشمیری بازار لاہور سے ملتی ہے۔

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے

طبقۂ نسواں میں اس کارخانہ کا عطر سہاگ اور عطر عروس نہایت مقبول ہے۔

اعلیٰ طبقہ کی خواتین سر میں لگانے کیلئے اس کارخانہ کا تیار کردہ بانو ہیر آئیل استعمال کرتی ہیں

اصغر علی محمد علی عطر ساز لکھنؤ

یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے۔

مرسلہ ۴ مئی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(ہمایوں)

یادگارِ علامہ فضیلے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد

جلد ۷ — نمبر ۴

فہرستِ مضامین

بابت ماہِ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء

تصاویر:- ۱- مصطفےٰ کمال پاشا، نئے فوجی لباس میں
۲- پارلیمنٹ میں صدر کی نشست
۳- ترکی مدارس میں مخلوط تعلیم ــــ اور ڈرائنگ کا ایک سبق

جہاں نما

مسلمانانِ ہند کی تعلیمی ترقی

ہندوستان کے مسلمانوں نے اُن نمایاں تبدیلیوں اور تجویزوں پر کافی توجہ نہیں دی جن کا حامل ہرٹوگ کمیٹی کی رپورٹ کا نواں باب ہے۔ اس باب میں مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ پر نہایت تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور تعمیری تجاویز کو پُورے پُورے طور پر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یونیورسٹی ہیں اور ثانوی تعلیم میں مسلمانوں کی مشکلات کا اس میں ذکر نہیں کیا گیا بلکہ اُسے اُن وجوہ کی تشریح و توضیح تک محدود کر دیا گیا ہے جو مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں رکاوٹ بنی رہیں۔

مندرجۂ ذیل دو نقشے مسلمانوں کی عام تعلیمی حالت کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:-

مختلف درس گاہوں میں مسلمان طلبہ کی تعداد صوبہ وار

صوبہ کا نام اور مسلمان آبادی (ملینوں میں)	یونیورسٹیوں و آرٹ کالجوں میں سنہ ۱۹۱۷ء	یونیورسٹیوں و آرٹ کالجوں میں سنہ ۱۹۲۷ء	ثانوی اور ابتدائی مدرسوں میں سنہ ۱۹۱۷ء	ثانوی اور ابتدائی مدرسوں میں سنہ ۱۹۲۷ء	تمام تسلیم شدہ درس گاہوں میں مجموعی تعداد سنہ ۱۹۱۷ء	تمام تسلیم شدہ درس گاہوں میں مجموعی تعداد سنہ ۱۹۲۷ء
مدراس (۲ر۸)	۱۸۲	۳۹۳	۱۳۶۶۹۰	۲۴۱۰۴۲	۱۳۷۷۳۲	۲۴۳۲۸۰
بمبئی (۴ر۰)	۱۵۷	۳۱۸	۱۲۳۹۴۳	۱۸۵۱۴۲	۱۲۵۰۴۸	۱۸۹۴۶۲
بنگال (۲۵ر۰)	۱۶۳۹	۳۴۱۹	۷۸۷۸۱۱	۱۰۲۹۶۶۲	۸۱۷۰۷۶	۱۱۰۹۲۳۷
صوبۂ متحدہ (۶ر۵)	۱۴۳۹	۱۱۲۷	۱۱۶۴۷۱	۲۰۶۹۶۴	۱۱۹۹۷۵	۲۱۲۷۶۶
پنجاب (۱۱ر۵)	۸۹۱	۱۸۵۴	۱۵۶۲۸۰	۴۶۴۸۲۳	۱۵۹۷۹۱	۵۱۶۸۳۱
برما (۰ر۵)	۴۰	۷۵	۱۶۳۹۹	۲۱۷۶۴	۱۶۵۳۱	۲۱۸۷۴
بہار اور اڑیسہ (۳ر۷)	۴۷۰	۴۶۷	۶۷۳۳۷	۱۳۱۵۰۶	۹۸۶۷۱	۱۳۵۶۹۵
صوبۂ متوسط (۰ر۵)	۶۲	۹۰	۳۰۶۹۱	۳۵۷۶۹	۳۰۸۴۷	۳۶۲۳۷
آسام (۲ر۲)	۸۶	۱۹۷	۵۰۹۵۸	۶۰۸۳۶	۵۱۷۱۸	۶۳۴۸۳
برطانی ہند (۵۹ر۴)	۵۲۱۲	۸۴۵۶	۱۵۵۲۱۴۲	۲۴۳۷۳۷۳	۱۵۹۳۵۲۸	۲۵۸۹۸۳۶

مسلمان طلبہ اور آبادی کا تناسب بحساب فیصدی

صوبہ	۱۹۱۷ء: تمام تسلیم شدہ و غیر تسلیم شدہ درسگاہوں کے مسلمان طلبہ	۱۹۱۷ء فی صدی تناسب: مسلمان آبادی کا مجموعی آبادی سے	۱۹۱۷ء فی صدی تناسب: مسلمان طلبہ کا مسلمان آبادی سے	۱۹۱۷ء فی صدی تناسب: مسلمان طلبہ کا کل طلبہ سے	۱۹۲۷ء: تمام تسلیم شدہ و غیر تسلیم شدہ درسگاہوں کے مسلمان طلبہ	۱۹۲۷ء فی صدی تناسب: مسلمان آبادی کا مجموعی آبادی سے	۱۹۲۷ء فی صدی تناسب: مسلمان طلبہ کا مسلمان آبادی سے	۱۹۲۷ء فی صدی تناسب: مسلمان طلبہ کا کل طلبہ سے
مدراس	۱۴۸۱۵۵	۶٫۶	۶٫۷	۱۱٫۱	۲۷۸۵۶۸	۶٫۷	۹٫۸	۱۱٫۰
بمبئی	۱۴۹۶۷۲	۲۰٫۴	۳٫۷	۱۹٫۲	۲۰۹۹۱۳	۱۹٫۶	۵٫۵	۱۸٫۱
بنگال	۸۶۴۲۵۹	۵۲٫۷	۳٫۶	۴۵٫۰	۱۱۴۰۱۴۰	۵۴٫۰	۴٫۵	۵۱٫۳
صوبۂ متحدہ	۱۶۲۶۷۷	۱۴٫۱	۲٫۴	۱۸٫۲	۲۴۴۶۹۷	۱۴٫۳	۳٫۸	۱۸٫۱
پنجاب	۱۹۶۹۲۱	۵۴٫۸	۱٫۸	۴۰٫۸	۵۹۰۸۳۴	۵۵٫۳	۵٫۲	۵۰٫۰
برما	۲۰۴۸۹۹	۳٫۵	۵٫۹	۴٫۲	۲۴۷۷۶	۳٫۸	۵٫۰	۳٫۸
بہار اور اڑیسہ	۱۱۰۱۵۵	۱۰٫۶	۳٫۰	۱۳٫۰	۱۴۴۹۱۱	۱۰٫۹	۳٫۹	۱۳٫۱
صوبۂ متوسط	۳۲۳۵۶	۴٫۱	۵٫۷	۹٫۲	۳۷۹۲۰	۴٫۱	۶٫۷	۹٫۵
آسام	۵۵۶۲۵	۲۸٫۱	۲٫۹	۲۳٫۸	۷۴۸۳۱	۲۹٫۰	۳٫۴	۲۵٫۹
برطانی ہند	۱۸۲۴۳۶۴	۲۳٫۵	۳٫۲	۲۳٫۲	۲۸۲۱۱۰۹	۲۴٫۱	۴٫۷	۲۵٫۳

ان نقشوں سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۷ء کے درمیان مسلمانوں کی زیادتی بہ سرعت اور عام طور پر عمل میں آئی۔ دس سال کے عرصے میں طلبہ کی تعداد ۶۲٫۵ فیصدی یا تقریباً دس لاکھ کے بقدر بڑھ گئی۔ مجموعی مسلمان آبادی کی نسبت سے طلبہ کی تعداد ۳٫۲ سے بڑھ کر ۴٫۷ فیصدی ہو گئی، درآں حالیکہ تمام اقوام اور مذاہب کے طلبہ کی وہ نسبت جو انہیں مجموعی آبادی سے ہے صرف ۳٫۱ سے ۴٫۳ تک بڑھ سکی۔ کل آبادی سے مسلمانوں کی نسبت ۲۴ فیصدی سے کچھ ہی زیادہ ہے لیکن کل اضافہ سے مسلمان طلبہ کے اضافہ کی نسبت ۳۱ فیصدی سی بڑھ کر رہی۔ گویا مسلمان طلبہ تمام اقوام کے طلبہ سے زیادہ تعداد میں مدرسوں کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

لیکن اونچے درجوں میں لڑکیاں ابھی لڑکوں سے کافی پیچھے ہیں ۲۲۶۰۳۱ مسلمان لڑکیوں میں سے جو سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پا رہی ہیں بہت کم ہیں جو پرائمری سے اوپر کے درجوں میں پڑھ رہی ہیں اور دس میں سے نو سے بھی زیادہ پہلی

جماعت میں ہیں۔

شودربانیانِ سلطنت

مسٹر کے پی جیسوال اخبار "مارننگ پوسٹ" میں بعض شودربانیانِ سلطنت کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ہندوؤں کی تاریخ میں مہابھارت کے زمانے سے پہلے شودروں کی جانب سے سلطنت کے قیام کی چار کوششیں عمل میں آئیں۔ تین ان میں سے کامیاب ہوئیں اور چوتھی کچھ زیادہ کامیاب نہ رہی۔ نند اکی سلطنت اس قسم کی پہلی حقیقی سلطنت تھی۔ ہندو مورخوں نے اسے تاریخ کے ایک نئے دور کا آغاز تسلیم کیا ہے۔ تمام پُران اس کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مہاپدمانند کی ایکاچھترا بادشاہت جو پنجاب سے بنگال تک پھیلی ہوئی تھی ہندوستانی ملوکیت کی ایک نادر الظہور مثال تھی۔ اس کی بنا بھی ایک شودر نے ڈالی اور یہ کئی نسلوں تک شودروں کے ہاتھ میں رہی۔ اس سلطنت کا دور تقریباً ۴۰۵ ق م سے شروع ہوکر ۳۲۵ ق م میں ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی یہ سلطنت ٹوٹی نہیں بلکہ وراثت کے طور پر چندر گپت موریا کے ہاتھ آئی جس نے اس کی حدود کو اور زیادہ وسیع کیا۔ شمال میں یہ ہرات اور ہمالیہ تک پہنچ گئی اور مشرق و مغرب میں اس نے سمندر کے ساحلوں کو جا چھوا۔ چندر گپت کے جانشین بندوسارا اور اشوک نے اس نظامِ حکومت کو ایران اور ہمالیہ کے پار خوتان تک پہنچایا۔ مشرق میں آسام تک اور جنوب میں میسور تک جس کا سیاسی اثر سیلون پر بھی پڑا۔ پُران کے مورخین کی متفقہ شہادت اور سنسکرت ادب کی تصریحات اس امر کا ثبوت ہیں کہ موریا خاندان بھی شودر تھا۔

تیسری سلطنت گپتا خاندان کی ہے جس کی بنا چندر گپت اور اُس کے بیٹے سمدر گپت نے ڈالی۔ یہ سلطنت صدیوں تک قائم رہی اور اُن سلطنتوں میں سے ایک ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ دیر تک قائم رہیں۔ ادب، تعمیر، سنگتراشی، عام آرٹ اور تجدید مذہب کے لحاظ سے گپتا خاندان کی سلطنت کی مثال نہیں ملتی۔ وید برہمن اور عام ہندو تہذیب کی بہت بڑی محافظ ثابت ہوئی۔ اس خاندان میں ایک نہیں بلکہ کئی ایک افراد ایسے نظر آتے ہیں جو بڑی بڑی رزمیہ نظموں کے موضوع بننے کے قابل ہیں، لیکن اس زمانے کے والمیک خاموش ہیں۔ ایک قدیم ناٹک جسے رام کرشن کوی نے حال ہی میں شائع کیا ہے ظاہر کرتا ہے کہ وہ کرسکار ذات کے شودر تھے۔ انہوں نے اپنے کتبوں میں کبھی اپنی ذات کا اظہار نہیں کیا، لیکن بعض سکوں پر ایسے الفاظ پائے گئے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھتریوں کے سخت دشمن ہیں۔

غلامی ابھی موجود ہے

اخبار "لٹریری ڈائجسٹ" کے مندرجہ ذیل شذرہ سے معلوم ہوگا کہ غلامی کا قطعی استیصال ابھی بہت دور ہے:-

غلامی ابھی تک دنیا کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا بنی ہوئی ہے جمعیت اقوام کی ایک مامور یہ کا بیان ہے کہ آج بھی دنیا میں غلاموں کی تعداد چالیس لاکھ سے کچھ کم نہیں ہے بلکہ غالباً ساٹھ لاکھ کے قریب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوئی شخصیت نہیں، وہ لوگ جنہیں کسی قسم کی جائداد بنانے کا حق حاصل نہیں، جنہیں ان کے اپنے معاملات میں بھی ضمیر کی آزادی میسر نہیں اور جن کے بیوی بچے اُن کے اپنے اختیار میں نہیں۔ کم از کم بیس لاکھ ان میں سے چین میں ہیں، پانچ لاکھ سے سات لاکھ تک عرب میں، ایک کافی تعداد لائبیریا میں اور چند ہزار دنیا کے دوسرے مختلف حصوں میں مختلف مقامات میں غلامی مختلف حالتوں میں ہے۔ ابی سینیا میں غلاموں کو کھلم کھلا عذاب دیا جاتا ہے لیکن چین میں ایک پوشیدہ طریق جاری ہے۔ وہاں لڑکیاں جو حقیقت میں گھر کی لونڈیاں ہوتی ہیں کہنے کو افرادِ خاندان کی طرح رہتی ہیں جمعیتِ اقوام کی کوششوں سے ایک لاکھ پچاسی ہزار ٹانگا نیکا میں، دو لاکھ پندرہ ہزار سیرالیون میں اور چھتر ہزار غلام برما میں آزاد کئے گئے ہیں ہمیں یقین ہے کہ ان شمار و اعداد کو دیکھ کر دنیا کی رائے عامہ انسانی غلامی کی آخری زنجیریں تڑانے میں جمعیت کی کوششوں کی مددگار ثابت ہوگی۔

رباعیاتِ عمر خیام کا ایک گراں بہا نسخہ

ایڈورڈ فٹز جیرلڈ کا ترجمہ "عمر خیام" پہلی بار ۱۸۵۹ء میں شائع ہوا اور اس کی قیمت ایک شلنگ رکھی گئی۔ گو اس کی فضیلت اور قدر کو بعض لوگوں نے جن میں بہت بڑے بڑے آدمی بھی موجود تھے اُسی وقت جان لیا تھا لیکن یہ مقبولِ عام نہ ہو سکا، اور اس کی قیمت گھٹا کر چار پنس کر دی گئی۔ حال ہی میں اس ایڈیشن کا ایک نسخہ خود ناشر نے ۱۴۰۱ پونڈ کو خریدا ہے۔ اس کا حجم اٹھارہ ورق ہے اور آج سے پچاس سال پہلے بیچنے والے نے اسے سات گنی میں خریدا تھا۔

دس لاکھ سال پہلے کا انسان

پیکن کے قریب ایک غار کے اندر دس ایسے انسانوں کی منتجر ہڈیاں ملی ہیں جو آج سے دس لاکھ سال پہلے زمین پر بستے تھے۔ ان ہڈیوں میں سب سے اہم ایک کھوپری ہے جس کے امتحان کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس قدیم زمانے میں بھی دنیا میں ایسی مخلوق موجود تھی جس میں سوچنے کی طاقت تھی اور جو سیدھا چل سکتی تھی۔ ماہرین کی رائے ہے کہ اس سے پہلے ایسا عجیب اور قدیم انکشاف آج تک نہیں ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ موجودہ انسانی نسل براہ راست اسی انسان سے چلی اور جاوا کا بن مانس اس خاندان سے نہیں ہے بلکہ دوسری دور کی شاخ سے ہے دس انسانوں کی ہڈیوں کا یکجا پایا جانا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ مل جل کر رہتے تھے

جدید ترکی

مس گریس ایلیسن جن کی تحریریں ترکی کے متعلق نہایت معتبر سمجھی جاتی ہیں اور جن کے ترکوں سے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں پانچ مرتبہ ترکی گئی ہیں اور اُن کو سلطان عبدالحمید کے عہد سے لے کر اب تک ترکی کے انقلابات کے ساتھ خاص ربط وضبط رہا ہے۔ ہمارے اس مضمون کی تصریحات انہیں کی کتاب سے ماخوذ ہیں جو عہدِ حاضر کی تاریخ کا ایک عظیم الشان اور دلچسپ باب ہے۔

مصطفےٰ کمال پاشا

اُس کی شخصیت اور اُس کا کام - اُس شخص کا ذکر کئے بغیر جدید ترکی پر کچھ لکھنا ناممکن ہے جو گویا اُس کا خالق ہے۔ اُس کی زبردست شخصیت کا نقش تمام ملک کے چپّے چپّے پر ثبت ہے ——— ہر گاؤں پر، ہر مدرسے پر، ہر مسجد پر، بہبودِ اطفال کے مراکز پر جو اُس کے حکم سے جابجا جاری ہیں اور پودوں کی اُن چھوٹی چھوٹی تربیت گاہوں پر جن سے وہ اناطولیہ کی سی سنسان اور بے شجر زمین کو ایک جنت بنا دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اُس وقت تک جدید ترکی کا مطالعہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہمارے دلوں میں اُس مصورِ اعظم سے پوری واقفیت حاصل کرنے کی خواہش پیدا نہ ہو جائے جس نے اُس کے حیرت انگیز نظاروں کو اپنے بلند تصوّر سے نکال کر صفحۂ ہستی پر کھینچ دیا ہے۔ یقیناً جدید ترکی کو اگر کوئی "کمالستان" کہے تو بجا ہے کیونکہ جدید ترکی مصطفےٰ کمال پاشا کی تخلیق ہے!

وہ ایک فوق العادت انسان ہے۔ وہ اُن عظیم الشان ہستیوں میں سے ہے جو اُس وقت ظاہر ہوتی ہیں جب کوئی قوم اپنا تمام سرمایۂ حیات کھو بیٹھتی ہے، اور اس لئے ظاہر ہوتی ہیں کہ وہ انہیں مایوسیوں اور محرومیوں کی پستی سے نکال کر آزادی اور کامیابی کے آسمان پر لے جائیں۔

عبدالحمید کے عہد کی بد انتظامیوں سے متاثر ہو کر اُس نے اوائلِ عمر ہی سے اپنی قوم میں حب الوطنی کی روح پھونکنی شروع کر دی تھی۔ اسی حب الوطنی نے اب وہاں ایک نئے مذہب کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ وہ ایک سپاہی ہے جس نے وطن کی محبت اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں پائی۔ پھر اپنے مضبوط ارادے کو ساری قوم کے دلوں میں راسخ کر دیا۔ اور انہیں

آزادی کے لئے لڑنے، ترقی کے لئے جدوجہد کرنے، روایات کے فتنے کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے اور ایک نئی مملکت تعمیر کرنے پر مجبور کر دیا۔ لڑکپن کے زمانے میں جب ابھی وہ مکتب میں پڑھا کرتا تھا لوگوں کے بے فائدہ غم، مصیبت اور جہالت پر اُسے غصہ آجایا کرتا تھا اور وہ مٹھی باندھ کر کہا کرتا تھا "آہ میرا وطن! میں اپنے وطن کو بچا لوں گا"! اور اُس کی عمر ابھی بارہ سال کی نہ ہوئی تھی کہ اُس نے تاریخ، حکومتِ جمہوری اور حکومتِ دستوری کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں وہ لڑکوں کو مسودے کی صورت میں ایک اخبار بھی تقسیم کیا کرتا تھا جس میں حکومت کی غلطیوں کی طرف اشارات ہوتے تھے اُس نے خود بتایا ہے کہ "دس سال کی عمر سے لے کر اب تک میں نے دن رات اپنی قوم کی ترقی کے لئے کام کیا ہے"۔

گو قسمت نے اُسے ملک میں سب سے بلند و برتر حیثیت عطا کی ہے لیکن اُسے اپنی ذات کے لئے کوئی خواہش نہیں۔ اُسے دولت، خاندان یا مرتبے کی کوئی آرزو نہیں۔ اور اگر یہ ممکن ہوتا تو وہ سلطان کو بھی تخت سے الگ نہ کرتا۔ اُس کی احسان مند اور شکر گذار قوم نے اُسے سلطان اور خلیفہ کا منصب پیش کیا لیکن اُس نے اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ "مجدد" نہ ہوتا بلکہ محض ایک "فاتح" ہوتا۔

مس ایلیسن نے مصطفےٰ کمال پاشا سے اپنی پہلی ملاقات کو اس طرح بیان کیا ہے:۔ وہ پہلا نقش جو مصطفےٰ کمال پاشا کی شخصیت نے مجھ پر کیا یہ تھا کہ اُس کو دیکھ کر مضبوط سے مضبوط جگرے کا آدمی بھی کانپ جاتا ہوگا۔ جب اپنے ڈسک پر اپنی دونوں باہوں کو جوڑ کر اور ذرا جھک کر اُس نے اُن آنکھوں سے میری طرف دیکھا جن کی مثال میں نے کسی دوسرے انسان میں نہیں پائی تو مجھے بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے میں پھر وہی چھوٹی سی بچی ہوگئی ہوں جو چڑیا خانے کے سب سے بڑے شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پہروں کھڑی رہتی تھی یہاں تک کہ یہ عظیم جانور اپنی نظریں جھکا لیتا تھا۔ مصطفےٰ کمال پاشا کی نظر، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روح کی گہرائیوں تک اتر گئی ہے۔ اور میں نے شکر کیا جب ایک وزیر کی آمد سے یہ عجیب مقابلہ ختم ہوا جس میں میں محض ناگہانی طور پر مبتلا ہوگئی تھی۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ وہ آنکھیں کبھی گہری نیلی ہو جاتی ہیں اور کبھی سخت بھوری، کبھی اُن میں انتہائی نرمی آجاتی ہے اور کبھی بالکل قاتل نظر آتی ہیں۔ اُس کا چہرہ ایک جنگجو سپاہی کا چہرہ ہے لیکن اُس کی آواز اس قدر شیریں ہے کہ ترجمان سے اُس کے ترکی یا فرانسیسی الفاظ کا ترجمہ سننے سے پہلے انسان مسحور ہو جاتا ہے۔

مذہب کے متعلق اُس کا قول ہے کہ "میرا کوئی مذہب نہیں، اور بعض اوقات میں چاہتا ہوں کہ تمام مذاہب کو لے کر سمندر کی تہ میں پہنچا دوں"۔ وہ کہتا ہے کہ "وہ ایک کمزور حاکم ہے جسے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے مذہب کے ستونوں کی ضرورت ہے، اُس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی انسانوں کو دام سے پکڑنا چاہے۔ میری قوم جمہوریت کے

اصول حقیقت کے قانون اور علوم کے ارشادات سیکھنے لگی ہے۔ توہمات کو اب مٹ جانا چاہیئے۔ لوگ جس طریقے سے چاہیں عبادت کریں، ہر شخص اپنے ضمیر کی پیروی کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اُسے عقل کے خلاف یا اپنے بھائی بندوں کی آزادی کے خلاف عمل کرنے کی ترغیب نہ دے"۔

اُس کے یا اُس کی قوم کے دل میں کسی کے لئے نفرت موجود نہیں۔ وہ ترکی کے ہمسایوں اور دوسری قوموں کے لئے سراپا امن اور دوستی ہے۔ اُس کی خواہش بس یہی ہے کہ سب قومیں ترکوں کی آزادی کا احترام کریں۔ "وہ کہتا ہے "میں نے جب کبھی جنگ کے لئے تلوار اٹھائی میرا مقصد حق کی حفاظت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ہم اپنے ہمسایوں ——— روس، یونان، بلگیریا، سربیا، انگلستان اور فرانس کے ساتھ صلح و آشتی سے رہنا چاہتے ہیں تاکہ ہم اپنے ملک کی شکستہ عمارت کو دوبارہ تعمیر کر سکیں اور جو اقتصادی کرم اور زنگ اُسے مدتوں سے لگ رہا ہے اُسے صاف کر سکیں"۔

وہ اپنے آپ کو صرف اپنی قوم کی جماعت کا امیر سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ لوگ بھی اُسے یہی سمجھیں۔ اصلاح کے لائحہ عمل کا اعلان ہمیشہ ان الفاظ میں ہوتا ہے کہ "ہم نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے"، اور اُن سے ہمیشہ یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جو کچھ اُس نے کیا ہے وہ اس کا فرض تھا۔ تاریخ کی اُس کے دل میں بڑی عزت ہے اور وہ اپنا معاملہ تاریخ ہی کے سپرد کرتا ہے کیونکہ تاریخ بے رحم ہے اور ہر چیز کو اس کی حقیقی حیثیت کے مطابق اہمیت دیتی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ کسی بڑے آدمی سے اُس کی مثال دی جائے کیونکہ اس قسم کے مقابلے دونوں بڑی ہستیوں کو چھوٹا کر دیتے ہیں۔ ایسے موقع پر وہ کہا کرتا ہے "میرا نام مصطفےٰ کمال ہے!"

اُس کی معمولی گفتگو بھی نہایت دلکش اور مسرور کُن ہوتی ہے۔ جب وہ کام کرتا ہے تو اُس کے پیش نظر صرف کام ہوتا ہے اور جب وہ کھیل میں مشغول ہوتا ہے تو اُسے کوئی اور دھیان نہیں ستاتا۔ جب وہ اپنی تجاویز کے نقشے تیار کرتا ہے یا کسی اور تعمیری کام میں مصروف ہوتا ہے تو اُسے کوئی پریشان نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے کام میں قطعاً منہمک ہوتا ہے لیکن کھیل کا بھی وہ اسی قدر قائل ہے۔ اگر وہ ناچ گھر میں ہے اور ناچ صبح کے آٹھ بجے ختم ہوتا ہے تو وہ شروع سے لے کر آخر تک اس میں ایک نوجوان لڑکے کی طرح دلچسپی لے گا، اور ایک گھنٹے کے اندر اندر بہترین تقریر کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔

کاشت کے کام کو پاشا کی تفریح کا سامان کہا جائے یا نہ کہا جائے لیکن یہ اُس کی حکومت کے انتظامات کا لابد ضرور ہے۔ بعض اوقات صبح سے پہلے ہی پہلے وہ اپنے کھیت میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں نئی نئی کلوں اور نئے نئے اصولوں سے ایسی محنت کے ساتھ کام کرتا ہے کہ اُس کے دوستوں کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ اس کا مقصد

زراعت کی ترقی کے سوا اور کچھ نہیں، اور وہ دکھانا چاہتا ہے کہ بہترین کھیتی کس طرح تیار کی جا سکتی ہے۔

نئی ترکی کا بانی وہ خود ہے لیکن یہ عمارت صرف اُس کی قوم کے اشتراک سے تعمیر ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اُس نے ساری قوم کی ذہنیت کو بدل دیا، تاہم جتنی اصلاحات بھی ہوئی ہیں وہ اس کی نہیں بلکہ اُس کی قوم کی ہیں۔ وہ ہمیشہ حکومت کو "ہماری حکومت" اور قوم کو "ہماری قوم" کہہ کر پکارتا ہے، اور جب وہ "مصطفےٰ کمال پاشا" کہتا ہے تو اِس کا مفہوم اُس کی اپنی ذات نہیں ہوتا بلکہ "قوم" ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے "ہماری حکومت نہ عمومی ہے نہ اشتراکی۔ یہ حکومت کسی دوسری حکومت سے مشابہت نہیں رکھتی۔ یہ قومی آزادی کی نمائندہ حکومت ہے، قوم کی فرمانروائی کی نمائندہ حکومت۔ ہم نے روشنی کو پالیا ہے اور ہمیں راستہ مل گیا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو ہمیں آگے بڑھنے سے روک سکے۔"

انگورہ

دارالخلافہ۔ انگورہ آج ایک تسلیم شدہ، ذمہ دار حکومت کا دارالخلافہ ہے۔ پہلے ایک قدیم وضع کا ایشیائی گاؤں سا تھا۔ انگورہ جاتے ہوئے ایک بے برگ و گیاہ اور تقریباً غیر آباد سطحِ مرتفع سے گزرنا پڑتا ہے جس میں مویشی تک نظر نہیں آتے۔ شاذونادر کہیں بھیڑوں پر نگاہ پڑتی ہے۔ انگورہ صحرا میں واقع ہے۔ آب و ہوا گرمیوں میں سخت گرم اور گرد آلود اور سردیوں میں سخت سرد ہوتی ہے۔ قدیم انقرہ بھی ہے اور اب بھی اس جگہ بعض دلچسپ رومی آثار اور آگسٹس ایک مندر موجود ہے، جن پر ترکوں کو بڑا ناز ہے۔

پرانے زمانے کے ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں جو لکڑی اور گارے سے بنائے جاتے تھے کوئی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے ان کو اوپر سے پھینکا ہے اور یہ بکھر کر پہاڑوں کے پہلوؤں میں آرہے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک مکان کو یاد رکھنے کے لئے اکثر کوئی فوارہ یا اسی قسم کی کوئی اَور چیز کی نشانی کے طور پر رکھنی پڑتی تھی۔ آج نئے مکانوں اور نئی سڑکوں نے یہاں ایک عجیب بے نظیر منظر پیدا کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کسی مصوّر کی بہترین تصویر ہے جو ابھی تکمیل کو نہیں پہنچی۔

انگورہ کی موجودہ معاشرت۔ انگورہ کا حلقۂ معاشرت وزرا، عہدہ دارانِ حکومت، نائبین اور اربابِ سیاست پر مشتمل ہے۔ اگر آپ دو یا تین دعوتوں میں شامل ہوں تو آپ ان سب کو جان لیں گے کیونکہ ہر جگہ یہی لوگ مدعو کئے جاتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان اب پردہ حائل نہیں۔ عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ ہر جگہ جاتی ہیں،

مہمانوں کی خاطر مدارات کرتی ہیں۔ بال (ناچ) میں شامل ہوتی ہیں۔ مصطفےٰ کمال پاشا کو خود بھی ناچ سے دلچسپی ہے اور وہ اسے تقویت دینے کا اس لئے حامی ہے کہ اس سے وہ نوعی حجابات اٹھتے ہیں جو اب تک قومی ترقی کے لئے سدِ راہ تھے۔

نشاۃ الثانیہ

رفع نقاب۔ جب ملک ہر طرح کی اندرونی اور بیرونی غلامی سے آزاد ہو گیا جمہوریت قائم ہو گئی تو مصطفےٰ کمال نے آزاد مردوں اور عورتوں کی ایک نئی عمومیہ کا کام اپنے ذمہ لیا بجلی کی سی سرعت سے انقلاب پر انقلاب پیدا ہوتا گیا۔ پاشا نے ایک عزمِ راسخ کے ساتھ مملکت کے گلے سڑے اعضا کو الگ کرنا شروع کر دیا۔ جو کچھ وہ کر رہا تھا اُسے وہ اچھّی طرح سمجھتا تھا اور اُسے اپنی کامیابی کا پُورا پُورا یقین تھا۔

خلافت رخصت ہوئی اور ساتھ ہی ملک کا قانون بھی بدل گیا۔ قانون بدلتے ہی آزادیٔ نسواں کی عظیم الشان اصلاح عمل میں آئی۔ غازی نے کہا "جمہوریت کا قیام کیسے ممکن ہوسکتا تھا جب کہ عورتیں بندش میں تھیں اور تمام معاشرتی نقشہ آدابِ حرم کی پابندیوں نے بگاڑ رکھا تھا۔ ہمارے تعمیری کاموں میں ہمیں مدد دینے کی بجائے عورتوں کو سست کیا جا رہا تھا۔ تمام نظام مضحکہ خیز بن چکا تھا۔ اس لئے اس کا ختم ہو جانا ہی بہتر تھا"

قانون کی تبدیلی، تعددِ ازدواج کی منسوخی اور اپنی شادی سے اُس نے نمایاں کر دیا کہ وہ آئندہ مملکت اور معاشرت میں عورت کا کیا درجہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ جو سلوک اُس نے اپنی بیوی سے کیا وہ ایک اظہار تھا اس امر کا کہ وہ دوسروں سے بھی اُن کی بیویوں کے لئے ایسے ہی سلوک کی توقع رکھتا ہے۔ اُس نے نہ صرف عورتوں کو کامل آزادی دی بلکہ معاشرتی طور پر بھی اُن کی حیثیت کو محفوظ و منضبط کر دیا۔ جہاں وہ یورپ کی طرح ترکی میں بھی ہر جگہ اپنے شوہروں کے ساتھ جا سکتی ہیں وہاں انہیں یہ بھی اجازت ہے کہ جو پیشہ چاہیں اختیار کریں۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ عورتوں کو آزادی جنگ نے دلائی اور یہ سچ ہے کہ جنگِ آزادی میں اُنہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ آزادی کی مستحق ہیں۔ انگورہ میں جنگ کی جو یادگار قائم ہوئی ہے اُس میں اُس تصویر نے ترکی عورتوں کے کام کو غیر فانی بنا دیا ہے جس میں وہ توپ کے گولے اٹھائے لئے جا رہی ہیں۔ توپ کے گولے اٹھانا کسی حالت میں بھی آسان کام نہیں ہے، لیکن انگورہ کے اُس ہولناک ماحول میں، جب نہ پہننے کو کافی کپڑا میسّر تھا نہ کھانے کو کافی خوراک اِن کے عظیم بوجھ تلے دبے ہوئے ہونا ترک عورتوں کا ایک کبھی نہ بھولنے والا کارنامہ ہے۔ ترکی قوم کی قوتوں کی صحیح رہنمائی کرتے ہوئے غازی

پاشا نے عظیم ترین قوت — عورت — کو اُس کا حقیقی درجہ عطا کیا ہے۔ پہلی حالت میں عورت ایک عضوِ معطل ہو رہی تھی کیونکہ اُس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔ یا وہ ایک پودا تھا جو پانی کے فقدان کی وجہ سے مرجھایا جا رہا تھا۔ جو تھوڑی بہت طاقت اس میں تھی وہ چھپی ہوئی تھی، اس لئے خطرناک تھی۔ اب اُسے ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ترکی کی عورتوں کو یہ نیا افتخار دے کر یقیناً مصطفےٰ کمال تمام مشرق کی عورتوں کا رتبہ بلند کر رہا ہے۔

ممنوع فیض - ترک بھی دوسری یورپی قوموں کی طرح اب ہیٹ پہنتے ہیں۔ فیض کا پہننا قانوناً ممنوع ہے۔ ترکی میں یہ پہلا موقع نہیں کہ لوگوں کو سر کا پہناوا بدلنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ جب فاتح ترکوں کو فیض پہننے پر مجبور کیا گیا تھا تو اُس وقت بھی صدائے احتجاج بلند ہوئی تھی جس کے سلسلے میں دس آدمی مر گئے تھے اور چالیس زخمی ہوئے تھے جب بیڑا عظم لوگوں کو جبراً ہیٹ پہنانے جا رہا تھا تو سواروں کے دو دستے اُس کے ساتھ تھے لیکن مصطفےٰ کمال پاشا کو اپنی قوتِ ترغیب اور اپنی شخصیت پر بھروسا تھا۔ صرف ایک مصاحب اور ایک معتمد کو ساتھ لے کر اُس نے ترکی کے مجنون ترین شہر میں لوگوں کے جمِ غفیر کے سامنے اعلان کیا کہ انہیں کل کے دن سے ہیٹ پہننی پڑے گی — اور کیوں؟ اس لئے کہ

"ہماری جلیل القدر قوم کو ایک مہذّب اور بین الاقوامی لباس کی ضرورت ہے۔ ہم اس کو ضرور پہنیں گے۔ ہم شُو، بوٹ، پتلون واسکٹ، قمیص، کالر، ٹائی اور جاکٹ پہنیں گے اور اس تمام لباس کی تکمیل کے لئے سر کا وہ پہناوا اختیار کریں گے جس کا کنارا بڑھا ہوا ہو۔ سر کے لباس کا نام ہیٹ ہے۔ جو لوگ اس معاملہ میں ہچکچائیں گے اُن سے میں کہوں گا کہ وہ جاہل اور بیوقوف ہیں۔ اگر فیض کا پہننا درست ہے جو یونانی ٹوپی ہے تو ہیٹ کا پہننا کیوں درست نہیں؟

"وہ لوگ جو طفلانہ خیالات میں الجھ رہے ہیں، جن کی ذہنیت قرونِ وسطےٰ کی ذہنیت ہے اور جو تہذیب کے خلاف جنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُن لوگوں کو اپنے انجام کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ اور وہ انجام کیا ہے؟ غلامی اور ناکامی۔ لیکن ترکی جمہوریت کے افراد نے اپنی بیڑیوں کو توڑ ڈالا ہے۔ اُن کی شجاعت کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، وہ اپنی زندگی ایک مہذب قوم کی طرح گزارنے کا فیصلہ کر چکے ہیں"

یہ سچ ہے کہ دس آدمیوں کا ہیٹ کے پہننے سے انکار کر کے جان سے گزر جانا انسان کے سارے جسم میں لرزہ پیدا کر دیتا ہے، لیکن ہیٹ نئی تہذیب کا نشان اور جمہوریت کے ساتھ اتحاد کا ثبوت ہے اس کے پہننے سے انکار کرنا حکومت کے احکام کی خلاف ورزی ہے اور فیض کے پہننے کے یہ معنی ہیں کہ پہننے والا سابق سلطان کا طرفدار ہے، جو موجودہ حکومت سے بغاوت ہے اور باغی کو اُس کی سزا ملنی ضروری ہے۔

دیہات - دیہات میں بھی نئی تہذیب اور جمہوریت کا اثر پہنچ گیا ہے، اور وہاں بھی اصلاحات عمل میں آ رہی ہیں۔

دیہات کے باشندوں کو فخر ہے کہ جمہوریت میں اب اُن کا بھی ایک حصہ ہے۔ انہوں نے مدرسے جاری کئے ہیں اور نئی صاف سیدھی سڑکیں بنائی ہیں۔ زندگی اب اُن کے لئے پہلے سے بہت مختلف ہے۔ پہلے زمانے میں والی دگورنر) غیض وغضب کا پُتلا بن کر یہاں آتا تھا اور غریب دیہاتیوں سے جو روپیہ پیسہ اُسے ملتا تھا زبردستی چھین کر لے جاتا تھا۔ محصولات کے بوجھ نے اُن کی پشت دہری کر دی تھی۔ انہیں بادشاہ کے لئے جسے انہوں نے کبھی نہ دیکھا تھا جنگوں میں لڑنا پڑتا تھا۔ اب انہوں نے اپنے حاکم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اُس کے ساتھ مصافحہ کیا ہے اور اُس سے گفتگو کی ہے۔ والی اب اُن کا دوست ہے۔ وہ اُن کے رنج و راحت کا شریک ہے۔ دیہات کے باشندے اُس کے لئے چشم براہ رہتے ہیں کیونکہ وہ ہر وقت اُن کی مدد کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ وہ بڑی محنت سے کام کرتے ہیں اور خوش ہوکر مالیہ ادا کرتے ہیں۔ ترقی اور کامیابی اب ہر وقت اُن کے پیشِ نظر رہتی ہے۔

عورتیں مردوں کے دوش بدوش کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ مصطفٰے کمال پاشا نے انہیں آزادی دے دی ہے لیکن ابھی انہوں نے پُوری طرح پردہ نہیں اٹھایا۔ اُن کے سر کے بال ڈھکے ہوئے ہوتے ہیں اور جب وہ غیر مردوں کو دیکھتی ہیں تو بعض اوقات اپنے چہروں پر نقاب کھینچ لیتی ہیں۔

اصلاحاتِ عظیمہ

نجد یہ کا اثر مذہب پر۔ جب ہم اونچے طبقے کے بعض لوگوں کی باتیں سنتے ہیں تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے متعلق ترکی میں ایک بغاوت جاری ہے لیکن یہ بغاوت بڑی حد تک اُن تعلیمات اور توہمات کے خلاف ہے جنہیں عہدِ جدید سے پہلے وہاں کے مولویوں اور درویشوں نے رائج کر رکھا تھا۔ عوام کو جاہل رکھ کر اُن کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھانا مولوی لوگوں کا شیوہ تھا۔ وہ اتنا بھی برداشت نہیں کرتے تھے کہ قرآنِ مجید کا ترجمہ ترکی زبان میں ہو جائے۔ چنانچہ جب غازی پاشا نے اصلاحات کا کام شروع کیا تو اُس نے بڑے بڑے مولویوں کو بلا کر پوچھا کہ آپ کیوں ترجمے کی مخالفت کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ قرآنِ مجید میں بعض آیات ایسی ہیں جن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اُس نے کہا "اگر وہ ایسی ہی مشکل اور دقیق ہیں تو انہیں چھوڑ کر باقی قرآن کا ترجمہ کر لینا چاہیئے"۔

کرنل جمیل بے نے اپنے قیام پیرس کے دوران میں قرآنِ مجید کا بہت اچھا ترجمہ کیا تھا۔ جب مصطفٰے کمال کو اس کا علم ہوا تو اُس نے اس کی نقول بڑے بڑے علما کو بھجوائیں۔ انہوں نے پڑھے بغیر اس کی شدید مخالفت کی لیکن غازی نے اُسے طبع کرایا اور اس کی جلدیں تمام مذہبی اور علمی مراکز میں بھیجیں۔

ان لوگوں کی جہالت بھی بعض اوقات ملک کے لئے نہایت ہی مضر ہوا کرتی تھی۔ سنہ ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے زمانے میں جب کہ مغربی طاقتوں نے نئی حکومت کو سنبھلنے کی مہلت دیئے بغیر ترکی علاقوں پر دستِ تطاول دراز کرنا شروع کر دیا۔ــــــ آسٹریا نے بوسینا ہرزیگووینا پر قبضہ کر لیا، یونان نے کریٹ کا الحاق کر لیا اور اٹلی نے ٹریپولی پر ہاتھ ڈالا۔ــــــ تو گو ترکوں کو شکست صاف نظر آ رہی تھی مگر وہ اس لُوٹ کو روکنے کے لئے مدافعت پر آمادہ ہو گئے۔ ایسے نازک وقت میں ان لوگوں نے بجائے قوم اور سپاہ کی ہمت بڑھانے کے یہ وعظ کہنا شروع کیا کہ اس تباہی کا باعث ترکی کی مغرب پرستی ہے۔ اب غازی نے ان پر محتسب مقرر کر دیئے ہیں جو ہر وقت ان کے افعال پر نظر رکھتے ہیں۔

اسی طرح درویش تھے جو ناچتے تھے، مداریوں کے سے کرتب دکھاتے تھے اور لوگوں کو اپنے معجز نما علاجوں اور گنڈے تعویزوں کا معتقد بناتے تھے۔ ان کا کوئی مطمحِ نظر نہ تھا، ان کی عبادت میں قربانی کا کوئی پہلو نہ تھا، یہ صرف سادہ لوح لوگوں سے اپنی نفسانی خواہشات پورا کرنے کے لئے روپیہ بٹورتے تھے۔ ان کے تکیوں کی خلوت اور پاکیزگی صرف ان کی بدکرداریوں کی ایک نقاب تھی۔ ان کے مذہبی رسُوم اور خصوصاً ان کے گیدڑوں کے سے نعرے آس پاس کے رہنے والوں کے لئے عذاب بن گئے تھے۔ اور اس کے سوا چارۂ کار ہی نہ رہا تھا کہ ان کی مجرمانہ توہم پرستی کا قلع قمع کر دیا جائے۔

دینیات کے مدرسوں میں محض وقت ضائع کیا جاتا تھا اور طالب علم بھی یہاں صرف اسی کشش کی وجہ سے داخل ہوتے تھے۔ اب یہ مدرسے بند کر دیئے گئے ہیں۔ اب جو طالب علم علمِ دین حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں بھی یونیورسٹی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

قومی تعلیم۔ چھوٹے سے چھوٹے قریہ میں بھی تعلیم نہایت سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہے۔ یہ تحریک بھی اسی طرح شروع ہوئی جیسے ترکی کی اَور تحریکیں ایک طریقِ عمل اور ایک حکم کو لے کر شروع ہوتی ہیں۔ مصطفٰے کمال پاشا نے کہا "تعلیم حاصل کرنا تمہارا قومی فرض ہے" اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ والدین اور ان کے بچّوں نے تمام ملک میں تعلیم کا ڈنکا بجا دیا۔

حکومت کی طرف سے تمام خانقاہیں اور تمام درویش گاہیں مدرسوں میں تبدیل کر دی گئیں۔ کونیہ کی تین عظیم الشان عمارتیں جو کسی زمانے میں ناچنے اور غل مچانے والے درویشوں سے بھری رہتی تھیں آج صنعت و حرفت کی ایک عمدہ درس گاہ بن رہی ہیں۔ یہاں لڑکے اور نوجوان مرد ایک اطالوی اور ایک جرمن کی ہدایات کے ماتحت ہل سے لے کر کرسی اور میز تک تمام چیزیں بنانا سیکھتے ہیں، اور اُن کی بنائی ہوئی چیزیں درس گاہ کے فائدے کے لئے فروخت کر دی جاتی ہیں۔ فروخت سے پہلے گورنر کے معائنہ کے لئے نمائش ہوتی ہے۔ گورنر تمام طلبہ سے واقف

ہے اور وہ ایک ایک کو علیحدہ علیحدہ مبارک باد دیتا ہے اور کہتا ہے "اگر تم پھر غلام بننا نہیں چاہتے تو خوب دل لگا کر کام کرو"

موازنہ (بجٹ) خواہ کتنا بوجھ تلے دبا ہوا ہو وزیر مالیات کو تعلیم کے لئے اتنی رقم منظور کرنی پڑتی ہے کہ مالیہ کو ملحوظ نظر رکھ کر اس کی منظوری بالکل غیر موزون معلوم ہوتی ہے لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے تو اُسے لوگوں کی نظروں سے گر جانے کا اندیشہ ہے کیونکہ وہ تعلیم کو اپنی "قومی روٹی" سمجھتے ہیں۔

ترکی میں اس وقت تین قسم کے مدرسے ہیں ——— ابتدائی، ثانوی اور ریہاتوں کے تعلیم کے نئے ضابطے میں جیسے غازی کے منشا کے مطابق وضع کیا گیا ہے مشاہدے کی تربیت پر بڑی توجہ دی جاتی ہے۔

تمام مدرسوں میں حتّٰی کہ دیہاتی مدرسوں میں بھی عجائب خانے موجود ہیں جن میں طلبہ کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چیزوں کی نمائش کی گئی ہے۔ ننھے کاریگروں کو ان چیزوں کے بنانے میں استاد کسی قسم کی مدد نہیں دیتے، طلبہ اپنے تخیل کو آزادانہ استعمال کرتے ہیں اور اس طرح بہت سی نئی چیزیں معرضِ وجود میں آجاتی ہیں۔ ترکی مدرسوں میں اب مغربی موسیقی اور مصوّری دو نئے اور اہم مضمون ہیں جیسے کہ ریاضی، کیمیا او ترکی زبان وغیرہ اہم مضامین ہیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر وہاں تاریخ کو اہمیت دی جاتی ہے۔ پہلے درجے پر قومی تحریک کی تاریخ ہے جس میں صاف صاف اور سچی سچی باتیں لکھی ہیں کہ ترک زمانۂ گزشتہ میں کیوں شکستیں کھاتے رہے۔ اب انہیں فتح کیوں نصیب ہوتی اور شہریت کے حقوق کیا ہیں۔

یہ تاریخ ہی کی تعلیم ہے جو ترکوں اور بدیسی مدرسوں کے درمیان وجہ نزاع بنی رہی۔ ترک سمجھتے ہیں کہ بدیسی مدرسے اس "مقدس" علم کو پڑھانے کے ناقابل ہیں۔ سلاطین کے زمانے میں بدیسی مدرسے جو تعلیم چاہتے تھے ترکی طلبہ کو دیتے تھے۔ اب جمہوریۂ ترکیہ اکثر اپنے انسپکٹر ان کے معائنے کے لئے بھیجتی رہتی ہے۔ چنانچہ جب کبھی ترک دیکھتے ہیں کہ کوئی مدرسہ پرانے نقشے استعمال کر رہا ہے جن میں سمرنا کو یونانی اور مغربی ولائتوں کو ارمنی مقبوضات ظاہر کیا گیا ہے تو ترک کہتا ہے "نہ کبھی وہ غیر کے قبضے میں تھے اور نہ ہوں گے" اور مدرسہ بند کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ کے معاملہ میں بھی ایسی ہی کارروائی عمل میں لائی جاتی ہے۔ جمہوریۂ ترکیہ کے دعاوی کے خلاف ایک غلطی سرزد ہو جائے اور مدرسہ بند کر دیا جاتا ہے۔

ہر ترکی ماں یہ سمجھتی ہے کہ وہ اپنے بچّے کی تربیت دنیا کی بہترین ماں سے بہتر طریق پر کر سکتی ہے۔ اسی طرح ہر ترک اپنے آپ کو ترکوں کی تعلیم کے لئے، اُن کو اُس طرح تاریخ پڑھانے کے لئے جس طرح وہ پڑھنا چاہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر اُن کو مفید ترکی شہری بنانے کے لئے بہترین ذریعہ خیال کرتا ہے۔

اجنبی کہتا ہے "تمہارے پاس استاد کافی نہیں ہیں"



ترکی مدارس میں مخلوط تعلیم —— اور ڈرائنگ کا ایک سبق

CALCUTTA
ART PG. WORKS.
LAHORE.

ترک جواب دیتا ہے "ہم استاد پیدا کرلیں گے اور اس اثنا میں ہم اپنے گھر میں بیٹھے ہیں اور اُس کا جتنا اچھا انتظام ہم کرسکتے ہیں کریں گے"۔

ترکی مدارس میں اب انقلاب سے پہلے کی بہ نسبت ایک بہتر فضا پیدا ہوگئی ہے۔ استاد یہ کوشش کرتے ہیں کہ بچّے کے ذہنی جوہر سے واقفیت حاصل کریں اور بچوں کے دل میں بھی اب اپنے استاد کے لئے پہلے سے زیادہ عزت موجود ہے۔ ان خوشگوار تعلقات کی وجہ مصطفےٰ کمال کا یہ حکم بھی ہے کہ طلبا کو جسمانی سزا نہ دی جائے۔ جب وہ خود طالب علم تھا تو اُسے ایک دفعہ بےقصور سزا دی گئی تھی جس پر اُس نے مدرسے کو چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ اسے اب بھی طالب علم کا حق سمجھتا ہے۔

غازی پاشا لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کا بڑا حامی ہے۔ لطفی خانم کا سکول اسی اصول پر نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔ لڑکیاں جن کے بال مغربی طریق پر کٹے ہوتے ہیں لڑکوں کے ساتھ جوڑا جوڑا بن کر بیٹھتی ہیں ممکن ہے آئندہ ان میں سے بعض شادی کرلیں اور امریکا کی طرح یہاں بھی وہ لڑکے اور لڑکیاں جو مدرسے میں ایک دوسرے کے رفیق رہے ہیں مسرور ترین متاہل زندگی گزاریں۔

صحتِ عامہ۔ اب سے پہلے ترکی میں عورتیں اپنا علاج مرد ڈاکٹروں سے کرانا معیوب خیال کرتی تھیں اور اب بھی ان کا خیال کچھ زیادہ نہیں بدلا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ عورتوں کی آزادی نے قوم کی صحت پر بھی بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ عورتیں جلد جلد ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کررہی ہیں اور متعدد خواتین بہت اچھّی ڈاکٹر بن چکی ہیں۔

صحتِ عامہ کا مسئلہ تو اہم تھا ہی لیکن بچّوں کی اٹھتّر فی صدی اموات خوفناک حد تک اہم تھیں مصطفےٰ کمال نے یہ کام عورتوں کے سپرد کیا کہ وہ جس قدر جلد ممکن ہوسکے اس نقصان میں کمی پیدا کرنے کی کوشش کریں کیونکہ ایک ایسا ملک جو اپنا تمام خون انقلاب اور عسرت کی راہ میں بہا چکا ہو اپنی نئی پود کو یوں بےدردی سے ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ سردی، خوراک کی کمی، تنگ و تاریک حرموں میں ہوا کی قلت، صحت کُش موٹے نقابوں اور ناموزوں کپڑوں نے سل اور دق کی خوب پرورش کی تھی۔ بچّوں والی ماؤں کی طرف سے بےپروائی کا یہ نتیجہ نکلا تھا کہ موت کے منہ سے بچنے کی استعداد بہت کم بچّوں میں پائی جانے لگی تھی۔ حرم اور نقاب کے منسوخ ہوتے ہی اس خرابی کا ایک حد تک علاج ہوگیا۔ ضیاعِ اطفال کے اس مسئلہ کا حل غازی پاشا نے یہ سوچا کہ اپنی ذاتی سرپرستی میں ایک "انجمنِ تحفظِ اطفال" قائم کردی۔ قومی صحت کو بہتر بنانے کے لئے ہر طریقہ عمل میں لایا جارہا ہے۔ عورتیں گھر میں بھی اور باہر جاکر بھی طبّی تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ ہوٹیڈش قواعد تمام مدرسوں میں رائج کردی گئی ہے، فاضل ڈاکٹر حفظانِ صحت پر

تقریریں کرتے ہیں اور جہاں جہاں امکان ہے وہاں بہبودِ اطفال کے مراکز بھی کھول دیئے گئے ہیں، جن میں بچوں اور اُن کی ماؤں کو خالص دودھ اور ہر قسم کی طبی امداد بہم پہنچائی جاتی ہے، اور ماؤں کو بچوں کی تربیت کے اصول سکھائے جاتے ہیں۔

ترکی عورتیں مذہبی توہمات میں بھی بڑی حد تک اسیر تھیں۔ اور اگر ایک زبردست انسان اٹھ کر ان تمام توہمات کا قلع قمع کر کے قومی صحت کو ایک علمی اصول پر قائم نہ کر دیتا تو اب تک جاہل عورتیں اپنے بچوں کو بجائے ماہر نرسوں کے حوالے کرنے کے درویشوں سے پامال کرانے کے لیئے جایا کرتیں۔ لیکن اس کام کے لئے اُن کی اپنی قوم کے ایک شخص کی ضرورت تھی، کوئی اجنبی اس کو انجام نہیں دے سکتا تھا۔ عورتوں کو آزاد کرنے میں مصطفٰے کمال پاشا نے اُسی طاقت کو استعمال کیا جو اُس کی قوم کو بچا سکتی تھی، اور شمار و اعداد اُس فرق کو ظاہر کر رہے ہیں جو بچوں کی اموات میں واقع ہُوا ہے۔

تحریکِ خواتین ۔ ترکی میں تحریکِ خواتین کے متعلق کچھ لکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی غیر موجود چیز کے متعلق کچھ لکھا جائے! تحریکِ خواتین وہاں دراصل مردوں کی تحریکِ ترقی کا ایک جزو ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور نہ کوئی امکان پایا جاتا کہ عورتوں کو ایک الگ تحریک کی ضرورت ہو۔

چونکہ آزادی عورتوں کو مصطفٰے کمال نے دی ہے اس لئے اُن کے مستقبل کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔ چنانچہ اُس نے حکم دے دیا ہے کہ عورتیں بھی اُنہیں شرائط اور اُسی طریق سے پروفیسر، ڈاکٹر، وکیل، صنّاع اور مصنّف بن سکتی ہیں جس طرح مرد بنتے ہیں اُن کی علیحدہ درسگاہیں قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اُس کا خیال ہے کہ "آرٹ یا جوہر کے لئے کسی نوع کی تخصیص نہیں۔ یہ ایک الہام ہے جس کی مردانہ یا زنانہ نوعیّت کا انحصار روح پر ہے" اس لئے ملک کو مردوں اور عورتوں کی تحریکات میں تقسیم کرنا ایک مانی ہوئی غلطی ہے۔ "ترک اوجق" (ترکی کلب) جس کی شاخیں تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہیں اُس کی سب سے اہم شاخ کے لئے قوم نے ایک خاتون نقی خانم کو صدر منتخب کیا ہے اور یہ مردوں اور عورتوں کے بے غرضانہ اشتراک کی ایک قابلِ تعریف مثال ہے۔ یہ کلب جس پر ترکوں کو بڑا ناز ہے اپنے وجود کے لئے حمد اللہ صبحی بے کی ممنون ہے۔ نہایت ادنیٰ حالت سے یہ ادارہ ترقی کر کے اب اِس عروج کو پہنچ گیا ہے کہ ہم اسے رجعت اور مذہب کے فتنوں کے لئے ایک زبردست ہتھیار اور ملک کی عظیم ترین قوتوں میں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہاں تقریریں ہوتی ہیں، مختلف مضامین کے سبق دیئے جاتے ہیں اور موسیقی، ناٹک اور سنیما کے تماشے دکھائے جاتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ ۔ اگر یہ سچ ہے کہ بصیرت کے بغیر قوم مٹ جاتی ہے تو ہم کہیں گے کہ آرٹ بصیرت کی غذا ہے۔ اُس ملک کی روح جہاں آرٹ کم ہے تشنہ رہتی ہے اور ترکی کی روح بھی تشنہ ہی تھی۔ مصطفٰے کمال نے جہاں اور اہم اصلاحات

کیں وہاں اس شعبہ میں بھی ترقی کے امکانات پیدا کر دیئے۔ اب ترکی میں تصاویر کی نمائشیں منعقد ہوتی ہیں اور پاشا کی طرف سے مصوری، موسیقی اور ادبیات کے لئے انعام تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ملک کے تمام نوادر جو جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے اکٹھے کر کے عجائب خانوں میں رکھ دیئے گئے ہیں اور اُن پر ٹکٹ لگا دیا ہے۔

تمام فنون میں سے ڈراما کے لئے ترکی میں کامیابی کے بہت زیادہ امکانات پائے جاتے ہیں کیونکہ ترک قوم کی ایک ایک بات ڈراما سے خاص مناسبت رکھتی ہے۔ صدر سے لے کر معمولی کسان تک اِس قوم کا ہر فرد اپنے مطلب کو کامل طور پر اشاروں میں بیان کر سکتا ہے۔ اچھی تمثیل کی پہچان یہ ہے کہ اسے انسان الفاظ سُنے بغیر سمجھ سکے اور یہ خوبی ترکی تمثیل میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

پہلے زمانے کے ناٹک میں ایک نقص یہ تھا کہ اُس میں مسلمان عورتیں حصہ نہ لے سکتی تھیں۔ عورتوں کا پارٹ یا تو مرد کیا کرتے تھے یا ارمنی عورتیں کرتی تھیں۔ دونوں صورتوں میں کھیل تباہ ہو جاتا تھا۔ مردوں کے تو حرکات و سکنات ہی عورتوں سے الگ ہوتے تھے اور ارمنی عورتیں ترکی زبان ایسے کرخت لہجے میں بولتی تھیں کہ کانوں پر اُس کا نہایت ناخوشگوار اثر پڑتا تھا۔ نئے دور نے ناٹک میں جان ڈال دی ہے۔ اب جو کھیل دکھائے جاتے ہیں اُن میں ترکوں کے گزشتہ اور موجودہ شہ پاروں اور دوسری زبانوں کے تراجم کو پیش کیا جاتا ہے۔

موسیقی میں بھی مغربیت آ گئی ہے۔ ترکی عود کی دھیمی لطیف آواز اب سنائی نہیں دیتی نہ دوسرے قدیم ساز کہیں نظر آتے ہیں۔ موسیقی کے لئے اصول اور اصطلاحات تمام مغربی ہیں اور غزلوں کی جگہ قومی گیتوں نے لے لی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ حد سے بڑھی ہوئی قومیت کا یہ دور جس میں سے اس وقت ترک گزر رہے ہیں اُن کی غزلی اور ادبی خوبیوں کو کھو دے گا۔ لیکن وہ غلطی پر ہیں۔ وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ "قومیت" کے مبالغہ کا یہ دور جب گزر جائے گا تو انگورہ کی کہانی اپنی تمام لطافتوں کے ساتھ اپنا اظہار چاہے گی۔

ترکی سکول آف آرٹ ایک عمدہ درس گاہ ہے جو پرانی پارلیمنٹ کی عمارت میں قائم ہے۔ آرٹ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے حکومت نے بڑی کوششیں کی ہیں اور جو متعدد نمائشیں یہاں منعقد ہوتی ہیں وہ امید افزا مستقبل کی خبر دیتی ہیں۔

رسم الخط کی تبدیلی۔ اصلاحات کے سلسلہ میں عربی کے بجائے لاطینی حروف کا رواج ایک اہم تبدیلی ہے۔ گزشتہ دور کے بہت سے لوگ اب بھی اپنی ذاتی خط و کتابت میں عربی رسم الخط کو ترجیح دیتے ہیں۔ مگر دفتری اور کاروباری تحریروں میں جن کے لئے نیا ترکی رسم الخط ضروری ہے اُن کا یہ طرزِ عمل ہے کہ وہ پہلے مسودہ عربی خط میں تیار کر لیتے ہیں

اور پھر عجب بے سلیقگی سے لاطینی خط میں اس کا مبیضہ لکھتے ہیں۔ بہرحال اب معلوم یہ ہوتا ہے کہ لاطینی رسم الخط ترکی زبان کے لئے مستقل طور پر رائج ہو چکا ہے۔

یہ ہے جدید ترکی کا ایک ہلکا سا خاکا! ترکی، جسے مصطفٰے کمال نے بنایا! لوگ حیران ہؤا کرتے تھے کہ "انگورہ کا یہ راہب" اپنے دُور افتادہ مکان کی تنہائیوں میں کیا کیا کرتا ہو! وہ جدید ترکی کا نقشہ اپنے دل میں تیار کر رہا تھا، ایسا نقشہ جس میں قوم کی فلاح و بہبود کا رنگ نہایت شوخ بھرا گیا تھا۔ پھر جب اُس نے دیکھا کہ اُس کا یہ شاہ کار تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور اب وہ اس قابل ہے کہ لوگوں کی نگاہیں اس پر پڑیں تو اُس نے حجاب اٹھا دیا کہ دنیا "حیرت انگیز شخص کا حیرت انگیز کارنامہ" دیکھ لے!

منصور احمد

اگر میں اس قدر کم مایہ اور ادنیٰ ہوتا جیسے پستی کے میدان، اور تم، میری پیاری، اتنی اعلیٰ اور بلند جیسے آسمان کی سطح، تاہم میرے خیالات، میری محبت کے اعزاز میں، تمہارے ساتھ ساتھ آسمان تک پہنچ جاتے۔

اگر میں اس قدر سربلند ہوتا جیسے آسمان کی رفعت، اور تم میری پیاری، اتنی کم مرتبہ اور ناچیز جیسے سمندر کی سب سے نیچی سطح، —— تم کچھ بھی ہوتیں، مگر میری محبت تمہارے ہی لئے ہوتی۔

اگر تم زمین ہوتیں، میری پیاری، اور میں آسمان، میری محبت، آفتاب کی مانند تم پر چمکتی رہتی، اور بے شمار آنکھوں سے تمہارے چہرہ کو دیکھتی، یہاں تک کہ آسمان اندھا ہو جاتا اور دنیا فنا ہو جاتی۔

غرض میں جو کچھ بھی ہوں، عالی مرتبت، یا بے بساط، اور تم جو کچھ بھی ہو، میرا دل ہمیشہ تم سے محبت کرے گا۔

(سلوسٹر)

محشر عابدی

غزل

اُس کم آزار کو رُسوا ہمیں کرنا ہی پڑا
زندگی اِس قدر آساں تھی کہ مرنا ہی پڑا

قصدِ ساحل تھا، پر اے ہمّتِ دشوار پسند
آگے دریا ہے تو اب پار اُترنا ہی پڑا

تھے ہم افتادہ، یونہی عمر بسر ہو جاتی
اب دباتا ہے زمانہ تو اُبھرنا ہی پڑا

گر ہے جینے کے لئے منّتِ عیسیٰ بھی ضرور
ہم کو مرنا ہی پڑا، جاں سے گزرنا ہی پڑا

جوشِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل کا حریف
آخر اُبھری ہوئی موجوں کو اُترنا ہی پڑا

حامد علی خاںؔ

عربی خواتین اور تعلیم

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مستورات کو تعلیم دینا غیر ضروری ہی نہیں بلکہ سرتاپا مضر بھی ہے لیکن سچ پوچھئے تو واقعہ کی اصل حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ عہدِ ماضی میں خواتین و مستورات اعلیٰ پیمانے پر تعلیم پاتی تھیں اور اُن کا اخلاق دنیا کے لئے ایک بہترین نمونۂ عمل ہوتا تھا۔ آج بھی ٹرکی، سوریہ اور مصر وغیرہ میں جہاں مستورات کی تعلیم کا اہتمام ہے وہاں کی عورتیں اپنے اسلاف کی سیرۃ اولیٰ کا ایک پیکرِ مجسّم ہیں۔ اس لئے خواتین کے لئے تعلیم کو غیر ضروری سمجھنا درحقیقت ایوانِ عدل و انصاف کا ایک سنگین جرم ہے۔ عربی خواتین کے تعلیمی حالات پڑھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُن میں تعلیم و تعلّم کا اس قدر رواج تھا کہ بیشتر خواتین متعدد علوم وفنون میں مسلّم الثبوت استاد مانی جاتی تھیں۔

ابتداءِ اسلام میں بعض تعلیم یافتہ خواتین۔ عربی مستورات کی تعلیم کے متعلق جب ایک خاص نوع کے ماتحت غور کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ نبوت میں بھی بعض تعلیم یافتہ عورتیں موجود تھیں۔ علّامہ بلاذری مصنّف فتوح البلدان اپنی تاریخ میں جہاں یہ لکھتے ہیں کہ عہدِ رسالت میں ۱۷ اشخاص فنّ کتابت کے جاننے والے تھے وہاں یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ابتداءِ اسلام (۶۲۲ء) میں چار پانچ تعلیم یافتہ خواتین بھی تھیں۔ انہی کی ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور صلعم نے ام المومنین حضرتِ حفصہؓ کو کتابتِ رقی کی صنعت سکھانے کے لئے شفا بنتِ عبداللہ کو طلب فرمایا تھا۔ اس لئے کہ شفا، ام المومنین کو پہلے سے فنِّ کتابت سکھا رہی تھیں، اور خود شفا اس فن کو بہت دنوں سے جانتی تھیں۔ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرتِ ام کلثوم بھی فنِّ کتابت سے واقف تھیں۔ عائشہ بنتِ سعد بیان کرتی ہیں کہ خود میرے باپ نے مجھ کو پڑھنا بتایا تھا اور کریمہ بنتِ مقداد کو ان کے باپ نے لکھنے کا ڈھنگ سکھایا تھا۔ حضرتِ ام سلمہؓ پڑھ لیتی تھیں لیکن لکھنا نہ جانتی تھیں۔ یہ چھ خواتین ہیں: شفا، حفصہ، ام کلثوم، عائشہ، کریمہ، ام سلمہ جو عرب کے اندر ساتویں صدی کے اوائل میں تعلیم یافتہ گذری ہیں۔

علامہ نووی نے (۱۲۷۶ء) اپنی مشہور تصنیف تہذیب الاسماء میں قاموسِ تراجم کے ضمن میں شہیرات خواتین کی ایک فصل باندھی ہے۔ ان میں سے بعض خواتین کو یہاں پر بیان کیا جاتا ہے جو احادیثِ نبوی کی نقل کا واسطہ تھیں اور جنہوں نے عصرِ اول میں کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو تاریخِ اسلام میں ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے جو محترم ہستی لائقِ ذکر ہے وہ ام المومنین حضرتِ عائشہ کی ذات گرامی ہے حضرتِ عائشہ ام المومنین اور آنحضور صلعم کی چہیتی بیوی تھیں۔ آپ کے غیر معمولی فہم اور ذکاء، فطنت اور دانائی پر تمام مورخین اور اربابِ سیر کا اتفاق ہے۔ سطورِ بالا میں یہ گذر چکا ہے کہ آپ پڑھنا جانتی تھیں، لیکن نووی کی روایت میں اتنا اور آیا ہے کہ آپ ہزار حدیثوں کی حافظ تھیں، ام المومنین کی قوت اور شہامت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ آپ نے اکثر اسی لیے تو پر اوازۂ سیاسیہ میں شرکت فرمائی ہے حتیٰ کہ واقعہ جمل میں حضرتِ علی کرم اللہ وجہہ کے مقابلہ کے لئے خود بہ نفسِ نفیس معرکۂ کارزار میں تشریف لاتی تھیں۔ حضرتِ عائشہ کی ہمشیرہ حضرتِ اسماء بھی ایک نامور تعلیم یافتہ اور مشہور خاتون گذری ہیں۔ ثقافتِ اسلامیہ کی غیر معمولی ترقی میں آپ کا ہاتھ بھی شریک تھا۔ ۵۶ حدیثوں کی آپ راوی ہیں، عبداللہ بن زبیر جب امویوں کے حق میں اعترافِ شاہی سے منکر ہو گئے اور اس کی پاداش میں حجاج کی طرف سے اُن پر سختیاں ہونے لگیں، تو اس نازک وقت میں حضرت اسماء نے ہی ان کی پشتیبانی کی، اور آخر وقت تک حق و صداقت کا سررشتہ اُن کے ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا۔ یہاں تک کہ قسی القلب حجاج نے اس راہِ حق کے مجاہد کو موت کے گھاٹ اتار کر دم لیا۔ حضرتِ اسماء کی بلند نفسی اور شجاعتِ قلب کا اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۶۳۶ء میں آپ اپنے شوہر کے ساتھ معرکۂ یرموک میں تشریف لے گئی تھیں، اور تاریخ کا یہ وہ مشہور واقعہ ہے جس میں عربوں نے رومیوں کو بُری طرح شکست دے کر پورے سوریہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ حجاج کے مقابلہ میں راہِ حق کے ثبات پر آپ ہی نے اپنے لختِ جگر کو ان لفظوں میں غیرت دلائی تھی یا بنی! "عش کریماً او مت کریماً"

حضرتِ اسماء پوری ایک صدی تک زندہ رہیں اور آخر وقت تک آپ کے تمام عقلی اور جسمانی قوا درست و صحیح تھے حتیٰ کہ آپ کا ایک دانت بھی نہیں ٹوٹا تھا۔

اس سلسلہ کی تیسری سنہری کڑی حضرتِ ام درداء ہیں آپ ایک تعلیم یافتہ اور بڑی پابندِ شریعت خاتون گذری ہیں۔ آپ مصاحبتِ علما کی بہت حریص تھیں۔ ساتویں صدی کے وسط تک زندہ رہیں، آپ کے غیر معمولی مقدرۃ و ذکا پر سب کا اتفاق ہے۔

مدارسِ نسواں ۔ جن خواتین و سیدات کا ابھی ابھی ذکر ہوا ہے، وہ تو اسی طرح اپنے اپنے گھروں میں رہ کر علوم کی تحصیل کرتی تھیں جس طرح مرد باہر اس دولت کو کمایا کرتے تھے، لیکن اس کے بعد تاریخ میں ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے، جس میں مستورات بھی مدرسوں میں جا جا کر علوم حاصل کیا کرتی تھیں، اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس زمانہ کے مدارس میں عورتیں بچوں کے ساتھ ساتھ پڑھتی تھیں، اور اُن کے معلم بھی عموماً مرد ہی ہوا کرتے تھے۔ نویں صدی کے وسط میں کوفہ کے اندر ایک نسوانی مدرسہ کا ذکر تاریخ میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ کوفہ ہی کے مشہور قبیلہ بنی عبس میں بھی ایک مکتب تھا

جس کے تلامذہ کی صف میں نوجوان عورتیں بھی شامل تھیں، ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدارس میں بچوں کے ساتھ نوجوان عورتیں بھی پڑھنے جایا کرتی تھیں۔ مشہور معلم علامہ خلیل کے مدرسہ میں بچوں کے ساتھ ساتھ بچیاں بھی تعلیم پاتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ولید بن عبد الملک خلیفہ اموی (۷۱۵ء) کا ایک ایسے مدرسہ پر گذر ہوا جس میں طلبا کے ساتھ ایک کنیز بھی قرآن پڑھ رہی تھی۔ کثرتِ تعلیم کی وجہ سے اس زمانہ میں کنیزیں بھی عموماً تعلیم یافتہ ہوا کرتی تھیں۔ مرحوم علامہ براؤن پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی لکھتے ہیں کہ خلیفہ ہارون الرشید کی خدمت میں (۸۰۹ء) ایک کنیز ۱۰ ہزار دینار پر پیش کی گئی، تو خلیفہ نے اس کی خریداری اس شرط پر منظور فرمائی کہ پہلے علوم و فنون میں اس کا امتحان لیا جائے۔ پروفیسر مرحوم اس امتحان کی کیفیت ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں کہ:-

"مشہور مشہور اساتذۂ فقہ و شرع، تفسیر و حدیث، طب و حکمت، فلسفہ و منطق، ادب و بلاغت، شطرنج و چوسر نے یکے بعد دیگرے اس کنیز کا امتحان لیا۔ اُس نے ان کے ہر سوال کا بہترین جواب دیا، اور بعض مواقع پر اُس نے جب ان علما کا تعاقب کیا تو اُن کو اپنا پیچھا چھڑانا دشوار ہو گیا۔" یہ شہادت درحقیقت ایک بہت ہی وقیع شہادت ہے اس سے یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے کہ عصورِ وسطیٰ میں مسلمان کیونکر علوم عامہ کو حاصل کیا کرتے تھے اور سیدات و خواتین مختلف علوم و فنون میں کتنی دستگاہ رکھتی تھیں؟ صاحبِ اغانی نے اس قسم کی ایک دوسری روایت نقل کی ہے کہ خالد بن عبد اللہ نے بڑی بڑی قیمتوں پر ۳۰ لونڈیاں خریدیں اور اُن کو قرات و تجوید، موسیقی اور شاعری کی عمدہ تعلیم دلوائی، حتیٰ کہ اُن میں سے ہر ایک کو کمیت شاعر کے تمام قصائد بر زبان یاد تھے۔ اسپین کی ایک کنیز نے نحو اور لغت میں اتنی دستگاہ حاصل کی کہ ائمۂ فن نے اس کو مسلّم الثبوت استاذ کا منصب عطا فرمایا۔ ان تمام تاریخی واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عصورِ وسطیٰ میں خواتین و سیدات تعلیمی میدان میں بہت آگے تھیں، اور ان میں حصولِ تعلیم کے دونوں طریقے عام طور سے رائج تھے، اگر بعض سیدات گھروں میں رہ کر تعلیم حاصل کرتی تھیں تو اکثر خواتین مدارسِ عامہ میں بڑے بڑے اساتذۂ فن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کے شرف سے مشرف ہوتی تھیں،

مدارس میں جنسین کے اس اشتراک و اختلاط پر آپ کو متعجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لئے کہ یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ عربی عورتیں اپنے شوہروں کی مرافقت میں میدانِ جنگ کی طرف بھی جاتی تھیں اور حیاتِ عامہ کے بوجھوں کو اٹھانے میں بھی اُن کا ساتھ دیتی تھیں، اور شوؤنِ عامہ کی تدبیروں میں بھی ان کے ساتھ مشترک رہتی تھیں۔ غرض یہ کہ وہ مردوں کے ساتھ ہو کر تمام کام کرتی تھیں۔ اور یہ صرف اس لئے تھا کہ ان کی حریت و آزادی عین شریعت کے مطابق تھی، رسم و رواج کی بوجھل زنجیروں سے ان کے قدم گرانبار نہ تھے۔

معلماتِ عربیات۔ عرب کی بعض خواتین فاضلہ نے درس و تدریس کی خدماتِ جلیلہ بھی انجام دی ہیں علامہ ابن خلکان اور مقری

نے بہت سی ایسی خواتین کے نام گنائے ہیں جو علمی میں شہرۂ آفاق تھیں، چنانچہ شہدہ بنتِ ابی نصر تعلیمی مہارت میں بہت مشہور ہیں۔ آپ سے بہتیرے مردوں نے علوم کی تحصیل کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سنہ ۲۰۰ھ میں جب امام شافعی رح قاہرہ تشریف لے گئے تو نفیسہ بنتِ ابی محمد کے پاس آئے اور ان کی مرویات کا استماع فرمایا۔ یہ محترم خاتون جہاں علم و فضل میں مشہور تھیں، وہاں تقویٰ و پرہیزگاری میں بھی اپنی نظیر آپ تھیں۔

ابو حیان کہتا ہے: جن اساتذہ سے میں نے علوم کی تحصیل کی اُن میں تین عورتیں بھی ہیں (۱) مؤنسہ بنتِ ملک العادل (صلاح الدین کا بھائی سنہ ۱۹۶ھ) (۲) شامیہ بنتِ حافظ (۳) زینب بنتِ عبد اللطیف، اس کے علاوہ کاتبہ بنتِ عبری (جنہوں نے عبد الرحمٰن فقیہ سے بخاری پڑھی تھی) وغیرہ ملاقاتی معلّمات کی تعداد مزید برآں ہے۔

اشبیلیہ میں مریم بنتِ ابی یعقوب آدابِ زبان کی ایک ماہر معلّمہ تھیں۔ موصوفہ محض معلّمہ ہی نہ تھیں بلکہ نکتہ سنج شاعرہ بھی تھیں۔ یاقوت کی ایک روایت میں ہے کہ ابنِ عساکر نے ۱۳۰۰ معلم اور ۸۰ معلّمات سے علوم کی تحصیل کی تھی۔ ابنِ خلکان لکھتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتیں برابر درس دیتی تھیں اور فاضل طلبا کو اجازات و شہادات بھی عطا کرتی تھیں۔

اسپین کا نامور مورخ مقری بیان کرتا ہے کہ اندلس کے عرب اپنی تعلیم یافتہ عورتوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ مفاخرۃ کے باب میں مورخ موصوف نے کسی عربی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کیا تمہارے شہر نے کوئی ایسی خاتون پیدا کی جو ہماری مشہور شاعرہ مروانیہ کے مانند ہو؟ ہماری وہ مروانیہ جس نے شعر و سخن میں وزیر ابنِ زیدون سے بحث کی تھی، اور کیا زینب بنتِ زیاد کی کوئی نظیر تمہارے ملک میں ہے؟ پھر مورخ مذکور ہی آگے چل کر یہ لکھتا ہے کہ اہلِ اندلس مرد ہوں یا عورت، بوڑھے ہوں یا جوان سب کے سب آدابِ لغت میں ماہر اور یکتا ہیں۔

بہرحال ان تمام واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں بچیاں بھی عموماً بچوں کے ساتھ مدارس میں پڑھتی تھیں، اور اکثر لونڈیاں کنیزیں علوم و فنون میں ماہر اور ثقافت و تہذیب کے انتہائی درجہ پر فائز ہوتی تھیں، اور خواتینِ فاضلہ، مردوں کو بڑے بڑے موضوعاتِ ادبیہ کی تعلیم دیتی تھیں۔ یہی وہ تاریخی واقعات ہیں جو اس حقیقت کی پردہ کشائی کرتے ہیں کہ مستورات بھی صناعاتِ ادبیہ میں مردوں کی مشارک اور سہیم رہ چکی ہیں۔

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ بلدانِ عربیہ میں عورتوں کی تعلیم بالکل عام تھی، مگر اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ تثقیفِ عقل اور تحصیلِ علوم میں ایک عورت کے حقیقی میلان اور واقعی رجحان پر بہت کچھ روشنی ڈالتا ہے۔

فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ

بدر اصلاحی

پپیہا

روح بیتاب و پر افشاں ہے ترے نغموں سے
حافظہ حشر بداماں ہے ترے نغموں سے

کس قیامت کا ہے نغموں میں ترے سوز و گداز
جسم سے روح ہوئی جاتی ہے محوِ پرواز

تیر کی طرح سے پیوست ہوئی جاتی ہے
تیری آواز رگِ جاں میں چُبھی جاتی ہے

تیری "پیہو" میں وہ پنہاں ہے خروشِ بیتاب
جس نے یکلخت اُلٹ دی رُخِ ماضی سے نقاب

اب تخیل میں ہے دُھندلا سا وہ عہدِ موہوم
جس جگہ دفن ہے گذری ہوئی خوشیوں کا ہجوم

ایسی بے نام فضاؤں میں اُڑا جاتا ہوں
جس جگہ ہوش، نہ مستی، نہ خرد ہے نہ جنوں

دل مئے درد سے لبریز ہوا جاتا ہے
غم نہ ہونے پہ بھی دل ہے کہ بھرا آتا ہے

یہ خلش وجہ سکوں بھی ہے جنوں خیز بھی ہے
دردِ جانکاہ بھی، تسکینِ غم آمیز بھی ہے

روح بے تاب و پر افشاں ہے ترے نغموں سے
حافظہ حشر بداماں ہے ترے نغموں سے

ذوقی

ترکی اور آزادیِ نسواں

عورتوں کی سب سے پہلی انجمنیں قسطنطنیہ میں ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد قائم ہوئیں۔ ان انجمنوں کے قیام کا مقصد مختلف قسم کے حقوقِ آزادی حاصل کرنا تھا۔ مثلاً بے پردہ پھرنا، گھر میں مردوں کے مقابلے میں مساوی درجہ رکھنا، وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اسی سلسلے میں قسطنطنیہ کی پڑھی لکھی عورتوں میں سے عزیز حیدر عثمان کی مساعی خاص طور پر قابلِ ستائش ہیں۔ "سینٹ پیٹرز برگ" (۲ فروری ۱۹۱۳ء) کی اطلاع کے مطابق قسطنطنیہ میں خالدہ خانم فاطمہ علی، نگار خانم، طبقۂ نسواں کی ممتاز سرکردہ تھیں۔

لیکن اس تحریک کی کامل ترقی جنگِ عظیم کے بعد ہوئی۔ جب کہ بہت سی عورتوں نے ترکوں کے دوش بدوش میدانِ کارزار میں حصّہ لیا۔ جب یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ جمالیا تو سب سے پہلے اُن کے خلاف آواز اٹھانے والی یہی جماعت تھی۔ اس کے بعد عورتیں مختلف محکموں میں کام کرنے لگیں۔ اور یہ چیز ان کو حقوقِ آزادی کے حصول میں بڑی حد تک ممد ہوئی۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے آزادی کی یہ تحریک جنگِ عظیم کے بعد پُورے جوش سے نمودار ہوئی۔ عورتوں نے جہاں ایک طرف اپنے حقوق کو حاصل کرنے کی جدوجہد کی وہاں اپنے ملک میں جمہوریت پیدا کرنے میں بہت بڑا حصّہ لیا۔ اور آج ٹرکی کی آزادی انہی کی پُرزور اور خالص مساعی کی شرمندۂ احسان ہے۔

حکومتِ انگورہ نے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے مشترکہ ابتدائی مدارس کھول کر ملک پر بہت بڑا احسان کیا۔ ۱۹۲۰ء میں تقریبًا بارہ زنانہ انجمنیں تھیں جن کا کام طبقۂ نسواں کی سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی اصلاح کرنا تھا۔ آج ترکی عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کا سہرا انہی جماعتوں کے سر ہے۔

عورتوں نے حقوقِ آزادی کے لئے منظم کوشش ۱۹۲۳ء کے اوائل میں شروع کی۔ "وقت" کی ۱۸ مئی کی اشاعت میں ایک نئی زنانہ انجمن کے قیام کا اعلان ہؤا۔ اس انجمن کا نام "مدافعِ حقوقِ نسواں" تھا جس کی بانی محی الدین خانم تھی جو موصل کے حاکم مرافعہ کی بیٹی تھی، لیکن اس انجمن کا کام کچھ زیادہ فروغ حاصل نہ کرسکا۔ یہاں تک کہ حکومت نے ان کی مدد کے لئے ہاتھ بڑھایا، غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے برسرِ اقتدار ہوتے ہی سب سے

پہلا کام جو کیا وہ آزادیٔ نسواں تھا، ابتداءً ۱۹۲۵ء میں مردوں کو انگریزی ٹوپی پہننے اور عورتوں کو بے پردہ پھرنے کی اجازت مل گئی، ۱۷ فروری ۱۹۲۶ء کو انگورہ کی مجلسِ جمہوریہ کے متفقہ فیصلے پر ملک میں عورتوں کی جداگانہ اور مستقل حیثیت قائم ہوگئی -

سب سے پہلے مسئلہ طلاق و نکاح کی اصلاح ہوئی - اور یہ قرار پایا کہ فریقین میں سے کسی کو طلاق کا حق حاصل نہیں جب تک کہ قانون اجازت نہ دیتا ہو اور ساتھ شرعی نکاح سے پہلے سول نکاح (قانونی طور پر) کا ہونا نہایت ضروری ہے - اس اصلاحی قانون پر سب سے پہلے ۱۹۲۶ء میں عمل شروع ہوا - ٹرکی میں نابالغوں کا نکاح ولی کی وساطت سے ہوتا تھا - اس کے لئے بالغ لڑکوں کی عمر ۱۸ سال اور لڑکیوں کی عمر ۱۷ سال مقرر ہوئی - لیکن "کادین برلیگی" یعنی انجمنِ نسواں نے اس کو بھی ناکافی سمجھا اور مختلف امور کی غور و پرداخت کے لئے قسطنطنیہ کانگرس کے انعقاد کا انتظام کیا - ۱۸ مارچ ۱۹۲۷ء تاریخ جلسہ مقرر ہوئی لیکن کورم کے پورا نہ ہونے پر جلسہ ملتوی کر دیا گیا - تاہم مفصلہ ذیل مباحث پر ابتدائی کارروائی عمل میں آئی :-

(۱) مجلسِ بین الاقوام کے نقطۂ نظر سے عورتوں کی حالت -

(۲) مردوں اور عورتوں کی تنخواہ میں مساوات -

(۳) محکمہ پولیس میں عورتوں کا داخلہ -

(۴) آزادی کا موجودہ مفہوم -

(۵) منکوحہ عورتوں کی قومیّت

(۶) بے وسیلہ عورتیں اور حکومت کا فرض -

(۷) کنواری مائیں اور اولادِ حرام

(۸) بدچلنی کا انسداد

یہ تمام تجاویز زنانہ مجلسِ بین الاقوامی کے روبرو پیش ہونے کے لئے تھیں -

چند روز بعد کانگرس نے اپنا کام محی الدین خانم کی صدارت میں شروع کیا - انجمن کے اغراض و مقاصد کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے کہا کہ ہم یہاں اس لئے نہیں جمع ہوئے کہ مردوں سے مسترحمانہ انداز میں اپنا استحقاق ظاہر کرکے اُن سے حقوق کے تحفظ کی درخواست کریں بلکہ ہمارا منشا مستقل اور کلّی حقوقِ مساوات کے حاصل کرنے کا ہے - اس پرتز کی شاعرہ "امین علی بے" نے جو اس کانگرس کا حامی تھا سوال کیا کہ یہ مجلس اتنے اہم اور بڑے کام کی تمام

لازمی مشکلات کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہے" صدر جلسہ نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ مجلس جمہوریت کے اصولوں پر قائم ہوئی ہے اور اس کے اغراض و مقاصد میں ان تمام اہم اور مشکل امور سے عہدہ برآ ہونا شامل ہے۔

تین سال کی لگاتار کوشش کے بعد یہ قرار پایا کہ ہر ایک شخص کو کونسل میں جانے کا حق حاصل ہے تو اس مجلس نے مفصلہ ذیل کمیشن مقرر کئے۔

(۱) تعلیمِ نسواں

(۲) پریس

(۳) صحتِ عامہ

(۴) زنانہ مجلسِ بین الاقوام کے ساتھ تعلق

جلسے کے برخاست ہونے سے پہلے صدر نے عورتوں کے کونسلوں اور میونسپل کمیٹیوں میں امیدوار کھڑے ہونے پر بے حد زور دیا۔ اس تجویز کو ابتدائً قسطنطنیہ کے گورنر نے نامنظور کیا اور یہ عذر پیش کیا کہ عورتیں محض بچے پیدا کرنے کے لئے ہیں اُن کے لئے سیاسی امور میں حصہ لینا جسمانی طور پر ناممکن ہے۔ اس پر نامی خانم ایک خاتون نے نہایت شدید جواب دیا۔ جس پر حکومت کو اسے سزا دینی پڑی۔ لیکن ساتھ ہی حکومت نے عورتوں کے ایک کلب کو جو زنانہ یونین کے ماتحت تھا تسلیم کر لیا۔ اس کلب کا کام عورتوں کی عام معاشرتی اصلاح کرنا تھا۔ اسی یونین نے لڑکیوں کے لئے فرانسیسی زبان کے درس و تدریس کا انتظام کیا اور اُن کے لئے جدید سادہ لباس تجویز کیا۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود سیاسی حقوق کے لئے جدوجہد جاری رہی اور اخبارات و رسائل اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں اس پر خوب بحثیں ہوئیں، مجلسِ مشاورت کے صدر کاظم پاشا نے لکھا کہ عورتیں ابھی اس قابل نہیں ہوئیں کہ وہ ممبر انتخاب کی جائیں۔ فی الحال انہیں ووٹ کا حق حاصل کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ "رجب بے" نے جو اُن کا بہت مداح تھا یہ کہہ دیا کہ ابھی اس کام کے کرنے کا وقت نہیں آیا۔ اسی طرح جمہوریت کے ڈاکٹر نے جب ترکی عورتوں کی جنگی کارگذاریوں کی بے حد تعریف کی تو محی الدین خانم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ حقوق ووٹ اور فوجی خدمات کو خبط کہہ دینا غلطی ہے، بوڑھے آدمی جو میدانِ جنگ میں نہیں جا سکتے ووٹ کیوں دیتے ہیں؟

ان تمام مخالفتوں کے باوجود یہ جدوجہد جاری رہی یہاں تک کہ نظامِ حکومت میں اور بھی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔

پبلک میں عورتوں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ چنانچہ محی الدین خانم نے اخبارات میں یہ اعلان شائع کیا۔

"آج تک ہماری کوششوں کا نتیجہ صرف اتنا ہؤا ہے کہ ہم نے پبلک کے صحیح خیالات کا اندازہ کرلیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ لوگ ہمارے ہمدرد ہیں۔ اب ہم آیندہ کونسل میں امیدوار بھیجیں یا نہ بھیجیں ایک سی بات ہے۔ اس وقت تک تین سو مرد ہماری حمایت پر تلے ہوئے ہیں۔ محمود صادق بے ہمارے ساتھ ہیں۔"

اسی قسم کا ایک اور اعلان بھی شائع ہؤا جس میں عورتوں نے اپنے خیالات کا اظہار نہایت جوش آمیز لہجہ میں کیا۔

"ہم اپنے حقوقِ انتخاب کے لئے جدوجہد کو نہیں چھوڑ سکتے اور اس کے لئے آخری دم تک جان توڑ کوشش کریں گے اور اگر حصولِ مقصد کے لئے ہماری زندگی بہت مختصر ہوئی تو ہماری آیندہ نسل اس کام کو سرانجام دے گی۔"

کچھ عرصے کے بعد یونین میں اختلافِ رائے ہؤا اور پہلا نظام درہم برہم ہوگیا۔ محی الدین خانم کی جگہ سعدی خانم متفقہ طور پر صدر مقرر ہوئیں۔ لیکن انہوں نے انکار کردیا اور بالآخر لطفی خانم نے ان کی جگہ لے لی۔ اس تبدیلیٔ نظام سے یونین میں بھی انقلاب آگیا۔ ممبروں کی تعداد ڈیڑھ سو سے ساڑھے تین سو تک پہنچ گئی، اور مجلس کی کارگذاریوں میں ایک تازہ روح آگئی۔ اور اس کے مقاصد پہلے سے زیادہ وسیع ہوگئے۔ بہت سی انجمنیں قائم ہوگئیں۔ جن کی اغراض اگرچہ جداگانہ تھیں لیکن وہ سب کی سب مرکزی مجلس کی زبردست حامی تھیں اور انہیں اس کے مقاصد سے کلی اتفاق تھا۔ عورتوں کی تعلیم، طرزِ معاشرت، لباس غرض ہر چیز پر غور ہونے لگا اور سب سے زیادہ سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے آواز بلند کی گئی۔ بالآخر حکومت کو ان مختلف جماعتوں کے وجود کو تسلیم کرنا پڑا۔ چنانچہ نئی مجلس مرکزیہ نے جب صدرِ جمہوریت غازی مصطفٰے کمال پاشا کو ایڈریس لکھ کر بھیجا تو مجلس کی صدر لطیفہ خانم اور ناظمِ مجلس عفت حلیم خانم کو مفصلہ ذیل جواب ملا:۔

"مجھے صدرِ جمہوریت کی طرف سے حکم ہؤا ہے کہ میں اُن خیالات و جذبات کے جواب میں جو آپ نے اُن کی ذاتِ بابرکات کے بارے میں ظاہر کئے آپ کی مجلس کا شکریہ ادا کروں۔

توفیق

ناظمِ اعلیٰ صدرِ جمہوریت سفیر پاسکو"

ترکی عورتوں کی موجودہ تمدنی حالت۔ گذشتہ چند سالوں میں ترکی عورتوں نے جس چیز میں نہایت عظیم الشان ترقی کی ہے۔ وہ ان کی تمدنی حالت ہے۔ متعدد عورتیں ملک کے نظامِ حکومت میں ممتاز عہدوں کے حصول میں کامیاب ہوگئی ہیں اور اسی پر کفایت نہیں کی بلکہ دوسرے علمی محکموں میں جو اب تک مردوں کے

لئے مخصوص تھے۔ انہیں بہت سی اسامیاں مل چکی ہیں۔ صرف گزشتہ دو سالوں کو لے لیجئے۔ اس قسم کے صدہا واقعات بطورِ شہادت پیش کئے جاسکتے ہیں جن میں عورتوں کے شاہراہِ ترقی پر نہایت سرعت کے ساتھ گامزن ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً ۱۹۲۷ء میں قسطنطنیہ کے سول چیمبر میں رجسٹرار کا عہدہ نزہت جلیل خانم کو ملا جس نے قانونی سند حاصل کی تھی، چھ نوجوان لڑکیوں نے طب میں اعلیٰ سندات حاصل کیں، اور بحری ہسپتال میں ماہر دنداں کے عہدے پر ایک عورت فائز ہوئی۔ پانچ نوجوان لڑکیوں نے سائنس میں علم کیمیا کی ڈگری لی۔ اسی سال انگورہ کی طبی کانگرس میں عورتوں کو وہی حقوق ملے جو مردوں کو حاصل تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں فخرالنسا کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اسی سال تقریباً پندرہ عورتوں کی شراکت سے ایک پریس جاری ہوا عورتوں کی طرف سے صنعت و حرفت کے میدان میں یہ پہلی پیشقدمی تھی۔ اس شرکت کی سرکردہ جلال، سلمیٰ درویش اور زکریا خانم تھیں۔

ہالینڈ والوں نے ٹرکی کے مالِ تجارت کو اپنے علاقے میں لانا ممنوع قرار دیا تھا، کاظم بے خانم نے پیہم کوششوں کے بعد اس چیز کی اجازت حاصل کر لی اور سمرنا سے بعض میوہ جات مثلاً کشمش وغیرہ ہالینڈ بھیجے گئے۔ اس کامیابی پر ہالینڈ کے ایک اخبار نے اس عورت کی مساعئ جمیلہ کی بے حد تعریف کی۔

۱۹۲۷ء ہی میں قسطنطنیہ کی یونیورسٹی سے دو عورتوں نے فلسفے کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔ انگورہ میں بہت سی نوجوان لڑکیاں سول انجینیرنگ کالج میں داخل ہوئیں۔ اس جگہ صبیحہ خانم کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس نے اٹلی میں جاکر معلمی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اخبار "اقدام" نے ترکی عورتوں کی علمی ترقیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس عورت کی خاص طور پر تعریف کی تھی۔

غرض ترکی عورتوں نے ہر شعبے میں نمایاں ترقی کی ہے مختلف محکموں کی ملازمتوں، اور سیاسی مجلسوں کے علاوہ وہ رفاہِ عام کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتی ہیں۔ جنوری ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر فواد بے نے انگورہ میں کمسن بچوں کی اموات کو روکنے کے لئے ایک کمیٹی یورپ اور امریکہ کے تتبع میں بنانی چاہی۔ غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے کہا کہ ٹرکی میں اس وقت کوئی کام بھی مشکل نہیں۔ چنانچہ اینہ خانم کے ماتحت فی الفور ایک مجلس قائم ہوگئی۔ اور اس نے اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے۔

میں یہاں اختصار کی غرض سے صرف ان عورتوں کے نام لکھ دینے پر اکتفا کروں گا جنہوں نے اپنی قابلیت سے ملک میں نام پیدا کیا۔

صفیہ خانم — نمائندۂ ترکی طبی کانگرس بولون۔

بدیعہ خانم — وکیلِ عدالتِ عالیہ قسطنطنیہ

ثریا خانم — " " "

نیکوار خانم — " " "

شگوفہ خانم — ایل ایل ڈی۔

پیشتر اس کے کہ اس مضمون کو ختم کیا جائے اس امر کی طرف اشارہ کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ٹرکی میں پردہ کی رسم اٹھتی جا رہی ہے۔ اور یہ آزادی یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ گزشتہ سال یعنی ۱۹۲۹ء میں "مقابلۂ حسن" کا اہتمام بڑے زور شور سے کیا گیا زیادہ قابلِ تعجب یہ امر ہے کہ اس مقابلہ میں شریک ہونے والی عورتیں اکثر مسلمان تھیں۔ اس مقابلے سے نہ صرف چہرے کی زیبائش و نمائش مقصود تھی بلکہ تمام جسم کے مختلف اعضا کے تناسب اور ان کے انداز، غرض حسن کی مجموعی دلفریبیوں کا مقابلہ تھا۔ بہترین حسینہ کا انتخاب ایک مجلس کے سپرد تھا لیکن پیشتر اس کے کہ یہ مجلس قائم ہو اس بات پر سخت بحث ہوئی کہ مجلس کے ممبر کون ہوں بڑی رد و کد کے بعد یہ قرار پایا کہ عورتیں اور مرد دونوں اس مجلس میں شریک ہوں۔

اس مقابلۂ حسن کے علاوہ اور بہت سے مواقع پر ترکی عورتوں نے پبلک کے سامنے جسمانی کرتب، کھیل اور رقص کا مظاہرہ کیا۔ الحاصل اس وقت ترکی عورتیں ممالکِ یورپ کی عورتوں سے آزادی میں کسی لحاظ سے پیچھے نہیں۔

ان حالات سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان عورتوں میں جہاں اعلیٰ تعلیم کو حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے وہاں محض مغرب پرستی کے باعث اُن کے ایک طبقے میں بعض ایسی چیزیں بھی آ گئی ہیں جو مشرقی تہذیب اور اسلامی روایات کے خلاف ہیں۔ یہ افراط و تفریط ہر بالغ نظر کے دل میں اُن کے مستقبل کے متعلق اندیشہ پیدا کر رہا ہے۔

(ماخوذ)

صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم

خُلدِ نشاط

ثنائے خلدِ نشاط و سرور کیا کیجے
بیانِ عشرتِ محمود و پُر کیا کیجے

کسی کے حسن کے جلوے جو ہوں نگاہوں میں
تو دل کو وقفِ تمنّائے حور کیا کیجے

کسی کی مست نگاہوں کی مے میسّر ہو
تو آرزوئے شرابِ طہور کیا کیجے

کسی کے دامنِ الفت کی ہو پناہ اگر
تو خوفِ سختیٔ روزِ نشور کیا کیجے

کسی کی بزم میں کون و مکاں کے جلوے ہوں
تو شوقِ جلوۂ بالائے طور کیا کیجے

جو عیش و عشرتِ امروز تک رسائی ہو
تو دل کو واقفِ امیدِ دُور کیا کیجے

کسی کی چشمِ سخن گو ہو جب تکلّم ریز
تو اپنے شعر و سخن پر غرور کیا کیجے

کسی کی شوخ ادائیں جو ہوں جنوں انگیز
تو نازِ ہوش و حواس و شعور کیا کیجے

ہجومِ شوق نے بے دست و پا کیا ہے ہمیں
ہے عضو عضو مگر ناصبور کیا کیجے

ہمیں بھی دعوئ تمکین و ہوش تھا لیکن
نہیں ہے تاب کسی کے حضور کیا کیجے

غرض کہ موردِ الطافِ بے حساب ہوں میں
خوشا نصیب محبّت میں کامیاب ہوں میں

اکبر
سروری

لفظِ شریف زادہ کا صحیح مفہوم

زمانۂ حال کے نظامِ معاشرت میں دو بڑی غلطیاں جنہوں نے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کے دلوں پر اپنی اپنی جگہ نہایت زہریلا اثر پیدا کیا ہے عظیم فساد اور عظیم تر بدبختی کا سرچشمہ ثابت ہوئی ہیں۔ یہ غلطیاں اُس طریقِ تعبیر کی وجہ سے ہیں جو ہم لفظِ "شریف زادہ" کے لئے اختیار کرتے ہیں۔

اپنے اوّلی لغوی اور مدامی مفہوم میں اس کے معنی "صحیح النسب آدمی" کے ہیں۔ یعنی اچھی نسل کا اُسی مفہوم میں جس میں کوئی گھوڑا یا کُتا اچھی نسل کا ہوتا ہے۔

وہ طبقے جن کو ہم اعلیٰ طبقوں کا نام دیتے ہیں چونکہ بالعموم ادنیٰ طبقوں سے زیادہ صحیح النسب ہوتے ہیں اس لئے انہوں نے اپنے دل میں اصلی خیال اور اس کے اذعاناتِ متعلقہ کو قائم رکھا ہے لیکن ساتھ ہی وہ اِس کے اظہار سے ڈرتے بھی ہیں اور اس کے متعلق عوام الناس میں منافقانہ غلط گوئی سے کام لیتے ہیں۔ اس منافقانہ غلط گوئی کی علّتِ غائی بڑی حد تک ان کی یہ خواہش ہے کہ وہ اس لفظ کو ایک اَور مفہوم اور غلط مفہوم پہنانا چاہتے ہیں۔ وہ مفہوم یہ ہے: "ایک ایسا آدمی جو بے کاری کے عالم میں دوسروں کی محنت پر بسر اوقات کرے" حالانکہ اصل لفظ کو اس خیال سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں۔

ادنیٰ طبقے اس خیال کی کہ شریف زادے سے مراد ایک سست اور کاہل آدمی ہے نہایت شدّت کے ساتھ اور بالکل بجا طور پر تردید کرتے ہیں۔ وہ بالکل صحیح طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ جس قدر زیادہ کوئی شخص کام کرتا ہے اُسی قدر زیادہ شریف وہ بن جاتا ہے اور بنتا جائے گا۔ لیکن اس حقیقت سے جو فائدہ انہیں حاصل ہو سکتا تھا اس کو انہوں نے ضائع کر دیا ہے کیونکہ وہ اس سچائی کے ساتھ ایک جھوٹ بھی ملانا چاہتے ہیں یعنی یہ کہ نسل وخاندان کی کوئی اہمیّت ہی نہیں۔ حالانکہ انسان کے لئے بھی اس کی بالکل اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کسی اور حیوان کے لئے۔

قوم اُس وقت تک حقیقی معنوں میں خوشحال نہیں ہو سکتی جب تک یہ دونوں مغالطے حتمی طور پر ملیا میٹ نہ کر دیئے جائیں۔ شرفا کو ابھی یہ سیکھنا ہے کہ کسی صورت میں بھی اُن کا یہ فرض نہیں ہے نہ اُن کو یہ حق

پہنچتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی مشقّت پر زندگی بسر کریں۔ انہیں ابھی یہ سیکھنا ہے کہ سخت ترین مزدوری یا حقیر ترین خدمت گاری میں اگر وہ دیانت دارانہ ہو، کوئی ذلت نہیں ہے لیکن ذلّت ہے اور نہایت شدید ذلّت ہے اسراف میں، رشوت ستانی میں، سُستی اور کاہلی میں، نخوت و تبختر میں، ایسی جگہیں سنبھالنے میں جن کے وہ اہل نہیں ہیں۔ یا ایسی جگہیں نکالنے میں جن کی درحقیقت کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی شریف زادہ اگر ایک خانگی ملازم یا محنت کش مزدور بن جائے تو اس سے اُس کی تذلیل نہیں ہوتی۔ لیکن ایک بدمعاش اور چور بننے سے یقیناً اس کی تذلیل ہوتی ہے۔ بدمعاشی کچھ کم بدمعاشی نہیں ہوتی اگر اس کا پھیلاؤ بہت بڑی بڑی باتوں کو اپنے اندر سمیٹتا ہو۔ نہ چوری کچھ کم چوری ہے اگر رواج اس کی حمایت کرتا ہو۔ یا اپنے ذمے لئے ہوئے فرض کو ادا کرنے سے قاصر رہنا اس کے ساتھ شامل ہو ——— کسی شخص کی جیب کترنا ڈاکے کی ایک بے انتہا کم مجرمانہ شکل ہے بمقابلہ اس کے کہ تم اس کی رضامندی سے اس کی جیب پر اس مفاہمت کے ساتھ قبضہ کرو کہ تم اس کی کشتی کو سلامتی کے ساتھ دریا کے پار لے جاؤ گے حالانکہ تمہیں دریا میں مختلف مقامات کی گہرائیوں کا کوئی اندازہ نہیں۔ دوسری طرف ادنیٰ جماعتوں بلکہ تمام جماعتوں کو یہ سیکھنا ہے کہ ہر بری عادت اور ہر مزمن مرض نسبتاً متوارث ہوتا ہے۔ اور نسب کی پاکیزگی سے انسانی جسم اور روح کا پورا نظام بتدریج بلند یا نسب کی دناءت سے ذلیل و پست ہو سکتا ہے۔ تا آنکہ ایک اونچی ذات والے اور نیچ ذات انسان کے درمیان اتنا ہی فرق حائل ہو سکتا ہے (خواہ ان کی تعلیم پر کتنی ہی زبردست محنت کی جائے) جتنا ایک اعلیٰ درجہ کے تازی اور ایک بدنسل دوغلے ٹٹو میں ہوتا ہے۔ اور اس عظیم صداقت کا علم ہمارے نوجوانوں کی تعلیم اور قوم کے تمام اعمال کا رہنما ہونا چاہئے۔

(ماخوذ از رسکن) حمید احمد خاں



بچھڑا ہوا جل مانس

آؤ پیارے بچّو! اب جائیں، نیچے ہی نیچے، سمندر کی گہرائیوں میں ——— اب میرے بھائی مجھے کھاڑی میں سے بلا رہے ہیں، طوفانی ہوائیں ساحل کے رخ چل رہی ہیں، موجوں کا تلاطم لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہا ہے اور نمکین طوفان سمندر کی طرف واپس آرہا ہے۔ وحشی سفید دریائی گھوڑے طرارے بھر رہے ہیں، وہ پانی میں اچھلتے ہیں اور چھینٹے اڑاتے ہیں۔

پیارے بچو! آؤ اب ہم جائیں ——— لیکن جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر اُسے آواز دو۔ انسانی آوازیں جسے وہ سمجھ سکے ——— "مارگرٹ! مارگرٹ!" ایک آواز لے دو۔ بچوں کی آوازیں ماں کے دل پر ضرور اثر کرتی ہیں، بالخصوص جب وہ درد و کرب سے بھری ہوئی ہوں۔ اگرچہ میرے لئے اُس کے دل میں محبت اور رحم کا کوئی جذبہ باقی نہیں رہا لیکن یقیناً ابھی وہ اپنے بچوں کو نہ بھول سکی ہوگی۔ وہ ضرور تمہاری آواز سن کر آئے گی۔ ایک مرتبہ اُسے پھر آواز دے لو۔ اور پھر آؤ نیچے چلے جائیں نیچے، بہت دور، سمندر کی گہرائیوں میں ——— "پیاری اماں ہم یہاں نہیں ٹھیر سکتے" ——— دریائی گھوڑوں کی کھیل کود سے سمندر میں کف پیدا ہو گیا ہے ——— "مارگرٹ! مارگرٹ!"

آؤ پیارے بچّو! چلو نیچے چلیں، اب آوازیں نہ دو، لیکن جانے سے پہلے ایک آخری نگاہ سفید دیواروں والے شہر پر ڈال لو، اور اس چھوٹے گرجا کو ایک نظر دیکھ لو جو سمندر کے طوفان خیز کنارے پر واقع ہے۔ اس کے بعد چلو نیچے چلیں، سمندر کی گہرائیوں میں جہاں ہمارا گھر ہے۔ خواہ تم تمام دن آوازیں دیتے رہو وہ اب نہیں آئے گی۔

پیارے بچو! کیا یہ کل کی بات ہے؟ جب کھاڑی کے اوپر سے گرجا کی گھنٹیوں کی نرم دھیمی اور شیریں آواز لہروں کے شور میں مل کر ہمارے غاروں میں پہنچی تھی، جہاں ہم لیٹے ہوئے تھے۔ جھاگ اور لہروں کے اوپر دور سے نقرئی گھنٹیوں کی آواز گہرے ٹھنڈے اور ریت سے بھرے ہوئے غاروں میں، جہاں ہوا بالکل خاموش ہوتی ہے جہاں روشنی بہت کم پہنچتی ہے، جہاں نمکین گھاس پانی کی رو میں اِدھر اُدھر ہلتا ہے۔ جہاں دریائی جانور جمع ہو کر کیچڑ میں اپنی خوراک تلاش کرتے ہیں، جہاں دریائی سانپ کنڈلی مار کر بیٹھتے ہیں اور سمندر کے گرم پانی میں نہاتے ہیں، جہاں بڑی بڑی وہیل مچھلیاں تیرتی ہوئی گذرتی ہیں۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں اور وہ تیرتی جاتی ہیں۔

پیارے بچّو! وہاں گانے کی آواز کب آئی تھی؟ کیا یہ کل کی بات ہے؟ پیارے بچو کیا یہ کل ہی بات ہے کہ جب

وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی تھی؟ ——— وہ ہم سب کے درمیان ایک سنہرے تخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا سب سے چھوٹا بچہ اس کے گھٹنوں پر بیٹھا تھا، وہ اس کے چمکیلے بالوں کو آراستہ کر رہی تھی، جب دور سے گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ اُس نے آہ بھری اور شفاف سبز سمندر میں سے اوپر کو دیکھا۔ ——— اُس نے کہا "مجھے جانا چاہیئے مجھے ضرور جانا چاہیئے، کیونکہ میرے متعلقین چھوٹے سفید گرجا میں جو سمندر کے کنارے واقع ہے دعا میں مشغول ہیں۔ دنیا میں آج ایسٹر کا متبرک دن ہوگا اور اے جل مانس! آہ میری روح یہاں تیرے ساتھ رہ کر روز بروز پستی میں جا رہی ہے اور میں اپنے بلند خیال بھول چکی ہوں" میں نے کہا "اچھی مارگرٹ! تم جاؤ، لہروں میں سے ہو کر، اور اپنی نماز ادا کر کے پھر ان آرام دہ بحری غاروں میں واپس آجاؤ" وہ ہنسی، اور پانی اور جھاگ میں سے ہوتی ہوئی کھاڑی میں پہنچی۔

پیارے بچو! کیا یہ کل کی بات ہے؟ ——— سمندر میں طوفان آنے لگا اور ننھے بچوں نے اُسے پکار پکار کر رونا شروع کیا میں نے کہا، "دنیا میں لوگ بہت ہی لمبی نمازیں پڑھتے ہیں" ——— ہم پانی اور جھاگ میں سے ہوتے ہوئے کھاڑی میں پہنچ گئے۔ پھر ہم سمندر کے ریتلے کنارے پر پہنچے، اور اس وادی میں سے ہو کر، جہاں خوشبودار پھول کھلتے ہیں، سفید دیواروں والے شہر میں پہنچے، اور تنگ پختہ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے جہاں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی، ہم اس چھوٹے گرجا کے پاس پہنچے۔ جو پہاڑی پر واقع ہے گرجا میں سے نماز کی آواز آرہی تھی، لیکن ہم باہر کی ٹھنڈی ہواہیں کھڑے رہے۔ پھر ہم قبروں کے اوپر چڑھ گئے، جن کے پتھر بارشوں سے خراب ہوگئے تھے، اور ہم نے کھڑکیوں میں سے گرجا کے مختلف حصّوں میں جھانکا۔ وہ ستون کے پاس بیٹھی ہوئی تھی ہم نے اسے اچھی طرح دیکھ لیا۔ میں نے زور سے اُسے پکارا "مارگرٹ! ادھر دیکھو، ہم یہاں آگئے ہیں"، لیکن اُس نے میری طرف کچھ التفات نہ کیا۔ میں نے پھر کہا، "مارگرٹ! مارگرٹ! سُن ہم بہت دیر سے تنہا ہیں، سمندر میں طوفان آرہا ہے اور ننھے رو رہے ہیں" اُس نے مجھ پر نگاہ تک نہ ڈالی، کیونکہ اُس کی نظریں مقدس کتاب پر جمی ہوئی تھیں۔ پادری زور زور سے دعا مانگ رہا تھا۔ دروازہ بند ہوگیا۔

آؤ پیارے بچو! آؤ اب چلیں اب آوازیں نہ دو، اب اسے بلانا بے سود ہے۔ اس نے اپنے دل سے محبت کے تمام لطیف جذبات نکال دیئے ہیں ——— چلو آؤ نیچے، اب اسے نہ بلاؤ۔ آؤ اب سمندر کی گہرائیوں میں واپس چلے جائیں۔ وہ شور انگیز اور روشن شہر میں چرخہ کات رہی ہوگی، اور نہایت مسرت سے گا رہی ہوگی۔ شاید وہ پادری کی باتوں، شہر کی رونق، اور خوشگوار چمکیلی دھوپ کی تعریف کے گیت گاتی ہوگی ——— اپنے چرخے کی گھنٹیوں کی

دلکش آواز اور سورج کی دلفریب روشنی کو دیکھ کر اس کا دل مسرت سے معمور ہو جاتا ہوگا، اور وہ گاتی ہوگی اسی بے خودی میں اس کے ہاتھ سے چرخے کا ہتّا چھوٹ جاتا ہوگا اور وہ کھڑکی میں کھڑے ہو کر سمندر کے ریتیلے ساحل پر نگاہیں ڈالتی ہوگی، اور پھر اس سے آگے سمندر پر۔ اور پھر ایک سرد آہ بھرتی ہوگی ——— شاید آنسو کا ایک قطرہ اس کی آنکھوں سے کھڑکی کی دہلیز پر گر کر مٹ جاتا ہوگا، پھر وہ بہت سی آہیں بھرتی ہوگی۔ اور شاید اُس وقت اسے یہ آرزو ستاتی ہوگی کہ وہ اپنی چھوٹی بیٹی کو دیکھے جس کی آنکھیں خوبصورت اور بال چمکدار سنہرے ہیں ——— میرے بچّو! آؤ ہم جلد سمندر کی گہرائیوں میں واپس چلے جائیں۔ بہت رات ہو چکی۔ ہوا تیز چل رہی ہے، اور شہر کے اندر لیمپ جل چکے ہیں۔

آدھی رات کے وقت، جب تیز و تند ہوائیں اس کے دروازے پر جا کر شور مچائیں گی تو سمندر کی لہروں کے شور اور ہوا کی آوازوں سے اس کی آنکھ کھل جائے گی۔ اس وقت ہم بھی جاگ اُٹھیں گے۔ ہمارے سر پر سمندر کی تیز و تند لہریں شور مچاتی ہونگی۔ اور ہم اپنی نیلے رنگ کی شفّاف چھت کے نیچے، جواہرات کے فرش پر لیٹے ہوئے گائیں گے۔

"یہاں ایک انسانی ہستی آئی تھی، مگر وہ بے وفا نکلی، اور اب سمندر کے بادشاہ ہمیشہ تنہا رہیں گے"

پیارے بچّو! ہم پھر آدھی رات کو خشکی پر جائیں گے، جب آندھیاں بند ہو چکی ہونگی۔ اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہوگی چاند آسمان پر سے سمندر کی سطح پر نور کے پھول برسا رہا ہوگا، اور خشکی پر وہ پھول کھلے ہوں گے جو گھاس میں ننھے تاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ ان کی خوشبو سے ہوا معطر ہو رہی ہوگی ——— ہم جلد جلد کنارے پر جائیں گے جہاں چمکیلے پتھر پڑے ہوئے ہیں۔ ان پتھروں اور جھاڑیوں پر سے گذرتے ہوئے جن کو سمندر کی لہریں اسی وقت بھگو کر واپس گئی ہوتی ہیں، ریت کے بڑے بڑے ڈھیروں پر کھڑے ہو کر ہم چاندنی میں دھلے ہوئے شہر پر ایک نگاہ ڈالیں گے۔ تمام شہر پر خاموشی چھا رہی ہوگی اور پہاڑی پر جو گرجا ہے وہ بھی ہمیں صاف نظر آرہا ہوگا۔

ہلکی ہلکی ہواؤں میں مل کر، ہماری سرد آہیں جب مارگرٹ کے کانوں تک پہنچیں گی تو وہ بے تاب ہو جائے گی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک چشمہ ابل پڑے گا۔ اگرچہ اسے اس بات کا علم نہ ہوگا کہ وہ کیوں رو رہی ہے، لیکن اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ جائے گا۔

اس وقت ہم سمندر کی گہرائیوں میں یہ گاتے ہوئے واپس آجائیں گے۔

"اِس شہر میں ایک محبوب ہستی رہتی ہے مگر وہ ظالم ہے اُس نے سمندر کے بادشاہوں کو ہمیشہ تنہا رہنے کے لئے چھوڑ دیا ہے"

(ماخوذ از انگریزی)

ع۔ ب

تجلّیات

میں بھی سرودخانۂ ہستی میں ساز تھا
جس کا ہر ایک نغمہ بہت دل گداز تھا

پندار نے "وجود" و "عدم" کو سمجھ لیا
سوچا تو یہ بھی راز تھا اور وہ بھی راز تھا

سرمستیاں عجیب تھیں عہدِ شباب کی
عالم تمام مےکدۂ حسن و ناز تھا

ہر حال میں دماغ مرا عرش پر رہا
لوحِ ازل پہ نام مرا سرفراز تھا

اے حُسن! کیا اُسی سے تغافل شعاریاں!!
ہر سانس جس کا تیرا فسانہ طراز تھا

جب تک جنونِ عشق سے ناآشنا رہا
میں مبتلائے فکرِ نشیب و فراز تھا

جب تک نہ رازِ عالمِ ہستی سمجھ سکا
میں بھی اسیرِ سلسلۂ حرص و آز تھا

اہلِ کرم کو اُس سے شکایت رہی مدام
صہبائی ایک مست تھا اور بے نیاز تھا

اثر صہبائی

خواہشات کا مصرف

انسانی روح کو اپنی تکمیل تک پہنچنے کے لئے تین جداگانہ حالتوں سے گزرنا پڑتا ہے اول حالتِ حیوانی جس میں انسان اپنی حواس کی خواہشات کو پورا کرکے مطمئن رہتا ہے اور علمِ گناہ سے اور اس حقیقت سے کہ اس کا مبداء خود خدا ہے بے بہرہ ہوتا ہے۔ اس حالت میں انسان اپنی پاکیزہ اور بلند روحانی ممکنات کو نہیں دیکھ سکتا دوم حالتِ دوگونگی جس میں انسانی دماغ روحانی اور حیوانی میلانات سے باخبر تو ہوتا ہے لیکن وہ ایک لائحۂ عمل اختیار کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ وہ ان دونوں کی اہمیت کو سمجھتا ہے لیکن شش و پنج میں مبتلا رہتا ہے۔ ترقیٔ روح کی اس حالت میں خواہشات عمل پیرا ہوتی ہیں۔ اس حالت میں انسان ایک لامتناہی اندرونی سلسلۂ جنگ میں مشغول رہتا ہے وہ کبھی بلندی و رفعت پر پہنچ جاتا ہے اور کبھی قعرِ گناہ میں گر پڑتا ہے۔ وہ گناہ کرتا ہے اور اپنے کئے پر پشیمان ہوتا ہے باوجود اس کے کہ حظِ نفس کو ترک کرتے ہوئے اپنے میلانِ طبع کے خلاف عمل کرتا ہے تاہم وہ پاکیزگیٔ نفس اور تکمیلِ روحانی کے لئے بے قرار رہتا ہے۔

اس کی روحانیت سے اثر پذیر ہو کر بالآخر یہ حالت بھی انتہائی غم اور کلفت کی زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور انسان اس حالت سے گذر کر تیسری حالت میں جا پہنچتا ہے۔ یہ حالت "علم" ہے جس میں وہ گناہ اور خواہشاتِ انسانی سے بلند تر ہو کر ایک پر امن خطہ میں قدم رکھتا ہے۔

جس طرح وہ خوشی جو گناہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے عارضی ہوتی ہے اسی طرح خواہشاتِ نفسانی بھی دیرپا نہیں ہوتیں۔ باوجود اس امر کے کہ یہ فانی ہوتی ہیں انسانی روح کو ان کا تجربہ لازمی ہے۔ لیکن یہ امر کہ ایک انسان ان خواہشات کی حدود سے پرے کامیابی کے ساتھ جا کھڑا ہو۔ پاکیزگی اور سکونِ دوام سے ہمکنار ہو جائے خود اس کی دماغی اور روحانی کیفیات کی قوت پر منحصر ہے۔ اس کی ریاضت اور اس کا جوشِ طبعی، جن سے وہ حقیقت کا متلاشی ہے اسے اس منزل پر پہنچا سکتی ہیں۔

خواہشات مع اُن کلفتوں کے جو اُن سے پیدا ہوتی ہیں ہر وقت اور ہر صورت میں ترک کی جا سکتی ہیں لیکن اس کے لئے "علم" لازمی ہے۔ ایک روح جو اشعۂ حقیقت سے منور ہے تمام خواہشات کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ جب ایک انسان خواہشات کے مبدار اُس کی اصلیت اُس کے معنی کا مکمل طور سے ادراک کرے وہ اسی لمحہ انہیں شکست دے سکتا ہے لیکن جب

تک جہالت اور ناواقفیت کی تیرگی اسے گھیرے ہوئے ہے اُس وقت تک کوئی مذہبی تعلیم، کوئی روحانی ریاضت اسے سکون نہیں دے سکتی۔

فرض کیجئے کہ کوئی انسان اپنے دشمن پر فتح حاصل کرنے چلا ہے اور اپنے دشمن کی قوت، اس کے حیل اور کمین گاہ سے واقف نہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے نہ صرف ایک پسپا کر دینے والی شکست ہی اٹھانی پڑے گی بلکہ وہ خود بھی سرعت کے ساتھ اس کے دام میں پھنس جائے گا۔ اپنے دشمن پر قابو پانے کے لئے اولین فرض یہ ہے کہ اس کی جائے پناہ، اس کی قیام گاہ کے متعلق پوری پوری واقفیت بہم پہنچائی جائے اور ادھر اپنے قلعہ اور جائے پناہ اور خصوصاً غیر محفوظ راستوں کی نگہداشت کی جائے جن میں سے دشمن کے اندر داخل ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے۔

اس کے لئے پیہم غور و فکر، لامتناہی دیدبانی اور ایک ثابت، راسخ اور شدید کشف الباطن کی ضرورت ہے جس سے اُس کے دل کی آنکھوں کے سامنے اس کی روح کی تمام بے سود خود کامیاں ظاہر ہو جائیں۔ ابرار کی یہی جنگ ہے اور اسی پاکیزہ جنگ میں روح حیوانی اشغال کی لمبی نیند سے بیدار ہو کر آمادۂ پیکار ہوتی ہے۔

لوگ کس لئے کامیاب نہیں ہوتے، اور یہ جنگ کس لئے ایک مدت تک ختم نہیں ہونے پاتی؟ اس کی دو وجوہ ہیں۔ وہ دو باطل خیالات کے زیر اثر کوششیں کرتے ہیں۔ اول یہ کہ تمام خواہشات خارجی ماحول کا نتیجہ ہیں۔ دوم یہ کہ خواہشات اُن پر اس طرح اثر کرتی ہیں کہ وہ فطرتاً تسلیم و رضا کے پابند واقع ہوئے ہیں۔ اُس وقت تک انسان ترقی نہیں کر سکتا۔ جب تک ان خیالات نے اُس کے دل و دماغ پر تسلط جما رکھا ہے جب وہ ان کی تردید میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ فتح پر فتح حاصل کرتا ہے اور آخر کار روحانی لذت اور سکون سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔

ان بطلان آمیز خیالات کو چھوڑ کر دو حقائق کو جگہ دینا لازمی ہے۔ اول یہ کہ تمام خواہشات اندر سے پیدا ہوتی ہیں۔ دوم یہ کہ انسان کا خواہشات سے متاثر ہونا اس کے اندرونی شر و فساد کا باعث ہے۔ یہ خیال کہ خدا یا شیاطین یا دیگر خارجی اثرات سے خواہشات پیدا ہوتی ہیں دور کر دینا چاہئے۔ اندرونی میلانات ہی تمام خواہشات کا باعث اور مبدا ہیں۔ اور جب انہیں میلانات میں پاکیزگی اور روحانیت پیدا ہو جاتی ہے تو کسی قسم کے خارجی اثرات اور بیرونی قوتیں روح کو خواہشات یا گناہ کی جانب نہیں لے جا سکتیں + خواہشات کا سبب اور وجہ حیات خارجی اشیا نہیں خود تمہارا امیلانِ طبع ہے۔ بالغرض اگر یہ نہ ہوتا تو تمام انسانوں میں ایک ہی روش پر خواہشات پیدا ہوا کرتیں وہ کبھی قابو میں آ ہی نہ سکتیں اور ہم سب ایک جاوداں اذیت اور بدبختی میں مبتلا رہتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر انسان اس روحانی کلفت سے نجات پانے کا علاج اپنے پاس رکھتا ہے اور وہ کامیاب ہو سکتا ہے،

بشرطیکہ وہ ان میلانات کو پاکیزہ بنالے ۔ ہم پر خواہشات اس لئے اثر کرتی ہیں کہ ہم میں چند اس قسم کے رجحانات اور دماغی حالتیں موجود ہیں جنہیں ہم گناہ آلود سمجھتے ہیں ۔ یہ رجحانات ممکن ہے بہت عرصے تک خوابیدہ ہی رہیں اور انسان یہ سمجھے کہ اس نے ان سے نجات پالی ہے لیکن ایک معمولی سے خارجی اثر سے متاثر ہوکر یہ جاگ اٹھتے ہیں انسان انہیں مطمئن کرنے کے لئے بیتاب ہوجاتا ہے ۔ اور یہی کیفیت خواہشات کی کیفیت ہے۔

نیکی کبھی خواہشات سے اثر پذیر نہیں ہوتی ۔ بلکہ انسان میں نیکی کا وجود خواہشات کے لئے پیغامِ مرگ ہے ۔ یہ صرف شر کی موجودگی اور اس کی بیداری ہی جو انسان کو خواہشات میں مبتلا کردیتی ہے ۔ ایک انسان کی خواہشات بقدر اس کے فقدانِ تقدس کے ہوا کرتی ہیں ۔ جوں جوں وہ اپنے آئینۂ دل کو صاف بناتا جاتا ہے خواہشات کا خاتمہ ہوتا جاتا ہے ۔ جب ایک ناجائز خواہش دل سے باہر نکال پھینک دی جاتی ہے تو وہ شئے جس نے اسے پہلے متاثر کیا تھا اب نہیں کرسکتی ، وہ مردہ اور بے قوت ہوجاتی ہے ۔ کیونکہ دل میں وہ مواد موجود نہیں ہوتا جو اس کی آواز پر لبیک کہے + ایک دیانت دار آدمی کے دل میں چوری کی خواہش پیدا نہیں ہوسکتی خواہ اس امر کی تکمیل کے لئے کیسا ہی موقع ہو ۔ ایک ذوقِ سلیم کا مالک پُرخوری اور بادہ آشامی کا مرتکب نہیں ہوسکتا ۔ خواہ اس کے سامنے دنیا بھر کی نعمتیں جمع ہوں اور شراب کتنی ہی اچھی طرح کشید کی گئی ہو ۔ ایک روشن دماغ ، پُرسکون اور اندرونی قوت سے بہرہ اندوز انسان ، غصہ ، زود رنجی ، کینہ وبغض کی جانب کبھی مائل نہیں ہوسکتا اور ایک حسنِ آرزو انگیز کی سحر آگین ادائیں اس کے پاکیزہ دل کے لئے بے معنی ثابت ہوتی ہیں ۔

خواہشات یہ واضح کردیا کرتی ہیں کہ انسان کس طرح اور کہاں سے کمزور ہے ۔ وہ اسے معرفت اور پاکیزگی کی بلندیوں پر لے جاتی ہیں + خواہشات نہ ہوتیں تو روح میں بالیدگی اور قوت پیدا نہ ہوسکتی ، دانشمندی اور حقیقی حسن نہ ہوتا ۔ اگرچہ موت و ثبات ضرور ہوتیں لیکن امن سکون اور کمال پیدا ہونا ممکن تھا جب خواہشات کا ادراک اور ان پر فتح یہ دو چیزیں حاصل ہوجاتی ہیں تو تکمیل ایک یقینی امر ہوجاتا ہے اور یہ ہر ایک انسان کے حیطۂ امکان میں داخل ہے کہ وہ ہر معرض اور غیر طاہر خواہش کا ازالہ کردے ۔ اور ایثار و معرفت کی آگ میں کود پڑے + آئیے ، اور اس پردے کو جس نے حقیقت کو چھپا رکھا ہے تن دہی اور جانفشانی سے اتار پھینکیں ، یہ جانتے ہوئے کہ جب تک ہم خواہشات کے زیر اثر ہیں ہم حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے اور ابھی بہت کچھ سیکھنا باقی ہے ۔

نہیں جاننا چاہئے کہ تم پر خواہشات اس لئے غلبہ پالیتی ہیں کہ تم اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتے کیونکہ "لذاتِ نفس ہی انسان کی گمراہی کا باعث ہوتی ہیں"۔ تم اس لئے خواہشات کے غلام ہو جاتے ہو کہ تم اُن حیوانی میلانات کو جو تم میں موجود ہیں بُری طرح چمٹے ہوئے ہو اور خود میں یہ صلاحیت محسوس نہیں کر رہے کہ ان سے نجات پا سکو گے۔ تم اُس کاذب اور فانی نفسانیت میں زندگی بسر کر رہے ہو جو عرفانِ حقیقی سے بے بہرہ ہے جو کچھ نہیں جانتی اور جسے سوائے اپنی بہجت کے کسی قسم کی تلاش نہیں۔ وہ ہر حقیقت، ہر قانونِ الٰہی سے بے بصر ہے۔ اس نفسانیت سے چمٹے ہوئے تمہیں تین جداگانہ اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے: خواہشات کی اذیت۔ ان کے امتلا کی اذیت اور پشیمانی کی اذیت۔

اس نفسانیت میں ہر تکلیف کا بیج ہر امید کی شکست اور ہر کلفت کا سامان پایا جاتا ہے۔ جب تم اسے چھوڑ دینے کے متمنی ہوتے ہو اور جب تم میں یہ ارادہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کو اس کی تمام خودغرضی آلودگی اور بے بصری کے ساتھ اپنی آنکھوں کے سامنے برہنہ دیکھ لو اور اس کی ضلالت کو تسلیم کر لو اُس وقت تم ایک ایسی زندگی میں قدم رکھتے ہو جو علم النفس اور رزانت کی روشنی سے منور ہوتی ہے۔ اُس وقت تم میں وہ شانِ ربوبیت وہ الٰہی فطرتی پیدا ہو جاتی ہے جو ہر قسم کی احتیاج سے بلند تر ہو کر ایک ایسے خطہ میں مقام رکھتی ہے جس میں امن و راحت کو پایندگی ہے، جہاں رنج و کلفت کا دخل نہیں اور جہاں خواہشاتِ نفسانی کا قیام ناممکن ہے۔

(ترجمہ) **محمد شفیع**

ہم خدا کے سارے باغ میں اسی پھل کے توڑنے کو جھپٹ پڑنا چاہتے ہیں جو کئی سردیاں اور کئی گرمیاں گزرے پر کہیں بڑی دیر میں جا کر پکتا ہے!

جب کوئی شخص مجھے پیارا لگنے لگتا ہے تو میں گویا خوش قسمتی کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہوں!

آؤ ہم خاموش ہو جائیں تا کہ یوں ہم ربانی سرگوشیوں کو خوب سُن سکیں!

گلچیں

بے مائگی

نہیں ہے جاہ و شوکت پاس میرے   نہیں ہے علم و حکمت پاس میرے
نہیں ہے دیں کی دولت پاس میرے   نہ کوئی قابلیّت پاس میرے

تری چاہت کا پھر میں دم بھروں کیا
محبّت کا تری دعوے کروں کیا

مجھے بے مائگی کا اپنی غم ہے   خجالت سے سرِ محبوب خم ہے
ستم ہے اے گلِ خوبی ستم ہے   کہ ہستی خار سے بھی اپنی کم ہے

تری چاہت کا پھر میں دم بھروں کیا
محبّت کا تری دعوے کروں کیا

امنگیں اُٹھ کے سو جاتی ہیں دل میں   امیدیں مردہ ہو جاتی ہیں دل میں
تمنّائیں جو کھو جاتی ہیں دل میں   وہ کانٹے غم کے بو جاتی ہیں دل میں

تری چاہت کا پھر میں دم بھروں کیا
محبّت کا تری دعوے کروں کیا

نہ پنہاں اس قدر پایا کسی کو   نہ پایا بے غرض ایسا کسی کو
نہ دیکھا اتنا بے پروا کسی کو   نہ دیکھا بے نیاز اتنا کسی کو

تری چاہت کا پھر میں دم بھروں کیا
محبّت کا تری دعوے کروں کیا

ح - ب

سوءِ اتفاق

لکھنؤ کی طرف جانے والی آخری گاڑی نکل چکی تھی۔ اب ریل کا وقت باقی نہ تھا۔ اور مجھے آج ہی رات لکھنؤ پہنچنا تھا۔ اسّی میل کی مسافت، اگر کوئی برق رفتار گھوڑا مل جاتا تو شاید طے بھی ہو جاتی، لیکن فیض آباد میں تو لے دے کے ہی تھے اور وہ بھی چوک میں گھومنے والے۔ میں اسی الجھن میں گرفتار تھا اور کوئی تدبیر ذہن میں نہ آتی تھی کہ میرے کاروباری دوست عبدالکریم صاحب آ پہنچے۔ میں نے اُن سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو وہ فوراً بولے "اگر ٹیکسی کا بندوبست ہو جائے تو کیا اعتراض ہے؟"

"کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ بہت ہی اچھا ہے۔"

فیض آباد اور لکھنؤ کے درمیان کرایہ پر موٹر چلانے کا رواج نہیں تھا اس لئے ٹیکسی ملنے میں بہت دقت پیش آئی لیکن دو تین گھنٹے کی دوڑ دھوپ اور ذاتی اثر و رسوخ کو کام میں لا کر کریم صاحب ایک فورڈ لے ہی آئے۔ اب صورت یہ تھی کہ میں اکیلا جانے والا اور سالم موٹر۔ میں نے کفایت شعاری کا خیال کر کے شوفر سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو ایک آدھ سواری اور لے لو۔ اُس نے بہت روکھے پن سے جواب دیا "صاحب، یہاں سواری کہاں۔ سچ پوچھئے تو میں بھی ٹھیکہ دار صاحب کے کہنے سے جا رہا ہوں ورنہ اس جاڑے میں کوئی شخص رات کا سفر نہیں کرتا۔"

وہ بھی سچّا تھا۔ فیض آباد ایسے پس ماندہ و دُور افتادہ مقام سے کون دسمبر کی یخ بستہ رات کو موٹر میں نکلنا پسند کرتا تھا۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش پوری موٹر پچاس روپے میں کر کے میں روانہ ہوا۔ مکمل بستر موجود تھا۔ ایڑھا ٹیڑھا کر کے پچھلی نشست پر بچھایا اور لحاف لپیٹ کر میں دراز ہو گیا۔ شوفر، کلینر اور مَیں کل تین اشخاص تھے۔ شوفر جو بظاہر اپنے کام سے خوب واقف معلوم ہوتا تھا خاموش سا آدمی تھا۔ لیکن کلینر اتنا باتونی کہ خدا کی پناہ۔ گفتگو کے ہر مہذب و غیر مہذب متعلق و غیر متعلق موضوع پر جھوٹے، سچے تجربات سنانا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ موسم کی خنکی کا ذکر آیا تو جھٹ گلمرگ و نینی تال کا قصہ لے بیٹھا۔ رات کی تاریکی کا نام لیا تو فوراً داستان شروع کر دی کہ کیونکر ایک دفعہ اپنے گاؤں کو جاتا ہوا وہ رات کی ہولناک تاریکی میں چوروں کے مسلّح دستہ سے دوچار ہو گیا اور پھر کس ترکیب سے جان و مال سلامت لے کر اُن کے چنگل سے نکل بھاگا۔ میں اس کی ہرزہ سرائی سے تنگ آ کر سختی کے ساتھ اُسے ٹوکنے والا تھا کہ شوفر اس سے کچھ گانے کی فرمائش کر بیٹھا اور پھر شاید بایں خیال کہ اُس

کی یہ فرمائش میرے آرام میں مخل ہو گی اُس نے مجھ سے اجازت بھی طلب کی "اگر آپ کچھ دیر جاگنا چاہیں تو خیراتی کا گانا ہی سن لیجیے"

میں نے متأمل ہو کر پوچھا "کچھ اچھا گاتا ہے؟"

"ہاں صاحب خاصا ہے"

میں نے کہا "لیکن اگر وہ گانے میں بھی ایسی ہی بے پر کی ہانکتا رہا تو میں ایک لفظ نہیں سنوں گا"

اس بات پر وہ دونوں ہنس پڑے۔ خیراتی نے ہندی کی دو، ایک چیزیں مزے سے گائیں۔ آواز اچھی تھی گو فن سے واقف نہ تھا۔ سنسان رات کی خاموشی میں جب کہ موٹر فراٹے بھرتی ہوئی فاصلہ کی دوری کو نگلتی چلی جا رہی تھی اس کی بلند آواز کانوں کو بہت خوش آئند معلوم ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ نیند کا فرشتہ پر پھیلا رہا تھا۔ میں نے شوفر سے خوب ہوشیار رہنے کی تاکید کی اور خود بستر میں منہ لپیٹ کر سو گیا۔

زوردار دھماکے کے ساتھ یک لخت موٹر رک گئی اور میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ چاروں طرف اجاڑ میدان تھا جس پر گھٹا ٹوپ اندھیرا مسلّط تھا۔ صرف موٹر کے دو لمپ فضائے بسیط کی پُر ہول تاریکی سے تھکے ہوئے پہلوان کی طرح جنگ کر رہے تھے۔ ایک خطرۂ موہوم کا احساس کرتے ہوئے میں نے چھوٹتے ہی پوچھا "کیا ہوا خیر تو ہے؟"

میرا مخاطب شوفر تھا لیکن وہ مشین کی دیکھ بھال میں انجان بن کر چُپکا ہو رہا۔ میں نے درشتی سے پوچھا۔

"خیراتی بولتے کیوں نہیں۔ کیا ہو گیا ہے؟"

"حضور ٹائر پھٹ گیا"

میرے منہ سے عالمِ بے اختیاری میں کلمۂ غیر نکلا اور انتہائے کوفت کے ساتھ کھڑکی کھول کر میں کمبل اوڑھے نیچے اتر آیا۔ وہ دونوں جیبی لالٹین کی مدد سے پہیوں کا بغور ملاحظہ کر رہے تھے۔ میں نے پھر سوال کیا "کوئی فالتو ٹائر ہے؟"

نہایت مایوسانہ جواب تھا "جی نہیں"

میں رنج و غصّہ کی شدت کو ضبط نہ کر سکا "تم عجب بیہودہ انسان ہو۔ جب تمہیں علم تھا کہ اسّی میل کا طویل سفر ہے۔ رات کا وقت ہے۔ غیر آباد راہ سے گذر ہے۔ پھر تم گھر سے مکمل سامان لے کر کیوں نہیں چلے۔ اب سردی میں جان سے مارو گے۔ بتاؤ فاصلہ کتنا طے کر چکے ہو؟"

"جناب ردولی سے گذر آئے ہیں"

"الامان! ابھی ردولی ہی میں ہو؟ میرا خیال تھا بارہ بنکی کے قریب پہنچ چکے ہونگے"۔ میں نے جیب سے گھڑی نکالی۔ گیارہ بجنے والے تھے۔ میرے دل و دماغ میں سخت اذیت کا احساس ہونے لگا۔ ایسی سردرات میں سفر اختیار کیا، اتنی تکلیف برداشت کی معقول معاوضہ بھی ادا کیا اور پھر بروقت منزل مقصود پر نہ پہنچ سکا۔ وہ دونوں متعدد اوزار سنبھالے موٹر کے مختلف حصّوں کو کھولتے، بند کرتے اور الٹتے پلٹتے رہے۔ میں صبر شکن انتظار کے ساتھ امید وبیم کی لہروں سے ڈانواں ڈول اُن کی کارروائی مضطرب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ نصف گھنٹہ کی تگ ودو کے بعد انہوں نے فیصلہ سنا دیا کہ ٹائر اس بری طرح پھٹا ہے کہ موٹر اب دس قدم بھی نہیں چل سکتی۔ ان الفاظ نے میرے اندر دہشت وحراس کے وہی جذبات پیدا کردیئے جو ایک خونی مجرم عدالت سے فیصلۂ موت صادر کئے جانے پر محسوس کرتا ہے۔ میں مغلوب الغضب ہو رہا تھا اور جی چاہتا تھا کہ شوفر کو جان سے ماردوں اس کی مہلک غفلت نے میرا بمبئی پروگرام تہس نہس کرڈالا تھا۔ کمبخت کو اتنا معلوم نہیں تھا کہ فالتو ٹائر کے بغیر سفر کرنا سراسر حماقت ہے۔ کبھی اپنی کاہلی پر افسوس کرتا کہ اگر شام کی ٹرین مل جاتی تو کیسے آرام واطمینان سے لکھنؤ پہنچ گیا ہوتا۔ اب یہ حالت تھی کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن یعنی "مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور"۔ میرے گرد وپیش تمام بنجر سرزمین تھی۔ آبادی کا نام ونشان نہ تھا۔ گیدڑوں کی خوفناک آوازیں رات کی سیاہی سے مل کر کرۂ ہوا میں ہولناک گونج پیدا کررہی تھیں۔ میں عجب شش وپنج میں مبتلا موٹر کا سہارا لئے خالی نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ اس ابتلا سے نکلنے کی کوئی تجویز نہ سوجھتی تھی۔ شوفر سہما ہوا ایک طرف کھڑا تھا۔ میں نے کڑک کر پوچھا "اب کیا ارادہ ہے؟"

وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا۔ "حضور مجھے معاف کردیجئے۔ میری غلطی کی وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف ہوئی۔ یہاں سے دو میل پر راؤ...... صاحب کا گاؤں ہے۔ راؤ صاحب یہاں کے بہت بڑے رئیس اور تعلقدار ہیں۔ کئی بار میں انھیں موٹر پر لکھنؤ لے گیا ہوں۔ مجھ پر ہمیشہ مہربانی کرتے ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کا سامان اٹھا کر ان کے یہاں لے چلوں۔ آپ رات وہیں آرام فرمائیے"۔ میں نے اس تجویز کو پسند کیا مگر پھر سوچا کہ آدھی رات کے وقت راؤ صاحب کو بے آرام کرنا بھی مداخلتِ بے جا سے کم نہیں۔ ممکن ہے وہ مجھے مہمانِ ناخواندہ سمجھ کر ناک بھوں چڑھائیں۔ پھر خیال آیا کہ میں کون سا اُن کے ہاں مہینوں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے تو طلوعِ آفتاب تک چھت کا سایہ اور چارپائی درکار ہے۔ قصّہ مختصر میں نے رضامندی کا اظہار کیا اور شوفر میرا اسباب سر پر رکھ کر روانہ ہوگیا اور میں اس کے ساتھ ہولیا۔ خیراتی کو نگرانی کے لئے موٹر میں چھوڑ گئے۔ پون، ایک گھنٹہ کے چل چلاؤ

کے بعد ہم "دیس نگر" پہنچے ۔ راؤ صاحب کی عظیم الشان کوٹھی اور وسیع پائیں باغ واقعی ان کی امارت و ثروت کی شہادت دے رہے تھے ۔ شوفر نے شاگرد پیشہ مکانات کی طرف جا کر کسی ملازم کو جگایا اور غالباً میرے متعلق کچھ کہا ملازم پہلے تو بہت بڑبڑاتا رہا پھر مجھے بغور گھورتا ہوا کوٹھی کے اندرونی حصہ میں داخل ہو گیا ۔ میں دل ہی دل میں نادم ہو رہا تھا کہ بے وقت ایسے معزز صاحب خانہ کو تکلیف دی ۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد نوکر برآمد ہوا اور بہت غیر شگفتہ لہجے میں بولا "چلئے جناب ، راؤ صاحب نے یاد فرمایا ہے "

میں نے حیرت سے کہا " راؤ صاحب کیا جاگ رہے تھے ؟"

"جی نہیں ۔ وہ تو سو چکے تھے ۔ میں نے جا کر جگایا ہے "

" اوہ کتنی تکلیف ہوئی ان کو "

میں ملازم کے ہمراہ راؤ صاحب کی خواب گاہ میں داخل ہوا ۔ وسیع و عریض کمرہ بہت نفیس سامانِ آرائش سے سجا ہوا تھا اور پلنگ کے قریب آرام کرسی پر وہ خود تشریف فرما تھے ۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے ۔ اور نہایت خندہ پیشانی سے ملے ۔ پچاس پچپن سال کا سن ہو گا لیکن چہرہ پر جوانی کی سرخی موجود تھی ۔ بالوں میں ابھی کہیں کہیں سفیدی نمودار ہوئی تھی ۔ گفتگو شروع کرتے ہی میں نے تکلیف دہی کی معذرت طلب کی جس کے لئے حقیقتاً میں بہت شرمندہ ہو رہا تھا ۔ انہوں نے بہت شفقت سے کہا " آپ بھی غضب کرتے ہیں ۔ موٹر کا بگڑ جانا تو غنیمت ہوا کہ ہمیں آپ کے درشن ہو گئے ۔ آپ تکلیف وغیرہ کا ذکر نہ کیجئے میری تو عمر ہی دوستوں کی خدمت میں بسر ہوئی ہے"

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں ۔ وہ کھانے کا اصرار کر رہے تھے لیکن مجھے مطلق اشتہا نہ تھی ۔ اُن کے ملازمین نے کوٹھی کے مردانہ حصہ میں میرے سونے کا انتظام کر دیا اور میں تعظیم ادا کر کے دل میں اُس شخص کی شرافت کا گہرا نقش لئے ہوئے آ کر دراز ہو گیا ۔

مجھے سوئے ہوئے تھوڑی ہی دیر گذری ہو گی کہ کوٹھی کے احاطے میں ایک کہرام مچ گیا " ڈاکو ڈاکو پکڑو ۔ مار دیا " کی مخلوط آوازیں اور خوفناک چیخیں میرے کان میں پڑیں تو میں سراسیمہ ہو کر جاگ اٹھا اور واقعہ کی اصلیت معلوم کرنے کو باہر دوڑا ۔ میری آنکھوں نے عجب منظر دیکھا ۔ راؤ صاحب خود ، اُن کے لواحقین اور ملازم پانچ سات اشخاص کے پیچھے بھاگ رہے تھے ۔ رات کی منجمد تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا ۔ حقیقتِ حال سے باخبر ہوئے بغیر لیکن موقعے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے میں ان کے پیچھے بھاگ اٹھا میں نے تیزی سے ایک شخص کو جا پکڑا لیکن جونہی اس کے جسم کو چھوا اُس نے برق آسا پھرتی کے ساتھ تلوار کا

ایک ایسا وار میرے ہاتھ پر کیا کہ میرا پونچا کٹ کر زمین پر گر گیا۔ اور میں بے ساختہ چیخ کے ساتھ وہیں بیٹھ گیا۔ حملہ آوروں کے پاس موٹر تھی جس میں سوار ہو کر وہ چشم زدن میں ہماری نگاہوں سے غائب ہو گئے۔ راؤ صاحب اور اُن کے متعلقین نے میرے گرد گھیرا ڈال دیا۔ خون بے تحاشا میرے زخم سے بہہ رہا تھا اور میں اگرچہ صبر کئے تھا لیکن حواس ایک جانکاہ اذیت میں مبتلا تھے۔ مجھے ایک شخص کندھوں پر اٹھا کر واپس کوٹھی میں لایا۔ طبی امداد تو وہاں کیا پہنچ سکتی تھی، بجائے راؤ صاحب دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگے بھاگے پھر رہے تھے اور کچھ بن نہ پڑتا تھا۔ کپڑے پانی میں بھگو بھگو کر میرے زخم پر رکھتے تھے لیکن خون کی دھار تھی کہ بند ہونے میں نہ آتی تھی۔ اسی پریشانی میں رات تمام ہو گئی۔ زنانخانہ کے اندر سے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں سمجھا شاید کوئی سخت حادثہ ہو گیا ہے۔ صبح ہوئی تو ایک نوکر نے ڈرتے ڈرتے رک رک کر مجھ سے کہا "آپ کو نہیں معلوم؟ رات وہ شخص سرکار کی صاحبزادی کو اٹھا کر لے گئے"۔

"راؤ صاحب کی صاحبزادی کو؟"

"جی ہاں"

یہ افسوسناک خبر بجلی کی طرح مجھ پر گری جس نے مجھے اپنی سب تکلیف بھلا دی۔ میں حیران و ششدر رہ گیا۔ گذشتہ کے واقعات اپنے دماغ میں دہرانے لگا۔ اجاڑ بیابان میں موٹر کا پھوٹ جانا۔ راؤ صاحب کے ہاں آمد۔ آدھی رات کو ڈکیتی۔ میرا ہاتھ کٹ گیا اور راؤ صاحب کی صاحبزادی کا اغوا۔ ایک حیرت انگیز ڈراما تھا۔ یقیناً وہ بہت ہی منحوس گھڑی ہو گی جب میں نے سفر کی نیت کی تھی۔ انسانی زندگی میں سب سے زیادہ تاریک اور غیر یقینی چیز مستقبل ہے۔ اگر مجھے ان مصائب کا ہلکا سا علم بھی ہوتا تو میں گھر سے نہ نکلتا، لیکن اب جب کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا پچھتانا بالکل بے سود تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں چندے وہاں ٹھہرا رہا تو وہ شیطانی طاقتیں جو برسرِ پیکار تھیں اور جنہوں نے میرے عزائم کو ملیا میٹ کر کے مجھے سخت جسمانی و روحانی عذاب میں مبتلا کر دیا تھا مزید گزند پہنچانے سے باز نہ رہیں گی۔ میں جلد از جلد اس چار دیواری سے بھاگنا چاہتا تھا۔ راؤ صاحب مخلصانہ اصرار کرتے تھے کہ میں چند روز اور قیام کروں اور جب تک زخم کی حالت بہتر نہ ہو جائے ان کے پاس سے نہ جاؤں۔ وہ باتیں کرتے تھے اور اُن کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ وہ آنسو رنج و غم اور شرم و ندامت کے آنسو تھے۔ وہ سوچتے ہونگے ایک اجنبی چند گھنٹوں کے لئے مہمان کی حیثیت سے اُن کے ہاں آیا اور معاوضہ میں اپنا ایک ہاتھ دے چلا۔ اُن خیالات کو جو میری روانگی کے وقت ان کے نیک دل میں موجزن تھے میں خوب سمجھتا تھا۔ لیکن اس متحمل و بردبار انسان نے اپنے ذاتی نقصان اور رنج والم

کا اشارۃً بھی اظہار مناسب نہ سمجھا۔ اُن کی دعائے خیر لے کر اور آئندہ ملاقات کا وعدہ کرکے میں اُن سے رخصت ہؤا اور واپس فیض آباد آگیا۔ لیکن تمام راہ میں مجھے یہی خیال رہا کہ راؤ صاحب کی صاحبزادی کا اغوا غالباً کسی بہت بڑے راز کا حامل تھا۔ معززین کے گھروں میں جب ایسے حادثات ظہور پذیر ہوتے ہیں تو تلاش و تفتیش اُن کی خانگی زندگی کے سنسنی پیدا کردینے والے حالات سے پردہ اُٹھا دیتی ہے۔ کیا راؤ صاحب بھی پولیس کو اطلاع کرکے اپنی ذات کو اخبارات کی آرا و قیاسات کا مرکز بنانا پسند کریں گے؟

دو ہفتے کی مرہم پٹی سے میرا زخم تو بالکل مندمل ہوگیا لیکن کٹا ہؤا ہاتھ ایسا بدنما معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اس کو ہمیشہ کوٹ یا پتلون کی جیب میں رکھنے کا ارادہ کرلیا۔ علاوہ ازیں میں روزمرہ کی کاروباری زندگی میں ایک ہاتھ کی اعانت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا تھا اور اس محرومی کو ہر لحظہ شدّت سے محسوس کرتا تھا۔ یہ نقصان ایسا ناقابلِ تلافی ثابت ہؤا کہ لکھنؤ کے قابل ترین سرجن نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ "ہندوستان میں تو اس درد کی دوا میسّر آنا قریب قریب ناممکن ہے۔ ہاں یورپ میں بعض ایسے ماہرینِ عضویات ہیں جو مصنوعی ہاتھ اس خوبی سے تیار کردیتے ہیں کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہو، کیونکہ جنگِ عظیم کے بعد وہاں جراحی کے اس شعبہ کو خاص طور پر بہت تقویت ملی ہے"۔ لیکن آہ یورپ امیری پہنچ سے بالکل باہر تھا۔

چند ماہ کی مصروفیت کے بعد میرا آب و دانہ پھر پنجاب کی طرف منتقل ہوگیا۔ اس دوران میں میں نے شمالی ہند کے بہترین اطبا سے استصواب کیا۔ مگر سبھی اس معاملہ میں عاجز نظر آتے تھے۔ میرے ایک عزیز نے مجھے بتایا کہ بمبئی میں دو ایک ڈاکٹر ایسے ہیں جو انگلستان اور جرمنی سے فنِ جراحی میں مہارت نامہ حاصل کرکے آئے ہیں اور عضویات کی اس شاخ کے معالج خصوصی ہیں۔ اگر اُن سے مشورہ کیا جائے تو ممکن ہے بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔ مجھے یوں بھی بہ سلسلۂ روزگار بمبئی ضرور جانا تھا اور اب توسمندِ شوق کو اک اور تازیانہ ہؤا چنانچہ بعض کاموں کو ادھورا چھوڑ کر میں عازم بمبئی ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر اپنی اولین فرصت میں میں نے ان ڈاکٹروں کا پتہ چلانے کی کوشش کی اور مجھے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ میرے اُس عزیز کی اطلاع بے بنیاد نہ تھی۔ ڈاکٹر رائے اور ڈاکٹر سیاول دو نام تھے جو متعدد حضرات کی زبانی میں نے سنے۔ ان میں ڈاکٹر رائے کا نام میرے احباب بہت اعتماد و وثوق سے لیتے تھے۔ بلکہ سرجری میں اُن کے چند کارہائے نمایاں کو تو لوگ معجزات سے تعبیر کرتے تھے میں بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہؤا۔ تیس پینتیس سال کی عمر ہوگی۔ مضبوط جسم، لانبا قد، نہایت خوبصورت ہنس مکھ آدمی تھا۔ شکل و شباہت سے شمالی ہندوستان کا باشندہ معلوم ہوتا تھا اور جب گفتگو شروع ہوئی تو لب و لہجہ نے

بتا دیا کہ اسے خاکِ پاکِ اودھ سے نسبتِ وطن حاصل تھی۔ رسمی تعارف اور مزاج پرسی کے بعد میں نے اپنی آمد کی غرض بتائی۔ پہلے تو میرے بازو کو مدت تک بغور دیکھتے رہے پھر ایک خاص قسم کے چشمے سے ملاحظہ کیا۔ اور یوں گویا ہوئے۔ "آپ کا ہاتھ کسی تیز دھار آلہ سے کٹا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آپ بتا سکتے ہیں یہ زخم آپ کو کیسے پہنچا؟"

میں نے عرض کیا "ایک حادثہ ہو گیا تھا۔"

وہ مسکرائے "آپ چال ڈھال سے فوجی سپاہی تو معلوم نہیں ہوتے اور نہ وضع قطع یہ ظاہر کرتی ہے کہ آپ اُس غیر ذمہ دار بازاری طبقہ سے ہیں جہاں صبح و شام جنگ و پیکار کا بازار گرم رہتا ہے۔ پھر آپ کو حادثات کیسے پیش آ گئے؟"

مجھے اُن کے اس سوال سے جس سے وہ بال کی کھال نکالنا چاہتے تھے کچھ ناگوار سا احساس ہوا۔ میں نے کہا "آپ حادثہ کی نوعیت کی طرف نہ جائیے۔ بس آپ کی تشفی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ تیز دھار آلہ سے یہ پونچا کٹ گیا تھا۔"

میرے اس گول مول جواب سے ان کے شوقِ جستجو میں نئی تحریک پیدا ہوئی۔ اور میرا ہاتھ چھوڑ کر وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئے "آپ جانئے! ایک معالج کا کام صرف یہی نہیں کہ وہ دوا تجویز کر دے۔ دفع امراض کے سلسلہ میں تجویزِ دوا آخری مرحلہ ہے جس تک پہنچنے کے لئے بہت سے دریافت طلب امور کا حل نہایت ضروری ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس زخم میں تیز دھار آلہ کا استعمال ہوا تھا لیکن یہ جاننا کہ وہ کیونکر ہوا اور کن حالات میں ہوا میرے علاج کو مکمل و موثر بنانے کے لئے لابدی ہے۔ اس لئے آپ براہِ عنایت حالات کے انکشاف میں بخل سے کام نہ لیں۔"

میں حیران تھا یہ کس قسم کا ڈاکٹر ہے جو زندگی کے خفیہ واقعات کرید کرید کر پوچھ رہا ہے۔ اگر اصل حالات کو چھپاتا ہوں تو اُس کے ناراض ہو جانے کا ڈر ہے اور اگر الف سے یے تک سب قصہ بیان کر دوں تو ایک معزز رئیس کی شرافت و عزت پر حرف آنے کا احتمال ہے۔ میری چشمِ تصور کے سامنے راؤ صاحب کی محبوب و مکرم شخصیت آ گئی اور دل نے کہا کہ ایسے شریف دوست کے راز کو رسوا کرنا آئینِ مروت سے بعید ہے۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب کے ہنسنے کی آواز آئی "اجی صاحب آپ کس گہری سوچ میں پڑ گئے۔ دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں جسے راز کہا جا سکے۔ ہر انسان کی زندگی ایک کھلا ہوا مرقع ہے جسے تمام دنیا بیک وقت پڑھ لیتی ہے۔ آپ کیوں تذبذب میں پڑ گئے؟ ایک مریض کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنے مرض کے تمام امورِ متعلقہ مجھ سے صاف صاف بیان کر دیں۔

ورنہ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکوں گا۔"

میں نے بھی جانا کہ اب زیادہ رکنا مناسب نہیں۔ چنانچہ تمام داستان از اول تا آخر اُن کے سامنے بیان کردی۔ میں بول رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب پتھر میں تراشے ہوئے بت کی مانند حیرت و استعجاب سے پھٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکٹکی لگائے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہر لحظہ اُن کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ جب قصّہ ختم ہو چکا تو وہ حیرت انگیز تبسّم کے ساتھ جس سے اُن کے رخساروں پر پھر سرخی دوڑ گئی تھی کھڑے ہو کر مجھ سے لپٹ گئے "آئیے، آئیے اندر چلئے۔ آپ تو اپنے ہی آدمی نکل آئے" وہ مجھے مطب سے کھینچ کر ملحقہ مکان کے سکونتی حصہ میں لے گئے۔ میں حیران و ششدر یہ سب کارروائی دیکھ رہا تھا اور کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ معاملہ کیا ہے۔ گول کمرے میں مجھے ایک کونے میں بٹھا کر ڈاکٹر صاحب نے اونچی آواز میں پکارا "سوشیلا سوشیلا" بغل والے کمرے کے دروازہ کا پردہ سرکا اور ایک نہایت دلفریب صورت نمودار ہوئی۔ ریشمین ساڑھی میں ملبوس، ماہ تاباں کی سی پُرضیا پیشانی پر قشقہ لگائے یہ پری وش بے دھڑک کمرے میں داخل ہوگئی۔ میں تعظیماً اپنی جگہ سے اٹھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اور میری جانب اشارہ کرکے کہا "آپ سے ملو، یہ ہمارے بہت بڑے محسن ہیں۔" ہم دونوں نے مصافحہ کیا اور مختلف کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے مخاطب کیا "حضرت یہی وہ خاتون ہیں جنہیں چھڑانے میں آپ نے اپنا ہاتھ کھو دیا تھا۔"

"واقعی؟" اتنا کہا اور دفورِ حیرت سے میری زبان گنگ ہوگئی اور آنکھیں اُس نازنیں کے چہرے پر گڑ گئیں۔ میری حیرانی کا یہ عالم تھا کہ وہ مکان میری نگاہوں میں ایک جادوگھر نظر آنے لگا اور ڈاکٹر صاحب کے الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کرنے میں میں سراسر قاصر تھا۔ نو وارد خاتون ندامت آلود نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔ چند منٹ کے مرگ آسا سکوت کے بعد ڈاکٹر صاحب بولے "ہم میں سے ہر شخص طلسمِ ہوش ربا کی کافی سیر کر چکا ہے۔ بہتر ہے کہ اب حقیقت سے پردہ اٹھا دیا جائے۔ سوشیلا مجھے ان صاحب سے ذرا تخلیہ میں باتیں کرنا ہے۔ تم ۔ ۔ ۔"

ابھی فقرہ ختم نہ ہوا تھا کہ سوشیلا موجِ رنگ و بو کی طرح ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کرسی میرے قریب کرلی۔ "آپ سمجھ گئے ہونگے سوشیلا میری بیوی ہے۔ دیس نگر کی اُس ہنگامہ خیز رات کو جب بدقسمتی سے آپ کو یہ حادثہ پیش آیا میں اور میرے چند جاں نثار دوست ہی حملہ آوروں کی صورت میں نمودار ہوئے تھے۔ راؤ صاحب کی جس صاحبزادی کا اغوا ہوا وہ سوشیلا ہی تھی۔ اس اجمال کی تفصیل سننے کے آپ یقیناً مشتاق ہونگے، اس لئے میں واقعہ کو ابتدا سے بیان کئے دیتا ہوں۔ یہ تو آپ جانتے ہیں محبت اور جنگ میں سب طریقے مستحسن

ہوتے ہیں اور پھر اُس جنگ میں جس کا انعام سوشیلا ایسی ہمہ صفت موصوف پری ہو۔ اس لئے اپنے طرزِ عمل کی مدافعت کی میں چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ بزرگوں کے دیرینہ مراسم کی وجہ سے میں اور سوشیلا بچپن میں اکٹھے کھیلے، ایک ہی ماحول میں پرورش پائی اور حسنِ اتفاق سے مذاق بھی یکساں تھے سنِ بلوغ کو پہنچ کر کچھ فطری حجاب اور کچھ تعلیمی مشاغل نے ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا۔ لیکن بچپن کی طبعی موانست میں اب محبت کے جذبۂ رنگین نے گلکاریاں شروع کر دیں۔ اور یہ جذبہ عمر کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتا گیا۔ سوشیلا کی والدہ کے قرابت داروں میں ایک شخص پرکاش صاحب تھے جنہیں دنیوی وجاہت اور زمینداری کے ٹھاٹھ نے بہت بر خود غلط بنا رکھا تھا۔ اُن کے تموّل نے سوشیلا کی والدہ کی آنکھوں کو خیرہ بنا دیا تھا اور اُن کا ذاتی ارادہ یہی تھا کہ وہ سوشیلا کو اُس کے حوالہ کریں گی۔ لیکن سوشیلا کے والد زمانہ شناس آدمی تھے۔ اُن کی نگاہِ دوربین میں امارت کی ظاہری رونق کی بہ نسبت تعلیم اور ذاتی اخلاق کو بہت زیادہ وقعت حاصل تھی۔ پرکاش صاحب بظاہر لکھنؤ میں طالب علم تھے لیکن اُن کے وقت کا زیادہ حصّہ سیر و شکار ہی میں گذرتا تھا۔ اس دوران میں میں نے کالج کی تعلیم کامیابی کے ساتھ ختم کر لی تو میرے والد نے مجھے انگلستان بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن اس ارادہ کی تکمیل سے قبل وہ مجھے علائقِ دنیوی کا پابند بنا دینا چاہتے تھے تاکہ مغرب کی مخربِ اخلاق آزادی سے محفوظ رہ سکوں۔ میرا سینہ جس آتشِ سوزاں کا مدت سے شکار ہو رہا تھا اُس کے اظہار کا وقت آ پہنچا تھا۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر سوشیلا نے میری رفیقِ زندگی بننے سے انکار کر دیا تو میں ساری عمر تیاگ میں بسر کر دوں گا۔ اُدھر سوشیلا کی والدہ کو یہ چڑ تھی کہ وہ اپنی لڑکی پرکاش کو دے گی۔ راؤ صاحب یوں تو دانا اور روشن خیال بزرگ ہیں لیکن گھر میں بیوی کے سامنے بالکل بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ اُن کی یہ حالت بہت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ انہوں نے بیوی کو بہت سمجھایا کہ "پرکاش کی دولت اُس کی فضول خرچیوں کی کب تک متحمل ہو سکے گی۔ زمانہ کی روش کی طرف دیکھو۔ ذاتی خصائل اور علم کا لازوال خزانہ انسان کی سب سے بڑی ملک ہے۔" لیکن وہ کج فہم اور ضدی عورت اِن حقائق کو سمجھنے سے عاجز تھی۔ راؤ صاحب تریا ہٹ سے مجبور ہو گئے تو انہوں نے کہا بہتر ہے۔ پرکاش بھی انگلستان جائے اور دونوں امیدواروں میں سے جو پانچ سال کے بعد ڈاکٹر بن کر واپس آئے گا میں اپنی بیٹی اس کو دوں گا۔" پرکاش محض جذبۂ رقابت سے متاثر ہو کر اپنی متاعِ علم کا جائزہ لئے بغیر عازمِ انگلستان ہو گئے۔ راؤ صاحب کا یہ فیصلہ حقیقتہً میرے حق میں کیا گیا تھا۔ میں ایڈنبرا میں اپنے داخلہ کا انتظام پہلے ہی سے کر چکا تھا۔ چنانچہ پانچ سال جس دماغی محنت اور ذہنی مشقت میں میں نے گذارے اُس کا اندازہ میں ہی کر سکتا ہوں۔ صرف سوشیلا کا عشق میرے گرتے ہوئے قدموں کو سنبھالے

رہا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ زمانۂ مفارقت ختم ہوا اور مَیں اُس کڑی آزمائش میں سے کندن بن کر نکلا۔ کامیاب و بامراد میں واپس وطن آیا۔ پرکاش صاحب بیچارے ابتدائی امتحانات سے بھی عہدہ برا نہ ہو سکے تھے لیکن میری واپسی کی خبر سن کر وہ بھی ہندوستان لوٹ آئے اور پھر قسمت آزمائی شروع کر دی۔ میرا پلڑا بھاری تھا میں عائد کردہ شرط پوری کر چکا تھا، اس لئے موعودہ انعام کا حقدار تھا۔ لیکن سوشیلا کی والدہ نے پھر میرا راستہ روک لیا۔ وہ مُصر تھی کہ خواہ اِدھر کی دنیا اُدھر کیوں نہ ہو جائے وہ اپنی بیٹی پرکاش کو دے گی۔ حالات کی یہ مایوس کُن منزل تھی جب میں نے آخری قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ پرتھی راج شاہِ دہلی کی مثال میرے سامنے تھی کہ کیونکر اُس نے سنجوگتا کو حاصل کرنے میں اپنی جان جوکھوں میں ڈال دی تھی۔ آخر میں بھی راجپوت ہوں۔ میری رگوں میں بھی وہی خون جاری ہے۔ میں جلتی آگ میں کودنے سے کیوں گھبراتا؟ میں نے سوشیلا کو اپنے ارادے سے مطلع کیا تو شکر ہے وہ میدانِ عشق میں ثابت قدم نکلی۔ خفیہ نامہ و پیام سے وقت مقرر کر لیا گیا اور اپنے چند جاں نثار دوستوں کے ساتھ میں نے دھاوا بول دیا۔ تعیّنِ مقام میں کچھ غلط فہمی ہو گئی۔ اس لئے راؤ صاحب کے چند ملازم جاگ اٹھے اور خلافِ توقع وہ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔"

ڈاکٹر صاحب کی مسحور کن تقریر ختم ہوئی، گویا طلسم ٹوٹا۔ اور مجھے زندگی میں دوسری مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ حقیقت افسانہ سے زیادہ دلکش اور حیرت انگیز ہوتی ہے۔

عاشق بٹالوی

التجائے بیمار

بیمار ہوں، تندرستی و صحت بھیج
نادار ہوں، یہ گئی ہوئی دولت بھیج

اقبالِ گنہ کا بھی یہی مطلب ہے
حقدار ہوں، جلدی کرم و رحمت بھیج

آزاد

زندگی

(اُردو میں ایک سانیٹ)

ہماری زندگی بھی کس قدر ویران منزل ہے،
شبِ تاریک ہے رستے سے ہم ناآشنا بھی ہیں،
مسافت دُور کی ہے شکوہ سنج "رہنما" بھی ہیں،
بیاباں ہے بلا کی تیرگی، سنسان منزل ہے!
خدا جانے ہمارے اِس سفر کا مدعا کیا ہے؟
"وطن" اپنے وطن سے دُور، ایسی سرزمیں میں ہم؟
اُڑے جاتے ہیں اِس تاریکیٔ ہول آفریں میں ہم!
ہماری آرزو کیا ہے، ہمارا منتہا کیا ہے؟

یہ تاریکی یہ سنّاٹا یہ دہشت خیز ویرانی
کمالِ خستگی سے پاؤں کی طاقت رہی جائے
رہا جائے الٰہی! حوصلہ بھی دمبدم اپنا!

اگر ہو اس قدر سامانِ لغزش کی فراوانی
تو اس حالت میں ہم سے کس طرح امید کی جائے:
رہے اک جادۂ موہوم پہ ثابت قدم اپنا!

راشد وجدی

وادی کا سوار

اپنی عمر میں صرف تین بار میں نے اُسے دیکھا تھا —— اُسے جس کا نام بھی مجھے معلوم نہیں۔
اگرچہ ہماری تینوں ملاقاتیں عجیب سے عجیب تر تھیں لیکن آخری کا تصور بھی دل میں لاتے ہوئے اب تک مجھ پر کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔

سردیوں کا اختتام تھا اور رات نصف سے زیادہ گذر چکی تھی۔ میں اپنے قصبے کو بہت پیچھے چھوڑ کر مغرب کی سمت سفر کر رہا تھا۔ رات کی خاموشی میں شاہراہ پر صرف میرے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز بلند ہوتی تھی اور وہیں صحرا کی تاریک وسعت میں جسے میرا گھوڑا پیچھے چھوڑ چکا ہوتا بھٹکتی ہوئی غائب ہو جاتی تھی۔ چاند ابھی ابھی ڈوبا تھا اور میں اپنی نگاہیں شفق پر جمائے اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر ساکت بیٹھا تھا۔

میں اُسے خوف سے تعبیر نہیں کر سکتا لیکن ایک تنہائی سی ضرور مجھے محسوس ہو رہی تھی جب میں نے ایک دوسرے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اپنے پیچھے سنی —— وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا قدم بہ قدم اُسی راہ کو پامال کرتا ہوا جس پر سے میرا گھوڑا گذر جاتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں میرے دل میں ایک خوف سا اُٹھا۔ میرا خیال لمحہ بھر کے لئے مجھے شاہراہ پر سے اٹھا کر بھوت پریت کی بستی میں جا داخل ہوا جہاں وہ انسان کو نابود کر دینے کے لئے کئی کئی سوانگ بھر رہے تھے۔ لیکن ان متوہم تصورات کو جلد میں نے وہیں چھوڑ دیا اور اب میرے دل میں اپنے ہمراہی کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے رفتہ رفتہ اپنے گھوڑے کی رفتار ہلکی کر دی تاکہ وہ مجھ سے آگے نکل جائے لیکن مجھے تعجب ہوا جب اُس نے بھی اُسی آہستگی کے ساتھ تاریکی میں اپنے گھوڑے کی رفتار کو ہلکا کر لیا۔ ظاہر تھا کہ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر پیچھے رہنا چاہتا ہے۔ اور اُس کے اِس طرزِ عمل کو دیکھ کر پھر میرے خیالات اُس کی نسبت شبہ میں تبدیل ہو گئے۔ کبھی وہ ایک چھلاوے کی شکل اختیار کر لیتا جو انسان کے بھیس میں میرا تعاقب کر رہا تھا۔ اور کبھی وہ ایک قاتل کی صورت میں تلوار کھینچ کر پیچھے سے مجھ پر حملہ کرنے پر آمادہ معلوم ہوتا۔ اور کبھی میرا تصور اُسے ایک ڈاکو کی شکل میں میرے سامنے لے آتا جو مجھ سے میرا گھوڑا اور ٹٹو طلب کر رہا تھا۔

لیکن جب صبح کی روشنی اچھی طرح پھیل گئی اور میں نے مڑ کر اُس کے سراپا پر ایک نگاہ ڈالی تو اپنے تمام گذشتہ شبہات پر مجھے ندامت سی ہوئی۔ سانولے رنگ کا ایک وجیہہ نوجوان جس کا چہرہ سنجیدہ لیکن مسرور تھا

ننگے سر اپنے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ اُس نے گھوڑے کو وادی کی طرف موڑتے ہوئے مجھے سلام کیا اور کہا "دوست شاید ہم پھر کبھی ملیں"۔ اس کے بعد اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور پہاڑی کے پیچھے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اُس کے گھونگریالے بال مشرق کی سمت سے چلنے والی نسیم میں ہلتے ہوئے اس قدر دلفریب نظر آئے کہ اُس وقت اُس کا برہنہ سر ہونا مجھے بالکل قدرتی معلوم ہُوا۔ اور کئی میل آگے نکل جانے کے بعد مجھے احساس ہُوا کہ وہ ٹوپی پہنے ہوئے نہ تھا۔ میں نے خیال کیا یہ شخص عجیب و غریب ہے۔ کاش میں نے اُس سے اُس کا نام پُوچھ لیا ہوتا۔ سال بھر میں کئی بار مجھے اس راہ سے گذرنے کا اتفاق ہُوا لیکن پھر کبھی تصوّر میں بھی میں نے اُس نوجوان کو نہ دیکھا جورات کا ایک پہر میرا ہم سفر رہا تھا۔

خزاں کے موسم میں پھر ایک بار مجھے اپنا وہی سفر درپیش ہُوا۔ دوپہر کے وقت جب سفر کا سیدھا اور صاف راستہ ختم ہو چکا تھا میرا گھوڑا چکردار ڈھلوانوں اور پتھریلی وادیوں میں سے تھکا ہُوا غیر معمولی سست رفتاری کے ساتھ چل رہا تھا۔ اور خود میرے ہاتھ پاؤں بھی سفر کی کوفت سے ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ ایک بے جان بوجھ کی طرح میں اپنے تھکے ہوئے جسم کو گھوڑے کی پیٹھ پر لادے ہوئے جا رہا تھا اور تعجب ہے کہ مجھ سا صحرا نورد انسان بھی اُن لوگوں کی حالت پر رشک کئے بغیر نہ رہ سکا جو اس وقت اپنے علاقہ کی ریل گاڑیوں میں آرام سے بیٹھے دنوں کا سفر گھنٹوں میں طے کر رہے تھے۔

اگر دفعتہً اپنے گھوڑے کا پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے میں نیچے اترنے پر مجبُور نہ ہو جاتا تو یقیناً اس سنسان وادی میں جہاں کوسوں تک آبادی کا نشان نہ تھا میں کبھی ٹھہر کر سستانے کا خیال بھی نہ کرتا۔ لیکن اب اپنے گھوڑے کو تھوڑی دیر کے لئے کھلا چھوڑ کر میں ایک بڑے سے پتھر کے سہارے زمین پر بیٹھ گیا۔ کبھی کبھی پہاڑی درختوں کا کوئی خزاں زدہ پتہ شاخ سے جھڑ کر میرے قریب گر جاتا اور اس سنسان وادی میں جہاں موت کی سی خاموشی طاری تھی یہی ہلکی سی آواز زندگی کی کشمکش کا سب سے نمایاں ثبوت معلوم ہوتی تھی۔ اس تنہا مقام میں جس کا سکون خود میرے دل کے تمام ہنگاموں کو بھی سر کر چکا تھا معلوم نہیں کیوں میری چشمِ تصوّر دفعتہً اُسی سانولے چہرے والے نوجوان کو میرے سامنے لے آئی۔ میں اُسے بھول چکا تھا۔ کیونکہ بھول جانا یاد رکھنے کی نسبت ہمیشہ آسان ثابت ہُوا ہے۔

اُس نے صرف ایک بار رات کی تاریکی میں میرے ساتھ چند گھنٹے بسر کئے تھے لیکن وہ جو میرے ساتھ عمر میں

بسر کر چکے تھے معلوم نہیں کیوں اس وقت اُن کی بجائے اُس نے میرے تصوّر میں جگہ لے لی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر تاریکی میں میرا گھوڑا اسی شاہراہ پر جا رہا تھا اور میرے پیچھے پیچھے اُسی طرح کچھ فاصلے پر اُس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دے رہی تھی ——— لیکن اب وہ ڈاکو نہ تھا نہ قاتل اور نہ چھلاوہ۔ بلکہ ایک ایسا اجنبی نوجوان جس کے عجیب و غریب انداز کا میرے دل میں احترام تھا۔ اُس کے الفاظ حرف بہ حرف مجھے یاد آ گئے " دوست! شاید ہم پھر کبھی ملیں"۔ لیکن پھر ابھی تک وہ مجھ سے نہ ملا تھا اور یقیناً مجھے اُسی طرح بھلا چکا تھا جیسے میں اُسے آج تک بھولا رہا۔ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور دور تک اُن راستوں پر نگاہ ڈالی جن سے گذر کر میں آ رہا تھا۔ اور میں نے خیال کیا اگر اس وقت وہ یہاں آ جائے تو میرا اور اُس کا اگرچہ کوئی بھی تعلق نہیں لیکن میں ضرور اس سے مل کر خوش ہوں۔ پھر میں نے خیال کیا " کہیں وہ مر تو نہیں چکا؟" اور جس طرح ایک غیر کی موت کے متعلق ہم سوچ سکتے ہیں اُسی بے دردی کے ساتھ میں نے اس کی موت کے امکانات پر غور کرنا شروع کیا۔

مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور میں تھوڑی دیر کے لئے وہیں سو گیا۔ خواب میں پھر میرا گھوڑا وادی میں سے سرپٹ دوڑتا ہوا جا رہا تھا اسی طرح میرے تھکے ہوئے جسم کو اٹھائے ہوئے جس میں اب تھکن کے علاوہ نقاہت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ گھوڑا معمول سے بہت زیادہ تیزی کے ساتھ جا رہا تھا اور اُس کی رفتار کے انداز میں ایک وحشت تھی جس نے مجھے خوفزدہ بنا دیا۔ میں اُسے روکنے کی بے حاصل کوشش کرتا رہا لیکن وہ دیوانہ وار مجھ سے باگیں چھڑا کر بھاگ نکلا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور گھوڑا اسی بے پناہ رفتار کے ساتھ پہاڑ کے دامن میں پتھروں اور اونچے نیچے ٹیلوں کو پھاندتا ہوا متوحش انداز میں بھاگا جا رہا تھا۔ پھر دفعتہً ایک جھیل کے کنارے وہ دھڑام سے میرے سمیت زمین پر آ رہا۔ اور گرتے گرتے میرا نیزہ سیدھا میرے پہلو میں پیوست ہو گیا ——— جھیل کا پانی آئینہ کی طرح روشن تھا اور اس کی سطح پر مجھے اپنا عکس تیرتا ہوا نظر آیا ——— لیکن ایک سانولا چہرہ، برہنہ سر، اور سیاہ چمکیلے بال جن کے باریک باریک چکر ہوا میں دلفریب انداز کے ساتھ ہل رہے تھے۔

میں جاگ اٹھا لیکن خواب کا اثر کچھ دیر تک مجھ پر اس طرح مسلط رہا کہ اپنی بیداری خواب اور اپنا خواب مجھے بیداری معلوم ہونے لگا۔ جنگل میں چاروں طرف وہی بھیانک خاموشی چھائی ہوئی تھی اور کچھ دور سے میرے گھوڑے کے خشک گھاس چبانے اور کبھی کبھی آہستہ سے ہنہنا دینے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ بہت سے خشک پتوں کے درمیان ایک کانٹا میرے پہلو کے قریب کپڑوں میں الکا ہوا تھا اور میرا نیزہ میرے قریب زمین پر پڑا تھا۔

میں دوبارہ سفر پر روانہ ہونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن ابھی تک میرے دل پر پژمردگی سی طاری تھی۔ چند میل

کا فاصلہ طے کر لینے کے بعد مجھے اونچے اونچے بے برگ و بار درختوں کے درمیان پانی کی ایک جھیل نظر آئی۔ میں نے اپنے گھوڑے کا رخ اُدھر پھیر لیا اور جب ہم پانی کے قریب پہنچ رہے تھے میرا گھوڑا وحشتناک آواز میں چیخ اُٹھا اور اُس کے قدم وہیں زمین پر جم گئے۔ چند ہی قدم کے فاصلے پر جھیل کے کنارے ایک بڑے سے پتھر کے قریب جو کچھ مجھے نظر آیا اب بھی اُس خوف اور دہشت کے اثر کو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے شانوں کو زور سے حرکت دی۔ مجھے شک ہونے لگا کہ میں کہیں پھر سو تو نہیں گیا؟

وہ عجیب و غریب نوجوان جسے صرف ایک بار میں نے صبح کی روشنی میں دیکھا تھا اور جس کی یاد آج دفعتہً میرے خواب اور میرے خیال میں بیدار ہوگئی تھی سامنے زمین پر چت لیٹا ہوا تھا۔ اُس کے پہلو کے عین درمیان ایک نیزہ پیوست تھا، اور اُس کے آس پاس کی زمین پر کئی سرخ نشان تھے۔ اور ایک سیاہ گھوڑا جس کے سفید دانت باہر کو نکل آئے تھے اپنا زخمی سر جھکائے اُس کے قریب کھڑا تھا۔

میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن یوں محسوس ہوا گویا عمر بھر کے لئے میری قوتِ گویائی سلب ہو چکی ہے۔ پھر اُس نے خود ہی سر کے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔ اُس کا رنگ زرد تھا اور اُس کے چہرے پر نزع کی سی تکلیف ظاہر ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود یوں ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت کوئی ایسا خیال اُس کی روح پر طاری ہے جس کے مقابلے میں وہ اس تکلیف کو بھی بھول چکا ہے۔

اُس نے بغیر کراہنے کے دھیمی اور صاف آواز میں کہنا شروع کیا "دوست! تم بہت دیر سے آئے۔ اب نیزہ جلد میرے پہلو سے کھینچ لو، میرے جسم کو یہیں چھوڑ دو اور ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کے بغیر یہاں سے جنوب کی سمت جاؤ۔ شام کے قریب سب سے پہلی بستی تمہیں ملے گی اور اس میں داخل ہونے سے پہلے پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا مکان ہوگا۔ اُس کی مکین کو شام سے پہلے پہلے میرے مرنے کی اطلاع دے دینا۔"

میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا "کوئی ایسا نشان بتا دو جس سے اس کی شناخت میں مجھے زیادہ سے زیادہ آسانی ہو جائے۔" اُس نے کہا "اُس کا نشان؟ اور پھر دفعتہً اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اُس کی آواز جو دھیمی پڑ چکی تھی پہلے سے بہت زیادہ صاف اور بلند ہوتی گئی اُس کے دل کے تمام جذبات تصویر کی طرح کھنچ کر اُس کے چہرے پر اُتر آئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی زبان سے نہیں بلکہ اپنے دل اور اپنی روح سے بول رہا ہے۔

"وہ دنیا میں صرف ایک ہے تنہا ــــ جس کا دل اس جھیل کے شفّاف پانی سے زیادہ روشن، زیادہ پاک، اور زیادہ بے لوث ہے جس کے دل میں محبت آسمان کے نیلے سمندر کی طرح بے پایاں ہے اور جس کی وفا اس پُرسکون وادی کے سکوت سے زیادہ خاموش، زیادہ پائیدار ہے اور جس کا چہرہ اس چمکتے ہوئے روزِ روشن کہیں زیادہ حسین اور پیارا ہے۔"

پھر اُس نے کمزور آواز میں کہا "میں نے آج تک کبھی اُس سے وعدہ خلافی نہ کی تھی میں اپنی موت کو زیادہ آسان سمجھتا ہوں بہ نسبت اس کے کہ اُسے اپنی عمر میں ایک دن کے لئے بھی میری وفا میں شبہ ہو"۔ آخر اُس کی زبان رک گئی اور اُس نے اپنی آنکھیں آہستہ آہستہ بند کرلیں۔

میں نے اپنا کانپتا ہُوا ہاتھ اُس نیزے پر ڈالا جو اس کے پہلو کو چیر کر آگے نکل گیا تھا اور اپنی تھوڑی بہت قوت کو جو اُس وقت میرے جسم میں باقی رہ گئی تھی اکٹھا کر کے میں نے نیزہ اوپر کو کھینچ لیا۔ نیزے کا چھوٹا سا سرا اُس کے پہلو کے اندر ہی ٹوٹ کر رہ گیا اور خون کا ایک سیلاب ابل کر جھیل کے کنارے پھیلنے لگا۔

میں نے جھک کر اُس کے چہرے پر نگاہ ڈالی، لیکن شاید اسی وقت جب میں نیزے کو اُس کے جسم سے علیحدہ کر رہا تھا اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔

میں نے اپنے گھوڑے کی باگیں جنوب کی سمت موڑ لیں۔ میرا گھوڑا تیز جا رہا تھا اور خیالات کے ہجوم میں میرا سر آگے کو جھکا ہوا تھا۔

شام کے قریب پہاڑ کے دامن میں میں نے اُس چھوٹے سے مکان کو پا لیا۔ اُسکی دیواریں سر بسر اس قسم کی عجیب بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں جن کے پتّوں کا رنگ سبزی کی بجائے آم کی کونپل کے مانند سرخی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اور سرخ پتّوں کے درمیان سفید پھولوں کے بڑے بڑے گچھّے کھلے ہوئے تھے۔ مکان کا دروازہ بالکل کھلا تھا اس طرح جیسے کسی کو پہلے ہی وہاں میرا انتظار ہو۔ اور اس سے پہلے کہ میں اندر داخل ہوتا مجھے ایک نوخیز لڑکی دروازے میں کھڑی ہوئی نظر آئی۔ مرنے والے کے الفاظ میری آنکھوں کے سامنے آگئے۔ واقعی وہ حیرت انگیز طور پر حسین تھی ـــــ اتنی کہ جب میں نے اُس کے چہرے کی طرف نگاہ اٹھائی تو مجھے یوں محسوس ہُوا کہ اس کی آنکھوں میں حسن کا کوئی ایسا جادو ہے جس سے میں ابھی مسحور ہو جاؤں گا۔ خود بخود میری نگاہیں اُس کے سامنے جھک گئیں۔ اور اب بھی اگر کوئی الگ الگ اُس کے خد و خال کی نسبت مجھ سے سوال کرے تو میں سوائے اس کے کچھ نہ کہہ سکوں گا کہ وہ نور کا ایک پیکر تھی جسے کسی سحر نے انسانی شکل میں تبدیل کر دیا تھا۔

میں اُس کے لئے کس قدر بُری خبر لے کر آیا تھا۔ میرا دل کانپ گیا۔ اُسے اُس نوجوان کی موت کی خبر سنانا مجھے اتنا ہی دشوار معلوم ہونے لگا جیسے کوئی قاتل قتل کے بعد اپنے سنگین جرم کا اقرار کر رہا ہو۔

اُس نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا "شاید آپ یہاں رات بسر کرنے کے لئے آئے ہیں لیکن بستی میں آپ کو یہاں کی نسبت بہت زیادہ آرام ملے گا"۔ مجھے یوں معلوم ہُوا کہ اُس کی آنکھوں کا سحر اتر کر اب اُس کی

آواز میں ساری ہو گیا ہے۔ میں نے رکتی ہوئی آواز میں کہا "میں آپ ہی کے پاس ایک پیغام لے کر آیا ہوں اور یہ پیغام اُس شخص کا ہے جو آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔"

اُس نے میری بات سُن کر اس طرح اپنے سر کو جنبش دی جیسے اُسے میری بات مضحکہ خیز طور پر ناقابلِ یقین معلوم ہوئی ہے اور بولی "پیغام؟ نہیں وہ خود آج یہاں آنے والا ہے" میری زبان سے اس کے جواب میں ایک حرف بھی ادا نہ ہو سکا گویا واقعی میں جھوٹ بول رہا تھا۔ اپنے دل کی دھڑکن کو روکتے ہوئے میں پھر بولا "افسوس میں ایک بہت بُری خبر لے کر آیا ہوں"

اُس نے ذرا گھبرا کر لیکن بظاہر دلجمعی سے کہا "اُس کی زندگی میں دنیا کی کوئی بری خبر مجھے تکلیف نہیں پہنچا سکتی" "لیکن آج وہ مر چکا ہے!" --- مجھے خود بھی معلوم نہ ہوا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور جب الفاظ میری زبان سے ادا ہوئے تو خود میرے کانوں نے ان کو اس طرح سنا جیسے کہنے والا کوئی اور تھا۔

اُس نے مجھ پر ایک ایسی نگاہ ڈالی جو سراپا قہر، خوف، وحشت اور دیوانگی سے معمور تھی۔ پھر ایسی آواز میں جسے آواز کی بجائے چیخ کہنا زیادہ موزوں ہوگا اُس نے کہا "سچ کہتے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں میرے الفاظ میں اتنی ہی سچائی ہے جتنا وہ اپنی محبت میں صادق تھا۔ اور میرے دل میں اُس کی شرافت کا اتنا ہی احترام ہے جس کے قابل اُسے خدا نے بنایا تھا۔"

پھر میں نے جلد جلد اُسے سب کچھ بتا دیا اور یہ سب سُن کر وہ بولی "کیا اُس نے پھر یہاں آنے کے متعلق تم سے کچھ نہیں کہا؟"

اس انوکھے سوال کا مطلب سوائے جنون کے میں کچھ نہ سمجھ سکا اور خود اُس کے چہرے سے بھی ظاہر تھا کہ یہ جملہ بلا ارادہ اُس کے منہ سے نکل گیا ہے۔ میں نے کہا "اس کی وصیت کے مطابق میں نے اُس کے جسم کو وہیں چھوڑ دیا اور سب سے پہلے آپ کے پاس آیا ہوں۔" لیکن اُس نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی۔

جس طرح ہم ڈوبتے ہوئے سورج پر آسانی سے نگاہ ڈال سکتے ہیں اُسی طرح پھر میں نے ایک نگاہ اُس کے چہرے پر ڈالنے کی کوشش کی اور کہا "میرا خیال ہے اُسے جنگل میں کوئی ایسا حادثہ پیش آ گیا جس میں کسی دشمن کا دخل نہیں۔" تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہی اور پھر اُس نے کہا "مجھے اس کا یقین ہے اس کا دوست کوئی نہیں تھا اور اُس کا دشمن بھی کوئی نہیں تھا" پھر وہ وہاں سے چلی گئی۔

میں چاہتا تھا کہ وہ روئے اور ماتم کرے جس طرح عام انسانوں کا قاعدہ ہے اور مجھ سے ذرا ذرا سی بات بھی اس کے متعلق پوچھے۔ میں اُسے صبر کی تلقین کروں اور جو کچھ میں سمجھنا چاہتا ہوں وہ سب اُس سے پوچھ سکوں لیکن ان میں سے ایک

بات بھی نہ ہوئی - خلافِ توقع نہ تو وہ روئی اور نہ بے ہوش ہوئی اور نہ پھر اُس نے اس کے متعلق مجھ سے کوئی استفسار کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ غم سے بالکل دیوانی ہوگئی ہے، اور اس وقت اُس سے کوئی بات کرنا بے فائدہ ہے کیونکہ اب نہ وہ خود بولتی تھی اور نہ میری کوئی بات سنتی تھی۔

سُورج غروب ہوگیا اور میرے اعضا اُس وقت اس قدر تھکے ہوئے اور میرا دل اتنا افسردہ تھا کہ کہیں اَور جاکر رات بسر کرنے کی جگہ تلاش کرنا یا کسی سے بات تک بھی کرنا مجھے سخت دشوار معلوم ہوتا تھا۔

آخر میں نے وہیں مکان کے دو کمروں میں سے ایک میں رات بسر کرنے کی اجازت حاصل کرلی جہاں بستر اور روشنی کے علاوہ مجھے کھانے پینے کی بھی چند چیزیں مل گئیں۔

پہلے پہل اُس کے چہرے سے جس دیوانہ وار غم کا اظہار ہوا تھا اُس کی جگہ اب اطمینان لے چکا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہوگئی تھی اور مختلف کاموں میں اس سرگرمی سے مشغول تھی جیسے کوئی کسی خاص تیاری میں ہو کبھی وہ آہستہ آہستہ گانے لگتی اور کبھی خود ہی مسکرا پڑتی میں اُس کے اس عجیب و غریب طرزِ عمل سے حیرت زدہ تھا۔ نہ میں یہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ بالکل دیوانی ہوگئی ہے اور نہ یہ سمجھ سکتا تھا کہ اُس نے اُس غریب نوجوان کو اپنی وفا اور محبت کے متعلق محض دھوکے میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آخر میں انہیں خیالوں میں اپنے بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

معلوم نہیں رات کتنی گذر چکی اور میں کب سے سو رہا تھا جب خواب کی سی حالت میں مجھے محسوس ہُوا کہ آہستہ سے کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس کے بعد روشنی گُل ہوگئی۔ کوئی میرے تکیہ کے قریب جھکا اور پھر اُسی آہستگی سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد پھر میں شاید تھوڑی دیر کے لئے بے خبر ہوگیا لیکن دفعتہً پھر مجھ پر وہی نیم بیداری کی سی کیفیت طاری ہوگئی ـــــ دُور سے کسی گھوڑے کے دوڑنے کی آواز آرہی تھی اور دُور ہونے کی بجائے یہ آواز لحظہ بہ لحظہ قریب ہوتی چلی آئی۔ گھوڑا شاید وہیں آکر رُک گیا کیونکہ آخری ٹاپ کی آواز عین میرے کمرے کی پچھلی دیوار کے قریب سنائی دی۔ پھر نیند مجھ پر پُورا غلبہ پالینے کو تھی جب میں نے دوسرے کمرے کے دروازے پر آہستہ سے ایک آواز سنی دروازہ نہایت آہستگی سے کُھلا اور پھر اُسی آہستگی سے بند ہوگیا۔

اب میں پوری طرح جاگ اُٹھا تھا۔ دوسرے کمرے سے مسلسل اور آہستہ آہستہ کوئی آواز اُٹھ رہی تھی۔ میں نے کان لگا کر سننا شروع کیا۔ کوئی ہلکی ہلکی سسکیاں اور آہیں بھر رہا تھا اور دوسری اس میں زیادہ ہلکی اور مبہم ایک آواز تھی جسے میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ پھر بے اختیار ہوکر میں اپنے بستر سے اُٹھ بیٹھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اس پُراسرار لڑکی کے پاس جو تمام دنیا سے بیگانہ معلوم ہوتی تھی اس وقت کون آیا ہے۔ میرے تاریک کمرے اور دوسرے کمرے کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی

لیکن ان کے درمیان دروازہ کوئی نہ تھا۔میں راستہ ٹٹول کر باہر نکل آیا۔دوسرے کمرے میں روشنی جل رہی تھی۔آہستہ آہستہ رونے اور سسکیاں بھرنے کی آواز اب صاف سنائی دینے لگی۔چھپ کر دیکھنا شاید بزدلی سمجھا جائے لیکن اس پُراسرار ماحول میں یہ بزدلی بھی مردانگی سے کم نہ تھی۔میں نے دروازے میں سے بہت کوشش کے بعد ایک باریک سی درز ڈھونڈ لی اور اندر کی طرف جھانکنے لگا ـــــ کوئی شخص دروازے کی طرف پیٹھ پھیرے بستر کے قریب بیٹھا تھا اور وہ لڑکی گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی اُس کے کپڑوں میں منہ چھپائے سسکیاں بھر رہی تھی۔اس کے سیاہ اور لمبے بال پریشانی سے اُس کے شانوں پر بکھر گئے تھے اور اس شخص کا ایک ہاتھ اُس کے سر پر تھا۔پھر میں نے اُسے بولتے ہوئے سنا لیکن ایسا آہستہ کہ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔اس کے جواب میں لڑکی نے اپنا سر اُوپر اُٹھالیا اور روتی ہوئی بولی "آہ اب ایک لمحہ بھی میں یہاں نہیں رہ سکتی" پھر اُس شخص نے پہلے سے بھی زیادہ دھیمی آواز میں کچھ کہا اور لڑکی سسکیاں بھرتی ہوئی بولی "مجھے اس کی پروا نہیں، چلو کیونکہ اب وقت بہت تھوڑا باقی ہے"

میں خود بخود دروازے سے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔میرا خون جوش سے میرے جسم میں کھولنے لگا۔میں نے سوچا آہ وہ بھولا نوجوان اس عورت کے لئے اپنے دل میں کیا جذبات رکھتا تھا۔اُس کی انتہائی وفا کا ثبوت اُس کا بے گور و کفن جسم اب بھی جنگل میں پڑا ہے لیکن وہ عورت جس کی وفاداری پر اُسے اپنی وفا سے بھی زیادہ اعتماد تھا لیکن جو اُس کی موت پر ایک آنسو بھی نہ نکال سکی تھی اب کسی دوسرے کے سامنے کس بیتابی سے رو رہی ہے۔اور اب بھی ان آنسوؤں میں اُس کی یاد شامل نہ تھی۔کیا سب عورتوں کی فطرت اسی طرح ہوتی ہے؟ میں خوف اور نفرت سے کانپ اُٹھا۔

کمرے کے اندر سے ایک ہلکی سی چیخ کی آواز بلند ہوئی اور دفعتہً دروازہ کھل گیا جو کچھ مجھے نظر آیا اُسے دیکھ کر اگر اُس وقت میری جان بھی نکل گئی ہوتی تو تعجب نہ تھا۔وہ سانولے چہرے والا نوجوان جس نے جنگل میں جھیل کے کنارے میرے سامنے جان دی تھی برہنہ سر میرے سامنے سے گذر گیا۔اب بھی اُس کا پہلو خون سے سرخ ہو رہا تھا اور اُس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی اس کے ساتھ ساتھ ایک اور سایہ تھا ـــــ ایک عورت کا ہیولیٰ ـــــ اور اس کے پہلو پر بھی ٹھیک اسی جگہ مجھے ایک سرخ دھبّا نظر آیا۔

شاید اُس نے بھی میری طرف دیکھ لیا۔اور اس کے بعد وہ دونوں میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔اس کے بعد کیا ہوا اور میں کہاں رہا مجھے کچھ معلوم نہیں۔

دن کو جب میری آنکھ کھلی تو میں اپنے بستر پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔سورج شاید بہت دیر کا نکل آیا تھا کیونکہ تیز دھوپ پہاڑ کے دامن میں چاروں طرف خوب پھیل چکی تھی اور پہاڑ پر سے کوّوں کی کائیں کائیں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں اپنے بستر سے اُٹھ بیٹھا۔دن کی روشنی میں جب ہر چیز پہلے کی طرح مجھے حقیقی شکل میں نظر آئی تو رات کا عجیب و غریب

واقعہ بھی میرے دل پر ایک پریشان خواب کے مانند رہ گیا۔ مجھے اتنی دیر تک سوئے رہنے سے پشیمانی ہوئی اور اب میں چاہتا تھا کہ گھر کی مالکہ اگر مجھ سے کوئی خدمت لینا چاہتی ہے تو اُسے بجا لا کر پھر میں فوراً یہاں سے چلا جاؤں۔ مجھے اپنے کئی معاملات طے کرنے تھے جن میں پہلے ہی ایک دن کی تاخیر ہو چکی تھی۔

اُسے صحن میں نہ پاکر میں اُس کے کمرے کی طرف گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا بالکل اُسی طرح اُسی انداز میں جیسے رات کو میں اسے کھلتے دیکھ چکا تھا۔ جب میں آگے بڑھا تو بے اختیار میرے منہ سے حیرت اور خوف کی ایک چیخ نکل گئی۔ وہ اپنے بستر پر چت لیٹی ہوئی تھی اور میرا نیزہ سیدھا اُس کے پہلو میں پیوست تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ اُس کے چہرے پر تھا اور دوسرا نیزے پہ۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی ——— اتنی نمایاں کہ گویا وہ ہنس رہی ہے۔

رات کا واقعہ میرے حافظہ میں اتنا روشن ہو گیا کہ اب مجھے اس پر کسی پریشان خواب کا شبہ نہ رہا۔

میرا نیزہ جا چکا تھا اور صرف میری تلوار میرے تکیہ کے نیچے رہ گئی تھی۔ مجھے خوف معلوم ہونے لگا۔ اگر بستی کا کوئی آدمی اس وقت یہاں آ جائے تو میرے قاتل ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ میری صداقت کا جاننے والا سوائے میرے وہاں کون تھا؟

میں نے اپنے نیزے کو ہمیشہ کے لئے اُسی خوبصورت لڑکی کے پہلو میں چھوڑ دیا جس کے سراپا پر نگاہ ڈالنے سے اُس وقت محسوس ہوتا تھا کہ محبت مجسم ہو کر اس پیکر میں سما گئی ہے۔

جلد جلد تیار ہو کر میں جانے کے لئے باہر نکلا لیکن میرا گھوڑا غائب ہو چکا تھا۔ مکان کی دیواروں پر وہ عجیب و غریب بیل جو بہار کی بجائے خزاں میں نشو و نما پاتی ہو گی اُسی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ سورج کی زرد شعاعوں کا عکس پڑنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے پتّوں اور ٹہنیوں کی رگیں زندگی کے خون سے بھری ہوئی ہیں۔ سفید پھولوں کے درمیان اب کثرت سے گہرے سرخ رنگ کے پھول بھی نکل آئے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہر پھول جدا جدا آنکھوں سے مجھے گھور رہا ہے۔ پہاڑ پر کوئی کوّا افسردہ انداز میں کائیں کائیں کر رہا تھا اور ایک سیاہ گھوڑا گھاس کی تلاش میں پتھروں کے درمیان منہ مار رہا تھا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا پہاڑ پر سے اُٹھا اور چیختا ہوا میرے کان کے قریب سے گذر گیا۔

وہ ساری فضا پہاڑ مکان اور وہ بستی جو دُور سے نظر آ رہی تھی سب مجھے ایک سحر معلوم ہونے لگا۔ میں پیدل ہی پہاڑوں کے سلسلے میں داخل ہو گیا کیونکہ میرا نیزہ ایک انسانی پہلو میں پیوست تھا اور وہاں میری صداقت کا جاننے والا سوائے میرے کوئی نہ تھا۔

پہاڑوں میں کچھ دور چل کر مجھے اپنا گھوڑا ایک جگہ سوکھے پتّوں کو ہٹا ہٹا کر گھاس چرتا ہوا مل گیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر زور سے ہنہنایا اور اسے پاکر مجھے اس وقت یوں محسوس ہوا گویا میں اپنی عمر کے کسی پرانے رفیق سے مل رہا ہوں۔

پھر میرا گھوڑا وادی میں تیز جا رہا تھا۔ میں نے لمحہ بھر کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں شاید میرا تصوّر پھر ایک بار رات کی اُسی تاریکی کو ڈھونڈ رہا تھا جب میرے پیچھے پیچھے شاہراہ پر ایک دوسرے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز بلند ہوئی تھی۔

"راہرو"

خمریات

(۱)

اے شاہدِ شوخ دل کے ویرانے میں آ
اے بادۂ ناب جسم کے پیمانے میں آ
اے ابرِ سیاہ داغِ عصیاں دھو دے
اے رحمتِ کردگار میخانے میں آ

(۳)

مسرور ہوا نشے سے دل شاد ہوا
صدماتِ غمِ دہر سے آزاد ہوا
میخانے میں آ کے زندگی بیتی سب
نیکی و بدی کا عالم برباد ہوا

(۲)

نشے سے فنا ہوئے ہیں ہستی کے غبار
ہے بادۂ راحت اثر جام پُر بہار
معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہیں مستِ دوام
محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہے عالمِ خمار

(۴)

کیا زندہ ہوں جب تک وہ زلفِ سیہ نہ ہو
بے چینی اور عیش کے اسباب نہ ہو
گر ہم کو میسّر نہ ہوا جامِ شراب
میخانے میں یا تم ہو کبھی عیب نہ ہو

ثاقب
کانپوری

بازیافت

آ اے محبوب عشق کی منزل کو وہیں سے شروع کردیں جہاں ہم نے اسے چھوڑ دیا تھا؛

آ اُس خواب کے رشتوں کو از سرِ نو استوار کریں جسے گزرے مدتیں ہوگئیں؛ اور پھر ایک دوسرے سے محبّت کریں اور خوش ہوجائیں خواہ دنیا اس محبّت کی تضحیک ہی کیوں نہ کرے۔

آ جذبات کی اُن قبروں کو جو ہمارے ہجر اور ہمارے وصال کے درمیان حائل ہیں؛ اور اُن آنسوؤں کو جنہوں نے وقت کی زرکاریوں کو زنگ آلود کردیا ہے؛ اور اُس کہر کو جو ہماری امید کے چمن پر چھا گیا ہے یکسر بھلادیں۔

آ ہم اُس سرد مہر اور کینہ ور تقدیر کو بھول جائیں جس نے ہمارے محبّت کرنے والے دلوں کو اپنا کھلونا بنالیا اور ایک مرتبہ پھر مسرور محبّت کے عیش و نشاط میں زندگی بسر کریں۔

نہیں، ابھی وقت بیت نہیں گیا!

میرے چہرے کی بڑی بڑی جھریوں کو بھول جا؛ میرے سفید سفید بالوں کو بھلادے؛ میری آنکھوں میں دیکھ! اے محبوب! تیری محبّت وہاں پہلے سے زیادہ روشن چمک رہی ہے۔

تیری پیاری آنکھوں کی کومل گہرائیوں میں اپنی جوانی کی کھوئی ہوئی یاد مجھے نظر آرہی ہے؛

وہ یاد جو تیری وفا کی مقدس روشنی سے منوّر ہے؛ اور جس میں بہار کے شفاف آسمانوں کا نیل جھلک رہا ہے۔

ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑ لے اور آ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے پیچھے کی طرف روانہ ہوں، نہیں آگے کی طرف ـــــــ مستقبل کے اُس روشن ملک کی طرف جو ہمارا ماضی تھا۔

(ایلا ویلر ولکاکس) عبدالعزیز

رحمٰن کی ایک غزل

تیری خواب آلود آنکھیں میری نیند اڑا لے گئیں
تیرے ہونٹوں نے مئے ناب کی لذّت کو مات کردیا۔
نہ آنکھوں میں آنسو باقی رہے اور نہ صبر کی کوئی صُورت رہی
میری بے صبری نے آنکھوں سے پانی کو خشک کردیا۔
میرے دل کو مطرب کے نغموں نے چھلنی کردیا
اور عقل کو ساقیوں کی شراب نے گم کردیا۔
ایک ساقی اور یار دوسرے مطرب نے مل کر
میرے جوفِ سینہ سے دل کو اڑا لیا۔
میں تجھ پر نثار! کیا ہُوا کہ تو میرے دل کو چھین لے گیا
میں مطمئن ہوں، آخر میرے محبوب کے سوائے کوئی اور تو نہیں لے گیا۔
تیرا خط تیرے مصحفِ رخ کے سیاہ حروف ہیں
اس کتاب کے شغل نے مجھ پر خور و خواب حرام کردیا۔
زہد و پرہیزگاری کا جو سرمایہ بھی میرے پاس تھا
اُسے تیرے حسن کا سیلاب بہا لے گیا۔
رحمٰن نے اپنے دل پر محراب کا نقش بنایا تھا
لیکن تیرے نقشِ ابرو نے اُسے بھی محو کردیا۔

پروانہ اور بلبل دونوں کی حالت دیکھ کر حیران ہوں
کہ تیرا رخِ انور شمع ہے یا پھُول!

(پشتو)

مظفر احمد

محفلِ ادب

عربی خون کا ایک گرم قطرہ

اسپین میں جب مسلمانوں کی سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہؤا تو اس انتشار کی حالت میں کچھ مسلمان افریقہ چلے گئے، کچھ اسپین ہی میں رہ کر عیسائیوں کے مظالم سہنے لگے، اور کچھ لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کر کے ان مظالم سے نجات حاصل کر لی، اور عیسائی سلاطین کے مقربین میں داخل ہو گئے۔ انہی عیسائیوں میں اموی خاندان کا ایک بہادر بھی شامل تھا جس کا اسلامی نام محمد بن امیہ تھا لیکن عیسائی ہونے کے بعد الدن انسطونیو مولائی دی قرطبہ وفالور کے نام کر پکارا گیا۔ اس کی صلب سے تین لڑکے پیدا ہوئے جن میں ایک کا نام فرنٹڈو، دوسرے کا مارٹین اور تیسرے کا لویس تھا۔ ان میں الدن فرنٹڈو جو خاندانی لقب سے ممتاز تھا نہایت آزاد اور سر دلعزیز شخص تھا اور غرناطہ کی مجلسِ امرا کا ممبر منتخب ہو گیا تھا۔ اس تعلق سے وہ ۱۵۶۵ء میں یعنی فتحِ غرناطہ کے ستر سال بعد ایک بار مجلسِ امرا میں جب کہ اُس کی عمر ۲۲ سال کی تھی شریک ہونے کے لئے گیا، اور جیسا کہ تمام امراء کا دستور تھا، اپنی تلوار دروازے پر رکھ دی، لیکن اپنے خنجر کو اپنے پاس سے جدا کرنا پسند نہیں کیا۔ اُس کی یہ روش صدرِ مجلس کو پسند نہیں آئی، اور اس نے اُس نے سختی کے ساتھ اس کو سرزنش کی فرنٹڈو نے اس کے یہ سخت الفاظ سنے تو اس کا عربی خون کھولنے لگا، اور اس نے ان الفاظ میں اس کا جواب دیا،

میں جس طرح چاہوں گا مجلس میں شریک ہوں گا، کیونکہ میں سلاطینِ بنو امیہ کی اولاد ہوں، اور میرے آباد اجداد اِس ملک کے بادشاہ تھے۔"

اب صدرِ مجلس نے اور بھی سخت الفاظ استعمال کئے، اور اُس کو ایک وحشی قوم کا فرد قرار دیا، اس پر فرنٹڈو کا غصہ اور تیز ہؤا اور اس نے دفعۃً اس پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد تمام امرا نے اُس پر متفقہ حملہ کیا تو اُس نے اپنے خنجر سے سب کا مقابلہ کیا، اور دروازے تک اُن کو دھکیلتا ہوا چلا آیا، دروازے پر پہنچ کر اپنی تلوار بھی ہاتھ میں لے لی، اور ایک خاص محلے میں جس میں عرب خاندان آباد تھے نکل آیا۔ چند ہی دنوں میں ان عربوں کی ایک بہت بڑی جماعت اس کی شریکِ کار ہو گئی۔ اس نے ان کی ایک فوج مرتب کی اور ان کو لے کر پہاڑ کی طرف روانہ ہؤا جہاں بہت سے عرب آباد تھے۔ یہ سب کے سب عیسائیوں کے مظالم سے تنگ آ کر اس پہاڑ کے دامن میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ ان

سب کی پشت پناہی حاصل کرنے کے بعد اُس نے اپنی بادشاہی کے ساتھ اسپینی سلطنت کے خلاف عام جہاد کا اعلان کیا اور اس کے جھنڈے کے نیچے عربوں کی ایک معتد بہ جماعت جمع ہوگئی جن کے سینے اسپینیوں کے بغض و عداوت کا آتشکدہ بنے ہوئے تھے۔ اس جماعت کو لے کر اُس نے اسپینیوں پر حملہ کیا اور اُن کے خون کا دریا بہا دیا۔ اسپینی سلطنت نے بھی بڑے عزم و استقلال کے ساتھ اس پُرجوش اسلامی جماعت کا مقابلہ کیا، لیکن ایک مدت تک ناکام رہی۔ بدقسمتی سے فرنٹڈو کا ایک چچازاد بھائی جس کا نام ابن امیہ تھا، اور جو ان عربوں پر حکومت کرنے کا خواہشمند تھا اس کا رقیب بن گیا۔ اُس نے سازش کر کے اس کو دھوکے سے قتل کرا دیا اور خود بادشاہ بن کر دوبارہ اسپینیوں کے ساتھ جہاد شروع کیا، لیکن اس کے اعوان و انصار کو رشوت دے کر اسپینیوں نے اُس کو قتل کرا دیا، اور اُس کے قتل ہو جانے کے بعد تمام عرب حملہ آور منتشر ہو گئے اور چار سال کی جنگ کے بعد اسپینیوں نے ان پر قابو پا لیا۔

فرنٹڈو کا باپ اپنے بیٹے کی موت کے بعد مدرید میں پناہ گزین ہو گیا تھا اور ایک فوجی سردار کی سفارش سے سلطنت نے بھی اس کو اور اس کی اولاد کو معافی دے دی تھی۔ اس معافی کے بعد اس کا دوسرا فرزند الدن مارٹین خاندانی لقب سے ممتاز ہوا لیکن اُس نے اپنے تیسرے بھائی الدون لوئس کے ہاتھ اپنی تمام جائداد فروخت کر دی اور اب اس کا لقب الدون لوئس ای ابنیسیا رغواروس قرار پایا۔ لیکن لوئس کے دوسرے بھائی مارٹین کا لقب صرف مارٹین دی والور باقی رہ گیا۔

اسپین میں اب تک یہ معزز خاندان اپنی قدیم وجاہت کے ساتھ قائم ہے اور اس کی تاریخ کے بیان کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اِس وقت اسپین میں انہی دونوں متصادم فریقوں کی یادگار آج کل ایک مشہور اسپینی شاعر ہے جس کا نام فیلا سباسا ہے۔ والور جو مارٹین کے لقب کا ایک جزو ہے، اس شاعر کی ماں کے خاندان کا نام ہے، اور اس کا باپ جنرل فیلا سباسا کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس نے اسپینیوں کی طرف سے الدن فرنٹڈو کا مقابلہ کیا تھا، اس مشہور شاعر یعنی فیلا سباسا کی ولادت ٹھیک اُسی مکان میں ہوئی ہے، جس میں اس کا اسلامی اور عربی دادا فرنٹڈو دھوکے سے مارڈالا گیا تھا۔ حریر کی جس سبز رنگ چادر میں فرنٹڈو قتل کیا گیا تھا وہ فیلا سباسا کی ماں کے پاس بطور ایک یادگار کے محفوظ تھی، لیکن فیلا سباسا نے چودہ برس کی عمر میں ایک تہوار کے دن اس کو استعمال کیا تو بلجیم کے ایک شخص نے اس کو خریدنا چاہا اور اس سے اس کے فروخت کرنے کی درخواست کی۔ پہلے تو فیلا سباسا نے انکار کیا، بعد کو اس کے اصرار سے مجبور ہو کر بلا قیمت ہدیۃً دے دی۔ اب اُس کے خاندان میں اس چادر کا صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا محفوظ رہ گیا ہے۔

اس عبرتناک واقعہ پر اب اگرچہ صدیاں گذر گئی ہیں اور خود مسلمان اپنی اسپینی شان و شوکت کا افسانہ بھول چکے ہیں، لیکن اس شاعر کی رگوں میں اب تک عربی خون دوڑ رہا ہے، اور وہ بار بار اپنے اشعار میں اس بھولے ہوئے افسانے کو دہراتا رہتا ہے۔

چند روز ہوئے ایک عیسائی عرب سیاح نے امریکہ میں بمقام سان بادلو اس سے ملاقات کی ہے، اور اس کے حالات، سوانح، معاشرت اور کلام پر ایک شاعرانہ ریویو کیا ہے جو المقتطف نومبر ۱۹۲۹ء میں چھپا ہے اور جس سے بہ تلخیص ماخوذ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "اس شاعر کی عمر ۵۰ سال سے زائد نہیں ہے، وہ سگرٹ پیتا ہے اور کھانے پینے کی پروا بہت کم کرتا ہے، ہمیشہ شاعرانہ تخیلات میں غرق رہتا ہے، اور یہ استغراق اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ شور و غل سے اُس کے شاعرانہ خیالات میں کوئی خلل نہیں واقع ہوتا، وہ شعر لکھتا رہتا ہے اور اس کے بچے اُس کے گرد کھیلتے کودتے اور شور مچاتے رہتے ہیں، اُس کی تصنیفات کی تعداد اس وقت تک ۵۸ تک پہنچ چکی ہے۔ اگرچہ کثرت تصنیف کسی مصنّف کی کوئی خاص فضیلت نہیں ہے، لیکن اس شاعر نے کثرتِ تصنیف کے ساتھ خوبیٔ تصنیف کی فضیلت بھی حاصل کرلی ہے، اور نظم و نثر دونوں میں اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اس کی تصنیفات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اکثر کا موضوع عرب اور عربیت ہے۔ اس کے ایک ناول کا نام "قصر لولو" ہے جس میں اُس نے ابن احمر کے زمانے کا ایک واقعہ لکھا ہے جو غرناطہ میں پیش آیا تھا۔ ایک ناول میں جس کا نام "ابن امیہ" ہے، وہ واقعات لکھے ہیں جو فتح غرناطہ کے ستر سال بعد وہاں کے بچے کھچے عربوں کو پیش آئے۔ ایک ناول میں جو "بادیہ" کے نام سے مشہور ہے، وہ واقعات لکھے ہیں جو صحرا میں پیش آئے اور ان واقعات کے سلسلہ میں اہل عرب کی شجاعت، فیاضی اور مہمان نوازی وغیرہ کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے غرض اس کے تمام ناولوں کے کیرکٹر اور ہیرو عرب ہیں، اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرب، آثار عرب اور ان کی اندلس کی معاشرتی واخلاقی زندگی کی تاریخ سے کس قدر واقف ہے۔ اس کا کلام تمام انواع شاعری کا جامع ہے۔ وہ کبھی ہنستا ہے کبھی روتا ہے، کبھی رنجیدہ ہوتا ہے، کبھی خوش ہوتا ہے۔ جس منظر کی تصویر کھینچتا ہے وہ آنکھ کے سامنے مجسّم ہو کر آجاتا ہے۔ نہروں کی روانی کا نقشہ دکھاتا ہے تو کانوں میں پانی کے گرنے کی آواز آجاتی ہے، ابھی ایک پُرسکون نہر کے کنارے کھڑا ہے کہ دفعۃً ایک مواج سمندر کے کنارے پہنچ جاتا ہے، ابھی تم اس کو زمین پر ڈھونڈ رہے تھے کہ چشم زدن میں آسمان پر نظر آنے لگتا ہے۔

وہ عربی زبان کا شیدائی ہے۔ ایک بار وہ صاحب فراش تھا، میں اس کی عیادت کو گیا تو اس نے کہا کہ "بیٹھو اور سنو" اس کے بعد اس نے ایک قصیدے کے چار بند مجھ کو سنائے، اور انہی سے اس کی شاعرانہ قوت کا اندازہ ہوتا ہے، چنانچہ ان کے بعض اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔

غرناطہ! آہ غرناطہ　　تیری شان وشوکت میں سے کچھ بھی باقی نہ رہا،
تیری نہروں میں سے آنسوؤں کے سوا اور کیا رہ گیا ہے؟　　جو تیری سلطنت کے کھنڈروں پر بہ رہے ہیں

تیری نسیم صبح
صرف آہِ سرد ہے

غرناطہ! آہ غرناطہ　　تو صرف ایک ویران کھنڈر ہے،
سنو تو کے لوگ　　تیرے مصیبت زدہ فرزندوں کو افریقہ لے جاتے ہیں

اور وہاں تیرے فرزند اُن کے خوف سے
روتے ہیں، نہیں اپنی ناامیدی پر روتے ہیں

غرناطہ! آہ غرناطہ　　تو برباد ہوا اور یہ کس قدر حسرتناک بربادی ہے،
موج اُن کے لئے روتی اور آہِ سرد بھرتی ہے　　جب اُس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اُن کو نظر آتی ہیں'

اُس نے میرے سامنے یہ اشعار پڑھے تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور جب وہ ان کو ختم کر چکا تو ہم پر ایک خاموشی طاری ہوگئی، جو رنج وغم سے لبریز تھی۔ اس کو خود یہ قصیدہ بہت محبوب ہے، اور جو جلسے اُس کے اعزاز میں کئے جاتے ہیں، اُن میں اس کو بآوازِ بلند پڑھتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ اس عربی جوش وتفاخر کا اظہار صرف اہلِ عرب کے سامنے کرتا ہے، بلکہ وہ تمام مجالس میں اہلِ عرب کی یادخوانی کرتا ہے، اور لومۃ لائم کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ میں نے جب اس کو اپنی تصویر دی اور اس پر پرتگالی زبان میں جس کو وہ سمجھتا ہے بطور تہدیہ وتقدمہ کے کچھ الفاظ لکھنے چاہے، تو اُس نے اس کو گوارا نہیں کیا، اور عربی زبان میں جو اس کو بہت محبوب ہے، ان الفاظ کے لکھنے کی خواہش کی۔ مجھ کو اس کے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ اہلِ عرب کے ساتھ اس کی محبت اس درجہ کو پہنچ گئی ہے، کہ ایک بار میں نے اُس کو دیکھا کہ مدرید کی سڑکوں پر عربی لباس پہنے ہوئے گھوم رہا ہے۔ عام طور پر اگرچہ وہ مغربی وضع میں رہتا ہے لیکن اس کے اندر عربی دل کی دھڑک محسوس ہوتی ہے، اُس نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ اسپین پہنچ کر ممکن کوشش اس غرض کے لئے کرے گا کہ غرناطہ میں عربی ادب وتاریخ کی تعلیم کے لئے ایک عظیم الشان یونیورسٹی قائم کی جائے

"معارف"

روحِ نشاط

یہ راز ہے میری زندگی کا　　پہنے ہوئے ہوں کفن خودی کا
پھر نشترِ غم سے چھیڑتے ہیں　　اک طرز ہے یہ بھی دل دہی کا

کونین پہ اک نگاہِ نفریں | اللہ رے دماغ بے دلی کا
پھر ڈھونڈ رہا ہوں بےخودی میں | کھویا ہوا لطف آگہی کا
او لفظ و بیاں میں چھپنے والے | اب قصد ہے اور خامشی کا
مرنا تو ہے ابتدا کی اک بات | جینا ہے کمال منتہی کا
عالم پہ ہے اک سکونِ بیتاب | یا عکس ہے میری خامشی کا
یاس ایک جنونِ ہوشیاری | امید فریب زندگی کا

"جامعہ"

پیغام

صبح تیرے لئے مبارک ہو! اے آتشیں رکاب کے سوار! تیرا سفر کامیاب ہو!

اگر اُس حسین پری چہرہ کے پاس تیرا گزر ہو تو میرے آقا! اُس کی ابروئے خمدار کا حال ضرور پوچھنا! آہ!! اب وہ میرے لئے آہیں نہیں بھرتی!

اُس کی فراموش گاری ایک سنگِ مزار ہے، جو میری آرزوؤں کی نعش پر نصب کر دیا گیا ہے! اے سوار! اُس سے التجا کرنا کہ وہ مجھے اِس قیدِ مرقد سے رہا کر دے!

اُس سے کہنا کہ میں غزل سرا ہوں ———

اُس کے جسم کا، جو آبِ رواں میں شاخِ نیلوفر کی طرح جھک جاتا ہے!

اُس کے رخسارِ آتشیں کا، جو پشمِ ارغوانی کی طرح شوخ رنگ ہے!

اُس کے ہلالِ ابرو کا، جس پر کاجل کی تحریر عقل و دانش کو مسحور کر دیتی ہے!

خدارا اُس سے کہنا کہ میں گیت گاتا ہوں ———

اُس کے پیارے لبوں کی شان میں، جو ایسے سرخ ہیں جیسے کسی شمع کے شعلے کا عکس شہد پر ناچ رہا ہو!

یا شرابِ لالہ رنگ کی صراحی آگ کی روشنی میں جھلک جھلک کر دل کو مدہوش بنا رہی ہو!

اُس سے کہنا کہ میں توصیف کرتا ہوں ———

اُس کی گردنِ بلوریں کی، جس کے گرد نکہت پاش پھولوں کے ہار لپٹے ہوں!

"نیرنگِ خیال"

نئی کتابیں

مرقعِ ادب۔ حصۂ دوم، مرتبہ جنابِ صفدر مرزا پوری۔ اس کتاب میں اُن نایاب خطوط کا مجموعہ ہے جنہیں ملک کے ادیبوں نے ایک دوسرے کے نام لکھا۔ ان خطوط سے بعض شعرا اور مشاہیر کے سوانحِ زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اکثر خطوط میں شاعرانہ نکات و حقائق پر بحث ہوئی ہے۔ لکھنے والوں میں مرزا غالب، علامہ شبلی، مولانا حالی، حضرتِ اکبر الہ آبادی، حضرتِ امیر مینائی، مولانا شررا اور حضرتِ ریاض کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ حجم ۲۱۲ صفحات، قیمت دو روپے۔ پتہ۔ صدیق بک ڈپو، امین آباد پارک، لکھنؤ

ڈالی کا جوگ۔ از پروفیسر حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی بی اے۔ اس مجموعہ میں "ڈالی کا جوگ" اور دس دوسرے افسانے شامل ہیں جن میں سے نو طبعزاد ہیں اور دو ماخوذ ہیں۔ شروع میں تیرہ صفحے کا ایک مقدمہ ہے جس میں افسانے کی ابتدا اس کی ترقی اور اس کے اصول سے بحث کی گئی ہے۔ حجم ۲۴۱ صفحات، قیمت: درج نہیں۔ انڈین پریس لمیٹڈ، الہ آباد سے طلب فرمائیے۔

کائناتِ ادب، مولفہ محمد عبدالحمید صاحب حمید میرٹھی سابق ایڈیٹر "نظارہ"۔ یہ کتاب میٹرکولیشن کے نصاب کے طور پر لکھی گئی ہے۔ اس میں اردو زبان کے مسلم الثبوت ادبا و فضلا کے مکتوبات، مضامین اور نظمیں درج ہیں آخر میں تمام اہلِ قلم کے مختصر سوانحِ حیات بھی دیئے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ انتخاب موجودہ زمانہ کی ضروریات کے مطابق نہایت اچھا ہے حجم ۲۳۷ صفحات۔ پتہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، سول لائنز علی گڈھ۔

اسرارِ شریانیہ۔ مع مجرباتِ انصاریہ، مصنفہ حکیم محمد عبدالوہاب صاحب انصاری دہلوی۔ اس میں فاضل مصنف نے نبض کے متعلق بصیرت افروز مجتہدانہ مقالات لکھے ہیں اور اپنے سینکڑوں مجربات افادۂ عام کے لئے پیش کر دیئے ہیں۔ حکیم صاحب کی اس بے غرضانہ اور مخلصانہ خدمت کی قوم کو قدر کرنی چاہیئے۔ حجم ۴۳۰ صفحات قیمت تین روپے۔ حکیم محمد عبدالحی صاحب انصاری، جامع مسجد، دہلی سے طلب فرمائیے

مجبورِ وفا۔ مصنفہ پنڈت کشن پرشاد صاحب کول۔ یہ نان کوآپریشن کے زمانے کا ایک افسانہ ہے جسے سلیس اور دلکش انداز میں لکھا گیا ہے۔ حجم ۶۰ا صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ مینیجر لیڈر پریس الہ آباد سے منگائیے۔

تحفۂ ہند و یورپ۔ مصنفہ مولوی نعمت اللہ خاں صاحب گوہر بی۔ اے۔ اس کتاب میں بعض محیر العقول

تاریخی و علمی استدلال کئے گئے ہیں۔ مثلاً سامی اور آریہ اقوام میں نسلی اعتبار سے غیریت نہیں اور سنسکرت، پہلوی اور انگریزی وغیرہ زبانوں کی اصل عربی ہے۔ حجم ۱۹۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ناشر چوہدری عبدالرحمان صاحب حسن آباد، قادیان۔

ماڈرن بک کیپنگ، مصنفہ سید ہادی حسین صاحب رضوی۔ اردو زبان میں حساب نویسی کی مختصر لیکن جامع کتاب ہے۔ حجم ۷۶ صفحات، قیمت ایک روپیہ۔ ناشر حکیم غلام مصطفٰے صاحب بک سیلر، حکیم منزل، محلہ کندیگراں، لاہور

اسلام اور نیشنلزم۔ از حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، حجم ۴۸ صفحات، قیمت چار آنے ناشر مہتمم البلاغ بک ایجنسی، نمبر ۵۸، گوال منڈی، لاہور

اسلام اور غیر مسلم۔ از مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب، حجم ۲۷ صفحے قیمت آٹھ آنے، ناشر مسلم بکڈپو پھلواری شریف ضلع پٹنہ۔

نغمہ اور سلام۔ حجم ۴۷ صفحے قیمت بارہ آنے، مصنف و ناشر مولوی محمد علی شاہ صاحب مسکین، میوہ کٹرہ، آگرہ

خیر البشر۔ مرتبہ حکیم ایم اے زیدی صاحب، حجم ۸۴ صفحے، قیمت دو پیسے، ناشر ناظم تبلیغ ہاؤس، کچا باغ، دہلی۔

مسلمانوں کی ایجادیں۔ از مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب، حجم ۸ صفحے قیمت تین پیسے، ناشر مسلم بکڈپو پھلواری شریف پٹنہ

خدا لائین برائے فارسی۔ تقریر آغا سید محمد علی صاحب پروفیسر نظام کالج، حجم ۲۸ صفحے۔ قیمت چار آنے، ناشر شعبہ جامعہ معارف ایران، حیدر آباد (دکن)

سلیقۂ تحریر۔ اردو میں خط نویسی و مضمون نگاری کی تعلیم از جناب محمد مسلم صاحب ایم اے۔ ایم او ایل، پروفیسر سینٹ کولمباز کالج، ہزاری باغ، (صوبہ بہار) حجم ۶۰ صفحے، قیمت ایک روپیہ۔

رواج کی پوجا۔ کلمہ گو زمینداران پنجاب سے دو دو باتیں، از شیخ عبدالرحیم صاحب بی اے ایڈووکیٹ حجم ۱۶ صفحے قیمت درج نہیں۔

ماضی و حال مدرسۃ العلوم (منظوم) از حضرت احسن مارہروی، لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ۔ حجم ۳۲ صفحے، قیمت چار آنے۔

عراق کے تاریخی مقامات، سیر عراق کے متعلق ضروری معلومات کی تفصیل، ناشر نارتھ ویسٹرن ریلوے، ہیڈ کوارٹرز آفس، لاہور۔

بہترین ادبی کتابیں

ادلستان:- یہ کتاب حضرت خلیقی دہلوی کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے خلیقی صاحب کی انشائے لطیف ایسی ندرت کاریوں کی حامل ہے جن کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہئے لطافت بیان کے ساتھ سلاست زبان آپ ہی کا حصہ ہے اکثر مضامین کو اصلاح اخلاق و معاشرت کے مقصد کے ماتحت ایسے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا تحسین کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تدبیر منزل، حریص قفس، مجبور گناہ، درہ موت، ندرت ذوق و نظر، سوز بیوگی، انسانیت و شعریت تو خاص طور پر ایسے مضامین ہیں کہ بار بار پڑھنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی اور ایسا گداز پیدا ہوتا ہے کہ آدمی اصلاح نقائص کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ پانچ تصاویر اور حضرت اختر شیرانی مدیر "خیالستان" لاہور کا ایک دلکش مقدمہ نثر بھی شامل اشاعت ہے جس میں انہوں نے مختلف نقاط نظر سے مصنف کی ادبی خصوصیات پر تنقید کی ہے۔ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے بھی یہ ایک قابل دید کتاب ہے ارباب ذوق نے اسے اس قدر پسند کیا ہے کہ مدیر صحیفہ "ہمایوں" لاہور نے ادلستان کی اشاعت کو ایک گرانقدر خدمت قرار دیتے ہوئے مہتمم کتب خانہ ناشر العلوم لاہور کو ان کے ذوق انتخاب پر مبارکباد دی ہے **قیمت** مجلد سنہری ۲ع

میری داستان حیات یعنی امریکہ کی عجوبۂ روزگار اندھی، بہری، گونگی گریجوایٹ خاتون مس ہیلن کیلر کی خود نوشت سوانحعمری کا اردو ترجمہ از مسٹر خادم محی الدین بی اے۔ بی ٹی ایم ای، ڈی دلیڈرز جس میں مس ہیلن کیلر کے ان حیرت انگیز کمالات کا ذکر ہے جو اس نے مختلف علوم وفنون میں اپنے بہترین حواس زائل ہونے کے باوجود صرف چھونے کی قوت کی تربیت اور مشق سے حاصل کئے۔ مس ہیلن کیلر کی زندگی اور کارناموں نے قوائے انسانی تربیت کے بارے میں نیا باب کھول دیا ہے اس کتاب کے مطالعہ سے عام پبلک اور مدرسین کو ایسی معلومات حاصل ہونگی جن سے بچوں کی تعلیم و تربیت میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ یہ کتاب سکول لائبریریوں کے لئے انسپکٹر صاحب مدارس لاہور ڈویژن نے منظور فرمائی ہے **قیمت** مجلد ۲ع

دنیا کے بہترین افسانے: اس کتاب میں دنیا کے تمام ممالک مثلاً ہندوستان، انگلستان، روس، فرانس، امریکہ، جرمنی، اٹلی، یونان، ہالینڈ، بلجیم، بلگیریا، رومانیہ، پولینڈ، یوگوسلاویہ، عرب، یہودی، ترکی، ایران، چین اور جاپان کے ۴۳ بہترین افسانے درج کئے گئے ہیں۔ کتاب کی خوبیوں کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس کے مرتب و مترجم منصور احمد ایڈیٹر "ہمایوں"،

ہیں جن کے طرز تحریر کو ادبی دنیا میں خاص وقعت حاصل ہے ان کی نظر انتخاب صرف انہی افسانوں پر پڑی ہے جو موجودہ و گزشتہ زمانے کی افسانہ نگاری کی جان سمجھے جاتے ہیں کتاب نہایت اعلیٰ کاغذ بہترین کتابت و طباعت کے ساتھ تیار ہوئی ہے **قیمت** عا **مجلد** ۱۲ر

کامیاب زندگی:- ہندوستان میں ہر ایک شخص خواہ وہ مزدور ہو یا سرمایہ دار، تاجر ہو یا کاریگر عام طور پر ناکامی و نامرادی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تنگدستی اور بدحالی سایہ کی طرح ساتھ لگی رہتی ہے اس عام حالت کے خلاف جو نوجوان زندگی کی کشمکش میں کامیاب ہو کر شہرت و عظمت کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کی تمنا رکھتے ہیں انہیں چوہدری غلام حیدر خان صاحب سابق مدیر صداقت کلکتہ کی اس جدید کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے جو درحقیقت ایک امریکن ماہر اقتصادیات کی انگریزی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے اُن کے لئے یہ کتاب ایک مخلص رفیق کا کام دیگی۔ کامیابی اور ترقی کے جو نکتے اور گُر اس کتاب میں درج ہیں ان پر عمل کر کے ناکام نہیں ہو سکتے **قیمت** **مجلد** [illegible]

الہامی افسانے:- انبیائے کرام کی زندگیوں کے حالات بہترین اسلوب اور لطیف اردو زبان میں پیش کئے گئے ہیں ہر مسلمان کو اس کتاب سے بہرہ اندوز ہونا چاہئے۔ یہ کتاب حضرت [illegible] بخش مدیر روزنامہ انصاف لاہور کی بہترین تصنیف ہے **قیمت** [illegible]

تاریخ المشاہیر مؤلفہ قاضی محمد سلیمان صاحب پنشنر جج پٹیالہ جس میں پچاس نامور بزرگوں، بادشاہوں، وزیروں اور شاعروں کے حالات درج ہیں۔ کتاب مجلد و مطلا ہے **قیمت** عا

خطبات نبوی:- حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام خطبات مع ترجمہ جو آپ نے مختلف موقعوں پر ارشاد فرمائے مع ضروری حالات و واقعات۔ **قیمت** [illegible]

پارچہ بافی بالتصویر:- اس کتاب میں زمانہ حال کی فن پارچہ بافی کے متعلق لکھی ہوئی بہترین انگریزی کتب سے روئی کی کاشت سے لے کر سوت کاتنا، بنائی، کپڑا بننے اور کپڑے کے مختلف ڈیزائن بنانے تک کی جملہ معلومات درج کی گئی ہیں مطالب کو واضح کرنے کے لئے تصاویر بھی دی گئی ہیں **قیمت** عا مگر کانگرسی ارکان کو کسی کانگرس کمیٹی کے سکرٹری کی سفارش پر [illegible]

گائے بیل اس کتاب میں گائے بیل کی پہچان خرید اور پرورش کے متعلق بہت مفید معلومات درج ہیں اور ان کے جملہ امراض کے اسباب، علامات اور علاج کے لئے آسان اور سہل الحصول نسخے بھی دئے گئے ہیں مطالب کے متعلق سولہ تصاویر بھی دی گئی ہیں اس کتاب کا مطالعہ عام لوگوں بالخصوص کاشتکاروں اور ان لوگوں کے لئے بہت مفید ہے جن کو رات دن گائے بیل کی خرید و فروخت اور پرورش سے سابقہ رہتا ہے **قیمت** [illegible]

رقعات اکبر:- یہ کتاب مولانا اکبر مرحوم کے رقعات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ہندوستان کے بہترین افراد کے نام لکھے ان رقعات میں حضرت اکبر کی جملہ خصوصیات سادگی زبان، بے ساختہ پن، پرلطف انداز بیان، بہترین اشعار وغیرہ نمایاں ہیں سلیس پرمعنی اور لطیف و دلکش انشا سیکھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہے محکمہ تعلیم نے بجا طور پر اس کی قدر کی ہے **قیمت** ۱۰ر

ہفت پیکر یعنی ملک کے نامور شاعر حضرت حفیظ کے سات طبعزاد اور دلکش افسانے جو جبر تحسین طلب کرتے ہیں **قیمت** [illegible]

حجاب زندگی ۔ اس کتاب کے متعلق مولانا سالک مدیر "انقلاب" لاہور کی رائے ہے کہ مصنف کتاب سید عابد علی صاحب عابد کا انداز بیان، آپ کی قوت تحریر اور متانت اظہار خیالات نہایت قابل قدر ہے اس مجموعہ میں بعض مضامین تو ایسے ہیں کہ کہ اردو زبان کے سرمائے میں فخر کے ساتھ پیش کئے جائیں۔ داستان پارینہ، انحطاط شباب اور نیائے اشکال دیہ تینوں افسانے حجاب زندگی کے افسانوں میں درج ہیں) معمولی تحریریں نہیں اردو ادب کے نہایت پاکیزہ جواہر ہیں **قیمت** ۱۲ر

ثمرنبات النحو علم النحو کے متعلق جناب غلام سرور خانصاحب پرسنل اسسٹنٹ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم صوبہ سرحد کی قابل قدر تصنیف ہے جسے دہلی اور پنجاب کی یونیورسٹیوں نے امتحان میٹرکولیشن کے لئے بطور ٹیکسٹ بک مقرر کیا **قیمت** عہ؍

لنگڑا ماموں ۔ یہ ایک دلچسپ افسانہ ہے جو سلیس اردو زبان میں لکھا گیا ہے۔ دیو پریوں کے فرضی اور خلاف قیاس کی بجائے اس میں ایک کہانی بیان کی گئی ہے جس کا ظہور میں آنا ممکن ہے۔ انداز بیان ایسا موثر ہے کہ واقعات دل پر نقش ہوتے جاتے ہیں اس کتاب کے مطالعہ سے حوصلہ، جرأت اور خطرے کے وقت گھبرانے کی بجائے اس سے بچنے کی تدبیر کرنے کا احساس پیدا ہوتا ہے بچوں کے اخلاق و عادات سنوارنے کے لئے بہت مفید ہے **قیمت** ۲ر

ولیم ٹل یعنی ولیم ٹل اور سوئٹزرلینڈ کی آزادی کی داستان جس میں ستم رسیدہ محکوموں کے احساس بیداری، اقتدار ملوکیت کے خلاف نفرت و ہیجان، قومی تحریک کی کامیابی اور ملوکیت کی تباہی کی مکمل کیفیت پیش کی گئی ہے **قیمت** ۸ر

شہر شہری اور شہریت ۔ یہ کتاب جناب حکیم احمد شجاع صاحب سیکرٹری پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی تصنیف ہے جس میں ایک دوسرے کے ساتھ انسانوں کے تعاون، شہروں کے قیام اور تمام شہری ضروریات اور نظام کی ابتدائی تاریخ اور شہروں کے موجودہ نظام اور شہری زندگی کے لوازمات پر بحث کی گئی ہے جس سے واقف ہونا ہر نوعمر بچے کیلئے ضروری ہے ۵ر

زرداد ۔ یہ کتاب بھی حکیم احمد شجاع صاحب کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے شہنشاہ بابر کے حالات زندگی اور اس کے ہمت جرأت اور استقلال آموز زرین کارناموں کی کہانی اسکے بچپن کے دوست زرداد کی زبانی نہایت سلیس اور آسان اردو زبان میں بیان کی ہے طبیعت میں حوصلہ، جرأت اور استقلال پیدا کرنے کے لئے اس کتاب کو ضرور دیکھنا چاہیئے۔ **قیمت** ۶ر

کیوں اور کس طرح ۔ اس کتاب میں عام حادثات، واقعات اور مختلف صورتوں کے متعلق جو قدرتی طور پر دن رات ظہور میں آتی رہتی ہیں نہایت سلیس اور آسان اردو زبان میں ان کے واقع ہونے کے اسباب بیان کئے گئے ہیں مثلاً پروانے کیوں جلتے ہیں"۔ زلزلے کیوں آتے ہیں"۔ دن کو ستارے کیوں نظر نہیں آتے"۔ ہمیں خواب کیوں یاد رہتا ہے" مور کس طرح معلوم کرتے ہیں کہ بارش ہونے والی ہے غرض کہ ایسے بیسیوں مسائل اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں۔ بچوں کی عام استعداد بڑھانے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے **قیمت** ۵ر

اساس القرآن ۔ بچوں کو آسانی سے عربی زبان سکھانے اور قرآن شریف کو صحیح اور آسانی سے پڑھانے کیلئے بہترین قاعدہ ۴ر

متفرقات

بم کا نسخہ مکمل عہ	فلسفہ البیان عہ	کلیات ولی صہ	مثنوی خواب وخیال عہ	جاپان اور اسکا تعلیمی نظم ونسق ۱۲
مشاہیر یونان وروما مکمل ہے	دریائے لطافت مجلد عہ	طبقات الارض عہ	علم المعیشت مجلد ۸ر	اسلام و نیشنلزم ۴ر
نپولین اعظم پانچ حصے مکمل ۵	حقیقت اسلام ۱۲ر	تاریخ نجد عہ	رسالہ نباتات ۴ر	سیرۃ عمرو بن عاص عہ
تاریخ فلسفہ اسلام عہ	عربوں کا تمدن عہ	صلاح کار عہ	اسباق القرآن ۴ر	سیرۃ النبی قسم اعلیٰ ۱۲
سیرۃ النبی قسم دوم للعہ	کلیات شبلی اردو عہ	الفاروق عہ	المامون عہ	ابن الوقت عہ
رویائے صادقہ عہ	مراۃ العروس عہ	اصلاح معیشت عہ	مکالمات برکلے عہ	تصوف اسلام عہ
فلسفۂ جذبات عہ	سیرۃ عائشہ صدیقہؓ ہے	بہادر خواتین اسلام ۴ر	سیر الصحابیات عہ	انقلاب الامم عہ
سیرۃ عمر بن عبدالعزیز عہ	اسوۂ صحابیات عہ	برکلے اور اس کا فلسفہ عہ	بادۂ ناب عہ	لسان الغیب یعنی شرح دیوان
تیغ کمال عہ	سمرنا کا چاند عہ	عروس کربلا عہ	طوفان حیات عہ	حافظ ۴ حصص فی حصہ عہ
صد پارۂ دل عہ	شہید وفا ۱۰ر	تاریخ یہود عہ	حروب صلیبیہ عہ	مسیح اور مسیحیت عہ
شوقین ملکہ عہ	رومۃ الکبریٰ عہ	ملک العزیز ورجنا عہ	فلورا فلورنڈا عہ	ملکہ زنوبیہ ۴ر
قیس ولبنیٰ عہ	سکینہ بنت حسینؓ ۶ر	فردوس بریں عہ	خوفناک محبت عہ	درگیش نندنی عہ
حسن بن صباح ۶ر	حسن انجلینا عہ	الفانسو ۱۲ر	مقدس نازنین عہ	مفتوح فاتح عہ
جویائے حق ہر دو حصے للعہ	فلپانا عہ	عرب قبل از اسلام عہ	صقلیہ میں اسلام ۱۴ر	لعبت چین عہ
شیریں ملکہ عجم ۴ر	بابک خرمی عہ	زوال بغداد عہ	ماہ ملک عہ	فتح اندلس عہ
یوسف نجمہ کامل عہ	عیب ان الدلہن عہ	گوہر مقصود ۶ر	سوکن کا جلاپا ۶ر	گلدستۂ عید ۱۲ر
سلونتی ۸ر	فسانہ سعید ۱۰ر	الزہرا ۱۲ر	نورۂ زندگی ۱۲ر	منازل ترقی ۴ر
محبوبۂ خداوند ۱۲ر	سراب مغرب ۸ر	درشہوار ۱۰ر	امت کی مائیں عہ	شب زندگی عہ
منازل السائرہ عہ	بنت الوقت ۸ر	صبح زندگی عہ	شام زندگی عہ	تائید غیبی ۸ر
اسلام کا انجام ۶ر	خطوط اکبر عہ	یزید نامہ عہ	سفرنامہ مصر وشام عہ	اولاد کی شادی عہ
مکاتیب اکبر عہ	حکومت اور نگ زیب ۱۲ر	تجارت ۸ر	دنیا کے عجائبات ۸ر	محبت کا انتقام عہ
صبح وطن عہ	رستم وسہراب ۸ر	نصیحت کے پھول ۴ر	آئینۂ عبرت ۱۲ر	زرین شہزادے ۶ر

اگر آپ اردو زبان پر عبور حاصل کرنا چاہتے ہیں

تو

آج ہی ایک لغاتِ سعیدی طلب فرمائیے۔ لغاتِ سعیدی موجودہ تمام اردو فارسی لغات میں سب سے زیادہ جامع اور حاوی لغت ہے۔ جو سالہا سال کی محنت اور عرق ریزی کے بعد تیار ہوئی ہے۔ عالیجناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خان صاحب شروانی صدر الصدور امور مذہبی ریاست حیدرآباد دکن نے بعد ملاحظہ اسکو پسند فرمایا ہے۔ و نیز بڑے بڑے علماء، صوفیاء اور اخبار کے ایڈیٹروں نے اچھی اچھی رائیں لکھی ہیں۔ لغاتِ سعیدی میں تقریباً دس ہزار لغات قدیم و جدید عربی۔ فارسی، ترکی، لاطینی، مصری لغات کے علاوہ انگریزی فرنسیسی ایسی زبان کے بھی وہ الفاظ جو ایران و قسطنطنیہ وغیرہ میں معرب و مفرس ہو کر رائج ہو گئے ہیں جمع کئے گئے ہیں۔ ہر لغت کے معنی اردو کی صاف و شستہ زبان میں لکھے گئے ہیں۔ اس لئے ہمارا دعویٰ ہے کہ موجودہ تمام لغات میں فارسی کی کوئی لغت اس سے بہتر تو درکنار اس کے ہمسر بھی نہیں۔ کوئی کتب خانہ کوئی تعلیم یافتہ گھر اس سے خالی نہ رہنا چاہئے۔ کاغذ عمدہ، لکھائی چھپائی دیدہ زیب، صفحات ۶۲۰، تقطیع فلسکیپ۔ قیمت صرف چار روپیہ للعہ۔ آرڈر جلد بھیجئے۔ ورنہ بعد میں طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑے گا۔

المشتہر

حاجی محمد سعید تاجر کتب و مالک مطبع مجیدی کانپور

پڑھنے اور عمل کرنے کے قابل

افسانہ نگاری کی دنیا میں انقلاب

ادبِ لطیف اور انسانی سائیکالوجی کا بہترین مرقع

افسانۂ ثریا

یا

تہذیب کی سرگذشت

مندرجہ بالا عبارت محض ترغیب خریداری پیدا کرنے کے لئے تحریر نہیں کی گئی بلکہ حقیقتاً حضرت ساغر نظامی مدیر استقلال کا یہ افسانہ ہندوستانی معاشرت، روزانہ زندگی اور انسانی فطرت کی گہرائیوں کا ایک بہترین نمونہ ہے اور افسانہ نگاری کی دنیا میں اسکی اشاعت نے ہلچل ڈالدی۔ تہذیب کی سرگذشت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نثر میں حکایت و فلسفہ کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کی جاسکتی ہے۔ محبت کرنے کا اعلیٰ ترین اصول، مشرقیت اور مغربیت کا موازنہ کرتے ہوئے کیسا خطابت۔ اگر آپ اردو زبان کے ترقی یافتہ ادب کو دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ افسانہ جو ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے ضرور ملاحظہ کیجئے۔ قیمت صرف ۱۲ مع محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ استقلال بک ایجنسی بنی اسرائیل اسٹریٹ علی گڑھ

1

آج تقریباً پچاس ۵۰ برس کے بعد بھی وہی قد اور صورت اور اوصاف ہیں

جو پیدائش کے روز تھے

آپ خیال نہ کریں کہ یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ یوم پیدائش اور آج کی صورت میں کوئی فرق کیوں نہ ہوگا۔ آپ خود قبول کر لیں گے۔ جام نگر کاٹھیاواڑ میں پیدا ہو کر تمام مذاہب اور فرقوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور معروف ہونے کے ساتھ ہر فرد بشر کی حفاظت کرنا اپنا فرض بنا لیا ہے۔ خواہ مسلمان ہو یا عیسائی ہندو برہمن ہو یا چمار حتیٰ کہ ہر انسان کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا اس کا خواص ہے۔ دوستوں کو بہرہ اندوز کرنے میں لاثانی لیکن دشمن کو ذرا بھی اذیت نہ دینا اس کی عادت ہے۔ آپ سنئیے یہ ہیں مقویات سرتاج عالم آتنک نگرہ گولیاں۔ جنکو جام نگر کاٹھیاواڑ کے وید شاستری منی شنکر گووند جی نے آج سے پچاس برس قبل ایجاد کر کے مقویات میں تہلکہ پیدا کر دیا یہ گولیاں اس طرح مقبول ہوئیں کہ ہندوستان اور ممالک غیر سے انکی مانگ روز افزوں ترقی پر ہے۔ یہ گولیاں قبض بدہضمی دل دماغ معدہ کی کمزوری خون کی خرابی اور جملہ امراض مخصوصہ کے دور کرنے میں پوری فتح حاصل کر چکی ہیں آپ ایک دفعہ استعمال کریں گے تو تعریف کئے بغیر نہ رہیں گے ایسی خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی قیمت اسلئے کم رکھی گئی ہے کہ امیر غریب مستفید ہو سکیں ۳۲ گولیوں کی ڈبیا ایک روپیہ پانچ ڈبیہ چار روپیہ

بال متر گولیاں (ہمدرد اطفال) بچوں کی ناساز طبیعت سے والدین کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور گھر بے رونق ہو جاتا ہے اسلئے بیمار بچوں کو تندرست اور تندرست کو طاقتور بنانے کیلئے بال متر گولیوں کا استعمال کرا دیں۔ یہ گولیاں بچوں کی جملہ شکایتوں دست کا زیادہ آنا قے کا ہونا شکم کا بڑھنا جسم کا زرد پڑ جانا پسلی ہستی کا چلنا دبلا پن وغیرہ دور ہو کر پوری صحت حاصل ہوتی ہے قیمت۔ ۳۲ گولی کے ڈبہ کی ایک روپیہ (عہ) ملنے کا پتہ:۔ وید شاستری منی شنکر جی گووند رام جی جام نگر کاٹھیاواڑ

مردہ عزیزوں سے

ملاقات اور بات چیت گھر بیٹھے کر لو

یہ نو ایجاد آلہ سپرٹس ورکنگ پلانچھٹ جس کے ذریعہ ہم خود اکیلے ہر ایک سوال کا جواب لے سکتے ہیں ایک امریکن دماغ کی اختراع ہے آلہ کے استعمال میں کسی دوسرے آدمی کی ضرورت نہیں جونسی روح آپ چاہیں آلہ میں حاضر ہو کر آپکے سوالوں کا درست جواب دے گی معمولی لکھا پڑھا ہر عمر اور ہر مذہب کا آدمی کام لے سکتا ہے نہ کچھ پڑھنا پڑتا ہے اور نہ ہی کسی چلہ کشی کی ضرورت ہے، عالم بالا کے حالات معلوم کرنا گمشدہ کا پتہ لگانا چوری کا سراغ نکالنا دشمن سے بدلہ لینا مقدمات میں فتح پانا سخت سے سخت حاکم سے حسب دلخواہ کام نکلوانا اور دراز فاصلہ پر ایک سیکنڈ میں خبر بھیجنا حسب دلخواہ نوکری یا روزگار حاصل کرنا۔ بند لفافوں کی عبارت پڑھنا مقفل صندوق یا مکان کے اندر کی اشیا معلوم کرنا وغیرہ ہزاروں کے کام ہو سکتے ہیں اس نایاب چیز کا ہر گھر میں ہونا لازمی ہے اصلی قیمت پانچ روپیہ۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے لئے معہ محصول ڈاک صرف تین روپیہ آٹھ آنے لئے جائیں گے ہدایات مفت ارسال ہوں گی۔ اپنا پتہ صاف انگریزی یا اردو میں لکھیں۔

کیمیکلز سنڈیکیٹ (H) جالندھر شہر (پنجاب)

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے

طبقہ نسواں میں اس کارخانہ کا عطر سہاگ اور عطر عروس نہایت مقبول ہے ،

اعلیٰ طبقہ کی خواتین سر میں لگانے کیلئے اس کارخانہ کا تیار کردہ بانو ہیر آئیل استعمال کرتی ہیں

یہ کارخانہ ۱۸۳۹ئہ سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے ،

ملنے کا پتہ [illegible]

قواعد

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کیے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کیے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ساڑھے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہیے
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لیے ار کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر نمونہ ۱۰ر۔

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجیے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھیے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳- لارنس روڈ لاہور

سید عبد اللطیف مینیجر رسالہ ہمایوں نے مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد

فہرستِ مضامین

جلد ۷   بابت ماہِ مئی سنہ ۱۹۳۰ء   نمبر ۵

تصاویر:
(۱) مولانا شبلی نعمانی مرحوم و مغفور
(۲) بغداد میں امامِ اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد

جہاں نما

تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے وائسرائے کی نصیحت

دہلی یونیورسٹی کی آٹھویں کانووکیشن کے موقع پر وائسرائے نے اپنی صدارتی تقریر کے دوران میں کہا۔

"آج چند منٹ کے لئے میں آپ سے کہوں گا کہ آپ میرے ساتھ مل کر کتابوں کے متعلق کچھ غور و فکر کریں، سوچیں کہ وہ ہمارے لئے کیا کچھ ہیں اور کیا کچھ ہو سکتی ہیں، اور اگر ہم عقل و دانش رکھتے ہیں تو معلوم کریں کہ ہماری زندگی کے معمولات میں انہیں کیا درجہ حاصل ہونا چاہئے۔

مطالعہ جس کی طرف میں آج آپ لوگوں کو توجہ دلانا چاہتا ہوں ایک بہت بڑی خوبی اپنے اندر یہ رکھتا ہے کہ اُس میں ایک ایسا غیر محدود تنوع موجود ہے جس سے ہم اپنی طبیعت اور خواہش کے مطابق چیزیں انتخاب کر سکتے ہیں۔

بعض وقت ہم پر بے دلی اور پریشانی سی مسلط ہوتی ہے اور ہمارا دل اُس تسلی اور تشفی کو چاہتا ہے جو فطرت اور اُس کے تصرفات سے حاصل ہوتی ہے، وہ فطرت جو انسانی دنیا کے شور و غوغا کے درمیان رہ کر بھی اُس سے غیر متاثر رہتی ہے۔ کتابوں میں یہ چیز بھی موجود ہے، کیونکہ ہر ملک اور ہر زمانے میں فطرت نے مفکر قلوب پر اپنا جادو کیا ہے۔ ورجل کی تمثیلات جن میں ہمیں حقائق کا جلوہ بطور تمام نظر آتا ہے وہ ہیں جو ہماری زندگی کی معمولی اور سادہ چیزوں سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھیاں، زخمی سانپ، آندھی میں ایک بڑا درخت، مرجھایا ہوا پھول وغیرہ۔ پرندے پھول اور قدرتی مناظر پر انگریزی اُدبا نے ایسی ایسی چیزیں لکھی ہیں کہ جب تک انگریزی زبان زندہ ہے وہ بھی زندہ رہیں گی۔

میں نے یہ کہتے ہوئے تقریر کی ابتدا کی تھی کہ میں اپنے سامعین میں سے نوجوانوں کو کچھ نصیحت کروں گا لیکن اب تک آپ کے فائدے سے زیادہ اپنی خوشی کے لئے میں اپنے حافظہ ہی کی وسعت میں بے مقصد چکر لگاتا رہا ہوں اب میں اپنی عملی نصیحت صرف دو فقروں میں کہہ دینا چاہتا ہوں۔" اپنے آپ کو فرصت کے قیمتی لمحوں میں مطالعہ کرنے کی عادت ڈالو ۔۔ اور ۔۔ جب تم پڑھو تو جس چیز کو تم پڑھ رہے ہو اپنی بساط کے مطابق اُس کی قدر و قیمت کو پہچاننے کی پیہم کوشش کرو۔"

کہا گیا ہے کہ ایک اچھی کتاب ہاتھ میں نہیں بلکہ زانو پر ہونی چاہیئے، تاکہ جو کچھ ہم پڑھیں اُسے سوچنے، سمجھنے اور اُس پر تنقید کرنے کے لئے اکثر و بیشتر ٹھہر سکیں۔ ہمیں کسی کتاب کو ختم کرنے سے پہلے چھوڑ دینے پر کسی تنگ دل کے قول کی پروا نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ سمجھ لینا کہ تمام کتابیں تمام طبیعتوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے نہیں ہوتیں اور کسی ایسی چیز کی طرف رجوع ہو جانا جس سے ہم صحیح طور پر مسرت حاصل کر سکتے ہوں بہت ہی اچھا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ہم ایک آزاد مذاق پیدا کریں، وسیع مطالعہ کریں، اور اس طرح خیال اور علم کی حدود کو بڑھاتے جائیں۔ ہمیں اس سے یقیناً بڑا فائدہ ہوگا، اور میں سچ کہتا ہوں ہم دیکھیں گے کہ ہماری عام زندگی کے بہت کم پہلو ایسے ہیں جن میں ہماری اِس کوشش سے رنگینی اور دلچسپی پیدا نہیں ہو جاتی۔

لینن گراڈ لائبریری

اکیڈمی آف سائنس کی لائبریری روس میں سب سے پرانی اور سب سے عجیب لائبریری ہے۔ اس کے قیام کو آج پورے دو سو سال گزر چکے ہیں۔ حال ہی میں اس کی سالگرہ کے موقع پر ایک نمائش کی گئی تھی جس سے معلوم ہوا کہ اس میں نادر و نایاب کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

اس لائبریری کی سب سے چھوٹی کتاب کرلاف کی حکایتوں کا مجموعہ ہے جسے ۱۸۵۵ء میں معمولی ڈاک کے ٹکٹ سے بھی چھوٹی تقطیع پر تیار کیا گیا تھا۔ اس کے بالمقابل وہاں ایسی بڑی بڑی کتابیں بھی موجود ہیں جو لمبائی میں تین فٹ اور چوڑائی میں دو فٹ سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اُن چالیس لاکھ کتابوں اور مسودوں میں جو اس لائبریری کی زینت ہیں ایسے مسودے بھی ملتے ہیں جو چمڑے کے کاغذ پر لکھے گئے ہیں اور جن کا زمانۂ تحریر گیارھویں سے تیرھویں صدی تک ہے۔

لائبریری کی قدیم ترین تحریروں میں سے ایک وہ حکم نامہ ہے جو بلگیرین زار آرسی نیوس ثانی نے ۱۲۳۰ء میں جاری کیا۔ بعض قدیم تحریروں سے کسی حد تک یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں روس میں غلامی کا رواج تھا۔ چنانچہ کسی بڑے زمیندار کا ایک اجازت نامہ ہے جو ایک کسان لڑکی کی شادی کے لئے حاصل کیا گیا تھا؛ اور تین روبل کی ایک رسید ہے جو ایک تاتاری غلام کے لئے ادا کئے گئے تھے جسے بیچنے والے نے ایک کاسک سے خریدا تھا۔ کاسک اُن دنوں کریمیا کے ترکوں اور تاتاریوں سے برسرِ جنگ تھے۔

ادبی نوادر میں قابلِ ذکر پیٹرِ اعظم کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر ہے، ایک کیلنڈر ہے جسے ایک شخص برساف نے روس میں طباعت کے رواج کے شروع شروع میں ترتیب دیا تھا، ایک بہت بڑا قدیم نقشہ ہے جس میں بحرِ مشرق کی حدود دکھائی گئی ہیں۔ یہ نقشہ پیٹرِ اعظم کے حکم سے ۱۷۱۶ء میں طبع کیا گیا تھا اور اُس زمانے کے چند روسی مدرسوں میں جغرافیے کے نصاب کے طور پر رائج تھا۔

حضرتِ مسیح کا نیا تصوّر

مشہور فلم ایکٹر چارلی چپلن کہتا ہے کہ "اگر میں مسیح کی کہانی کی فلم تیار کروں تو میں اُس کی شخصیت کو نہایت قوی نہایت نمایاں اور نہایت شاندار صورت میں پیش کروں، ایسی صورت جس سے ظاہر ہو کہ لوگ اُس کی عظمت و شان کو دیکھ کر اُس کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ جدھر وہ جا نکلے میں مردوں، عورتوں اور بچوں کو خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے اُس کا خیر مقدم کرتے دکھاؤں۔

"میں اُن کو اُس سے زیادہ قریب ہونے کے لئے اور اُس کی مقناطیسیت کو محسوس کرنے کیلئے دھکا پیل کرتے دکھاؤں۔ اُس کے آس پاس کھڑے ہونے والوں میں سے کوئی اداس نہ ہو، کوئی غمگین نہ ہو۔

"میں اُس تمثیل میں کوئی ایسی بات شامل نہ کروں جس سے اُس کے متبعین کے دلوں میں کسی قسم کا خوف پیدا کر کے دکھایا جائے، بلکہ میں اُس کو لوگوں کے لئے انتہائی طمانیت، محبت، شرافت اور طاقت کا پیکر بناؤں۔

"مجھے امید نہیں کہ میں کبھی اس کہانی کو سینما کے پردے پر پیش کر سکوں کیونکہ یقیناً اِس سے تنقید و اعتراض کا ایک طوفان امنڈ پڑے گا، لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر ایک ایسی تصویر تیار کی جائے تو وہ مذہب کے لئے ناقابل بیان حد تک مفید ثابت ہو، وہ بتائے کہ مسیح یقیناً ایک ایسا شخص تھا کہ اس سے محبت کی جاتی اور وہ ایک حقیقی اور خوبصورت انسان تھا۔ میں نے ایک دفعہ مسیح کی ایک تصویر دیکھی۔ اب پھر میں اُسے نہیں دیکھنا چاہتا اُس میں حقیقت کا شائبہ بھی موجود نہ تھا۔"

کپلنگ کی ایک کہانی

انگریزی زبان کے مشہور مصنّف رڈیارڈ کپلنگ کے اُس سفر کے دوران میں جس کا تذکرہ کتاب "فرام سی ٹو سی" میں موجود ہے جب وہ نیویارک پہنچے تو ہندوستانی کہانیوں کا ایک بھرا ہوا بستہ ان کے ساتھ

تھا۔ ان کہانیوں کو وہ بہت سے ناشرین کے پاس لے گئے۔ وہ انہیں پچاس ڈالر فی کہانی کے حساب سے فروخت کر دینے پر آمادہ تھے، لیکن ہر جگہ انہیں یہی جواب ملا کہ ہندوستان سے کسی کو کچھ دلچسپی نہیں مگر ایک ایڈیٹر کو سن کر شوق پیدا ہؤا اور اُس نے ایک کہانی خرید لی، گو بعد میں اُسے اِس پر افسوس ہؤا۔ اُس نے مسودے کو بے کار سمجھ کر اپنی میز کی ایک دراز میں ڈال دیا اور شائع نہ کیا۔ چند سال کے بعد جب کپلنگ کی تصانیف مقبول ہوئیں اور ہر زبان پر اُسی کا چرچا ہونے لگا تو ایک استقبال کے سلسلہ میں اسی ایڈیٹر اور کپلنگ کی ملاقات پھر ہوئی۔ کپلنگ نے کہا "ہم پہلے بھی ایک دفعہ ملے ہیں"۔ ایڈیٹر نے چونک کر کہا "کب؟" کپلنگ نے جب اُسے اچھی طرح بتایا تو وہ دوڑا ہؤا اپنے دفتر میں گیا اور اُسی دن اُس کہانی کو نہایت شان سے چھپوا دیا۔

دولت کا بہترین مصرف

آج تک کسی دولت مند نے اپنی دولت اُس سے بہتر مصرف کے لئے نہیں چھوڑی، جس کے لئے ملک سویڈن کا ایک انجنیر اور کیمیا دان الفریڈ بی نوبل اُسے چھوڑ گیا۔ اُس نے اپنی وفات سے پہلے اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ موجدوں، مفکروں، مصنفوں اور حکیموں کو سال بہ سال انعامات دینے کے لئے وقف کر دیا اور آج دنیا اس کے صرف سے دانش و حکمت میں ترقی کر رہی ہے۔

اس سال نوبل کا ادبی انعام مشہور جرمن مصنف تامس مین کو ملا ہے جو اس کا بجا طور پر مستحق تھا۔ اُسے ۹۲۰۰ پونڈ ملے۔

نوبل کے انعامات اٹھائیس سال سے تقسیم ہو رہے ہیں لیکن یہ ایک عجیب دلچسپ بات ہے کہ اس تمام عرصے میں ایک دفعہ بھی ادبیات کا انعام کسی امریکا کے مصنف نے حاصل نہیں کیا۔

نوبل نے اٹھارہ لاکھ پونڈ اپنے پیچھے چھوڑے۔ اِن کی آمدنی کا ۶۸ فی صدی ہر سال بہترین مفکروں کو انعامات دینے میں خرچ کیا جاتا ہے۔ اِس سال پہلی دفعہ سویڈن کی حکومت نے نوبل فنڈ پر سے بہت سے محصولات اٹھا لئے ہیں جس سے انعامات کی رقوم اب بڑھائی جا سکیں گی۔

شبلی بحیثیتِ مصنّف

کسی شخص یا کسی شے کو بخوبی جاننے پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ اوّل و بیشتر اُس کی خصوصیتوں اور خوبیوں پر نظر ڈالی جائے اور ابتدائً اِس سے قطع نظر کرلی جائے کہ اُس میں کون کون سی کمیاں اور نقائص ہیں! اور کسی شخص کی خوبیاں کبھی نظر نہیں آسکتیں جب تک ہمیں اُس شخص سے پوری واقفیّت نہ ہو جب تک ہم اُس کی زندگی میں دلچسپی نہ لیں جب تک ہم اُس سے اک نوع کا خواہ عارضی ہی ہو لیکن اک سچّا محبت وہمدردی کا رشتہ قائم نہ کرلیں + کارلائل اپنی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں "ہیرو بحیثیّت پیغمبر" کے تحت میں نکتہ چینوں کی معائب شماری کے جواب میں کہتا ہے کہ "سچ بات تو یہ ہے کہ ہم قصور وعیوب پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں" پھر پکارتا ہے قصور! میں کہتا ہوں کہ سب سے بڑا قصور یہی ہے کہ انسان اپنے قصوروں سے آگاہ نہ ہو" + اور پھر کہتا ہے کہ "اگر تم کسی کو جاننا چاہو تو اس کے محاسن کو دیکھو نہ کہ اُس کے عیوب کو" قیصر لنگ جو دنیا کے عظیم ترین زندہ مفکّروں میں شمار ہوتا ہی کہتا ہے کہ "بلا شبہ ہر فرد بشر قطعی طور پر نرالا ہے" پھر ایک اور جگہ ہمیں یقین دلاتا ہی کہ انسان صرف اُسی کو سمجھ سکتا ہے جسے وہ محبت کرے" + بڑے آدمی اور چھوٹے آدمی میں فرق یہ ہی کہ بڑے آدمی میں اُس کے نرالاپن کا ظہور ہوتا ہے چھوٹے آدمی میں نہیں ہوتا + اِس فطری نرالاپن کا اظہار کرنے والا اُسے عمدًا اپنی زندگی کا جزو بنانے والا اُسے بیشتر بروئے کار لانے والا آدمی ایک عظیم الشان انسان ہوتا ہے جس کی شخصیّت کا اثر دور و نزدیک ہر جگہ پڑتا ہے +

شبلی ایک ایسا انسان تھا! آؤ دیکھیں کہ ہمارا یہ شبلی کون تھا؟ اُس کے سوانحِ حیات پر نگاہ ڈالیں۔ وہ کیا تھا؟ اُس کی تصنیفات پر نگاہ ڈالیں۔ وہ کس لئے تھا؟ اُس کے مطمحِ نظر پر نگاہ دوڑائیں اور دیکھیں کہ اُس کے پیغام کے معنی ہمارے اور دنیا کے لئے کیا تھے اور کیا ہیں؟

حالاتِ زندگی ۔ شبلی ۱۸۵۷ء یعنی بغاوتِ ہند کے سال میں صُوبہ متحدہ کے ضلع اعظم گڑھ میں بندول کے گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ ان کا خاندان ایک معزز اور ممتاز خاندان تھا ۔ اُن کے والد اعظم گڑھ میں وکالت کرتے تھے۔ خاندان میں علم کا چرچا تھا۔ پہلے فارسی تعلیم پائی پھر عربی ۔ اعظم گڑھ سے رام پور، رام پور سے لاہور اور لاہور سے سہارنپور

جہاں جہاں کسی مشہور عالم کی درس گاہ تھی اُس میں جاکر جملہ فارسی و عربی علوم کی تحصیل کی۔ لاہور میں اگر وقت میسّر نہ آتا تو مولوی فیض الحسن سے اورینٹل کالج سے آتے جاتے رستے میں پڑھ لیا کرتے تھے + اپنے ایک خط میں جو ۲۳ ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء کا نوشتہ ہے لکھتے ہیں[51]:۔ ”علمی شوق والد اور گھر کی تربیّت کا اثر تھا۔ خاندان میں علم کا چرچا تھا۔ اور تمام بزرگ مصروفِ علم تھے۔ اس زمانہ کی طالب علمی بہت مشکل تھی۔ یکہ پر سفر کرتے تھے۔ پیدل بھی چلنا پڑتا تھا یہ سب میں نے خوشی سے گوارا کیا تھا۔ دو دفعہ والد کی اجازت کے بغیر چپکے نکل گیا۔ یہ خاص التزام رہا (اور اس میں مَیں منفرد تھا) کہ ہر فن مثلاً ادب۔ منطق۔ حدیث۔ اصولِ فقہ کے لئے انہی علما کے پاس دور دراز کا سفر کر کے گیا جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے۔ مثلاً حدیث کے لئے مولانا احمد علی سہارن پوری۔ ادب کے لئے مولانا فیض الحسن لاہور میں + والد بلکہ تمام خاندان کی مرضی بلکہ حکم تھا کہ میں علمی مشاغل کو چھوڑ کر وکالت اور ملازمت کر لُوں چنانچہ مجبور ہو کر امتحان دیا اور کامیاب ہؤا۔ چند روز وکالت کی۔ لیکن وکالت اور ملازمت سب چھوڑ دی اور علمی اشغال میں مصروف ہؤا اور اس لئے معمولی معاوضہ پر اول علی گڈھ کی پروفیسری کی للعہ ماہوار پر۔“

سنہ ۱۸۷۶ء میں کہ ۱۹ سال کی عمر تھی حج کو گئے اور مکّہ و مدینہ کے مناظر سے بغایت متاثر ہوئے۔ مدینے کے کتب خانوں میں جاکر حدیث کی بعض نایاب کتابیں دیکھیں جو بعد میں کہیں نظر سے نہ گذریں +

واپس آکر علم و شاعری کا مشغلہ لاحق ہوگیا۔ کتب بینی کی شروع سے عادت تھی۔ کہتے تھے کہ اعظم گڑھ میں رہتا تھا تو ایک کتب فروش کی بازار میں دکان تھی وہاں جاکر اردو فارسی کے دیوان دیکھا کرتا تھا کبھی کبھی گھر لے آتا تھا + مشاعروں میں حصہ لیتے تھے اور اُس وقت کے مشہور رسائل پیام یار اور اودھ پنچ کے پرچے بڑے شوق سے پڑھتے تھے +

مشاعروں کے علاوہ اُن کا شغل غیر مقلّدوں کی تردید اور شدید مخالفت تھا۔ اُن کا قول تھا کہ ”انسان عیسائی ہو سکتا ہے لیکن غیر مقلّد نہیں ہو سکتا۔“ اُن کا عربی رسالہ ”اسکات المعتدی“ اِسی زمانے اور اِسی مذہبی جوش و تعصّب کی یادگار ہے + اُس وقت ہندی مسلمانوں میں جو حنفیت و وہابیت کی جنگ برپا تھی۔ وہ اس جنگ میں بڑے شد و مد سے شریک تھے۔ شرر لکھتے ہیں کہ[52]:۔

”مولانا نے جن درس گاہوں میں تعلیم پائی تھی اور جن اساتذہ سے پڑھا اُن کی صحبت نے ابتدا ہی میں انہیں سخت حنفی بنا دیا تھا۔ اسی شوق میں انہوں نے اپنے نام کے ساتھ نعمانی کا لقب لکھنا شروع کیا۔ جس کی وجہ سے بعض ناواقف لوگوں نے انہیں غلطی میں پڑ کر نسبًا نعمانی یعنی امام اعظم ابو حنیفہ کوفی کی

[51] معارف نومبر سنہ ۲۳ء ص ۳۹۴۔ [52] مجموعۂ نظم شبلی اردو ص ۲۲۔

نسل میں خیال کر لیا۔ مگر اُس کی کوئی اصلیّت و حقیقت نہیں ہے۔ وہ متشدّد حنفی تھے اور حنفیت ہیں اپنے آپ کو اوروں سے ممتاز ثابت کرنا چاہتے تھے۔"

وہ ایک مذہبی جابر تھے اور روایت ہے کہ بعض لڑکوں کو اس لئے کہ وہ آئندہ نماز پڑھنے کا وعدہ کریں انہوں نے دو دو گھنٹے مارا +

لیکن اس درس و تدریس اور فرقہ بندی اور مذہبی سختی سے گھر والوں کو تسلی نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ شبلی کسی ایسے کام میں لگیں جو دنیاوی حیثیت سے بارآور ہو۔ پہلے زمینداری پھر وکالت پھر امانت کا کام نبھانا چاہا لیکن ایک شاعر مزاج مولانا سے یہ کام کیا سرانجام ہو سکتے ؟ ناچار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پھر مطالعہ و تدریس میں مصروف ہو گئے اور قصائد و رسائل لکھنے شروع کئے +

سنہ ۱۸۸۲ء میں ۲۵ سال کی عمر میں وہ علی گڑھ کالج کی عربی فارسی کی پروفیسری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے شرر لکھتے ہیں :-

"علی گڈھ میں سید صاحب نے انہیں اپنی کوٹھی کے احاطے کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی جو سب سے الگ بلکہ باہمہ اور بے ہمہ تھا اور ایک خاموش مقام تھا۔ اُن میں جستجو و تحقیق کا سچا مذاق دیکھ کر سید صاحب نے اُن سے ربط و ضبط بڑھایا۔ اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلا ناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی + سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور مورخانہ تحقیق کے غور و خوض میں رہتے اور تحقیق و تدقیق کے لئے انہیں اکثر حدیث و فقہ و تاریخ و سیر کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی۔ اس کام کو انہوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا۔ اور مولوی شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی اور قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی اور وسعتِ نظر کے مولانا شبلی قائل ہوتے جاتے تھے اُس سے زیادہ سید صاحب اُن کی تلاش جستجو اور جلب روایات کے معتقد و معترف ہو گئے تھے۔ اِس زمانہ میں مجھے بارہا مولانا شبلی کے پاس جا کے ٹھہرنے اور اُن کے ذریعہ سے خود سیّد صاحب کا مہمان بن جانے اور دونوں کے ساتھ ہفتوں کھانا کھانے اور شریکِ صحبت رہنے کا موقع ملا۔ مولانا سے اور مجھ سے حد درجہ کی بےتکلفی تھی۔ اور میں اس بات کو ہر صحبت میں محسوس کرتا تھا کہ وہ اور سید صاحب دونو کس قدر ایک دوسرے کے علمی کمالات کے معترف ہوتے جاتے ہیں۔ سید صاحب کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر اُن کے مشورہ کے نہ کرتے اور مولانا شبلی کے اعتراف کا یہ ثبوت ہے کہ میرے علم میں اُن کی سب سے پہلی نظم

جو اُن دنوں شائع ہوئی تھی "صبحِ امید" ہے، جس میں انہوں نے مسلمانوں کی غفلت اور سید صاحب کی برکت سے اُن کے بیدار ہونے کو نہایت ہی پُرلطف اور موثر الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔"

شبلی کا قول ہے کہ میں سید صاحب کا کتب خانہ دیکھ کر باغ باغ ہوگیا۔ مصر و یورپ کی تمام جدید و قدیم مطبوعات الماریوں میں بالترتیب سجی ہوئی تھیں۔ وہ کئی کئی گھنٹے الماریوں کے پاس کھڑے رہتے تھے اور کبھی تھک کر انہیں الماریوں کے پاس زمین پر بیٹھ جاتے تھے۔

اُس زمانے میں اُس دائرۂ علمیہ میں جس کے مرکز سرسید تھے مولانا حالی اور مسٹر آرنلڈ بھی شریکِ صحبت تھے۔ سرسید کے بعد شبلی سب سے زیادہ مسٹر آرنلڈ کے علمی خیالات سے متاثر ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ادھر شبلی نے آرنلڈ کو اُن کی کتاب "دعوتِ اسلام" کی تصنیف و تہذیب میں بہت مدد دی اور اُدھر آرنلڈ نے شبلی کو مغربی علوم اور مغربی علمی تفتیش کے طریقوں سے آگاہ کیا۔ آرنلڈ نے شبلی سے عربی سیکھی تو شبلی نے آرنلڈ سے فرانسیسی زبان کا درس لیا۔

سنہ ۱۸۸۲ء سے سنہ ۱۸۹۸ء تک سولہ سال شبلی علی گڈھ کالج میں رہے۔ مارچ سنہ ۹۸ء میں سرسید نے انتقال کیا۔ مئی سنہ ۹۸ء میں شبلی نے کالج سے رخصت لی اور اعظم گڑھ پہنچ کر اپنا استعفا بھیج دیا۔ اس دوران میں قومی ترقی کی اس نئی فضا میں اُن کے قلم سے متعدد تصنیفات شائع ہوئیں۔ سنہ ۱۸۸۴ء میں مثنوی "صبح امید" لکھی جس میں علاوہ ادبی خوبیوں کے شبلی پر سرسید کے اثرات کا عکس صاف طور پر عیاں ہے۔ سنہ ۱۸۸۷ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں انہوں نے "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" پر ایک فاضلانہ خطبہ پڑھا جس میں اول اول اُن کی علمیت اور اسلام سے محبت کا اظہار ہوا۔ سنہ ۱۸۸۹ء میں "رائل ہیروز آف اسلام" کے سلسلے کی پہلی کڑی "المامون" جو اُن کی سیرت نگاری کی پہلی زبردست کوشش تھی انہوں نے سرسید کی خدمت میں ہدیۃً پیش کی۔ اور غالباً اس کے عین بعد ہی "الجزیہ" اور "کتب خانہ اسکندریہ" کے رسالے لکھے۔ سنہ ۱۸۹۲ء میں انہوں نے روم و مصر و شام کا سفر کیا جس کا محرک اُن کا اسلامی اور علمی شوق تھا۔ سنہ ۱۸۹۳ء میں "سیرۃ النعمان" تکمیل کو پہنچی اور اس کے بعد دوستوں کے اصرار سے "سفرنامہ روم و مصر و شام" شائع ہوا۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں "رسائل شبلی" ایک کتاب کی صورت میں طبع ہوئے۔ اسی سال مارچ میں سرسید کا انتقال ہوا اور ماہ مئی میں شبلی نے کالج سے رخصت لی اور اعظم گڑھ پہنچ کر پروفیسری سے استعفا دے دیا۔

یہاں کے نیشنل سکول کے انتظام و ترقی میں کچھ دیر شبلی نے حصّہ لیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۹۹ء میں کشمیر گئے جہاں صحت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ "الفاروق" جو انہوں نے "المامون" کے بعد ہی لکھنی شروع کر دی تھی اور جس کے لئے علمی تحقیق کا خیال مصر و روم و شام کے سفر میں اُن کو برابر لگا رہا یہاں مکمل ہوئی جس روز اس مہتم بالشان تصنیف کی آخری

سطریں اُن کے قلم نے لکھیں وہ بستر پر دراز تھے اور گھنٹوں تک بیہوشی کی حالت طاری تھی۔

غالباً اسی سال سید علی بلگرامی کی تحریک پر وہ ریاست حیدر آباد میں شعبۂ علوم و فنون کے ناظم مقرر ہوئے ۱۹۰۲ء میں "الغزالی" اور اُس کے بعد "علم الکلام" چھپی۔ ۱۹۰۴ء میں "الکلام" اور پھر "موازنۂ انیس و دبیر" اور "سوانحِ مولانا روم" طبع ہوئیں۔

اس کے بعد شبلی نے حیدر آباد چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کیا۔ یہاں انہوں نے ندوۃ العلما کے ساتھ جس کی تحریک ۱۸۹۴ء میں شروع ہوئی تھی اور جس کے متعلق دارالعلوم انہیں کے خیال کے مطابق ۱۸۹۸ء میں قائم کیا گیا تھا اپنے آپ کو وابستہ کر لیا۔ ۱۹۱۳ء تک برابر نو سال شبلی نے ندوہ کی خدمت کی۔ جیسا کہ شبلی نے رسالہ "الندوہ" کے پرچے (۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء) میں ظاہر کیا انہوں نے محسوس کیا کہ "جدید تعلیم کے ساتھ اس بات کی بھی ضرورت اور سخت ضرورت ہے کہ ہمارے علوم و فنون ہمارا مذہب، ہماری قومی خصوصیات مٹ نہ جانے پائیں" سچ یہ ہے کہ اگرچہ ندوۃ العلماء کے قیام کا یہی مقصد قرار دیا گیا لیکن فی الحقیقت شبلی کی زندگی کا نصب العین بھی یہی تھا اور شبلی وہ عالم تھا جس کی زندگی اِس اصول پر عامل تھی کہ اسلام و اہلِ اسلام کی گئی گذری دنیاوی و روحانی و علمی عظمت کو از سرِ نو چمکایا جائے۔ ندوہ کے لئے وہ در بدر پھرے۔ ہندوستانی ریاستوں اور دیگر ذرائع سے سرمایہ جمع کیا یہاں تک کہ ۱۹۰۹ء میں ندوہ کی عظیم الشان عمارت کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔ لیکن اس تعمیر کے ساتھ تخریب کا کام بھی جاری تھا یعنی وہ علما جن کے اجتماع و تنظیم کا خواب ہمیشہ شبلی کے پیشِ نظر تھا اُن کی قدامت پسندی اور شکوک و شبہات نے آخر کار شبلی کو مجبور و مایوس کر دیا۔ اور وہ ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ چھوڑ کر اعظم گڑھ چلے گئے۔ شبلی میں مذہبی و ادبی میلانات پہلو بہ پہلو موجود تھے۔ قیامِ ندوہ کے زمانے میں ہی انہوں نے اپنی مشہور تنقیدی تصنیف "شعر العجم" کا پہلا حصہ ۱۹۰۸ء میں شائع کیا اور "اورنگ زیب عالمگیر" بالاقساط "الندوہ" میں شائع ہوتا رہا۔

اعظم گڑھ پہنچ کر انہوں نے "شعر العجم" کا کام جاری رکھا اور اُس کا دوسرا تیسرا اور چوتھا حصہ اردو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کا پانچواں حصہ اُن کی وفات کے چار سال بعد شائع ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں شہرۂ آفاق کتاب "سیرۃ النبی" زیرِ تصنیف تھی کہ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو موت اپنے مقررہ وقت پر آپہنچی۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں کہ "۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۵۷ ہی برس کی عمر پائی۔ ہنگامۂ مشرق (غدر) میں ظہور کیا اور ہنگامۂ مغرب (جنگِ یورپ) میں مخفی ہوئے۔" "بدر الاسلام" "سیرۃ نبوی" سے پہلے تصنیف کی اور سیرۃ نبوی پر آخر دم توڑا۔ مرنے سے کچھ دنوں پہلے کیا خوب فرمایا تھا ؎

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا"

ان کی وفات کے بعد سنہ ۱۹۱۶ء میں مکاتیبِ شبلی حصہ اول سنہ ۱۹۱۷ء میں حصہ دوم سنہ ۱۹۱۸ء میں سیرۃ النبی حصہ اول سنہ ۱۹۲۰ء میں حصہ دوم (جن آخرالذکر دو کتابوں میں کہیں کہیں قوسین میں سید سلیمان ندوی کے اضافات مندرج ہیں) شائع ہوئیں۔ کلیاتِ شبلی اردو اور کلیاتِ شبلی فارسی اُن کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں۔ البتہ "مقالاتِ شبلی" کتابی صورت میں اُن کی وفات کے بعد شائع ہوئی +

دنیاوی حیثیت سے شبلی نے مختلف اطراف سے اپنی قابلیت کا اعتراف حاصل کیا + سفرِ روم کے دوران میں سلطانِ ترکی نے تمغۂ مجیدی عطا کیا۔ دو سال بعد برٹش گورنمنٹ نے شمس العلما کا خطاب دیا اور الہ آباد یونیورسٹی کا فیلو بنایا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں امیر عبدالرحمٰن خاں نے کابل میں ایک علمی خدمت پر بلایا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ متعدد بار کانفرنسوں اور کمیٹیوں میں مدعو کئے گئے۔ حیدرآباد نے مدت تک اُن کی سرپرستی کی۔ اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بیرونی ممالک مصر و شام و ترکی و جزائرِ ملایا بلکہ انگلستان پیرس اور برلن سے علمی سوالات اُن کی رائے کے لئے اور بغرضِ استفادہ اکثر آیا کرتے تھے +

قوم کی تمدنی و علمی ترقی ہمیشہ شبلی کے پیشِ نظر تھی۔ چنانچہ آخری عمر میں اُن سے دو بڑے کام سرانجام ہوئے + "قانونِ وقفِ اولاد" انہیں کی مساعی سے منظور و نافذ ہؤا اور انہوں نے مشہور علمی مجلس "دار المصنفین" کی بنا ڈالی اور اپنا مکان باغ اور کتب خانہ اس کے نشوونما اور قیام کے لئے وقف کر دیا +

وفات سے تقریباً دو سال پیشتر ایک خط (مورخہ ۲۳ ستمبر سنہ ۱۲ء) میں اپنی پبلک زندگی کے متعلق یوں لکھتے ہیں[۴۷]:-

"متعدد دفعہ حیدرآباد اور دیگر ریاستوں میں بیش قرار تنخواہ پر بلایا گیا لیکن علمی مشغلہ کو چھوڑ کر نہ گیا حیدرآباد سے جو معمولی وظیفہ مقرر ہے اُس پر قناعت کی + ریاستوں نے صلے اور نذرانے دیئے اور دینے چاہے لیکن ہمیشہ انکار کیا اور واپس کر دیا + رائے میں ہمیشہ آزاد رہا۔ سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا لیکن پولیٹیکل مسائل میں ہمیشہ اُن سے مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں + سفر ترکی و مصر صرف علمی تحقیقات کے لئے کیا اور تمام مصارف خود گوارا کئے۔ ریاست رام پور نے مصارف دینے چاہے۔ انکار کیا۔ بزرگوں نے قسطنطنیہ روپے بھیجے وہ بھی واپس کر دیئے + ہمیشہ بڑے بڑے اہم مقاصد پیشِ نظر رہے + وطن

---

۴۷ "معارف" نومبر سنہ ۲۳ء ص ۳۹۴۔

یعنی اعظم گڈھ میں مسلمانوں کا کوئی اسکول نہ تھا اور مسلمان انگریزی سے بالکل الگ تھے۔ میں نے نیشنل ہائی اسکول قائم کیا۔ اس کے اکثر مصارف خود ادا کئے + پھر ندوہ کی تحریک میں جزوِ غالب رہا۔ اور جب ندوہ بالکل مرگیا تھا تو اُس کو از سرِ نو زندہ کر کے ترقی دی۔ تصنیفات میں خاص یہ خیال رہا کہ مستقل شاخیں مکمل کردوں۔ چنانچہ علمِ کلام، تاریخ، لٹریچر (موازنہ و شعر العجم) تین شاخوں پر سیریز تیار کردی + فارسی شاعری میں زبان کو اہلِ زبان کے اصول پر برتا + ملازمت تو اکثر علمی ہی اختیار کی لیکن وکالت اور سرکاری ملازمت کے زمانہ میں بھی درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا اور یہ فطرت تھی بچپن سے میری صحبت بدچلن لوگوں میں تھی اور وہ لوگ ہمیشہ ان مشاغل کی تحریک کرتے تھے لیکن کبھی ناچ رنگ بلکہ گانے میں بھی شریک نہ ہوا + جب راجہ کرشن پرشاد وزیر ہوئے اور حسبِ دستور نذر دینے گیا تو اُن کے اے ڈی کانگ نے کہا کہ آپ نے تو تہنیت کا قصیدہ لکھا ہوگا۔ میں نے کہا یہ اَوروں کا پیشہ ہے۔ میں یہ کام نہیں کرتا۔ اس پر رد و بدل ہوئی اور میں نے ناگواری کے ساتھ جواب دیا کہ "میں کسی کی مدح نہیں کرتا + قلمی اور نایاب کتابیں بہت بہم پہنچائیں اور کثرت سے مطالعہ کیں۔ یہ سرسری باتیں لکھ دیں۔ خود اپنا آلھا کیا گاؤں؟

شبلی ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء"

شبلی کی زندگی کے مختصر حالات تو ہم سن چکے۔ اب ان حالات میں ہمیں اُن تغیرات کو ڈھونڈنا ہے جنہوں نے شبلی کو شبلی بنایا + اس دنیا میں جہاں حرکت زندگی ہے اور سکون موت۔ وہی شخص زیادہ زندہ وہی شخص زیادہ پُر عظمت ہے جس کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ تحریک پائی جائے۔ شبلی کی زندگی میں کون سی تحریک یا تحریکیں تھیں اور اس کے یا اُن کے محرکات کیا تھے؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شروع شروع میں وہ ایک پرانی وضع کے متشرع مسلمان تھے اور اُن کی تنگ نظر اسلامیت اُن کے اس قول سے مترشح ہوتی تھی کہ "انسان عیسائی ہوسکتا ہے لیکن غیر مقلد نہیں ہوسکتا" البتہ یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ نرے مُلّانے نہ تھے بلکہ اُن میں اسلام کے لئے ایک پُرجوش خلوص و عشق تھا جو ابھی اُس زمانے میں جب انہوں نے ۱۹ سال کی عمر میں فریضۂ حج ادا کیا اور پھر مدینے میں درگاہِ رسول میں حاضر ہوئے اُن کے ہر قول و فعل سے ٹپکا پڑتا تھا + لیکن پھر بھی قدامت پسندی نے ابھی انہیں گھیر رکھا تھا اور ابھی اُن میں وہ آزاد منشی اور زمانہ شناسی کا جوہر نہ چمکا تھا جس کے اثر سے وہ یکتائے علم و فن بن گئے + اعظم گڑھ کا حساس نوجوان جب علی گڑھ پہنچا تو وہاں اُسے اُس مردِ خدا سے پالا پڑا جس نے گذشتہ بارہ سال سے مسلمانوں کی قوم کو خوابِ گراں سے جگانے میں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور اپنے دل و دماغ کے سب جذبات و خیالات صرف کر دیئے تھے + سرسید کی صحبت و اثر نے شبلی کے تمام

اُن خوابیدہ اوصاف کو بیدار کر دیا جو فطرتاً اُن کی طبیعت میں موجود و مضمر تھے + وہ برگزیدہ ہستیاں جو سرسیّد کے اثر سے مسلمانوں کی قوم میں اچھے اور بڑے کاموں پر آمادہ ہو گئیں اور جنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام کی سچّی روح پھونکنے میں اپنی زندگی وقف کر دی اُن میں ایک شبلی بھی تھے +

سرسیّد خود ایک زبردست قومی ضرورت سے متاثر تھے ۔ انھوں نے دیکھا کہ ہندوستان کے مسلمان تخت و تاج کھو کر حکومتِ وقت سے روٹھ کر قدامت پسندی زیاں کاری اور سہل انگاری کی دلدلوں میں پھنسے ہیں اور کسی طرح نکالے نہیں نکلتے + انھوں نے اک عرصہ اُن تجاویز پر غور کیا جن سے اِس برگشتہ قسمت قوم کو اس کی غفلت کے برے نتائج سے کما حقہٗ آگاہ کر کے اسے ترقی و تہذیب کے رستے پر لگایا جاتے + اکتوبر سنہ ۱۸۷۰ء میں وہ ولایت سے واپس آئے اور پہنچنے کے جلد بعد انھوں نے مسلمانوں کو مغربی تہذیب سے مانوس کرنے اور اس کے ساتھ ہی اپنی قدیم تہذیب کے پھر پا لینے کے لئے دو بڑے بڑے کام بیک وقت شروع کئے ۔ ۲۴ ۔ دسمبر کو "تہذیب الاخلاق" کا پہلا نمبر شائع ہوا اور ۲۶ ۔ دسمبر کو کمیٹی "خواستگارِ ترقیِ تعلیم مسلمانانِ ہندوستان" قائم ہوئی ۔ تہذیب الاخلاق کے ایڈیٹر اور اس کمیٹی کے سکرٹری سرسید بنے + تہذیب الاخلاق نے صرف مسلمانوں کے اخلاق کی تہذیب کا کام ہی نہیں کیا بلکہ اُس کے ذریعے سے مسلمانوں میں وہ مذہبی و قومی ترقی کی روح پھیلی جس کا نتیجہ آج اُن کی بدرجہا بہتر حالت میں عیاں ہے اور اردو زبان میں اُس سلاست و متانتِ ادب کی بنیاد پڑی جس پر آئندہ ساٹھ سال میں ایک خوش آئند عمارت قائم ہو گئی + اور کمیٹی مذکورہ کی مساعی کا نتیجہ آج "علی گڈھ یونیورسٹی" کے در و دیوار سے ظاہر ہے + سرسید کو قومی ترقی کی جو لو لگی ہوئی تھی وہ اُس دل گداز واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے جسے نواب محسن الملک نے اِن لفظوں میں بیان کیا ہے[۵۵] کہ

> جس تاریخ کمیٹی مذکور کے انعقاد کے لئے جلسہ قرار پایا تھا اُس سے ایک روز پہلے میں بنارس میں پہنچ گیا تھا ۔ رات کو سرسید نے میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بچھوایا تھا ۔ گیارہ بارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں ۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی ۔ دو بجے کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے سرسید کو اُن کے پلنگ پر نہ پایا ۔ میں اُن کے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا ۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار زار قطار روتے جاتے ہیں ۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ "اس سے زیادہ اَور کیا مصیبت ہو سکتی ہے" کہ مسلمان بگڑ گئے اور

---

۵۵ حیاتِ جاوید جلد ۱ ۔ ص ۱۷۳ ۔

بگڑتے جاتے ہیں اور کوئی صورت اُن کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔ پھر آپ ہی کہنے لگے کہ جو جلسہ کل ہونے والا ہے مجھے امید نہیں کہ اس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ ساری رات اسی ادھیڑ بن میں گزر گئی ہے کہ دیکھئے کل کے جلسہ کا کیا انجام ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں۔" نواب محسن الملک کہتے ہیں کہ "سرسید کی حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پر گذری اس کو بیان نہیں کرسکتا۔ اور جو عظمت اس شخص کی اُس دن سے میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہے اُس کو میں ہی خوب جانتا ہوں"[۵۶]

ایک خط میں جو سرسید نے اپنے اِس ہمدرد اور دلی دوست کو ولایت سے لکھا ایک عربی مدرسے کا جو کہیں دہلی میں قائم کیا گیا تھا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں[۵۶]:۔

"جانِ من و جنابِ من! ایسے ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں۔ افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی اُن کا نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس! امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس! ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی کچھ فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور تعلیمِ اولاد کا کیا قاعدہ ہے؟ اور علم کیونکر آتا ہے؟ اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آن کر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا۔ مگر مجھ کافر مردود، گردن مروڑی ہوئی مرغی کھانے والے، کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنے گا؟"

قوم نے طوعاً وکرہاً سرسید کی زبردست آواز سنی اور اُس پر جن چند صاحب دلوں نے بزور لبیک کہی اُن میں ایک شبلی بھی تھے، وہ جوش و خروش وہ محبت و عقیدت کے جذبات جو سب کے سب سچائی اور نیک دلی پر مبنی تھے کس طرح ممکن تھا کہ وہ بے اثر و بے نتیجہ رہتے! علی گڑھ کالج میں دو سال پروفیسری کرنے کے بعد جو مثنوی "صبح امید" کے نام سے انہوں نے لکھی اُس سے ظاہر ہے کہ سرسید کی تحریک کا اُن پر کیا کچھ اثر ہوا + زوالِ اسلام کا ایک پُر درد خاکہ کھینچنے کے بعد کہتے ہیں[۵۷]:

ماتم تھا یہی کہ آئی ناگاہ	اک سمت سے اک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آہ دلگیر	پہلو میں اثر، بغل میں تاثیر
دل ہاتھ سے لینے میں بلا تھی	جادو تھی؟ فسوں تھی؟ جانے کیا تھی

---

[۵۶] حیاتِ جاوید جلد ۲ - ص ۵۷ + [۵۷] کلیاتِ شبلی اردو صفحات ۷۷، ۸۱، ۱۰

دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکیں — آیا نظر ایک پیرِ دیریں
صورت سے عیاں جلالِ شاہی — چہرے پہ فروغِ صبحگاہی
وہ ریشِ دراز کی سپیدی — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
وہ ملک پہ جان دینے والا — وہ قوم کی ناؤ کھینے والا
اُٹھتے ہوئے جوش سے بہ رقت — ہے مرثیہ خوانِ قوم و ملت
تا دیر وہ قوم کا فدائی — وہ خضرِ طریقِ رہنمائی
اٹھتے ہوئے جوشِ دل سے پیہم — عبرت کا دکھا رہا تھا عالم
افسانۂ غم سنا کے ٹھہرا — سوتوں کو جگا جگا کے ٹھہرا
جادو کی بھری ہوئی وہ تقریر — ہونٹوں سے ٹپک رہی تھی تاثیر
باتوں میں اثر تھا کس بلا کا — اِک بار جو رخ پھرا ہوا کا
امید کی بڑھ گئی تگ و تاز — اونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز
خواہش کے بدل گئے ارادے — ہمت نے قدم بڑھائے آگے
جو تھا وہ عجیب جوش میں تھا — مخمور بھی اب تو ہوش میں تھا
اب ملک کے ڈھنگ تھے نرالے — اخبار کہیں کہیں رسالے
تعلیم کے جابجا وہ جلسے — گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے
بے تاب ہر ایک جزوِ کل تھا — ہر بار "بڑھے چلو" کا غل تھا

اخیر میں علمائے قوم کو خطاب کر کے تہدیداً کہتے ہیں ؎

اے مدعیانِ حبِ اسلام! — حجروں میں تو اب کرو نہ آرام!
دعوے ہیں تو کچھ ہنر دکھاؤ! — ہمت کے قدم ذرا بڑھاؤ!
موقع ہے یہی ہنر دکھاؤ — جو کہتے تھے، آج کر دکھاؤ!
کر دو جو گذشتہ کی تلافی — ثابت ہو زمانے پر کہ اب بھی!
گو دورِ فلک ہوا دگرگوں — پھر بھی تو رگوں میں ہے وہی خوں
اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی — اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی

اس جام میں ہے شراب باقی — اب تک ہے گہر میں آب باقی
گو خوار ہیں طرز خو وہی ہے — مرجھا گئے پھول بو وہی ہے
هٰذا ولقد بلغت اقصاه — فاسعوا او توکلوا علی اللہ

شبلی کی پہلی اردو نثر کی تحریر دہ علمی اسلامی مضمون ہے جو انہوں نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کے عنوان سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں پڑھا۔ اس میں انہوں نے بتایا کہ مسلمانوں نے علوم و فنون کس طرح حاصل کئے اور پھر دنیا کی تمام قوموں کو اُن علوم کی کیونکر تعلیم دی۔ اس مضمون کو ان فقروں پر ختم کرتے ہیں[۵۸]۔

"میں نے اس آرٹیکل میں اس بات سے قصداً پرہیز کیا ہے کہ سلف کے کارنامے زیادہ آب و تاب سے لکھوں۔ قوم کی آج یہ حالت ہے کہ جتنا لکھا گیا یہ بھی اُس کے چہرے پر نہیں کھلتا۔ سلف کے مفاخر کا ہم کیا ذکر کر سکتے ہیں۔ جب ہم نے خود کچھ نہیں کیا تو اس سے کیا حاصل کہ سلف نے بہت کچھ کیا تھا۔

گر نیم کز حریفاں بیش یا کم میتواں گفتن — ز دستت تا چہ آید آخر ایں ہم میتواں گفتن"

اس کے ڈیڑھ دو سال بعد شبلی نے مسلمانوں کے گذشتہ کارنامے اک گری ہوئی قوم کے سامنے پیش کرنے کا تہیہ کیا اور رائل ہیروز آف اسلام یعنی نامور فرمانروایانِ اسلام کے سلسلے میں سب سے پہلی کتاب "المامون" لکھ کر اس کا حقِ تصنیف مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو دے دیا۔ اس کے دوسرے ایڈیشن کے ساتھ جو اکتوبر ۸۹ء میں شائع ہوا سرسید نے دیباچہ لکھا جس میں وہ سلف کے کارناموں کو یاد رکھنے کی اہمیت جتا کر لکھتے ہیں[۵۹]

ہم کو نہایت خوشی ہے کہ ہمارے دوست مخدوم اور ہمارے مدرسۃ العلوم کے پروفیسر مولانا مولوی محمد شبلی نعمانی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور ایک سلسلہ ہیروز آف اسلام کا لکھنا چاہا ہے۔ اسی سلسلہ میں کی ایک کتاب یہ ہے جو "المامون" کے نام سے موسوم ہے۔ انہوں نے خلفائے بنی عباس میں سے مامون الرشید ابن ہارون الرشید کو عباسی خلفا کا ہیرو قرار دیا ہے۔ اور اس کے عام کارنامے اچھے یا برے نہایت خوبی اور بے انتہا خوش اسلوبی سے اس میں لکھے ہیں"

الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، سیرۃ النعمان، سفرنامہ روم و مصر و شام، رسائلِ شبلی سب علی گڑھ کے زمانے کی یادگار ہیں۔ علی گڑھ کا زمانہ شبلی کی پبلک زندگی کا پہلا دور تھا۔ علی گڑھ ہی میں اُن کی تصنیف و تالیف کی ابتدا ہوئی۔

---

۵۸ "گذشتہ تعلیم" ص ۱۷۔ ۵۹ المامون دیباچہ ص ۱

وہیں سرسید کی صحبت میں اُن پر جدید قومی رنگ چڑھا۔ وہیں انہوں نے مشرقیت و مغربیت کے صحیح امتزاج کی خوبی اور سودمندی دیکھی۔ اس ضمن میں اُن کے مذہبی خیالات میں بقولِ شرر "ایک نازک انقلاب" واقع ہوا۔ شبلی جو اولاً نعمانی و حنفی تھے اب غیر مقلد معتزلی سرسید کے زیرِ اثر بغیر اس کے کہ غیر مقلد بنیں "بلا واسطہ نعمانی سے معتزلی بننے لگے اور آخر میں اس بات کی کوشش شروع کی کہ خود حنفیت کو اصلی اعتزال ثابت کریں"۔ اس کے بعد شرر لکھتے ہیں[۱]:-

"اب اس کے ساتھ ہی اُن میں ایک دوسرا تغیر شروع ہوا۔ اُن میں باوجود انتہا درجے کے اخلاق کے خودداری کا خیال بہت بڑھا ہوا تھا۔ سید صاحب کی صحبت علی گڈھ کالج کی مرجعیت اور اُن کی ذاتی قابلیت نے انہیں ابتداً اس حیثیت سے پبلک میں انٹروڈیوس (متعارف) کرایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور اُن کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں خصوصاً جب وہ سید صاحب کے ہمراہ رکاب حیدرآباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو اور پختگی ہو گئی۔ مگر خود مولانا شبلی کی خودداری اس حیثیت کو (؟) اپنی اُن تصنیفوں اور نظموں کو تو وہ مٹا نہ سکتے تھے جن میں خود ہی اپنی اس حیثیت کو آشکارا کر چکے تھے۔ لیکن اب اس بات کو ناقابلِ برداشت دیکھ کے علی گڑھ کالج سے علیحدگی اختیار کر کے ندوۃ العلما میں شرکت کی اور سمجھے کہ اس ذریعہ سے ہیں علما کا سرتاج اور شیخ الکل بن کے اُس درجہ پر پہنچ جاؤں گا جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہے۔ میں نے بارہا اُن کو اس خیال سے روکا اور اسی زمانہ میں کہہ دیا تھا کہ علما بس میں آنے والے نہیں ہیں"

اس علیحدگی کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ سرسید کو اپنی عمر کے آخری حصّے میں کالج سے کم تعلق تھا اور سید محمود کی بے بس تلون مزاجی بعض وقت خوددار کام کرنے والوں کے لئے اک سوہانِ روح ہو جاتی تھی۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو یہ ظاہر ہے کہ علی گڑھ کی فضا اب شبلی کے کام کے لئے ناکافی یا غیر موزوں ہو گئی تھی۔ وہ محض اک کالج کے پروفیسر بنے رہنے پر راضی نہ تھے۔ اُن کی حد درجہ حساس اور خوددار اور رانو کھی شخصیت اپنے اظہار و اتمام کے لئے اور نئے نئے ذریعے ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ کالج کو چھوڑ کر اول اول نو سال ڈیڑھ سال تک وہ سب بندشوں سے آزاد رہے اور اسی آزادگی و علالت کے زمانے میں "الفاروق" کی سی زبردست تصنیف تکمیل کو پہنچائی۔ بعد میں وہ حیدرآباد کی علم نواز ریاست سے متعلق ہو گئے اور اُس کی سرپرستی میں انہوں نے تاریخ سے فلسفے اور فلسفے سے ادب کی طرف رجوع کیا۔ یہ شبلی کی مصنفانہ زندگی کا دوسرا دور تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب اُن کی طبیعت محض تاریخی بیانات و تحقیقات سے سیر ہو چکی تھی اور اپنی جودت و اجتہاد کے لئے نئے نئے میدان ڈھونڈتی تھی۔ لہذا پہلے "الغزالی" پھر "علم الکلام" پھر "الکلام" لکھی گئیں اور ان کے بعد ادبیات نے دل میں

---

[۱] مجموعۂ نظم شبلی اردو ص ۲۵ ۔

چٹکی لی تو پہلے "سوانح مولانا روم" اور پھر "موازنہ انیس و دبیر" تیار ہوئیں۔ لیکن یہ دوسرا دور جو یوں علی گڑھ کی طرح اک تصنیف و تالیف کا دور تھا مگر جس میں علی گڑھ کی سی کوئی قومی تحریک اپنی لہریں نہ لیتی تھی شبلی کی شخصیت کے زور اور پھیلاؤ کے لئے ایک علمی تنگ نائے ثابت ہؤا اور اس لئے وہ چار سال کے بعد ہی حیدرآباد سے رخصت ہو کر چل دئیے۔

حقیقت یہ ہے کہ شبلی ایک آزاد روش عالم تھے۔ سر سیّد تھے جنہوں نے اُن کی آزاد منشی اور اجتہاد کو ابھارا اور علی گڑھ اور حیدرآباد میں اُن کی علمیّت و قابلیّت کو اپنے جوہر دکھلانے کا موقع ضرور ملا لیکن اُن کی آزادگی اک نئی راہ بنانے اور بلا واسطہ خود کچھ کر سکنے کے لئے بے تاب تھی۔ بالآخر فکرِ معاش سے کچھ فارغ ہو کر انہوں نے اُس کام کو ہاتھ میں لیا جو انہیں جان و دل سے زیادہ عزیز تھا۔ یہ تھا ہندی مسلمانوں کے علما کو اک نئی راہ پر لے جانے اور نئے چلنے کا زبردست و نتیجہ خیز کام۔ شبلی نے محسوس کیا کہ وہ خاص اس کام کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ سر سیّد کو "پیغمبرِ تعلیم" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ شبلی مسلمانانِ ہند کے مذہبی رہنما بننا چاہتے تھے۔ اک ایسے رہنما جس کی پُر درد آواز دماغ نہیں بلکہ دل پر اپنا اثر پیدا کرے۔ اور سچ یہ ہے کہ شبلی میں اس کام کی قابلیّت بھی تھی۔

لیکن یہ کام اس قدر آسان نہ تھا جتنا وہ سمجھے تھے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ انہوں نے اس بارے میں سخت بلکہ انتہائی کوششیں کیں۔ دن رات محنت کی۔ ریاستوں سے روپیہ جمع کیا۔ دربدر گداگری کی۔ ندوہ کو ندوہ انہیں نے بنایا اور ایسے ایسے علما پیدا کر دئیے جن میں سے کسی کسی میں شرقیت و مغربیت دونوں کی جھلک یکجا پائی جانے لگی۔ اور اس کے ساتھ اُن کی رہائش کے انتظام و اہتمام اور اُن کے اخلاق و اطوار پر ایک دقیق و نکتہ رس نظر تھی۔ غرض شبلی نے ہندوستان کے قدامت پسند مسلمانوں کو انہیں کے دل اپنے ارادوں سے ہر طرح مطیع و منقاد کرنا چاہا لیکن آخر میں علما کی انانیت اور کج روشی نے اُن کو مجبور کر دیا کہ اس کام سے قطعی طور پر ہاتھ اٹھا لیں۔ اس دوسرے دور میں علاوہ رسالہ الندوہ اور ندوہ کے دار العلوم کو بوجوہِ احسن چلانے کے انہوں نے "شعر العجم" کی تصنیف کی ابتدا کی۔ گومتی کے کنارے ندوۃ العلما کی شاندار عمارت آج تک اُن کی مساعی کو پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے۔

اس کے بعد شبلی پھر اعظم گڑھ چلے گئے۔ شعر العجم ختم کی لیکن طبیعت کو قرار نہ تھا۔ چاہتے تھے کہ علاوہ اس انفرادی علمی کام کے کوئی اجتماعی قومی خدمت بھی سرانجام دیں۔ چنانچہ ایک طرف سیرۃ النبی کا مبارک کام ہاتھ میں لیا اور دوسری طرف اک زبردست ایثار کے ساتھ "دار المصنفین" کی بنا ڈالی۔

زندگی کے دور۔ مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ شبلی کی زندگی چھ حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ اول ۱۸۵۷ء سے

سنہ ۱۸۸۳ء تک کا زمانہ جو تعلیم و تربیت اور جستجوئے معاش کا زمانہ تھا۔ اس وقت خیالات میں پرانی روش قائم تھی + دوسرا سنہ ۱۸۸۲ء سے سنہ ۱۸۹۸ء تک جب وہ سر سید کے زیر اثر آئے اور اُن میں وہ جوہر ابھرا جس سے اُن کی شخصیت دنیا پر ہویدا ہونے والی تھی + تیسرا سنہ ۱۸۹۸ء سے سنہ ۱۸۹۹ء تک جب انہوں نے کچھ دیر علیحدگی میں تصنیف کا کام کیا + چوتھا سنہ ۱۸۹۹ء سے سنہ ۱۹۰۴ء تک جب حیدر آباد میں ناظم علوم و فنون کی حیثیت میں اُن کو وسیلۂ معاش ہی میں مشغلۂ تصنیف حاصل ہوگیا اور وہ نظام کی اعانت میں اطمینان سے اپنا مصنّفانہ کام کرتے رہے + پانچواں سنہ ۱۹۰۴ء سے سنہ ۱۹۱۳ء تک جب انہوں نے علما کی تہذیب و تربیت کا دشوار کام اپنے ذمے لیا اور اس کو جہاں تک ممکن تھا خوش اسلوبی کے ساتھ نباہا + چھٹا اور آخری زمانہ سنہ ۱۹۱۳ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک جب وہ بظاہر پبلک زندگی سے علیحدہ ہوگئے لیکن جب انہوں نے تصنیف میں سیرۃ النبی اور تنظیم میں دار المصنفین کی داغ بیل ڈالی جن کے نقش و نگار آج تک ہندوستان میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں + اس تمام عرصے میں شبلی کی شخصیت ہم کو چھ مختلف مقامات پر اپنا کام کرتی نظر آتی ہے۔ اعظم گڑھ۔ علی گڑھ۔ کشمیر۔ حیدر آباد۔ لکھنؤ اور پھر اعظم گڑھ!

مصنّفانہ زندگی کی تبدیلیاں ۔ اب دیکھو کہ شبلی کی مصنّفانہ زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ شروع میں قدیم رنگ کی محدود دینداری کا اظہار ہے چنانچہ اسکاتُ المعتدی کا شور و غل سنائی دیتا ہے + پھر علی گڑھ میں جا کر اسلامی وسیع نظری پیدا ہوتی ہے "صبحِ امید" میں امید افزائی ہے۔ "گذشتہ تعلیم" میں علم کے عملی نمونے ہیں "المامون" میں اسلامی تمدن کے علم و فضل کا خاکہ ہے "الجزیہ" اور "کتب خانہ اسکندریہ" میں ثابت کیا ہے کہ اسلام میں انتظامی و ملکی و علمی بہبود کا خیال تھا وہ تنگ نظری نہ تھی جس کا الزام مخالفین نے اُس کے سر تھوپا ہے + "سیرۃ النعمان" میں دکھایا ہے کہ حنفیت کیسی عقل پسندی اور توسیعِ خیال پر مبنی ہے + "سفرنامہ" میں بتایا ہے کہ کون سے اسلامی ملک میں ابھی قدامت پسندی کا رنگ غالب ہے اور کہاں نئی زندگی کے آثار ہویدا ہو رہے ہیں + "رسائلِ شبلی" میں جا بجا اشارے ہیں کہ مسلمانوں نے گذشتہ زمانوں میں کیسے اُن علوم مثلاً میکینکس میں ترقی کی جو موجودہ مغربی تہذیب کا مابہ الامتیاز سمجھے جاتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ آج کل کے مسلمانوں کو پھر ادھر توجہ کرنی چاہیئے + اس دورِ تصنیف کی بلند ترین چوٹی الفاروق ہے جس پر زیادہ تر یہی اعتراض کیا گیا ہے کہ اُس میں گذشتہ زمانے کے ملکی مالی اور فوجی انتظامات کو حال کے مغربی ادارات کے ہم پلّہ ثابت کرنے کی مصنوعی کوشش کی گئی ہے + یہ تھا اُس انتہائی وسعتِ نظر کا نتیجہ جو اسلام کے دائرے میں رہ کر شبلی کو حاصل ہوئی + اس کے بعد خالص علمی دور ہے جب معقولات و فلسفۂ اسلام کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ "علم الکلام" زیرِ ترتیب تھی کہ متکلمین کے حالات کے ضمن میں امام غزالی کے حالاتِ زندگی اس قدر بسیط ہوگئے کہ اُن کو پہلے ہی سے ایک کتاب

کی شکل میں یکجا پڑا۔ اس تاریخ "علم الکلام" کے بعد شبلی نے موجودہ زمانے کے اقتضا کے مطابق ایک جدید علم الکلام کی عمارت کھڑی کر دی جس کے اندر رہ کر اُن کے نزدیک اسلام موجودہ متشککین اور مادئیین کے حملوں سے محفوظ رہ سکتا ہے + اس کے بعد کا دور ایک خالص ادبی دور ہے + "سوانح مولانا روم" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ[1]

"سلسلۂ کلامیہ کا یہ چوتھا نمبر ہے۔ تین حصے (علم الکلام۔ الکلام۔ الغزالی) پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے وہ فقر و تصوف ہے۔ اور اس لحاظ سے متکلمین کے سلسلہ میں اُن کو داخل کرنا اور اس حیثیت سے اُن کی سوانح عمری لکھنا۔ لوگوں کو موجبِ تعجب ہوگا۔ لیکن ہمارے نزدیک اصلی علمِ کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقاید کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق و معارف اس طرح بتاتے جائیں کہ خود بخود دل نشین ہو جائیں۔ مولانا نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے مشکل سے اُس کی نظیر مل سکتی ہے۔ اس لئے ان کو زمرۂ متکلمین سے خارج کرنا ناانصافی ہے"

اس طریقے سے علم سے ادب کی طرف رجوع کیا + چنانچہ اس کے بعد "موازنۂ انیس و دبیر" لکھا جس میں ادب کو علم و فلسفہ سے مطلق کچھ سروکار نہیں۔ اس کتاب میں پہلے پہل ظاہر ہوا کہ شبلی نرے مورخ نہیں نرے فلسفی نہیں نرے مذہبی مجتہد نہیں بلکہ اُن کو ادب کا صحیح مذاق ہے اور وہ جو ہمیشہ سے خود اردو فارسی کے منظومات میں تخلیق کا کام کرتے رہے ہیں اب وہیں تنقید سے بھی عہدہ برا ہونا چاہتے ہیں + چنانچہ "شعر العجم" جو تاریخی حیثیت سے ایک ناقص کتاب پکاری گئی ہے تنقیدی حیثیت سے ایک زبردست اور خیال انگیز تصنیف ہے جس کا وجود اردو ادب کے لئے فی الحقیقت مایۂ ناز ہے +

آخری دور پھر ایک پاکیزہ و شستہ دین داری پر ختم ہوتا ہے جو "سیرۃ النبیؐ" میں آئینہ ہے +

ہمہ گیری ۔ شبلی کا ایک بڑا وصف اور اُن کی مصنفانہ عظمت کی اک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ادب کے مختلف النوع شعبوں پر تقریباً مساوی طور پر حاوی تھے + وہ عربی کے ایک جیّد عالم، فارسی کے ایک زبردست انشا پرداز، اردو کے ایک شاندار مصنّف تھے۔ عربی فارسی، اردو وہ تینوں زبانوں میں بآسانی تقریر و تحریر اور خط و کتابت کرتے تھے۔ اردو مکاتیب کی جمع و اشاعت کے خیال کو تو عموماً انہوں نے ناپسندیدگی ہی کی نگاہ سے دیکھا۔ ہاں اپنے فارسی خطوط کی ترتیب و تہذیب کا انہیں شوق تھا + اس کے ساتھ وہ تھوڑی سی انگریزی بھی جانتے تھے اور فرانسیسی زبان سیکھنے میں بھی انہوں نے کچھ وقت اور محنت صرف کی + انہوں نے مختلف موضوعات پر مضامین اور رسالے اور کتابیں لکھیں +

---

[1] "سوانحِ مولانا روم" دیباچہ

اس حیثیت سے انہوں نے جو کچھ لکھا وہ سوائے الکلام اور موازنۂ انیس و دبیر اور منظومات کے سبھی ایک نقطۂ نظر سے تاریخی سرمایہ تھا وہ اول و بیشتر ایک مورخ ہی ہیں لیکن باعتبارِ موضوع نظر ڈالی جائے تو جو کچھ لکھا وہ بہت سے شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ "گذشتہ تعلیم" زیادہ تر اسلامی مدارس اور قدیم تعلیم پر مشتمل ہے۔ اسی طرح اسلامی شفاخانے، اسلامی کتب خانے، ہیکلکس اور مسلمان، ہندوستان میں اسلامی حکومت، عبدالرحیم خان خاناں، ہمایوں نامہ، تزک جہانگیری، علامہ ابن تیمیہ کے مقالات تاریخی شذرات ہیں۔ حقوق الذمیین، جزیہ، تراجم، مسلمانوں کی علمی بے تعصبی، موبدانِ مجوس اور سلطنتِ تیموریہ، برج بھاشا اور مسلمان، کتب خانہ اسکندریہ میں مسلمانوں کے تعلقات دوسری قوموں سے دکھائے ہیں کہ وہ کیسے فراخ دل اور عالی نظر تھے۔ "اورنگ زیب عالمگیر" میں اُس بادشاہ پر جو اعتراضات کی بھرمار ہے اُس کو روکنے کی کوشش کی ہے۔ "خطبہ" (مرقومہ ۱۸۹۵ء) میں ظاہر کیا ہے کہ مسلمان علما کے فرائض زمانۂ موجودہ کے لحاظ سے کیا ہیں اور اُن کو کیسے قوم کی حالت کو سنوارنا چاہیئے۔ "ابن رشد"، "معتزلہ اور اعتزال"، "منطقِ یونانی کی غلطیاں"، "علومِ جدیدہ"، فلسفیانہ و متکلمانہ مضامین ہیں۔ "بدء الاسلام" ایک مختصر سی "سیرت النبی" ہے جو شبلی نے عربی میں لکھی اور جس کا بعد میں فارسی اور اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

یہ اُن کے بعض مختصر مضامین یا مقالات ہیں جو ایک کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ "المامون"، "سیرۃ النعمان"، "الفاروق"، "سوانحِ مولانا روم"، "سیرۃ النبی"، سوانح عمریاں ہیں اور تاریخ و سیرت کی کتابیں ہیں۔ لیکن ان میں سیرۃ النعمان کو دوسری طرف فقہ سے تعلق ہے الغزالی کو علمِ کلام سے اور سوانحِ مولانا روم کو شعر و ادب سے۔ "علم الکلام" تاریخی بھی ہے اور متکلمانہ بھی۔ الکلام اسلام کا جدید فلسفہ ہے۔ موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم شعر و ادب سے متعلق ہیں اور تنقیدِ عالیہ کے قابلِ قدر نمونے ہیں۔ "سفرنامۂ روم و مصر و شام" اور "مکاتیبِ شبلی" اور "خطوطِ شبلی" میں وہ ہمیں ایک معمولی انسان کی طرح چلتے پھرتے اور بولتے چالتے دکھائی سنائی دیتے ہیں۔

غرض شبلی صرف ایک مذہبی عالم و مصلح ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک مورخ و سوانح نگار بھی ایک اسلامی فقیہ و متکلم بھی ایک علمی و ادبی نقاد بھی ایک فارسی اردو کے فصیح شاعر بھی اور ایک بے تکلف آزاد رو انسان بھی تھے۔ اُن کی ہمہ گیری قابلِ غور ہے وہ محض تاریخ و مذہب کے سمندر کے پیراک ہی نہ تھے بلکہ شعر و ادب کی فضا کے ہوا باز بھی تھے! لیکن جہاں ہمیں اس ہمہ گیری پر ایک نظر ڈالنی پڑتی ہے جہاں ہم مجبور ہوتے ہیں کہ شبلی کے ہر شعبۂ تصنیف پر ایک نظر ڈالیں وہاں ہمیں یہ بھی نہ بھول جانا چاہیئے کہ ہمیں اُن کی کتابوں اور مختلف تصانیف کو ایک سلسلے میں منسلک کر کے بھی دیکھنا چاہیئے کہ اُن کا مجموعی مدعا کیا تھا؟ جس طرح ایک کتاب کے مختلف ابواب اور فصلیں ہوتی ہیں اور اُن میں

سے ہر ایک میں ایک کم و بیش جداگانہ موضوع پر بحث ہوتی ہے لیکن وہ سب مل کر ایک ہی کتاب کا جزو ہوتی ہیں اسی طرح ایک مصنّف کی مختلف کتابیں اُس کی شخصیت کے مختلف ابواب ہوتے ہیں جن کو الگ الگ اور یکے بعد دیگرے پڑھنے کے بعد ہم کو اُن پر ایک مجموعی نظر ڈالنی چاہیئے کہ وہ ایک خاص مجموعہ کے اجزا ہیں اور وہ مجموعہ عبارت ہے اُس مصنّف یا اُس کی شخصیت سے۔ اگر ہم شبلی کی کتابوں کو مجموعی طور پر دیکھیں یا یوں کہئے کہ اگر ہم ان کو ایک مجموعے میں یا ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے اس کو نامزد کرنا چاہیں تو ہم اس کا نام غالباً یہ رکھیں "مسلمان اور اُن کا علم و ادب"۔ شبلی کی تصنیفات میں ہم اصلی اسلام کی ایک تصویر دیکھتے ہیں اُس کے تمدن میں اُس کے فلسفے میں اُس کے شعر و ادب میں!

تصنیفات کی خصوصیّات ۔ شبلی کی تصنیفات کی خصوصیات کیا ہیں؟

مولوی محمد یحییٰ تنہا ایک جرمن مستشرق کی شبلی کے متعلق رائے نقل کر کے کہ اہل مغرب کے محققانہ اور عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی ہندوستانی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں گو یہ ایک گونہ اسلامی رنگ لئے ہوتی ہیں"۔ اور یہ قرار دے کر کہ مولوی چراغ علی سرسید اور مولانا حالی کی تصنیفات ان تمام خوبیوں سے بھری ہوئی ہیں"، شبلی کی تصنیفات و تالیفات پر یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ[۵۱]

> بلا شبہ مولانا شبلی کی تصانیف بلحاظ عالمانہ استدلال و انداز کسی مستند یوروپی تصنیف سے کم نہیں۔ آپ کی کتابوں کی سب سے بڑی خصوصیت مضبوط رائے اور منطقی استدلال ہے۔ اُن میں ایک قسم کی جدت بھی ہے اور طرز ادا میں دل آویزی اور عام فہمی کا خیال محفوظ رکھا گیا ہے۔ عالمانہ غور و خوض کی قوت، تجسس، درایت، علمی جانچ پرتال کی عادت اپنی طبیعت سے کسی نتیجہ پر پہنچنا، پیچیدہ مسئلہ کو تیرہ و تاریک جھاڑیوں اور خارستان سے نکال کر سمجھانا اور پھر تقسیم و تحلیل کرنا، بعد ازاں اُسے اپنے طور سے ترتیب دینا کہ وہ شئے اپنی اصلی حالت میں نظر آنے لگے یہ وہ باتیں ہیں جو مولانا شبلی کو درجۂ امتیاز بخشتی ہیں۔ اِسی کے ساتھ مولانائے مرحوم میں ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ قدیم و جدید میں ایسا پیوند لگاتے ہیں کہ مطلق اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ معاملہ فہمی اور دور اندیشی بھی آپ کے خصائص میں سے ہے۔
>
> آپ کی تصانیف کے مطالعہ سے دنیائے اسلام کی وسعت و عظمت اور خوبیوں اور ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ غیر اقوام پر ان کے پڑھنے سے اسلام کی حقیقی عظمت اور خوبیاں منکشف ہو جاتی ہیں۔ یہ کتابیں

---

[۵۱] سیر المصنفین جلد دوم ص ۴۲۵

سہل پسندی عام فہمی اور دلآویزی میں اپنی آپ نظیر ہیں +

آپ کا مذاقِ علمی مختلف پہلو رکھتا ہے۔ ایک طرف تو آپ سخت فلسفیانہ اور محققانہ پہلو لئے ہوئے ہیں دوسری طرف آپ بے حد نیچر پرست واقع ہوئے ہیں۔ آپ کی فارسی غزلیات سے جذباتِ لطیفہ دردِ عشق اور حسن و جمال کا پتہ چلتا ہے +

لیکن جہاں ہم مولانا ئے مرحوم کی مقبولِ انام تصنیفات کے دلدادہ ہیں۔ وہاں اُن خیالات و آرا کا اظہار بھی ضروری ہے جو ارباب نظر اُن کی کتابوں کے متعلق رکھتے ہیں +

چونکہ آپ کی کتابیں زیادہ تر سوانح عمریاں ہیں اور سوانح عمریاں بھی اکابر اسلام کی ہیں پس جن بزرگوں کے پاک ناموں کی ہمارے دلوں میں ضرورت سے زیادہ عزت و توقیر ہو اُن کی زندگی کے کارناموں کی نسبت ہمیں یہ کبھی خیال نہیں ہو سکتا کہ فی الواقع اُس زمانہ میں وہ انجام بھی دیئے گئے یا نہیں۔ مثلاً حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حالاتِ زندگی الفاروق میں پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کی شائستگی اور اس زمانہ کے تمدن میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ حالانکہ تیرہ سو سال کے عرصہ میں زمانہ نے ہر شعبۂ زندگی میں بے حد ترقی کی ہے۔ اور جو محکمے اور دفاتر موجودہ طرزِ حکومت کے لازمی عناصر ہیں کم و بیش وہ سب دربارِ خلافت کے ارکان پائے جاتے ہیں۔ جن کو درایت کبھی تسلیم نہیں کر سکتی "

پھر لکھتے ہیں کہ "شعر العجم پر بھی رسالہ اردو میں حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کے اعتراضات شائع ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم نے کتابِ مذکور لکھنے میں کافی تحقیق و تدقیق سے کام نہیں لیا" + پروفیسر شیرانی خصوصاً پروفیسر اقبال کے اکثر اعتراضات کے جوابات فروری ۲۴ء کے معارف میں سید سلیمان ندوی نے دیئے لیکن یہ تسلیم کیا کہ "ہمارے معترض پروفیسروں کی نگاہ کے سامنے ادبیاتِ ایران کا وہ پورا ذخیرہ موجود ہے جو یورپین مستشرقین نے اپنی تحقیق و کاوش سے پیدا کیا ہے اور جس پر علمائے مشرق کو عموماً دسترس حاصل نہیں" ساتھ ہی یہ بھی جتا دیا کہ بقولِ مہدی مرحوم "شعر العجم واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ حسن و عشق کا صحیفہ ہے"، اور مولانا شرر کی رائے (مطبوعہ دلگداز جون ۲۳ء) بھی نقل کر دی کہ "شبلی مرحوم کی شعر العجم پر ایک نہایت محققانہ ریویو نکل رہا ہے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتراضات تمام صحیح ہیں مگر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ خدا نے ان قابل ریویو نگاروں کو جتنا علم و فضل دیا ہے اتنا ہی ضبط و تحمل بھی عطا کرتا اور یہ کہ دنیا کی تحقیق صرف ایک مصنف کے قلم سے نہیں ہوتی تکمیل ہمیشہ ایک دوسرے کا نقد کرنے سے ہوتی ہے" +

علمی تحقیق ۔ یہ شعر العجم کا حال ہے لیکن شبلی نے بالعموم جس موضوع پر قلم اٹھایا اُس کے متعلق بہت سے ماخذوں کی

چھان بین کی۔ اور پھر بصراحت دیباچہ میں یا کتاب میں جا بجا اُن کے حوالے دیئے تاکہ ہر بیان کسی نہ کسی ثبوت پر مبنی نظر آئے۔ مثلاً سیرۃ النعمان کے دیباچے میں یہ لکھ کر کہ "امام ابو حنیفہ کو اسلام میں جو رتبہ حاصل ہے اُس کا اندازہ اِس سے ہوسکتا ہے کہ جس کثرت سے اُن کی سوانح عمریاں لکھی گئیں کسی کی نہیں لکھی گئیں" اور پھر ۲۵ ایسی سوانح عمریوں کا بہ تفصیل نام کتاب، نام مصنف و کیفیت ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ افسوس ہے کہ یہ کتابیں ہمارے ملک میں ناپید ہیں۔ انہوں نے اِن میں سے تین کتابوں کا مطالعہ کیا اور لکھا کہ "عُقُودُ الجُمان جو نہایت جامع اور مفصل کتاب ہے میری تالیف کا عام ماخذ ہے"۔ پھر تصریح کی کہ "امام ابو حنیفہ کے حالات میں تصنیف تو مجھ کو ایک ہی مل سکی لیکن رجال و تاریخ کی مستند کتابیں جن میں امام کا ذکر ہے اکثر میری نظر سے گذریں"۔ یہاں نو کتابوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "میری کتاب کا پہلا حصہ جس میں امام ابو حنیفہ کے عام حالات ہیں انہیں تصنیفات سے ماخوذ ہے لیکن دوسرا حصہ جس میں امام صاحب کی طرز اجتہاد و اصولِ استنباط سے بحث ہے، اُس کے لئے یہ تمام دفتر بے کار تھا کیونکہ قدیم زمانہ میں سوانح عمریوں کا یہ ڈھنگ ہی نہ تھا کہ حالاتِ زندگی کے ساتھ اس شخص کی تصنیفات یا مسائل سے بھی بحث کرتے"۔ پھر مثالیں دے کر اس بات کو واضح کیا ہے، پھر بتا کر کہ امام صاحب کی زندگی کے مختلف یعنی تاریخی اور محدثانہ اور مجتہدانہ حصّے ہیں صاف صاف بتا دیا ہے کہ "اس کتاب میں میں نے اُن مختلف حیثیتوں کا لحاظ رکھا ہے جو حالاتِ تاریخ سے متعلق ہیں اُن میں وہ شہادتیں کافی سمجھی ہیں جو عام مورخوں کے نزدیک مسلّم ہیں۔ جو واقعہ محدثانہ پہلو رکھتا ہے اس میں زیادہ تر تدقیق کی ہے اور تمام تر اُن اصول سے کام لیا ہے جو محدثین نے اخبار و روایت کے لئے قرار دیئے ہیں عام ناظرین کو شاید ان بحثوں میں مزا نہ آئے مگر ایسے ضروری حصے کو میں کیونکر چھوڑ سکتا تھا، عام تاریخی واقعات میں گو رواۃ حدیث کی طرح بال کی کھال نہیں نکالی ہے۔ تاہم کوئی ایسا واقعہ نہیں لکھا جس کی سند موجود نہ ہو۔ ساتھ ہی اس کا التزام کیا ہے کہ ایسی کتاب کا حوالہ نہ دیا جائے جو خود میری نظر سے نہ گذری ہو۔ کیونکہ نقل در نقل ہو کر اکثر وہ اپنی حالت پر قائم نہیں رہتیں۔ اِن قیود و اصول کے ساتھ بھی ممکن بلکہ ضروری ہے کہ مجھ سے مسامحات اور غلطیاں ہوئی ہوں۔ لیکن میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔ وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَہَا"۔

اسی طرح "الغزالی" کے دیباچے میں یہ لکھ کر کہ امام غزالی کی سوانح عمری میں کوئی مستقل کتاب تو غالباً لکھی نہیں گئی لیکن رجال اور تراجم کی کتابوں میں عموماً ان کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں (یہاں دو کتابوں کا خاص ذکر کیا ہے) پھر لکھا ہے کہ امام صاحب اس رتبے کے شخص تھے کہ ایک مدت تک اُن کی تصانیف کا یورپ میں چرچا رہا، بعض کتابیں خاص امام صاحب کی تصنیفات کے متعلق لکھی گئیں ان میں سے دو تصنیفیں میرے پاس موجود ہیں۔

---

۵۱۳ سیرۃ النعمان ص ۱۳۔

(یہاں اِن کتابوں کا ذکر ہے) پہلی کتاب جرمن زبان میں تھی اس لئے مَیں اُس سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ دوسری کتاب سے (یہ فرانسیسی میں ہے) مَیں نے فائدہ اٹھایا ہے اور جا بجا اس کے حوالے دیئے ہیں“ (چنانچہ دیکھو الغزالی امام صاحب کی تصنیفات اور یورپ۔ فٹ نوٹ صفحہ ۵۴)

شبلی نے اپنی اکثر کتابوں میں یہ التزام رکھا ہے کہ جا بجا صفحات کے نیچے فٹ نوٹ دے کر ماخذوں کے حوالے دیئے ہیں اور متعدد مقامات پر بعض جگہ اتنی کہ سہل انگار کتاب خوان گھبرا جائے اِن ماخذوں سے مفصل بحث کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک محقق یا نکتہ بین کے لئے شبلی کی تصنیفات کے یہی حصے بے انتہا دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ مثلاً ماخذوں کی چھان بین کے سلسلے میں جو ۲۲ صفحے الفاروق میں اور ۵۷ صفحے سیرۃ النبی کے شروع میں محققین کے سامنے پیش کئے گئے ہیں وہ علاوہ سودمند ہونے کے دلچسپ استدلالات اور دلکش بیانات سے لبریز ہیں۔ الفاروق میں پہلے قدما کی تصنیفات کا مفصل ذکر کیا ہے۔ طبقاتِ ابنِ سعد اور انساب الاشراف کا ذکر کرکے بتایا ہے کہ ان کے قلمی نسخے اُن کی نظر سے گزرے ہیں۔ پھر متاخرین (مثلاً ابن الاثیر۔ ابو الفدا سیوطی وغیرہ) کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ ”اِن لوگوں نے تاریخ کے ساتھ من حیث الفن کوئی احسان نہیں کیا قدما کی جو خصوصیات تھیں کھو دیں اور خود کوئی نئی بات پیدا نہیں کی“۔ پھر ابنِ خلدون اور اُس کے شاگرد علامۂ مقریزی کو اس عام نکتہ چینی سے مستثنےٰ قرار دیا ہے۔ اور بتا دیا ہے کہ ”بہرحال الفاروق کی تالیف کے لئے جو سرمایہ کام آسکتا تھا وہ یہی قدما کی تصنیفات تھیں“۔ اس کے بعد تاریخ اور فنِ تاریخ پر ایک زبردست مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔ اس کے ضمن میں تاریخ کی دو تعریفیں نقل کرکے لکھا ہے کہ[1]

> ”ان تعریفات کی بنا پر تاریخ کے لئے دو باتیں لازمی ہیں۔ ایک یہ کہ جس عہد کا حال لکھا جائے اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات قلمبند کئے جائیں یعنی تمدن، معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب، ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔ قدیم تاریخوں میں یہ دونوں چیزیں مفقود ہیں۔ رعایا کے اخلاق و عادات اور تمدن و معاشرت کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں آتا۔ فرماں روائے وقت کے حالات ہوتے ہیں لیکن اِن میں بھی فتوحات اور خانہ جنگیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ نقص اسلامی تاریخوں تک محدود نہیں بلکہ کل ایشیائی تاریخوں کا یہی انداز تھا اور ایسا ہونا مقتضائے اسباب تھا“۔

واقعات کی صحت کے معیار کے متعلق لکھتے ہیں کہ واقعات کے جانچنے کے صرف دو طریقے ہیں روایت و درایت۔ پھر ان کی تعریف کرکے لکھا ہے کہ اس امر پر مسلمان بے شبہ فخر کرسکتے ہیں کہ روایت کے فن کے ساتھ انہوں نے جس

---

[1] الفاروق جلد اول ص ۱۱

قدر اعتنا کیا کسی قوم نے نہیں کیا تھا، انہوں نے ہر قسم کی روایتوں میں مسلسل سند کی جستجو کی اور راویوں کے حالات اس تفحص اور تلاش سے بہم پہنچائے کہ اُس کو ایک مستقل فن بنا دیا جو فنِ رجال کے نام سے مشہور ہے۔ یہ توجہ اور اہتمام اگرچہ اصل میں احادیثِ نبوی کے لئے شروع ہوا تھا لیکن فنِ تاریخ بھی اس سے محروم نہ رہا + طبری فتوح البلدان طبقاتِ ابنِ سعد وغیرہ میں تمام واقعات بسندِ متصل مذکور ہیں۔ یورپ نے فنِ تاریخ کو کمال کے درجے پر پہنچا دیا ہے لیکن اِس خاص امر میں وہ مسلمان مورخوں سے بہت پیچھے ہیں"۔ اس سلسلے میں سیرۃ النبی میں لکھتے ہیں کہ "اس سے زیادہ کیا عجیب بات ہو سکتی ہے کہ آنحضرت کے افعال اور اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپ کے دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلمبند کئے گئے اور اُس زمانے میں کئے گئے جب تصنیف و تالیف کا آغاز تھا۔ کیا دنیا میں کسی شخص کے رفقا میں سے اتنے لوگوں کے نام اور حالات درج تحریر ہو سکتے ہیں" قدما نے یہ ذخیرہ کس طرح مہیا کیا۔ لکھنے کے فن نے کیونکر رواج پایا اس کے متعلق بعض دلچسپ واقعات درج کئے گئے ہیں + فنِ روایت کے سلسلے میں جہاں اسماء الرجال (بیوگرافی) کا ذکر ہے وہاں لکھا ہے کہ ان تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال (بیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر کے حسنِ ظن کا اعتبار کیا جائے تو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے"+ ملاحظہ ہو کہ شبلی نے محض مشہور جرمن عربی دان کا قول نقل نہیں کر دیا بلکہ اُسے بیان کر کے گویا اک رائے پر صاد کرنے سے صاف طور پر احتراز کیا ہے جو اُن کے نزدیک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی + درایت کے اصول کے تحت میں روایتوں کے ناقابلِ اعتبار ہونے کی جو مثالیں نقل کی ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ مثلاً یہ حدیث کہ تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں سبزہ زار آبِ رواں اور خوبصورت چہرے کا دیکھنا یا کہ فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا یا یہ کہ مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی کو پسند کرتا ہے یا کہ دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہے وغیرہ وغیرہ + فنِ سیرۃ کے تبصرہ میں سیرۃ ابن اسحاق واقدی ابن سعد اور طبری کا ذکر کر کے لکھتے ہیں" اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرۃ کا ذخیرہ کتبِ حدیث کا ہم پلّہ نہیں البتہ اِن میں سے تحقیق و تنقید کے معیار پر جو اتر جائے وہ حجت اور استناد کے قابل ہے"+ اس معیار کے اندازہ میں جن اصولوں کو قائم کیا ہے اُن میں دو ایک یہ ہیں "یہ لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ واقعہ کی نوعیت کے بدلنے سے شہادت اور روایت کی حیثیت کہاں تک بدل جاتی ہے"۔ "سب سے اہم اور سب سے زیادہ قابلِ بحث یہ بات ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے اُس میں کس قدر حصہ اصل واقعہ ہے اور کس قدر راوی کا قیاس ہے"+ آگے چل کر لکھتے ہیں "اکابر صحابہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو روایت کو باوجود راوی کے ثقہ ہونے کے اِس بنا پر تسلیم نہیں کرتے تھے

کہ وہ دلائلِ عقلی یا نقلی کے خلاف ہے "

اخیر میں یورپین تصنیفات کے نقائص کی وجوہ بیان کرکے اپنے "اصولِ تصنیف و ترتیب" کے تحت میں لکھتے ہیں[۵۱]

ہم نے اس کتاب میں جو اصول اختیار کئے ہیں اب اُن کے بتلانے کا وقت آگیا ہے۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآنِ مجید میں مذکور ہے اُس کو سب پر مقدم رکھا ہے۔ یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآنِ مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ لیکن لوگوں نے آیاتِ قرآنی پر اچھی طرح نظر نہیں ڈالی اس لئے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے (۲) قرآنِ مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے۔ احادیثِ صحیحہ کے سامنے سیرت کی روایتیں نظر انداز کردی ہیں۔ جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں اُن کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، اربابِ سیر کو ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ واقعات کو کتبِ حدیث میں اُن موقعوں پر ڈھونڈتے ہیں جہاں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے اُن کو درج ہونا چاہئے۔ اور جب اُن کو ان موقعوں پر کوئی روایت نہیں ملتی تو وہ کم درجہ کی روایتوں کو لے لیتے ہیں لیکن کتبِ حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آجاتے ہیں۔ اس لئے اگر عام استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں صحاحِ ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں۔ ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈ کر مہیا کئے جو اہلِ سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے (۳) روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روائتیں کافی خیال کی ہیں لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں اُن کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے اور تا امکان کد و کاوش کی ہے اس خاص ضرورت کے لئے ہم نے پہلا کام یہ کیا ہے کہ ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے تمام رواۃ کے نام الگ انتخاب کر لئے جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے اُن کی جرح و تعدیل کا نقشہ تیار کیا تاکہ جس سلسلۂ روایت کی تحقیق مقصود ہو بہ آسانی ہو جائے۔ (۴) جن فروگزاشتوں کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے جہاں تک ممکن تھا ان کی اصلاح اور تلافی کی ہے۔

۵۱۔ سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۷۲۔

شبلی کو علمی تحقیق کا اس قدر شوق تھا کہ روم و مصر و شام کا سفر اختیار کرنے کی بڑی وجہ اسلامی مذہبی اور خصوصاً تاریخی کتب کی تلاش تھی۔ سفرنامہ میں جہاں قسطنطنیہ کے کتب خانوں کا ذکر ہے وہاں اُن کی پانچ خصوصیتیں گنوائی ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ "فنِ تاریخ و ادب میں بعض ایسی تصنیفات دیکھیں جن میں وہ جدّت ہے جس کو میں مدت سے تلاش کرتا تھا اور یورپ کی تصنیفاتِ حال کے سوا اس قسم کی طرزِ تصنیف کا کہیں پتہ نہ لگتا تھا" اور ایک یہ کہ "مشہور حکما اور ائمۂ فن کی کتابیں جس کثرت سے یہاں موجود ہیں اور کہیں نہیں مل سکتیں۔ امام غزالی بوعلی سینا، فخر رازی، فارابی کی وہ کمیاب تصنیفات جن کے نام صرف ابنِ خلکان وغیرہ کے ذریعہ سے معلوم ہیں اکثر یہاں موجود ہیں"۔ اس تحقیق کے ساتھ عقل و درایت کے اصولوں پر برابر عمل ہے چنانچہ سوانح مولانا روم میں مولانا سے شمس تبریزی کی ملاقات کے ذکر میں جو حکایتیں نقل کی ہیں مثلاً یہ کہ جب شمس تبریزی نے مولانا کی کتابوں کی طرف اشارہ کرکے پوچھا کہ یہ کیا ہے اور انہوں نے کہا کہ یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے اور یہ کہنا تھا کہ دفعتہً کتابوں میں آگ لگ گئی وغیرہ وغیرہ ان حکایتوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ اگرچہ ان میں سے بعض نہایت مستند کتابوں میں ہیں لیکن ایک بھی صحیح نہیں نہ صرف اس وجہ سے کہ خارج از قیاس ہیں بلکہ اس لئے کہ جیسا کہ آگے آتا ہے صحیح روایت کے خلاف ہیں۔ اسی طرح ہیجو تغال کی فوج کے آگے مولانا کے مصلا بچھا کر ڈٹ جانے اور باوجود تیروں وغیرہ کی بوچھاڑ کے زخمی نہ ہونے کو محض خوش اعتقادی کے حاشیے کہتے ہیں۔

مضبوطیٔ رائے۔ اُن کی مضبوطیٔ رائے اور استدلال کا اندازہ غزوۂ بدر پر اُن کی محققانہ نظر سے ہوتا ہے جہاں سوال یہ درپیش ہے کہ غزوۂ بدر کا مقصد کاروانِ تجارت کو لوٹنا تھا یا قریش کے حملے کا دفاع۔ لکھتے ہیں کہ اس بات کا مجھ کو خوف نہیں کہ اس فیصلہ میں عام مورخین اور اربابِ سیر میرے حریفِ مقابل ہیں۔ نہایت جلد نظر آجائے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پا سکتا ہے۔ پھر تمام واقعہ کو بیان کرکے یوں استدلال کرتے ہیں کہ اس سے پہلے آنحضرت نے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لئے جس قدر سرایا بھیجے اُن میں کبھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا۔ اس بنا پر اگر اس دفعہ بھی مدینہ سے نکلنے کے وقت صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو انصار ساتھ نہ ہوتے۔ علاوہ بریں چونکہ مدینے سے مکّے تک کے قبائل قریش کے زیرِ اثر تھے اور مدینے سے شام تک کے حدود تک قریش کا اثر نہ تھا اس بنا پر اگر قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ بالکل خلافِ قیاس ہے کہ کاروانِ تجارت شام سے آ رہا ہے اور مسلمان بجائے اس کے کہ شام کی طرف بڑھیں پانچ منزل مکّے کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ پھر واقعات بالترتیب درج کرکے لڑائی کا اصلی سبب یہ بتایا ہے کہ ایک سریہ میں قریش کے ایک حلیف کا قتل وقوع میں آیا تھا جس سے

یہ سارا سلسلۂ جنگ چھڑ گیا۔ الفاروق میں آنحضرت کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعات کے سلسلے میں جہاں حضرت ابو بکر و عمر کے چلن کو ملکی مفاد کے اعتبار سے سراہا ہے وہاں حضرت عمر کی تندی اور تیز مزاجی کا ذکر بھی کیا ہے۔ اسی کتاب کے حصۂ دوم میں فتوحات پر ایک اجمالی نگاہ ڈالتے ہوئے جہاں یورپین مورخین کی رائے کے مطابق اسلامی فتوحات کے بیان کردہ اسباب کو مسترد کیا ہے وہاں بعد میں فتوحات کے اصلی سبب کو کس قدر اصابت رائے سے بیان کیا ہے کہ ہمارے نزدیک اس سوال کا اصلی جواب صرف اس قدر ہے کہ مسلمانوں میں اُس وقت بانیٔ اسلام کی بدولت جو جوش عزم استقلال ہمت بلند حوصلگی دلیری پیدا ہوگئی تھی اور جس کو حضرت عمر نے اور زیادہ قوی اور تیز کر دیا تھا روم و فارس کی سلطنتیں عین عروج کے زمانے میں بھی اُس کی ٹکر نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ پھر تین اور اسباب کا بھی ذکر کیا ہے۔

صدق گوئی۔ شبلی کو اعترافِ صداقت سے کبھی عمداً گریز نہیں۔ غزوات پر دوبارہ نظر ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ "اسباب ایسے جمع ہیں کہ اس قسم کی غلطیوں پر نہ صرف دوستوں کو بلکہ دشمنوں کو بھی معذور رکھ سکتے ہیں۔" امام غزالی کی شہرۂ آفاق تصنیف احیاء العلوم کا ابن مسکویہ کی کتاب تہذیب الاخلاق سے موازنہ کرتے ہوئے اُن کی عبارتیں (جو لفظاً و معناً مطابق ہیں) بالمقابل نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "ناظرین کو اختیار ہے کہ اس کو توارد قرار دیں یا نقل یا اقتباس۔" الغزالی کے اخیر میں امام غزالی کی تصنیفات پر جو بعض نہایت سخت اعتراضات ہیں اُن کو نہایت نقل کیا ہے پھر لکھا ہے کہ "آخر میں اس بات کا اعتراف بھی کرنا ضرور ہے کہ امام صاحب کی بعض تصنیفات میں واقعی بعض باتیں مواخذہ کے قابل ہیں۔ مثلاً احیاء العلوم میں احادیث کے نقل کرنے میں نہایت بے احتیاطی کی ہے۔ بزرگانِ سلف کے متعلق جو واقعات لکھے ہیں اکثر دُور از کار اور بعید از عقل ہیں۔" مصنف کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ "بہر حال امام صاحب امام تھے پیغمبر نہ تھے۔" مامون کے ملکی کارناموں اور علمی تذکروں کو تجزیہ بیان کرنے کے بعد سیرت نگار نے اُس کی عشرتوں اور عیاشیوں کا بھی صاف صاف ذکر کر دیا ہے کہ ان کا اُسے چسکا پڑ گیا تھا۔ سوانح مولانا روم میں یہ لکھ کر کہ "تمام اہلِ تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ شیخ سعدی عراقی اور مولانا روم ہیں" اعتراف کیا ہے کہ "اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ غزل کو ترقی دینے والوں کی فہرست سے مولانا کا نام خارج نہیں کیا جا سکتا لیکن انصاف یہ ہے کہ غزل گوئی کی حیثیت سے مولانا کا سعدی اور عراقی کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔" ساتویں صدی ہجری کے فحش و بدتہذیبی کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ شیخ سعدی اس زمانے کے اخلاقی ریفارمر ہیں لیکن گلستان کے باب پنجم میں خود ایسی حکایتیں لکھی ہیں جو آج کسی مہذب آدمی کی زبان سے ادا نہیں ہو سکتیں۔ مولانا روم کی مثنوی "ہست قرآں در زبانِ پہلوی"

لیکن کنیزک اور خاتون کا قصّہ جعفر زٹلی کے نامۂ اعمال میں داخل کرنے کی چیز ہے"۔ قسطنطنیہ پر یورپی اثر کا ذکر کر کے لکھتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ صفائی اور خوش سلیقگی آج کل یورپ کا خمیر بن گیا ہے" (سفرنامہ) + ابن رشد کے حالات میں لکھا ہے کہ "یورپ کی یہ فیاضی دلی رشک کے قابل ہے کہ ایک طرف تو مذہبی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا لیکن دوسری طرف اُس نے بے تکلف مسلمانوں کے خوانِ کرم سے زلّہ ربائی شروع کر دی" (موازنۂ انیس و دبیر میں ہے کہ کثرتِ صنائع و بدائع شاعری اور انشا پردازی کا دیباچۂ زوال ہیں" لکھتے ہیں کہ میرے ایک معزز دوست نے خود میر انیس سے پوچھا کہ آپ لفظی رعایتوں اور صنائع و بدائع کو پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں لیکن آخر لکھنؤ میں رہنا ہے تاہم میر انیس نے یہ کیا کہ جو صنعتیں محض لغو تھیں وہ نہایت کم برتیں"۔ اس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دبیر نے انیس کے مرثیوں کا سرقہ کیا لیکن جب ثابت نہیں ہو سکتا تو ضروری معلومات ہاتھ نہ آ سکنے پر صاف کہہ دیا ہے کہ افسوس ہے کہ باوجود بہت سی جد و جہد کے اس بارہ میں مجھ کو کچھ کامیابی نہیں ہوئی"+

آزادگی۔ شبلی کی آزادگی اور آزاد منشی باوجود اُن کے زہد و تقویٰ کے جا بجا اُن کی تصنیفات میں مترشح ہے+ "الکلام" میں لکھتے ہیں بے شبہ اگر مذہب اسی چیز (یعنی علم اور حقیقت کے خلاف ہونے) کا نام ہے تو وہ سائنس کے مقابلہ میں کسی طرح نہیں ٹھہر سکتا لیکن اسلام نے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ انتم اعلم بامور دنیاکم (یعنی تم لوگ دنیا کی باتیں خود خوب جانتے ہو)+ " انبیا کی تعلیم و ہدایت کا طریقہ بتاتے ہوئے (ص ۱۰۵) شاہ ولی اللہ صاحب کے ضروری الذکر اصولوں میں پہلا یہ بیان کرتے ہیں کہ "اُن کی (یعنی انبیا کی) طرزِ تعلیم اور طریقۂ ہدایت میں عوام کا پہلو زیادہ ملحوظ ہوتا ہے البتہ ہر جگہ ضمن میں ایسے الفاظ موجود ہوتے ہیں جن سے اصل حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور جس کے مخاطب خواص ہوتے ہیں"+ پانچواں اصول یہ ہے کہ شریعت کا ایک حصہ خاص خاص قوموں یا ملکوں کے مصالح اور فوائد پر مبنی ہوتا ہے + آخری اصول کے ضمن میں یہ منقول ہے کہ "اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی اور طریقہ نہیں کہ شعار، تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قسم کی عادات کا لحاظ کیا جائے جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر اُن احکام کے متعلق چنداں سخت گیری بھی نہ کی جائے"+ اسلام کو تمدن و ترقی کا موید ثابت کرنے کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ [۱۶]

"یورپ کے تمدن کے مہمات اصول حسبِ ذیل عنوان میں محدود کئے جا سکتے ہیں اور دنیا میں جب کبھی کسی قوم نے تمدن میں ترقی کی ہوگی یا آئندہ کرے گی تو انہی اصول پر کی ہوگی اور کرے گی۔

---

[۱۶] الکلام جلد دوئم ص ۲۲۴

(۱) انسان کی تمام ترقیوں کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ وہ خیال کرے کہ وہ اصلی ترین مخلوقات ہے اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے وہ اِسی لئے ہے کہ انسان اِس سے تمتع اٹھائے +

(۲) انسان کی تمام ترقیوں کی بنیاد یہ ہے کہ اُس کو یقین ہو کہ اس کے خیر و شر ترقی اور تنزل عروج اور زوال کا مدار تمام تر اُس کی سعی اور کوشش پر ہے اور دنیا اور دین کی تمام کامیابیاں محض اُس کی کوششوں پر موقوف ہیں +

(۳) تمدن کی ترقی کا سب سے بڑا اصول مساوات کا اصول ہے یعنی یہ کہ تمام انسانوں کے حقوق مساوی ہیں۔

(۴) تمدن کی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ اور ترقی تمدن کی بہت بڑی علامت مذہبی نفرت اور مذہبی جبر کا دور کرنا ہے +

(۵) ترقیِ تمدن کے بڑے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق برابر قائم کئے جائیں +

(۶) کسی قوم کی ترقی کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ اُس کے ہر فرد کو من حیث القوم سلف آنر یعنی اپنی آپ عزت کا خیال دلایا جائے +

(۷) ترقی کا مقدم ترین اصول علم ہے +

(۸) ترقی کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ نظامِ حکومت جمہوریت کی بنا پر قائم کیا جائے +

(۹) ترقی کا بڑا اصول یہ ہے کہ تقسیم عمل کے اصول پر کام کیا جائے یعنی ہر فرقہ ایک خاص کام میں مشغول ہو تاکہ اس کام کو بوجہ خصوصیت کے نہایت اعلیٰ درجہ تک ترقی دے سکے۔

(۱۰) ہر زمانہ میں ایک گروہ ایسا ہوتا آیا ہے جس کی یہ رائے ہے کہ انسانوں کے افراد میں جو اختلاف مراتب ہے یہ مٹا دیا جائے +

(۱۱) ترقی کا بڑا اصول یہ ہے کہ علمی ترقی کی کوئی انتہا نہ قرار دی جائے یعنی انسان ترقی کی کسی حد تک پہنچ کر قانع نہ ہو اور یہ خیال رکھے کہ ابھی ترقی کے اَور منازل طے کرنے باقی ہیں +

ہر اصول کو بیان کر کے قرآنِ مجید کی آیتوں سے صاف صاف ثابت کر دیا ہے کہ اسلام عین اِن اصولوں کے مطابق ہے بلکہ ان میں سے اکثر کا بانی مبانی اسلام ہی ہے + علامہ ابن حزم کی مشہور کتاب الملل والنحل پر بحث کر کے اخیر میں کہتے ہیں کہ اس کتاب میں بعض خیالات بالکل جدید ہیں مثلاً ابن حزم کا دعوےٰ ہے کہ عورتیں پیغمبر ہو سکتی ہیں، عام

خیال ہے کہ عورتوں کا درجہ مردوں سے کم ہے لیکن علامہ ابنِ حزم اس کے خلاف ہیں۔ پھر لکھا ہے علامہ موصوف کا یہ خیال صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے زمانہ کے تعلیم یافتہ حضرات کے ہم خیال پہلے بھی موجود تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ شبلی ابن حزم کے ہم خیال ہیں لیکن احتیاطاً خاموش ہیں!

شبلی کانگرس کے جانب دار اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ جہانگیر اور تزک جہانگیری میں لکھتے ہیں "بے شبہ تیموریوں نے ہندوؤں کے ملک کو نہیں بلکہ دل کو فتح کر لیا تھا اور ہندوؤں کے اخلاص و محبت نے فاتح کو مفتوح بنا لیا تھا ۔

بہ لوحِ مشہدِ پروانہ ایں رقم دیدم
کہ آتشے کہ مرا سوخت خویش را ہم سوخت"

قومی اصلاح۔ شبلی اگرچہ بار بار بصراحت نہیں کہتے لیکن قوم کی اصلاح اور تربیتِ اخلاق ہر وقت اُن کے پیشِ نظر ہے۔ امام غزالی نے تربیتِ اطفال کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس کو غایت درجہ سبق آموز پند نامہ نیز اُس ہدایت نامہ کو جو امام ابو حنیفہ نے قاضی ابو یوسف کے نام[۱۸] لکھا زیادہ تر اس غرض سے بتفصیل درج کرتے ہیں کہ اس دور کے کج روش مسلمان اُن سے مستفید ہو سکیں اور دیکھیں کہ کیا کیا مہمات اصول تھے جو اُن کے بزرگوں نے قائم کئے تھے۔ لیکن جن پر اُن کا اک عرصے سے عمل نہ رہا۔ الغزالی میں لکھتے ہیں[۱۸] "صدقات و وجوہِ خیر کی نسبت امام صاحب نے جو لکھا ہمارے زمانے کے بالکل حسبِ حال ہے۔ تمام ممالکِ اسلامیہ میں آج مسلمانوں کے تنزل کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ لاکھوں کروڑوں روپیہ بے جا وجوہِ خیر پر صرف کر دیا جاتا ہے۔ شہر میں سینکڑوں مسجدوں کے موجود ہوتے اور نئی مسجدیں بنتی جاتی ہیں اور جو روپیہ اسلام کے نہایت ضروری کاموں میں خرچ ہونا چاہئے تھا وہ اس میں صرف کر دیا جاتا ہے"۔ پھر لکھا ہے[۱۹] "امام صاحب نے جو کچھ لکھا ہے ہمارے زمانے سے اُس کو مطابق کرو تو گمان ہوگا کہ اسی زمانے کو دیکھ کر لکھا ہے۔ تمام ہندوستان میں چھوٹے چھوٹے اختلافاتِ مذہبی پر نزاعیں قائم ہیں"۔ اخلاق کی اصلاح کے تحت میں لکھا ہے "اس بنا پر امام غزالی کے نزدیک تمام قوم کی بد اخلاقی کے ذمہ دار علماء ہی تھے"۔ الغزالی ۱۹۰۲ء کی تصنیف ہے۔ ۱۸۹۵ء میں شبلی نے جو خطبہ ندوۃ العلما کے پہلے اجلاس میں دیا اُس میں یہی رونا ہے۔ شبلی نے اپنی تصنیفات میں اُنہیں شخصیتوں کی طرف رجوع کیا ہے جن کے خیالات اُن کے خیالات سے مطابقت رکھتے تھے۔ جب اُن کو اپنے زمانے کے علما میں ہم خیال نہ ملے تو انہوں نے گذشتہ نسلوں میں ایسے خلفا و ائمہ کو ڈھونڈا جو اُن کے احساسات کی

---

۱۷ سیرۃ النعمان ص ۵۸ ۱۸ الغزالی ص ۱۹ ۱۹ ص ۹۴ +

تائید کریں +

اسلامی تاثرات: شبلی سراپا اسلامی تاثرات میں ڈوبے ہوئے ہیں + مصر میں جاکر جامع ازہر کی بُری حالت کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں کہ مجھ کو اپنے سفر میں جس قدر جامع ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہُوا کسی چیز کا نہیں ہُوا۔ تربیت و معاشرت کا جو طریقہ ہے اُس سے حوصلہ مندی بلند نظری جوش ہمت غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہوجاتا ہے[۲۰] + لمامون کی جامع مسجد کے قریب ایک مکتب میں گئے[۲۱]۔ مولوی صاحب کے اشارے سے ایک لڑکے نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں۔ میرے دل پر عجیب اثر ہُوا۔ خیال آتا تھا کہ کہاں وہ حجاز کا ریگستان! کہاں بحیرۂ روم کے دور دراز جزیرے۔ اس مقدس کلام (قرآن مجید) میں کیا تاثیر تھی کہ مشرق سے مغرب تک برقی قوت بن کر دوڑ گئی۔ اور آج تک باقی ہے۔ وہ معصوم لڑکا خوش لحن بھی تھا اور اصولِ قرات کے مطابق پڑھتا تھا۔ اتفاق سے آیتیں بھی مؤثر تھیں اِن باتوں نے مجھ کو بالکل مدہوش کردیا اور دیر تک ایک عجیب حالت طاری رہی +

احیاء العلوم کے ذکر میں لکھتے ہیں[۲۲]:-

احیاء العلوم میں یہ عام خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے۔ ہر فقرہ نشتر کی طرح دل میں چبھ جاتا ہے۔ ہر بات جادو کی طرح تاثیر کرتی ہے۔ ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زمانے میں لکھی گئی خود امام صاحب تاثیر کے نشہ میں سرشار تھے۔ بغداد میں اُن کو تحقیقِ حق کا شوق پیدا ہُوا۔ تمام مذاہب کو چھانا۔ کسی سے تسلّی نہیں ہوئی۔ آخر تصوف کی طرف رخ کیا۔ لیکن وہ قال کی چیز نہ تھی بلکہ سراپا حال کا کام تھا۔ اور اُس کا پہلا زینہ اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس تھا۔ امام صاحب کے مشاغل اس کیفیت کے بالکل سدِّ راہ تھے۔ قبولیتِ عام۔ ناموری۔ جاہ و منزلت مناظرات و مجادلات اور تزکیۂ نفس ع شَتَّانَ بَیْنَهُمَا۔ ع ایں رہ کہ مے روی تو بمنزل نمے رود + آخر سب چھوڑ چھاڑ ایک کملی پہن بغداد سے نکلے اور دشت پیمائی شروع کی۔ سخت مجاہدات اور ریاضات کے بعد بزمِ راز تک رسائی پائی۔ یہاں پہنچ کر ممکن تھا کہ اپنی حالت میں مست ہوکر تمام عالم سے بے خبر بن جاتے۔ لیکن ع بیاد آر حریفانِ بادہ پیمارا کے لحاظ سے افادۂ عام پر نظر پڑی۔ دیکھا تو آوے کا آوا بگڑا ہُوا ہے۔ امیر و غریب۔ عام و خاص۔ عالم و جاہل۔ رند و زاہد سب کے اخلاق تباہ ہوچکے ہیں۔ اور ہوتے جاتے

---

[۲۰] سفر نامہ ص ۱۹۳ [۲۱] ص ۱۷ [۲۲] الغزالی ص ۶۲

ہیں ۔علما جو دلیلِ راہ بن سکتے تھے طلبِ جاہ میں مصروف ہیں یہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور اسی حالت میں یہ کتاب لکھی ۔ دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مرض نے تمام عالم کو چھا لیا ہے اور سعادتِ اخروی کی راہیں بند ہوگئی ہیں ۔علماء جو دلیلِ راہ تھے زمانہ اُن سے خالی ہوتا جاتا ہے جو رہ گئے ہیں وہ نام کے عالم ہیں جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور جنہوں نے تمام عالم کو یقین دلا یا ہے کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے مناظرہ (جو فخر اور نمود کا ذریعہ ہے) وعظ و پند (جس میں عوام کی دلفریبی کے لئے رنگین اور مسجع فقرے استعمال کئے جاتے ہیں) فتویٰ دینا جو مقدمات کے فیصل کرنے کا ذریعہ ہے " باقی آخرت کا علم تو وہ تمام عالم سے ناپید ہوگیا ہے اور لوگ اُس کو بھول بھلا چکے " یہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور مہرِ سکوت ٹوٹ گئی +

حضرتِ عمر کی سیرت میں شبلی کے قلم سے بعض ایسی ایسی سادہ لیکن موثر عبارتیں نکلی ہیں کہ ظاہر ہے کہ جس رنگ میں قارئین کو رنگنا چاہتے ہیں وہ پہلے کس طرح بے تکلفی سے خود اُن کے دل پر چڑھ گیا ہوگا ۔ لکھتے ہیں[۲۳]

"اُن کے اخلاق و عادات کے بیان میں مورخوں نے تواضع اور سادگی کا مستقل عنوان قائم کیا ہے اور درحقیقت اُن کی عظمت و شان کے تاج پر سادگی کا طرہ نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے ۔اُن کی زندگی کی تصویر کا ایک رخ یہ ہے کہ روم و شام پر فوجیں بھیج رہے ہیں ۔قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے معاملہ پیش ہے ، خالد و امیر معاویہ سے بازپرس ہے ، سعدِ وقاص ، ابوموسیٰ اشعری ، عمرو ابن العاص کے نام احکام لکھے جا رہے ہیں ۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ بدن پر بارہ پیوند کا کرتا ہے ۔ سر پر پھٹا سا عمامہ ہے پاؤں میں پھٹی جوتیاں ہیں ۔ پھر اس حالت میں یا تو کاندھے پر مشک لئے جا رہے ہیں کہ بیوہ عورتوں کے گھر پانی بھرنا ہے یا مسجد کے گوشے میں فرشِ خاک پر لیٹے ہیں اس لئے کہ کام کرتے کرتے تھک گئے ہیں اور نیند کی جھپکی سی آگئی ہے + بارہا مکہ سے مدینہ تک سفر کیا لیکن خیمہ یا شامیانہ کبھی ساتھ نہیں رہا ۔جہاں ٹھیرے کسی درخت پر چادر ڈال دی اور اُسی کے سایہ میں پڑ رہے ۔ابن سعد کی روایت ہے کہ اُن کا روزانہ خانگی خرچ دو درہم تھا جس کے کم و بیش ۱۰ ہوتے ہیں ۔ ایک دفعہ احنف بن قیس رؤسائے عرب کے ساتھ اُن کے ملنے کو گئے ۔ دیکھا تو دامن چڑھائے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں ۔ احنف کو دیکھ کر کہا آؤ تم بھی میرا ساتھ دو ۔ بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا ہے ۔ تم جانتے ہو ایک اونٹ میں کتنے غریبوں کا حق شامل ہے ۔ایک شخص نے کہا امیر المومنین ! آپ کیوں تکلیف اٹھاتے

---

[۲۳] الفاروق جلد دوم ص ۲۹۱ ۔

ہیں، کسی غلام کو حکم دیجئے وہ ڈھونڈ لائے گا۔ فرمایا۔ اَیُّ عَبْدٍ اَعْبَدُ مِنِّی" یعنی مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہو سکتا ہے؟"

سادگی کے ایک اَور عنوان سے لکھا ہے[۲۴]:

"نہایت بے تکلفی اور سادگی سے رہتے تھے۔ کپڑوں میں اکثر پیوند ہوتا تھا۔ ایک دفعہ دیر تک گھر میں رہے۔ باہر آئے تو لوگ انتظار کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ پہننے کو کپڑے نہ تھے۔ اس لئے انہی کپڑوں کو دھو کر سوکھنے کو ڈال دیا تھا۔ خشک ہو گئے تو وہی پہن کر باہر نکلے"

ادبیات :- تاریخ و سیرت، فلسفہ سے اب ہم خالص ادب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ موازنۂ انیس و دبیر میں شبلی نے شاعری کا محض اجمالاً ذکر کیا ہے کہ شاعری کے دو جزو ہیں مادہ وصورت یعنی کیا کہنا چاہئے اور کیونکر کہنا چاہئے[۲۵]۔

"انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے، سننے یا کسی حالت یا واقعہ کے پیش آنے سے جوش و مسرت عشق و محبت، درد و رنج، فخر و ناز، حیرت و استعجاب، طیش و غضب وغیرہ وغیرہ کی جو حالت پیدا ہوتی ہے اُس کو جذبات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان جذبات کا ادا کرنا شاعری کا اصلی ہیولیٰ ہے۔ ان کے سوا عالمِ قدرت کے مناظر مثلاً گرمی و سردی، صبح و شام، بہار و خزاں، باغ و بہار، دشت و صحرا، کوہ و بیابان کی تصویر کھینچنا یا عام واقعات اور حالات کا بیان کرنا بھی اِسی میں داخل ہے۔ لیکن یہ شرط ہے کہ جو کچھ کہا جائے اِس انداز سے کہا جائے کہ جو اثر شاعر کے دل میں ہے وہی سننے والوں پر بھی چھا جائے۔ یہ شاعری کا دوسرا جزو یعنی اُس کی صورت ہے اور انہی دونوں جزوں کے مجموعہ کا نام شاعری ہے۔ باقی خیال بندی، مضمون آفرینی، دقّت پسندی، مبالغہ، صنائع و بدائع، شاعری کی حقیقت میں داخل نہیں۔ اگرچہ بعض جگہ یہ چیزیں نقش و نگار اور زیب و زینت کا کام دیتی ہیں۔"

شعر العجم جلد چہارم کے شروع میں شاعری پر سو صفحہ کا ایک ایسا مبسوط اور جامع تبصرہ ہے کہ اردو زبان اُس کی دقّتِ نظر سلاستِ زبان اور پیرایۂ بیان پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ اگر کسی کو سمجھنا ہو کہ شاعری کیا ہے تو وہ اس تبصرہ کو اپنے جی میں جگہ دے لے۔ پہلے شاعری کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاعری چونکہ وجدانی اور ذوقی چیز ہے اس لئے اُس کی جامع و مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔ اِس بنا پر مختلف طریقوں سے اُس کی حقیقت کا سمجھانا زیادہ

---

[۲۴] الفاروق جلد دوم ص ۲۹۸۔ [۲۵] موازنۂ انیس و دبیر ص ۴۔

مفید ہوگا کہ اِن سب کے مجموعہ سے شاعری کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہو جائے + پھر احساس اور ادراک کو تمیز کر کے بتایا ہے کہ احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ منطقی پیرایہ میں شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں" + پھر شاعری کو دوسری چیزوں سے الگ کر کے دکھایا ہے کہ" جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں بہت سی ہیں۔ مثلاً موسیقی، مصوری، صنعت گری وغیرہ لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے"+ سائنس اور شاعری میں یوں فرق بتایا ہے کہ"شعر کا نمایاں وصف جذباتِ انسانی کا برانگیختہ کرنا ہے" + "شاعری کا تخاطب جذبات سے ہے اور سائنس کا یقین سے۔ سائنس استدلال کرتا ہے اور شاعری محرکات کو استعمال کرتی ہے"+ پھر موسیقی اور شعر تصویر اور شعر خطبہ اور شعر تاریخ اور شعر افسانہ اور شعر کے فرق کو واضح کیا ہے + پھر لکھتے ہیں"اصلی شاعر وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو" "شاعری تنہا نشینی اور مطالعۂ نفس کا نتیجہ ہے"+ شاعری کے عناصر وزن اور محاکات اور خیال بندی اور سادہ اور شیریں الفاظ اور صاف بندش اور جدید طرزِ ادا ہیں + اور حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخئیل۔ اِن میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا"+ پھر محاکات اور تصویر کا مقابلہ کیا ہے تخئیل کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ دراصل قوتِ اختراع کا نام ہے"+"فلسفہ اور سائنس میں قوتِ تخئیل کا استعمال اس غرض سے ہوتا ہے کہ ایک علمی مسئلہ کو حل کر دیا جائے لیکن شاعری میں تخئیل سے یہ کام لیا جاتا ہے کہ جذباتِ انسانی کو تحریک ہو"+"ایک پھول کو دیکھ کر سائنس دان تحقیق کرنا چاہتا ہے کہ وہ نباتات کے کس خاندان سے ہے، اس کے رنگ میں کن رنگوں کی آمیزش ہے، اس کی غذا زمین کے کن اجزا سے ہے؟ اس میں نر و مادہ دونوں کے اجزا ہیں یا صرف ایک کے؟ لیکن شاعر کو ان چیزوں سے غرض نہیں پھول دیکھ کر بے اختیار اُس کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے ع اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری + پھر محاکات اور تخئیل پر تفصیلی بحث کی ہے جس میں جا بجا دلکش اور عام فہم مثالوں سے اُن کی حقیقت واضح کر کے پیش کر دی ہے + "محاکات کے کمال کے لئے عالمِ کائنات کی ہر قسم کی چیزوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے"+"تخئیل کا خاکہ یوں کھینچا ہے کہ شاعر کی نظر میں عالمِ کائنات قوتِ تخئیل سے ایک اور عالم بن جاتا ہے" "آفتاب، ماہتاب، ستارے، صبح، شام، شفق، باغ، پھول، پتے سب اس سے ہمزبانی کرتے ہیں سب اُس کے رازدار ہیں، سب سے اُس کے تعلقات ہیں، وہ شبِ وصل اور صبحِ وصل سے یُوں خطاب کرتا ہے ؎

اے شب اگرت ہزار کار است مرو
وے صبح گرت ہزار شادی است مخند

"واقعاتِ عالم پر جب وہ عبرت کی نظر ڈالتا ہے تو ایک ذرہ ناصح بن کر اُس کو اخلاق اور عظمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس عالم میں وہ گورِ غریباں میں جا نکلتا ہے تو بوسیدہ ہڈیاں علانیہ اُس سے خطاب کرتی ہیں:-

کہ زنہار اگر مردے آہستہ تر

کہ چشم و بنا گوش و روئے است و سر"

نوتِ تخیل ایک چیز کو سو سو دفعہ دیکھتی ہے اور ہر دفعہ اِس کو اُس میں ایک نیا کرشمہ نظر آتا ہے"۔ پھر تخیل کے بے جا استعمال کی مثالیں دی ہیں۔ اور مبالغہ کی بے اعتدالیاں دکھائی ہیں۔ لفظی تناسب اور ایہام کی بے بنیادی ظاہر کی ہے استعارات اور تشبیہات کے استعمال میں احتیاط لازم قرار دی ہے اور بتایا ہے کہ فارسی میں متاخرین کی سخت غلطی جس سے اُن کی شاعری بالکل برباد ہو گئی یہ ہے کہ وہ ان موقعوں پر محاکات کے بجائے تخیل سے کام لیتے ہیں مثلاً

زمانہ ایست کہ بر قفل اگر نسیم وزید

بسانِ غنچہ اش از انبساط خنداں کرد

پھر تشبیہ و استعارہ کا صحیح مصرف دکھایا اور اس بات کی ترغیب دلائی کہ شاعر نادر اور جدید تشبیہیں اور استعارے ڈھونڈ کر پیدا کرے۔ جدت و لطفِ ادا کے بعد حسنِ الفاظ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ "زیادہ تر اہلِ فن کا یہی مذہب ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہے"۔ "یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک عمدہ سے عمدہ خیال عمدہ سے عمدہ مضمون عمدہ سے عمدہ نظم اِس وجہ سے برباد ہو جائے کہ اُس میں صرف ایک لفظ اپنے درجے سے گر گیا"۔ الفاظ کے انواع اور اُن کے مختلف اثر خوب ظاہر کئے ہیں کہ "الفاظ متعدد قسم کے ہوتے ہیں بعض نازک، لطیف، شستہ، صاف، رواں اور شیریں اور بعض پُرشوکت، متین، بلند پہلی قسم کے الفاظ عشق و محبت کے مضامین کے ادا کرنے کے لئے موزون ہیں"۔ پھر کہا ہے کہ "اس سے زیادہ مقدم الفاظ کا باہمی تعلق اور تناسب ہے"۔ الفاظ کے توافق، تناسب، موزونی اور ہم آوازی سے سلاست صفائی اور روانی پیدا ہوتی ہے۔ پھر مترادف الفاظ کا باریک اور نازک معنوی فرق دکھایا۔ پھر سادگی، جملوں کے اجزا کی ترکیب اور واقعیت سے ایک لطیف بحث کی ہے۔ اخیر میں پھر شاعری اور جذبات کا تعلق واضح کیا ہے اور شاعری کے استعمال کا صحیح رستہ دکھایا ہے کہ "شعر ایک قوت ہے جس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ اس کا استعمال صحیح طور سے کیا جائے"۔ "شاعری کے جس قدر اقسام ہیں یعنی فلسفیانہ، اخلاقی، عشقیہ، تخیلی سب سے مفید کام لئے جا سکتے ہیں۔ فلسفیانہ شاعری دقیق خیالات کو آسانی کے ساتھ ذہن نشین کر سکتی ہے، اخلاقی شاعری اخلاق کو سنبھالتی ہے، عشقیہ شاعری سے زندہ دلی

اور تازگی روح پیدا ہوتی ہے تخئیل سے طبیعت کو اہتزاز و انبساط ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اکثر شعرائے ایران نے شاعری کا صحیح استعمال نہیں کیا"۔ دیکھو کیونکر شبلی نے اصطلاحی کنجلکوں سے بچ کر یا اُن کو سلجھا کر شاعری کے معنی اور اُس کا مقصد ذہن نشین کردیا ہے۔ تنقید و تبصرہ عموماً اک خشک بیابان کا منظر پیش کرتے ہیں۔ شبلی نے اس کے بجائے روزمرہ کے واقعات اور موزوں اقتباسات سے ایک دلکش چمنستان کا سماں آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا ہے جس سے محض لطف اٹھانے والا لطف اٹھا سکتا ہے اور چمن بندی کرنے والا اپنے فن کی مناسب اصلاح کر سکتا ہے۔ باب دوم میں فارسی شاعری کی پیدائش، ارتقا، ترقی و تنزل، عربی شاعری کا اس پر اثر، نظام حکومت کا اثر، امرد پرستی کا شرمناک اثر، مختلف قومی خصوصیتوں اور مختلف آب و ہوا اور مناظر قدرت کا مختلف ملکوں میں مختلف اثر ان سب پر ایک تاریخی ادبی نظر ڈالی ہے مثلاً لکھتے ہیں "غزنین اور سمرقند وغیرہ کے شعرا سخت گو اور سادہ گو ہیں بخلاف اس کے شیراز وغیرہ کے شعرا کا کلام لطافت اور نزاکت سے گویا عروس رعنا ہے۔ ہندوستان میں آکر ایرانی فحش گو بھی مہذب بن جاتے ہیں۔ ایران کے فطری خوبصورت اور رنگین مناظر کی وجہ سے رنگین سخنی، رنگین نوائی، رنگین ادائی کے محاورات پیدا ہوتے"۔ باب سوم میں عربی فارسی شاعری کا فرق دکھایا ہے پھر فارسی کے مختلف انواع پر تفصیلی تبصرہ ہے۔ مثنوی، قصیدہ، عشقیہ شاعری، غزل، صوفیانہ شاعری، اخلاقی شاعری، فلسفیانہ شاعری، کو یکے بعد دیگرے لیا ہے اور نہ صرف ان کا ارتقا دکھایا ہے بلکہ شاعر کا شاعر سے تمثیلاً موازنہ کیا ہے اور اس طرح ضمناً جابجا شاعری کے اصولوں سے بحث کرتے ہوئے لطیف و بلیغ اشعار سے اپنی عالمانہ تصنیف کو دلچسپ و دلکش بنا دیا ہے۔ تصوف کا اثر یوں دکھاتے ہیں کہ اول قصیدہ گوئی جو سراپا خوشامد تھی موقوف ہوگئی۔ بادشاہ وقت کا نام لینا لازم نہ رہا۔ زبان مہذب اور شائستہ ہوگئی اور وہ الفاظ جو رندی و عیاشی کے لئے خاص تھے حقائق اور اسرار کے ترجمان بن گئے۔ فلسفہ شاعری میں تصوف کی راہ سے آیا۔ تصوف کا اصلی مقام عشق و محبت ہے۔ اس عالم میں دشمن اور دوست کی تمیز اُٹھ جاتی ہے ہر چیز میں اُسی کا جلوہ نظر آتا ہے ہر چیز کی طرف دل کھنچتا ہے۔ اس کا اخلاق پر عمدہ اثر پڑا۔ عام محبت اور ہمدردی کے خیالات پھیل گئے اور یہ تعلیم ہونے لگی کہ ؎

در حیرتم کہ دشمنی کفر و دیں چرا است ۔۔۔ از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

گاندھیت ملاحظہ ہو ؎

زمین عشق بہ کونین صلح کل کردم ۔۔۔ تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

تصوف نے بہت سے نئے الفاظ اصطلاحات تلمیحات زبان میں داخل کئے۔ عزت نفس کا خیال لوگوں

کے دل میں پیدا کر دیا یہاں تک کہ لکھا ؎

سرمد اگرش وفاست خود می آید　　در آمدنش بجاست خود می آید
بیہودہ چرا در پئے اوی گردی　　سرمد اگر او خداست خود می آید

غرض شبلی نے صرف اصولوں سے خشک اصطلاحانہ بحث نہیں کی بلکہ صحیح محاکات کے اصول پر گویا اک جیتی جاگتی دنیا پیش کر دی ہے جس سے طبیعت میں اک تازگی آ جاتی ہے - یہ ہے مصنف کا کمال کہ وہ جس بات کو لے اس انداز سے بیان کرے کہ اُس کی کیفیت آنکھوں میں پھر جائے اور دل میں سما جائے اور یہی ہے نقاد کا فرض کہ مصنف پر تبصرہ کرے تو خود مصنف کو بولنے دے اور قارئین یا سامع کو براہِ راست مصنف سے دوچار ہونے دے کیونکہ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کسی شے یا کسی شخص کو بخوبی جاننے کے لئے لازم ہے کہ اُس سے براہِ راست اور بے تکلف تعلق پیدا کیا جائے +

شعر العجم میں ایک اور خوبی ہے کہ صرف ایک ہی مقام پر شاعری اور شعر کے حسن و قبح سے بحث نہیں کی۔ بلکہ جا بجا ہر شاعر کے ذکر میں مختلف اصنافِ شاعری کے نکتے بیان کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ نقص تو ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ جا بجا توارد ہو گیا ہے لیکن اس نقص کی تلافی اس امر سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ عام پڑھنے والے کو مختلف شخصیتوں اور مختلف تمثیلوں کے ذریعے سے شاعری کے اصول بخوبی ذہن نشین ہو جاتے ہیں + ہر فارسی شاعر کے کلام پر مختلف پہلوؤں سے تبصرہ کیا ہے اور پھر فارسی شاعری کے ان مختلف پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ تبصرہ بھی کیا ہے یعنی اُنہیں چیزوں پر پہلے جزئی نقطۂ نظر سے اور پھر کلی نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالی ہے۔ تبصرے کا یہ طریقہ نہایت موزون و مناسب ہے +

اس کے ساتھ ہی مختلف شعرا کا کلام بالمقابل رکھا ہے جس سے شعر کے مختلف درجوں اور خوبیوں کا بخوبی موازنہ کیا جا سکتا ہے + حافظ کے مقابل میں سلمان کی بندش کی سستی دکھاتے ہیں ؎

سلمان　　حافظ

شوقم افزوں شد و آرام کم و صبر نماند　　عاشقاں بندۂ اربابِ امانت باشند
در فراقِ تو و لے عہد ہماں ست کہ بود　　لاجرم چشمِ گہربار ہماں است کہ بود

یہ کہہ کر کہ در فراقِ تو کا موقع پہلے مصرع کے ابتدا میں کا ہے +

در ازل عکسِ مے لعلِ تو در جام افتاد　　عکسِ روئے تو چو در آئینۂ جام افتاد
عاشقِ سوختہ دل در طمعِ خام افتاد　　عارف از پرتوِ مے در طمعِ خام افتاد

خالِ مشکین تو در عارضِ گندم گوں دید
کے دم آمد نہ پئے دانہ و در دام افتاد

در خمِ زلفِ تو آویخت دل از چاہِ زنخ
آہ کز چاہ بروں آمد و در دام افتاد

اسی طرح انیس اور دبیر کے اشعار کا موازنہ کیا ہے۔

دبیر
گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا

انیس
گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے
انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پہ انصاف نہیں ہے

بندھنی تھی اور کھلتی تھی مٹھی حباب کی

کھلتی تھیں اور جھپکتی تھیں آنکھیں حباب کی

شبلی کی شاعری - شبلی ہمیں "موازنہ" اور "شعر العجم" میں ایک زبردست نقاد بن کر نظر آتے ہیں لیکن اس سے مدتوں پہلے وہ ایک شاعر تھے - چنانچہ اپنے اوائل عمر میں جب کہ ابھی اُن سے کوئی بڑا کام سرانجام نہ ہوا تھا جب کہ بھی وہ فقط ایک پکّے مسلمان تھے وہ اکثر مسلمان نوجوانوں کی طرح شعر وسخن کے مشتاق تھے اور اپنے وقت کا کچھ حصہ اِن "غیر عملیات" میں صرف کرتے تھے + پھر جب اُن کو معاش کی فکر ہوئی اور جب علی گڑھ میں وہ ایک زبردست قومی تحریک سے دو چار ہوئے تو اگرچہ شروع شروع میں "صبح امید کی سی زبردست نظم اُن کے دماغ و قلم سے نکلی لیکن تحقیقی مشاغل میں مصروف ہو جانے کے ساتھ کچھ عرصے کے لئے اُن کی شاعری پر مہرِ خاموشی ثبت ہوگئی + لیکن شاعری دبائے دبنے والی چیز نہیں اور پھر ایک مسلمان کی شاعری! شاعری جذبات کی ترجمانی ہے اور مسلمان کیا ہوتا ہے جذبات کی ایک پوٹ، یہ دوسری بات ہے کہ یہ پوٹ پاکیزہ و نفیس ہے کہ نہیں + غرض شبلی ایک شاعر ضرور تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعر سے بڑھ کر ایک نقاد تھے - اِس حیثیت سے اُن کا مقابلہ انگریزی کے مشہور نقاد شاعر میتھیو آرنلڈ سے کیا جا سکتا ہے جس کی نقادیت کو اُس کی شاعری پر بدرجہا سبقت تھی + شبلی کے ہم عصر بتاتے ہیں کہ اُن کو فی الحقیقت فارسی کے ہزاروں اشعار نوک زبان تھے اور راقم نے سنا ہے کہ ایک موقع پر کیسے سید سجاد حیدر یلدرم نے بحالتِ طالب علمی دروازے کے ایک چھید میں سے "شبلی غمزدہ" کو شعر لکھنے کی دُھن میں چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھا + سو شبلی شاعر تو ضرور تھے لیکن ایک نقاد شاعر تھے ایک مورخ شاعر تھے ایک محقق شاعر تھے ایک

سیاسی شاعر تھے اور اس لئے سوائے اُس وقت کے جب وہ بمبئی چلے جاتے تھے اور جب "ہنگامۂ خوبانِ زرتشتی" سے جو "بہم آمیختہ اززلف وعارض ظلمت وضورا" "کنارِ آبِ چوپاٹی وگلگشتِ اپالو" پر جلوہ گر ہوتے وہ فطری طور پر متاثر ہو جایا کرتے اتنا کہ کم از کم فارسی تغزل کے لئے ایک خاصا سامان مہیا ہو جاتا باقی اوقات میں وہ تنقید وتحقیق وسنجیدگی ووقار کو ہاتھ سے نہ چھوڑ سکنے کے باعث ایک بے اختیار انسان یعنی صحیح معنوں میں ایک زبردست شاعر نہ تھے + اور قوم کی خوش قسمتی تھی کہ شبلی کی شاعریت اُن کی علمیت کے نیچے دب کر رہ گئی اور فقط ایک وقتی مشغلہ بنی رہی ورنہ "سنگ بر شیشۂ تقویٰ زدہ ام ہاں زدہ ام" کی دلکش صدائے جانکاہ اُنہیں اور اُن کے ذریعے سے بہت سے حساس مسلمان نوجوانوں کو علمی کاموں کے لئے کسی حد تک بیکار بنا دیتی + اور شبلی کی عدیم المثال تحقیقات جذبات کے کہر میں کم ہو جاتیں! تاریخی تحقیق کی روشنی کے آگے اُن کی شاعری کی چاندنی پھیکی پڑ گئی + کم از کم اُن کی اردو نظموں کو دیکھو کہ کس قدر بیانیہ ہیں۔ واقعات ہیں دلچسپ ضرور سچی کہانیاں ہیں دل آویز بھی اور زبان صاف ستھری اور پیرایۂ بیان سدھرا ہوا اور سلجھا ہوا کلام میں روانی اور سلاست اور صفائی یہ سب کچھ لیکن تخئیل کو ڈھونڈو تو شاید کہیں کہیں چھپی بیٹھی ہو اور موسیقیت بھی شاید کبھی کبھی کنکھیوں سے دیکھتی ہو۔ ایک مورخ واقعات کو نظم کر رہا ہے ایک مسلمان سلف کے قصے خوش الحانی سے سنا رہا ہے اور چونکہ مسلمان ہی سننے والے ہیں لہذا ان کا اثر بھی ہونا ضرور ہے اور ان کے مفید ہونے سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس لئے اسے شاعری کے زمرے سے خارج کرنا بھی ناانصافی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسے اعلیٰ معیار کی شاعری نہیں کہہ سکتے + بلاشبہ "صبحِ امید" کی مثنوی کے بعض حصے نہایت موثر ہیں۔ اور بعض جگہ طنزیہ کلام سے بھی شبلی کی قدرتِ کلام ظاہر ہوتی ہے ؎

ہماری کلفتیں سب دور ہو جاتی ہیں یہ سُن کر
کہ دنیا آج تک اسلام کی ممنونِ احساں ہے

علاوہ بریں غزل کی شکل میں واقعات کو نظم کرنا اور تسلسل ومحاکات کو یوں قائم رکھنا کہ ذرا تکلف معلوم نہ ہو یہ شبلی کے اردو کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ "اہلِ بیتِ رسول صلعم کی زندگی" "خلافتِ فاروقی کا ایک واقعہ" "عدلِ فاروقی کا ایک نمونہ" تسلسل اور روانی کے بہترین نمونے ہیں۔ "ہنگامۂ طرابلس وبلقان" سے متاثر ہو کر اہلِ یورپ کو یوں خطاب کرتے ہیں ؎

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو! یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگیزیٔ طوفانِ بیداد و بلا تا کے ۔۔۔ یہ لطف اندوزیٔ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے ۔۔۔ ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے ۔۔۔ سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا ۔۔۔ ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم ۔۔۔ مٹاؤگے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

شبلی کی سیاسی آزاد خیالی بھی فقط اُن کی نظموں ہی میں سے ظاہر ہوتی ہے ؎

معاملاتِ حکومت میں دیجئے کچھ دخل ۔۔۔ یہ کیا کہ قصۂ پارینۂ وفا کہئے

برادرانِ وطن کہہ رہے ہیں کیا کیا کچھ ۔۔۔ کبھی تو آپ بھی افسانۂ جفا کہئے

آپ اِس بھول بھلیاں سے نہ نکلیں گے کبھی ۔۔۔ دل سے جائے گا نہ تعلیمِ غلامی کا اثر

لاکھ آزادیٔ افکار کو روکا لیکن ۔۔۔ یہ وہ افسوں ہے کہ ہر شخص پہ چل جاتا ہے

غیر کمبخت تو گستاخ تھے مدت سے مگر ۔۔۔ اب تو کچھ آپ کے منہ سے بھی نکل جاتا ہے

شبلی کی شاعری کا معراج اُن کی فارسی نظموں میں نظر آتا ہے ؎

دوش ایں مژدہ بگوشِ گل و ریحاں آمد ۔۔۔ کہ بہار آمد و بسیار بساماں آمد

ابر گوہر ہمہ افشاند چو گریاں بگذشت ۔۔۔ گل ہمہ زر بپراگند چو خنداں آمد

آب را سلسلہ بر پائے بہ بستند ز موج ۔۔۔ بس کہ دیوانہ وش از طرفِ بیاباں آمد

لالہ چوں مغ بچگاں چہرہ برافروخت بباغ ۔۔۔ سنبل آشفتہ تر از طرۂ خوباں آمد

کشمیر کی تعریف میں لکھتے ہیں ؎

درِ بنِ آب دمد سبزہ و نیلوفر و گل ۔۔۔ قوتِ نامیہ بنگر ز کجا تا بکجاست

گرچہ دانم کہ سخن خود بہ درازی بکشید ۔۔۔ چہ تواں کرد سخن ہم ز سر نشو و نماست

جدید تعلیم والوں کو یوں تہدید کرتے ہیں ؎

اے کہ بر مائدۂ یورپ مہماں باشی ۔۔۔ حیف باشد اگر از جملۂ ایشاں باشی

حیف اگر از اثرِ فلسفۂ مغربیاں ۔۔۔ منکرِ فلسفۂ سنت و قرآں باشی
قیصراں را ہمہ یک یک بشماری ز آغاز ۔۔۔ بے خبر از عمر و حیدر و عثماں باشی
از خداوندِ جہاں یاد نیاری گاہے ۔۔۔ روز و شب خود بہ پرستاریٔ سلطاں باشی
در بہ پرسی کہ دریں کارچہ تدبیر بود ۔۔۔ دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر بود

بمبئی کی تعریف میں بہت سی غزلیں ہیں۔ یہ مشہور ہے:۔

نثارِ بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نو را ۔۔۔ طرازِ مسندِ جمشید و فرِّ تاجِ خسرو را

تغزل کا رنگ ملاحظہ ہو:۔

من کہ در سینہ دلے دارم و شیدا چہ کنم ۔۔۔ میل با لالہ رخاں گر نہ کنم تا چہ کنم
من نہ آنم کہ بہ ہر شیوہ دل از دست دہم ۔۔۔ لیک با آں نگہِ حوصلہ فرسا چہ کنم

عمرے ست عشق ورزم و کارم تمام نیست ۔۔۔ ایں بادہ پختہ نیز نہ شد گرچہ خام نیست
چشمم ہر آنچہ دید نہ ہر دیدہ بنگرد ۔۔۔ نظارۂ جمالِ تو عام ست و عام نیست

وقتِ سحر کہ عارضِ او بے نقاب بود ۔۔۔ در بزمش اول آں کہ رسید آفتاب بود
بزمِ شراب و شاہدِ رنگین و بانگِ نے ۔۔۔ ایں حرفے از فسانۂ عہدِ شباب بود

یہ ہے شبلی کی عاشقی اور شبلی کی شاعری لیکن اس سے بعض نکتہ چینیوں کی طرح یہ نتیجہ نکالنا کہ شبلی کی زندگی کا ایک نہایت تاریک پہلو بھی تھا سخت ناانصافی اور پرلے درجے کی تنگ نظری ہے۔ ہاں متانت جن لوگوں کا مذہب ہے جو اسلام کو لطافت و فطریت کا دشمن سمجھتے ہیں جن کے نزدیک کسی خوبصورت چہرے کا دیکھ لینا اور پھر اُس کو خوبصورت سمجھ لینا یا خدانخواستہ کہہ دینا ایک گناہِ کبیرہ ہے جس کا کفارہ صرف دوزخ کی آگ میں جلنے سے ممکن ہے انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ شبلی کو جو نہیں معلوم کیوں اپنی ایک کتاب میں تھیٹر دیکھنا بھی معیوب سمجھتے ہیں ایک چھپا وارفتہ مزاج عاشق سمجھ لیں ورنہ شبلی نے تو صاف بتا دیا ہے کہ:۔

شبلیا نابلدِ کوچۂ عشقیم ولے ۔۔۔ دوستاں تہمتِ ایں شیوہ بما نیز کنند

اس سے یہاں مراد یہ نہیں کہ شبلی ضرور عشق سے نابلد تھے لیکن اُن کو اصلی عشق اسلام اور تاریخِ اسلام اور ادب

اور ادب اسلام اور اس لیئے تحقیق اور تدقیق اور تنقید سے تھا نہ کہ خوبانِ زرتشتی سے یا کسی اَور بے نقاب یا نقاب دار کے زلف وگیسو سے۔

محاکات - محاکات اور خوبیٔ بیان کی مثالیں جابجا شبلی کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ واقعہ نگاری کا کمال ذیل کی مثال سے واضح ہوگا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں قادسیہ کی مشہور جنگ و فتح ۱۴ھ بمطابق ۶۳۵ء سے قبل جو نامۂ پیام طرفین میں جاری رہے اُن میں سفارتِ ربعی کا یوں بیان کرتے ہیں[۵۶]

"رستم چونکہ لڑنے سے جی چُراتا تھا ایک دفعہ اَور صلح کی کوشش کی۔ سعد کے پاس پیغام بھیجا کہ تمہارا کوئی معتمد آدمی آئے تو صلح کے متعلق گفتگو کی جائے۔ سعد نے ربعی بن عامر کو اس خدمت پر مامور کیا۔ وہ عجیب وغریب ہیئت سے چلے۔ عرق گیر کی زرہ بنائی، اور اسی کا ایک ٹکڑا سر سے لپیٹ لیا۔ کمر میں رسی کا پٹکا باندھا اور تلوار کے میان پر چیتھڑے لپیٹ لئے۔ اِس ہیئت کذائی سے گھوڑے پر سوار ہو کر چلے۔ ادھر ایرانیوں نے بڑے سروسامان سے دربار سجایا۔ دیبا کا فرش۔ زریں گاؤ تکیے۔ حریر کے پردے۔ صدر میں مرصع تخت۔ ربعی تخت کے قریب آ کر گھوڑے سے اترے اور باگ ڈور کو تکیے سے اٹکا دیا۔ درباری بے پروائی کی ادا سے اگرچہ کچھ نہ بولے تاہم دستور کے موافق ہتھیار رکھوالینا چاہا۔ انہوں نے کہا میں بلایا ہوا آیا ہوں۔ تم کو اِس طرح میرا آنا منظور نہیں تو میں الٹا پھر جاتا ہوں۔ درباریوں نے رستم سے عرض کی۔ اُس نے اجازت دی۔ یہ نہایت بے پروائی کی ادا سے آہستہ آہستہ تخت کی طرف بڑھے۔ لیکن برچھی جس سے عصا کا کام لیا تھا اُس کی انی کو اس طرح فرش میں چبھوتے جاتے تھے کہ پُرتکلف فرش اور قالین جو بچھے ہوئے تھے جابجا سے کٹ پھٹ کر بے کار ہو گئے۔ تخت کے قریب پہنچ کر زمین پر نیزہ مارا جو فرش کو آر پار کر کے زمین میں گڑ گیا۔ رستم نے پوچھا کہ اِس ملک میں کیوں آئے ہو؟ اُنہوں نے کہا" اس لئے کہ مخلوق کے بجائے خالق کی عبادت کی جائے"۔ رستم نے کہا "میں ارکانِ سلطنت سے مشورہ کر کے جواب دوں گا"۔ درباری بار بار ربعی کے پاس آ کر اُن کے ہتھیار دیکھتے تھے اور کہتے تھے کہ اسی سامان پر ایران کی فتح کا ارادہ ہے؟ لیکن جب ربعی نے تلوار میان سے نکالی تو آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی اور جب اُس کی کاٹ کی آزمائش کے لئے ڈھالیں پیش کی گئیں تو ربعی نے اُن کے ٹکڑے اڑا دیئے۔

یرموک ۱۵ھ بمطابق ۶۳۶ء کی فیصلہ کن جنگ کے دوران میں عکرمہ کی شجاعت کو یوں بیان کرتے ہیں[۵۷]

عکرمہ نے جو ابوجہل کے فرزند تھے اور اسلام لانے سے پہلے اکثر کفار کے ساتھ رہ کر لڑے تھے

---

۵۶ الفاروق جلد ۱ ص ۱۰۱ ۵۷ ص ۱۴۸

گھوڑا آگے بڑھایا اور کہا عیسائیو! میں کسی زمانہ میں (کفر کی حالت میں) خود رسول اللہ سے لڑ چکا ہوں کیا آج تمہارے مقابلے میں میرا پاؤں پیچھے پڑ سکتا ہے؟ یہ کہہ کر فوج کی طرف دیکھا اور کہا مرنے پر کون بیعت کرتا ہے؟ چار سو شخصوں نے جن میں ضرار بن ازور بھی تھے مرنے پر بیعت کی اور اس ثابت قدمی سے لڑے کہ قریباً سب کے سب وہیں کٹ کر رہ گئے۔ عکرمہ کی لاش مقتولوں کے ڈھیر میں ملی، کچھ کچھ دم باقی تھا۔ خالد نے اپنے زانو پر اُن کا سر رکھا اور گلے میں پانی ٹپکا کر کہا "خدا کی قسم عمر کا گمان غلط تھا کہ ہم شہید ہو کر نہ مریں گے"۔

شبلی نے اپنی تاریخی کتابوں کو متعدد دلچسپ حکایتوں سے زینت دی ہے جن کے پڑھنے سے زمانۂ گذشتہ کا نقشہ آنکھوں کے آگے پھر جاتا ہے اور اسلامی تمدن کی جیتی جاگتی تصویر نظر آنے لگتی ہے الفاروق کے اخیر میں لکھتے ہیں[۵۲۸]

"اسلم (حضرت عمر کا غلام تھا) کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رات کو گشت کے لئے نکلے۔ مدینہ سے تین میل پر صرار ایک مقام ہے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور تین بچے رو رہے ہیں۔ پاس جا کر حقیقتِ حال دریافت کی۔ اُس نے کہا کہ کئی وقتوں سے بچوں کو کھانا نہیں ملا ہے اُن کے بہلانے کے لئے خالی ہانڈی پانی ڈال کر چڑھا دی ہے۔ حضرت عمر اُسی وقت اُٹھے۔ مدینہ میں آ کر بیت المال سے آٹا، گوشت، گھی، اور کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا کہ میری پیٹھ پر رکھ دو۔ اسلم نے کہا میں لئے چلتا ہوں۔ فرمایا ہاں لیکن قیامت میں میرا بار تم نہیں اٹھاؤ گے۔ غرض سب چیزیں خود لاد کر لائے اور عورت کے آگے رکھ دیں۔ اُس نے آٹا گوندھا، ہانڈی چڑھائی۔ حضرت عمر خود چولہا پھونکتے جاتے تھے۔ کھانا تیار ہوا تو بچوں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور اچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمر دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ عورت نے کہا خدا تم کو جزائے خیر دے، سچ یہ ہے کہ امیر المومنین ہونے کے قابل تم ہو نہ عمر"۔

زبان و طرزِ بیان ـ شبلی کی زبان و طرزِ بیان عالمانہ اور پُر شوکت ہے لیکن یہ تو عام انداز ہے یوں جہاں جس قسم کا مضمون ہو اُن کی انشا پردازی اُس کے دوش بدوش چلتی ہے۔ سرسید نے جو بلاشبہ اردو میں موجودہ طرزِ انشا پردازی کے موجدِ اعلیٰ تھے۔ شبلی کی اولین تصنیف "المامون" کے دیباچے میں اُن کی زبان کی بابت یہ لفظ لکھے ہیں[۵۲۹]

"یہ کتاب اردو میں لکھی گئی ہے اور ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلّی والوں کو بھی اس پر رشک آئے گا۔ اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر

---

۵۲۸ الفاروق جلد ۲ ص ۲۔ ۵۲۹ المامون دیباچہ ص ۳۔

فن کے لئے زبان کا طرزِ بیان جداگانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول (قصہ) اور ناول میں تاریخانہ طرزگو کیسی ہی فصاحت اور بلاغت سے برتا گیا ہو دونوں کو برباد کرتا ہے۔ لارڈ مکالی جو انگریزی زبان کا بے نظیر ادیب ہے اس کے تاریخانہ ایسیز باعتبار فصاحت و بلاغت کے اپنا نظیر نہیں رکھتے مگر ایشیائی اور شاعرانہ طرزِ ادا سے تاریخانہ اصلیت کو بہت کچھ نقصان پہنچانے والے ہیں۔ ہمارے لائق مصنف نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اُس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے، اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے۔ جو خوبصورت ہے خوبصورت ہے۔ جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے۔ نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے۔ نہ بھونڈے پنے کو زیادہ بھونڈا اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔"

سیرۃ النبی میں آنحضرت کی ہجرت کا واقعہ یُوں بیان کرتے ہیں[۵۳]

"کفّار نے جب آپ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گزر گئی تو قدرت نے اُن کو بے خبر کر دیا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے۔ کعبہ کو دیکھا اور فرمایا "مکّہ! تُو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے"۔ حضرت ابوبکر سے پہلے قرارداد ہو چکی تھی۔ دونوں صاحب پہلے جبلِ ثور کے غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے۔ یہ غار آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہِ خلائق ہے۔ حضرتِ ابوبکر کے بیٹے عبداللہ جو نوخیز جوان تھے شب کو غار میں ساتھ سوتے، صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں؟ جو کچھ خبر ملتی شام کو آ کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کرتے۔ حضرت ابوبکر کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا۔ آپ اور حضرت ابوبکر ان کا دودھ پی لیتے۔ تین دن تک بس یہی غذا تھی لیکن ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو اسماء گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں۔ اسی طرح تین راتیں غار میں گزریں۔ صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بجائے جنابِ امیر تھے۔ ظالموں نے آپ کو پکڑا اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور چھوڑ دیا۔ پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلاش میں نکلے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانہ تک آ گئے۔ آہٹ پا کر حضرت ابوبکر غمزدہ ہوئے اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کی کہ دشمن اس قدر قریب آ گئے کہ اگر اپنے قدم پر اُن کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے۔ آپ نے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا گھبراؤ نہیں

---

[۵۳] سیرۃ النبی جلد ۱۔ ص ۱۹۸۔

خدا ہمارے ساتھ ہے"۔

فتحِ مکہ کے بعد خطبۂ فتح میں آنحضرت نے صرف اہلِ مکہ نہیں بلکہ تمام عالم کو خطاب کیا۔ شبلی لکھتے ہیں[۵۳۱]:-

"خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے اِن میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب کے پیشرو تھے۔ وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں۔ وہ بھی تھے جن کے تیغ و سنان نے پیکرِ قدسی کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں۔ وہ بھی تھے جنہوں نے آنحضرت صلعم کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے۔ وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی۔ وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا۔ وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر اُن کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔ رحمتِ عالم نے اُن کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا "تم کو کچھ معلوم ہے؟ مَیں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں"۔ یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے لیکن مزاج شناس تھے پکار اُٹھے کہ اَخٌ کَرِیْمٌ وَابْنُ اَخٍ کَرِیْمٍ۔ تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے۔ ارشاد ہوا لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ۔ تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو"۔

فاتح و پیغمبر کا امتیاز یُوں دکھایا ہے[۵۳۲]:-

"جہاد کے معرکوں میں آپ کے ہاتھ میں گو تیغ و سپر اور جسم مبارک پر خود و مغفر ہوتا تھا لیکن اُس وقت بھی پیغمبر اور سپہ سالار کا فرق صاف نظر آتا۔ عین اُس وقت جب کہ معرکہ کارزار گرم ہے، تیروں کا مینہ برس رہا ہے، تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے، ہات اور پاؤں اِس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں جس طرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں۔ دشمنوں کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھی آ رہی ہیں عین اُسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ دعا آسمان کی طرف بلند ہے۔ جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سرِ مبارک سجدۂ نیاز میں ہے۔ معرکۂ بدر میں حضرت علی عین شدتِ جنگ میں تین بار خبر لینے آئے۔ اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے۔ فوجیں تیروں کا مینہ برسا رہی ہیں اور لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ فاتح بے سلاح زمین سے مٹھی بھر خاک اٹھا لیتا ہے اور دشمن کی طرف پھینکتا ہے۔

---

[۵۳۱] سیرۃ النبی جلد اول ص ۳۸ - [۵۳۲] ص ۵۰۴

دفعتہً فوجوں کا بادل پھٹ کر مطلع صاف ہو جاتا ہے + حنین میں دشمن نے دفعتہً اِس زور سے حملہ کیا کہ تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے - ۱۲۰۰۰ ہزار آدمیوں میں سے ایک بھی پہلو میں نہیں - سامنے سے دس ہزار قدر انداز تیر برساتے آ رہے ہیں لیکن مرکزِ حق اپنی جگہ پر قائم ہے اور ایک پُرجلال آواز آ رہی ہے انا النبی لا کذب - میں پیغمبر ہوں اور جھوٹا پیغمبر نہیں ہوں + عین اُس وقت جب کہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں، ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں، ہات پاؤں کٹ کٹ کر زمین پر بچھے جاتے ہیں، موت کی تصویریں ہر طرف نظر آ رہی ہیں، اتفاق سے نماز کا وقت آ جاتا ہے، دفعتہً نماز کی صفیں قائم ہو جاتی ہیں، سپہ سالار امامِ نماز ہے، فوجیں صفوفِ نماز ہیں، رجز کے بجائے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہیں - جوش و خروش، تہور و جانبازی، غیظ و غضب، اب عجز و نیاز، تفرع و زاری اور خضوع و خشوع بن جاتا ہے - صفیں دو دو رکعتیں ادا کر کے دشمن کے مقابلہ پر چلی جاتی ہیں - اُن کی بجائے لڑنے والے نماز میں شامل ہو جاتے ہیں - یہ دو رکعتیں ادا کر کے پھر اپنی پہلی خدمت پہ واپس چلے جاتے ہیں - اور مشغولینِ جنگ آ کر بقیہ نماز پوری کر لیتے ہیں لیکن یہ تبدیلیاں فوجوں میں ہوتی ہیں - امام (رسول) اول سے آخر تک عبادتِ الٰہی میں مصروف ہے + تعلیم و ارشاد، ہدایت و تلقین، تہذیب و تزکیہ کا کام ہر وقت جاری ہے - عین فتح کے وقت جب کہ مجاہدین فتح کے نشہ میں چُور ہیں، مالِ غنیمت فروخت ہو رہا ہے، ایک ایک کو ہزاروں کی رقمیں وصول ہو رہی ہیں ایک صحابی خوش خوش آتے ہیں اور جوشِ مسرت میں کہتے ہیں - "یا رسول اللہ! آج میں نے مالِ غنیمت سے جس قدر فائدہ اٹھایا کبھی نہیں اٹھایا تھا، پورے تین سو اوقیہ ہات آئے" (اوقیہ دس روپیہ کے برابر ہوتا ہے) آپ فرماتے ہیں کہ "میں اِس سے بھی زیادہ نفع بتاؤں؟ وہ بڑے شوق سے پوچھتے ہیں کیا؟ ارشاد ہوتا ہے - "نمازِ فرض کے بعد دو رکعتیں"۔

مصنفینِ اردو اور شبلی - سرسید کے زمانے کے انشا پردازوں نے اردو کو اردو بنایا + سرسید پہلے لکھنے والے تھے جنہوں نے زبان کو لفظوں کی بے معنی بھرمار اور صنائع و بدائع کے مصنوعی بار اور اِس قسم کی دیگر آلائشوں سے پاک کیا - اُن کی تحریریں احساس اور صداقت اپنی فطری عریانی میں نظر آتے ہیں - وہ جو کچھ لکھتے ہیں دل میں جگہ پا لیتا ہے کیونکہ وہ براہِ راست دل سے نکلا ہے + حالی سرسیّد کے بڑے چیلے تھے حالی گویا نظم کے سرسید تھے، سادگی اصلیت متانت اُن کی تحریر کے جوہر ہیں + نذیر احمد اصلاح کے علم بردار مسلمانوں

کی جمعیت کو اپنی پُر رعب آواز سے پکارتے ہیں۔ دہلی کی بامحاورہ زبان کے چٹخارے اور روزمرہ سے وہ حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ آزاد سب تحریکوں سے آزاد ہیں پرانی لکیر کے فقیر نہیں لیکن نہ نئی ڈگر کے مسافر ہیں اپنی راہ آپ بناتے ہیں اور اُسے اپنے ہی طبع زاد پھولوں پتّوں سے سجاتے ہیں۔ اِن سب کی انشا کے نمونے اپنی اپنی جگہ دلکش و دلپذیر ہیں اور ذوقِ سلیم پر بار ہے کہ ہم اس موقع پر اُن کے نقائص کی طرف متوجہ ہوں۔ ان شیریں زبانوں کے دہن سے بعض ایسے ایسے جملے نکل گئے ہیں کہ کبھی بے ساختہ منہ سے داد نکل جاتی ہے اور کبھی زبان مزے لے لے کر انہیں دہرائے جاتی ہے۔ کون بدبخت مسلمان ہے جس نے اپنے نبی کے ظہورِ قدسی کا یہ خطبہ شبلی کی زبان سے نہیں سنا۔[۳۳]

"چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرکہن سالِ دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے۔ سیارگانِ فلک اِسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخِ کہن مدت ہائے دراز سے اِسی صبح جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدّت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابرو باد کی تردستیاں عالمِ قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیم، جمالِ یوسف، معجز طرازیٔ موسیٰ، جاں نوازیٔ مسیح، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارزو شاہنشاہِ کونین کے دربار میں کام آئیں گے۔"

آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے۔ اربابِ سیر اپنے محدود پیرایہ بیانِ زبان میں لکھتے ہیں کہ "آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا" لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیمِ شر، آتشکدۂ کفر، آذرکدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی کا آئینہ پر تو قدس سے چمک اٹھا۔

یعنی یتیمِ عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرمانروائے عالم، شہنشاہِ کونین

شمسۂ مسندِ ہفت اختراں ــــ ختمِ رسل خاتمِ پیغمبراں

---

[۳۳] سیرۃ النبی ص ۱۲۳۔

احمدِ مرسل کہ خرد خاکِ اوست | ہر دو جہاں بستۂ فتراکِ اوست
امّی و گویا بزبانِ فصیح | از الفِ آدم و میمِ مسیح
رسمِ ترنج است کہ در روزگار | پیش دہد میوہ پس آرد بہار

عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت و جلال ہوا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلِّم

حق یہ ہے کہ یہ پیرایۂ بیان مورخ و نقاد شبلی کا نہیں بلکہ شاعر و عاشقِ رسول شبلی کا ہے مصنف روایت و درایت کے اصولوں کو عبور کر چکا ہے بحث و تنازعہ کے مرحلے طے کر چکا ہے اور ایک ایسے مقام پر پہنچا ہے جس کے لئے وہ کبھی سے ساعی و بے تاب تھا اور ایک ایسے وقت سے رُوبرُو ہے جس کا وہ مدتوں سے منتظر تھا اور ایک ایسے وجود سے دوچار ہونے کو ہے جس کے جلوے کے لئے اُس کی ساری زندگی گویا اک تیاری تھی۔ وہ بے اختیار ہو جاتا ہے وہ اس وقت دنیا میں یا اُس وجود کا احساس کرتا ہے یا اپنا۔ یہیں اُس کے خیالات تنہائی میں یہاں تک کہ اُس کا محبوب جب اُس کے سامنے آجاتا ہے تو وہ یہ ہدیہ پیش کرتا ہے جس کا سرنامہ ان لفظوں سے عبارت ہے:-

"ایک گدائے بے نوا شہنشاہِ کونین کے دربار میں اخلاص و عقیدت کی نذر لے کر آیا ہے۔
زچشمِ آستیں بردار و گوہر را تماشا کن"

حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلمان خواہ اُس کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کے بعد اس تصنیف پر نکتہ چینی کے لئے کیا قلم اٹھا سکتا ہے!

پیرایۂ بیان میں تغیّرات ۔ دیکھو ۱۸۸۹ء سے ۱۹۱۴ء تک ۲۵ برس میں شبلی کی انشاپردازی اور اس کے پیرایۂ بیان میں کیا کیا تغیرات آئے ہیں + ذرا المامون کے ابتدائی و انتہائی صفحے کو سیرۃ النبی کے ابتدائی انتہائی صفحوں کے مقابل میں رکھ کر دیکھو تو فرق واضح ہو جائے گا + اُس وقت کا مورخ شبلی شاعر شبلی سے پہلو بچا کر تاریخ و سیرت پر قلم اٹھاتا ہے۔ اِس وقت کا سیرت نگار شبلی حقیقت کو شعریت سے جدا نہیں کر سکتا، نہیں کرنا چاہتا + اُس وقت کا شبلی سیرۃ مامون کو یوں شروع کرتا ہے[۵۴۳]

"زمانہ کے انقلاب سے مسلمانوں کی قومی خاصیتیں گو بہت کچھ بدل گئیں اور بدلتی جاتی ہیں تاہم اپنی

---

[۵۴۳] المامون ص ۲ +

اپنی قومی تاریخ کے ساتھ جو دلچسپی اور شغف اُن کو پہلے تھا اب بھی ہے۔ جس طرح قومی روایتوں کو محفوظ رکھنے میں وہ ہمیشہ نام آور رہے ہیں آج بھی اپنی گذشتہ تاریخ کی طرف اُن کو وہ جوشِ التفات ہے کہ اُس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

اِس وقت کا شبلی سیرۃ النبی کو "تالیف کی ضرورت" کے عنوان سے لیکن یوں شروع کرتا ہے[۳۵]۔

عالمِ کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض، اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے یعنی پہلے ہر قسم کے فضائل اخلاق، زہد و تقویٰ، عصمت و عفاف، احسان و کرم، حلم و عفو، عزم و ثبات، ایثار و لطف، غیرت و استغنا کے اصول و فروع نہایت صحیح طریقہ سے قائم کئے جائیں اور پھر تمام عالم میں اُن کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔"

خطوط۔ یہاں گنجائش نہیں کہ اُن کے خطوط پر تبصرہ کیا جائے لیکن چند اقتباسات دیئے جاتے ہیں کہ اُن کی شخصیت اور ادبیت پر کچھ روشنی پڑے اور ظاہر ہو کہ جہاں وہ مصنّف بن کر نہ نکلتے تھے وہاں کس خلوص و شستگی کے مالک تھے۔ ایک خط میں جو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ہے لکھتے ہیں[۳۶]

ع آنچہ استادِ ازل گفت ہماں مے گویم۔ آپ نے دیکھا اِدھر اوقافِ اسلامی کی تحریک شروع ہوئی اُدھر گورنمنٹ نے یادداشت شائع کی اور ایک کانفرنس اسی مہینہ میں بٹھانے والی ہے۔ خیر میرا کام تو اس کے پیچھے جان لڑا دینا ہے۔ ع آگے نصیب ہے، جسے پروردگار دے۔ ہاں دار المصنفین پر کیوں آپ نے سکوت کیا۔ آپ سے بڑھ کر اس کی شرکت کا کس کو حق ہے۔ میں اس عمارت کو انشا اللہ پورا کر کے رہوں گا۔ اور شاید وہی میرا مدفن بھی ہو۔ ۲۴ سے پہلے علی گڑھ پہنچوں گا۔

شبلی ۱۶۔ فروری سنہ ۱۹۱۴ء

سیّد سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں[۳۷]:-

عزیزی! تم نے اپنی حالت کے متعلق حجابانہ طریقہ میں اظہارِ خواہش کیا ہے۔ عزیزی! کیا اِس کے کہنے کی حاجت ہے تم ہر وقت میری آنکھوں میں ہو اور میں موقع ڈھونڈتا رہتا ہوں لیکن اتنی جلدی کون کامیاب ہوا ہے۔ میاں حمید اُس لیاقت پر جو زمانہ کے موافق بھی تھی کتنے دنوں کے بعد ٹھکانے لگے خود میرا کیا حال ہوا، عمادی کس حالت میں ہیں۔"

---

۳۵ سیرۃ النبی ص ۱ ۳۶ مکاتیب شبلی جلد اول ص ۲۰۸ ۔ ۳۷ مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۶۸

بمبئی سے ایک خط میں اُن کو لکھتے ہیں :-

"یا تو سموم لکھنؤ میں جھلس رہا تھا یا یہاں بہشت کی ہوائیں آرہی ہیں تمام دن اور تمام رات اس قدر ہوا کے جھونکے آتے ہیں کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ شاید اب کی زیادہ رہوں + ہاں اب الندوہ یوں چلتا نظر نہیں آتا پھر تم اپنے ہاتھ میں لو۔ جو شرطیں پیش کروگے منظور کروں گا۔ مجھ کو الندوہ سے کوئی غرض نہیں لیکن وہ درحقیقت ندوہ کا ایک اعلان ہے اس کو مٹانا نہیں چاہیئے + ... غزلیں ہورہی ہیں لیکن پھیکی، کہاں تک۔؟ آخر عمر اور سن کا بھی کچھ تقاضا ہے + شبلی ۲۹ مئی ۱۹۱۱ء بمبئی

زہرا فیضی صاحبہ کو ایک خط (مورخہ ۵ افروری ۱۹۰۹ء) میں لکھتے ہیں۔ نزاکتِ خیال اور شوخیٔ بیان ملاحظہ ہو:-[۳۸]

"خاتونِ محترم! عنایت نامہ پہنچا۔ آپ نے مختصر نویسی کی شکایت کی ہے لیکن انصاف فرمائیے اگر ایک کاغذ بالکل سادہ ہو اور ایک پر دو ہی حرف ہوں تو آپ کس کو مختصر کہیں گی۔ میں نے تو سلام علیکم بھی لکھا لیکن آپ صاحبوں نے تو مطلق یاد ہی نہیں کیا۔ شاید آپ کو معلوم ہُوا ہوگا کہ میں بارِ خاطر ہونے سے بہت پرہیز کرتا ہوں۔ جب میں وہاں تھا یا جب کبھی آپ لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کا ہر وقت کھٹکا رہتا ہے کہ میری ملاقات سے آپ گھبرا نہ گئی ہوں۔ یہی حالت خطوط لکھنے کی ہے۔ اور جب یہ دیکھتا ہوں کہ آپ صاحبوں کے خطوط کبھی ابتداءً نہیں آتے بلکہ میرے جواب میں آتے ہیں تو سمجھ لیتا ہوں کہ کیوں بار بار زحمت دوں اور زبردستی آپ سے جواب حاصل کروں۔ بہرحال مختصر نویسی کا یہ سبب ہے ورنہ میں تو دفتر لکھ کر بھی سیر نہ ہوں"

شبلی کے اسلوبِ بیان کا اثر۔ آزاد کے مقابل میں شبلی کے اسلوبِ بیان میں یہ خصوصیت ہے کہ اس کا تتبع سہل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ بیس پچیس سال میں شبلی کے اسلوبِ بیان نے اردو کے اسالیبِ بیان پر بے انتہا اثر ڈالا ہے اور جو لوگ اب سلامت روی کے ساتھ تاریخ وسیر پر قلم اٹھاتے ہیں اُن کی تحریریں جا بجا شبلیانہ طرزِ بیان کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں + اُن کا اسلوب شگفتہ ہونے کے ساتھ شوکت و متانتِ بیان کا پہلو لئے ہوتا ہے۔ تاریخ و فلسفہ میں اُن کے خاص عربی مفرد و مرکب الفاظ اور ترکیبیں اب مدت سے اردو کے اخبار و رسالوں میں رائج ہوچکی ہیں۔ وہ اُن زبردست مصنفوں میں ہیں جنہوں نے اردو زبان کو اُس زمانے میں جب

---

[۳۸] خطوطِ شبلی ص ۱۰۰

پہلی بار اُسے سادہ وسہل بنانے کی کوششیں جاری تھیں بہت سے ایسے نئے الفاظ سے روشناس کرایا جن سے وسعتِ بیان میں آسانیاں پیدا ہوگئیں + تاریخ وسیرت کے پیچیدہ سے پیچیدہ مضامین اگر آج عام فہم طور پر اردو میں ادا کئے جا سکتے ہیں تو اس مشکل کو آسان کرنے والا پہلا شخص بلاشبہ شبلی ہی تھا +

ترتیبِ کتاب ۔ پیرایۂ بیان کی یہ سہل نگاری دراصل اُس نظم وترتیب کا اک نتیجہ ہے جو لازم طور پر شبلی کی طبیعت کا ایک جزو ہوگی ۔ راقم شبلی کے ذاتی روزمرہ کے حالات وعادات سے مطلق واقف نہیں لیکن وہ اُن کے اقوال، اُن کے پیرایۂ بیان، ترتیب وتنظیمِ واقعات اور تحلیل وتقسیمِ موضوعات میں اُس صفائی اور سادگی اور نفاست پسندی کی ایک جھلک دیکھ سکتا ہے جو شبلی کی زندگی کا ایک لازمہ ہوگا + مثال کے طور پر الفاروق کو لو۔ یہ کتاب ۱۸۹۹ء میں نامی پریس کانپور میں شائع ہوئی اور اس لحاظ سے اس کی ظاہری صورت نہایت پسندیدہ ہے اور لکھائی چھپائی بھی حسبِ حال ہے ۔ شروع میں فہرستِ مضامین ہے جس سے تقسیم وترتیبِ مضمون کے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے + پہلے تاریخ، عربی تاریخ، اصولِ فنِ تاریخ، تاریخی طرزِ تحریر اور اس خاص کتاب کی ترتیب و حوالہ جات پر ۲۲ صفحے کا ایک دیباچہ ہے ۔ اگلا عنوان ہے حضرتِ عمر کا نام ونسب ۔ سنِ رشد وتربیت ۔ پھر قبولِ اسلام جس سے اُن کی زندگی میں ایک انقلاب آیا ۔ پھر ہجرت جس سے اسلام کی تاریخ میں ایک انقلاب آیا پھر آنحضرت کے زمانے کے واقعات تا وفات ۔ پھر سقیفہ بنی ساعدہ کا جھگڑا اور حضرت ابوبکر کی خلافت ۔ اس کے بعد حضرتِ عمر کی خلافت اور فتوحات ۔ فتوحات کی الگ الگ فصلیں ہیں یعنی عراق ۔ واقعۂ بویب ۔ قادسیہ کی جنگ فتوحاتِ شام ۔ فتحِ دمشق ۔ فحل ۔ حمص ۔ جنگِ یرموک ۔ حضرتِ عمر بیت المقدس میں ۔ حمص کی دوسری لڑائی ۔ خالد کی معزولی ۔ عمواس کی وبا قیساریہ وجزیرہ ۔ خوزستان ۔ عراقِ عجم ۔ ایران پر عام لشکرکشی ۔ آذربیجان ۔ طبرستان ۔ آرمینیہ ۔ فارس ۔ کرمان ۔ سیستان ۔ مکران ۔ خراسان ۔ مصر ۔ اسکندریہ کی فتوحات ۔ اخیر میں ۱۰ برس چھ مہینہ ۴ دن کی خلافت کے بعد حضرتِ عمر کی شہادت ۔ یہ کتاب کا پہلا حصہ ہے جس میں حضرتِ عمر کے مختصر ابتدائی حالات اور فتوحاتِ اسلام کا ذکر ہے + دوسرے حصے میں جو اس مہتم بالشان تصنیف کی روح وروا‌ں ہے ۔ ملکی ومذہبی نظام پر ایک غائر نظر ڈالی ہے اور حضرتِ عمر کے ذاتی حالات وواقعات درج ہیں جن سے اُن کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے ۔ اس حصے کے عنوانات یہ ہیں ۔ فتوحات پر ایک اجمالی نگاہ ۔ نظامِ حکومت (جس میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرتِ عمر کی حکومت صحیح جمہوری اصولوں پر مبنی تھی) ملک کی تقسیم، صوبجات اور اضلاع، عہدہ دارانِ ملکی ۔ صیغۂ محاصل ۔ صیغۂ عدالت ۔ افتاء ۔ فوجداری اور پولیس ۔ بیت المال یا خزانہ ۔ پبلک ورکس

یا نظارتِ نافعہ۔ شہروں کا آباد کرنا۔ صیغۂ فوج۔ صیغۂ تعلیم۔ صیغۂ مذہبی متفرق انتظامات۔ ذمی رعایا کے حقوق غلامی کا رواج کم کرنا۔ سیاست و تدبیر۔ عدل و انصاف۔ امامت اور اجتہاد۔ اس کے بعد ہیں فرانی حالات اور اخلاق وعادات (جن کے پڑھنے میں اک افسانے کا لطف آتا ہے) ازواج و اولاد۔ خاتمہ۔ واقعات کو الگ الگ کردیا ہے۔ جہاں ایک اہم واقعہ پیش آیا جس کے بعد یا جس کی وجہ سے آنے والے واقعات کا رنگ پلٹ گیا وہاں سے ایک الگ فصل شروع کردی ہے۔ ضمناً ملکی حالات کے ساتھ معتبر روایات کو نقل کیا ہے جس سے کتاب کہیں خشک یا غیر دلچسپ نہیں ہونے پاتی۔ سفارتوں کے مکالمے، میدانِ جنگ کے معرکے اور حادثے تاریخ کو افسانے کی طرح دلکش بنا دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بحث طلب امور پر تحقیق و تدقیق سے غور کیا ہے اور گتھیوں کو ساتھ ساتھ سلجھا دیا ہے۔ دوسرے حصے میں جملہ نظاماتِ حکومت پر یکے بعد دیگرے نگاہ دوڑائی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم کسی موجودہ دولتِ متمدن کا حال کسی علمی جریدہ میں پڑھ رہے ہیں۔ یہی اس حصے کا جزوی نقص بھی ہے مانا کہ حضرتِ عمر کے زمانے میں وہ ترقیاں بروئے کار آئیں وہ ملکی و مذہبی ایجادات و اختراعات ہوئیں وہ ادارات قائم ہوتے جن میں سے اکثر کا پہلے وجود نہ تھا اور جو اکثر جزوِ اسلام بن گئے بنے ہیں لیکن اِن تمام حالات و بیانات کو اِس طرح پیش کرنا چاہئے تھا کہ یہ شبہ نہ ہو کہ مورخ یہ ثابت کرنے کے درپے ہے کہ حضرتِ عمر کا زمانہ یورپ کی انیسویں صدی کا زمانہ ہے۔ لیکن ایک اس فروگذاشت کے علاوہ اس حصۂ کتاب میں بظاہر کوئی کمی نہیں مصنف نے دریافتِ حالات میں کمال تحقیق اور بیان میں کمال وضاحت سے کام لیا ہے۔ یقیناً "الفاروق" اردو کی بہترین تصنیفات میں شمار ہونے کے قابل ہے اور وہ شبلی کی بہترین تصنیف ہے۔

مصنفانہ طریق کار۔ شبلی کے مصنفانہ طریقِ کار کے متعلق "سیر المصنفین" میں لکھا ہے کہ[۳۹]

مولانا شبلی کی زندگی میں چند باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ایک یہ کہ باوجود نہایت ضخیم کتابیں تالیف کرنے کے اور کثیر التصانیف ہونے کے وہ کسی دن بھی فلسکیپ کے دو یا تین صفحے سے زیادہ نہیں لکھتے تھے۔ زیادہ وقت مطالعہ میں اور زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ لکھنے دیر میں اور سوچ کر مگر اس میں کاٹ پھانس بہت کم ہوتی تھی۔ ہمیشہ ایک دو سطر بیچ میں چھوڑ کر کھلا کھلا لکھتے تھے۔ خط نہایت صاف اور باقاعدہ ہوتا تھا آخر عمر تک خوشنویسی کی شان اِس قدر تھی کہ شاید ہی کوئی اتنا بڑا مصنف حروف کی خوبصورتی کی اس قدر پروا کرتا ہو۔ ایک خاص بات اُن کی طبیعت میں یہ تھی کہ بجز تعلیم اور علمی

---

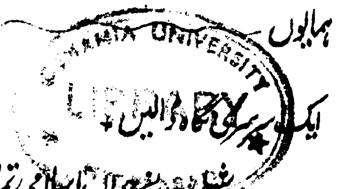
[۳۹] سیر المصنفین جلد ۲ ص ۴۴۰

مذاکرہ و مباحث کے اور کسی بات سے دلچسپی نہ تھی۔ غالباً ۱۰ برس کی عمر سے ۵۷ برس کی عمر تک اُن کے پورے ۴۷ سال خالص علمی زندگی میں بسر ہوئے یہ علمی زندگی بھی محض تقلیدی ورق گردانی نہ تھی اور نہ صرف بے کار معلومات کا دماغ میں جمع کرنا اِس کا مقصد تھا بلکہ وہ اس کے ذریعہ روشنی اور آزادی پھیلانا چاہتے تھے"۔

مقبولیّت۔ شبلی کی تصنیفات کو جو مقبولیت تعلیم و تمدن یافتہ طبقہ میں حاصل ہوئی وہ بہت کم اور مصنفین کی تصنیفات کو ہوئی۔ آزاد کی بعض تصنیفات اور حالی کی مسدّس کو چھوڑ کر غالباً مسلمانوں کو کسی حال کے مصنف سے اس قدر رغبت نہیں ہوئی جتنی شبلی سے۔ شبلی نے تاریخ اور فلسفہ کو جدّت کے رنگ اور ادب کی زبان میں لکھا، جو کچھ کہا تحقیق کے بعد کہا اور اس کے کہنے میں متانت اور سنجیدگی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ الفاروق نے خاص و عام کے دلوں پر قابو پالیا۔ الکلام نے بہت سے "یورپ زدہ" مسلمانوں کی مرہم پٹّی کی اور کامیابی کے ساتھ کی۔ الغزالی کے متعلق الکلام کی تمہید (رقمزدہ میر کاظم علی) میں لکھا ہے کہ "یہ امر خاص طور پر ذکر کے قابل ہے کہ سالِ رواں (سنہ ۱۹۰۲ء) میں ہندوستان کی گورنمنٹ نے اپنی انتظامی رپورٹ کے صفحہ (۶۰) میں الغزالی کو جو اسی سررشتہ (علوم و فنون حیدر آباد دکن) کی تصنیف شدہ ہے تمام کتابوں پر ترجیح دی ہے اور نہایت مدحیہ الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا ہے"۔

موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم اکثر نوجوان اردو شاعروں اور ادیبوں اور طالب علموں کے زیرِ مطالعہ رہتے ہیں اور اُن سے اور حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری سے تنقید کے اصول واضح ہو کر ادب و شعر روز بروز جلا پا رہے ہیں۔ شبلی کی آخری تصنیف سیرۃ النبی کو جو قبولیتِ عامہ حاصل ہوئی وہ گزشتہ چند سالوں سے کسی تصنیف کو نہیں ہوئی۔ اکثر مسلمان گھروں میں اور اکثر مسلمان نوجوانوں کے پاس اس عزیز و محبوب تصنیف کی ایک جلد ضرور موجود ہے اور جس تعلیم یافتہ مسلمان نے اس کا مطالعہ نہیں کیا اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے تساہل کی وجہ سے بزمِ ادب میں شرمسار نظر آتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شبلی کی تصنیفات کو اُن کی زندگی میں اور اُن کے بعد کس قدر مقبولیّت حاصل ہوئی اور کیسے اُن کا نام ہندی مسلمانوں کی مذہبی و علمی زندگی میں ہر دل عزیز اور ممتاز رہے۔

کمیاں۔ شبلی میں بلا شبہ بحیثیتِ مصنّف متعدد خوبیاں اور وصف ہیں جن میں سے اکثر صریحاً یا اشارۃً بیان ہو چکے لیکن آخر اُن میں کمیاں بھی تو ہونگی۔ اُن کی خوبیوں کے بعد ہمارا فرض ہے کہ ہم اِن کمیوں پر



ایک سرسری نگاہ ڈالیں +

شبلی نے جہاں اسلامی تمدن کی خوبیاں دکھائی ہیں وہاں ملکی تنظیم وتنسیق اور سیاسی ادارات کا اِس طریقے سے ذکر کیا ہے اور اُن کی تفصیلات ایسے پیرائے میں بیان کی ہیں کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ بالکل آج کل کے مغربی نظامات سے مشابہ تھے + مثلاً حضرتِ عمر کی جمہوری حکومت کے انداز کو یا اس کے ضمن میں انگریزی الفاظ کونسل اور پبلک ورکس اور پولیس کو اس طرح استعمال کیا ہے گویا اُس وقت کے ادارے بالکل آج کل کے اداروں کی مانند تھے + دوسرے جہاں مسلمان حکمرانوں کو متعصب نکتہ چینیوں سے بچانے کی کامیاب کوشش کی ہے وہاں بعض چیزوں کو خواہ مخواہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے مثلاً ذمیوں کی وضع کو مسلمانوں کی وضع سے الگ رکھنے کا اصول جو حضرتِ عمر نے قائم کیا تھا اُس کو بنظرِ استحسان دیکھنے کی کوئی وجہ نہیں بالخصوص جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ حضرتِ عمر نے عام طور پر ذمیوں کے حقوق کا ہر ایک طرح خیال رکھا یہاں تک کہ اپنی وصیت میں یہ خاص طور پر جتایا کہ ذمیوں سے جو عہد کئے گئے اُن کا خیال رکھا جائے اور اُنہیں اُن کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہ دی جائے + اِسی طرح اورنگ زیب کے بعض فتنہ گروں کے مندر ڈھا دینے پر صاد کرنا شبلی کے شایانِ شان نہیں - تیسرے - بعض مقامات پر مبالغہ بیان سے کام لیا ہے مثلاً الغزالی میں جہاں بیان کیا ہے[520] کہ امام صاحب نے فلسفہ اخلاق پر کیا اضافہ کیا وہاں لکھا ہے کہ اخلاق میں انہوں نے نفسِ فن کو اس قدر وسعت دی کہ یونانیوں کا فلسفۂ اخلاق اُس کے مقابلے میں قطرہ و دریا کی نسبت رکھتا ہے + اسی طرح علم الکلام میں شاہ ولی اللہ کے متعلق لکھا ہے[521] کہ اُن کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی رازی ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے + الفاروق میں لکھتے ہیں[522] کہ حضرتِ عمر نے فوجی نظم ونسق کو اس قدر مرتب اور منتظم کر دیا کہ غالباً اس عہد تک کہیں اور کبھی نہیں ہوا تھا + شعر العجم میں فیضی کے متعلق لکھا ہے[523] کہ "فیضی کی خصوصیات میں سب سے بڑھ کر جوشِ بیان ہے جس کا وہ موجد بھی ہے اور خاتم بھی" کتاب کے خاتمے پر فلسفیانہ شاعری کے تحت میں لکھتے ہیں[524] "فارسی شاعری میں فلسفیانہ خیالات کا جس قدر ذخیرہ ہے کسی زبان میں نہیں" اس قسم کے بیانات میں اگر ذرا زیادہ محتاط الفاظ استعمال کئے جاتے تو بہتر ہوتا ورنہ اِن میں کوئی ایسی فاش غلطی نہیں کہ ان کو قطعی لغو قرار دیا جائے + چوتھے - مذہبی اعتقاد کی بنا پر بعض جگہ واقعات کو اصولِ درایت کی نگاہ سے

---

۵۲۰ الغزالی ص ۸۹ ۵۲۱ ص ۱۰۹ ۵۲۲ الفاروق - جلد دوم - ص ۹۷ ۵۲۳ شعر العجم - جلد سوم - ص ۲۷ -

۵۲۴ شعر العجم جلد - ۵ - ص ۲۰۵ -

نہیں دیکھا مثلاً امام غزالی کی وفات پر بروایتِ ابنِ جوزی لکھتے ہیں کہ "پیر کے دن امام صاحب صبح کے وقت بسترِ خواب سے اٹھے، وضو کر کے نماز پڑھی، پھر کفن منگوایا اور آنکھوں سے لگا کر کہا "آقا کا حکم سر آنکھوں پر" یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیئے۔ لوگوں نے دیکھا تو دم نہ تھا"۔ اس قسم کی روایتوں پر شبلی عموماً یقین نہیں کرتے اور عموماً اُن کی ایسی تاویل کرتے ہیں کہ روایت کے خول کے اندر سے اصل واقعہ ظاہر ہو جاتا ہے لیکن کہیں کہیں ایسے تسامحات ہیں جن سے شبہ پڑتا ہے کہ قوتِ تنقید زورِ اعتقاد کے نیچے دب گئی + پانچویں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اگرچہ شبلی نے بالعموم مسلمانوں کے مذہب اور معاشرت میں آزادگی اور حریت اور عقل پسندی کے اصولوں کو برتا، اک نیا علمِ کلام مرتب کیا جس سے عقل وحجت کے ذرائع سے انہوں نے یورپ کی دہریت اور الحاد کی ایک بڑی حد تک روک تھام کی یہاں تک کہ نیا طبقہ اُن سے خوش ہو گیا اور علما کی جماعت کے اکثر افراد اُن سے برگشتہ ہوتے گئے لیکن پھر بھی بعض باتوں میں انہوں نے حالات سے متاثر ہو کر پوری وسیع نظری سے کام نہیں لیا + مثلاً زہرہ فیضی صاحبہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "ہم پرانے لوگ آزادی سے بے پردہ مجامعِ عام میں تقریر کرنا پسند نہیں کرتے لیکن آپ تو اس میدان میں آ چکی ہیں اس لئے اب جو کچھ ہو کمال کے درجے پر ہو" + یہاں تک کہ اُن کے ساتھ ولایت جانے پر بھی نیم آمادہ ہو جاتے ہیں یہ کہہ کر کہ "یورپ کی ہم سفری بھی چنداں بعید نہیں ممکن ہے ہمت پیدا ہو اور ساتھ چل سکوں"+ اس کے ساتھ ہی مقالاتِ شبلی میں گلبدن بیگم کے ذکر میں ناپردہ داروں پر چوٹ کر گئے ہیں[۵۴۵] اور سفرنامہ میں تھئیٹر میں جانے کو معیوب کہا ہے[۵۴۶] لیکن خیر یہ مدت ہوئی اس وقت کی رائے ہے + اصل یہ ہے کہ شبلی کم از کم اواخرِ عمر میں پردے کی سی پرانی رسوم کے دل میں ضرور مخالف ہونگے اور اسی طرح تھئیٹر کو "وقار و شائستگی کے خلاف" نہ سمجھتے ہونگے لیکن اکثر ایسی باتوں میں اُن کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ قدیم وضع کے علما و فضلا کے ہوتے علانیہ اپنی نئی راہوں کا اظہار کرتے اور ہدفِ ملامت بنتے + چنانچہ ایک خط میں عطیہ بیگم صاحبہ کو کم ہمتی کے الزام کے جواب میں لکھتے ہیں "تم کو کیا معلوم ہے کہ میں اگر عوام کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک فوراً برباد ہو جائے"+ اس سے ظاہر ہے کہ شبلی ایک نیک دل مصلح و مدبر تھے جو زمانے کی مصلحتوں پر نظر رکھتے تھے لیکن ایک مجدد یا مہاتما نہ تھے کہ وقتی بندشوں کو بے دھڑک توڑ سکتے اور جان و مال و عزت سب کو صداقت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتے +

شبلی بحیثیتِ مصنّف ۔ اخیر میں ہمیں شبلی کی بہت سی خوبیوں اور تھوڑی سی کمیوں سے قطعِ نظر کر کے

---

۵۴۵ مقالاتِ شبلی ص ۷۹ ، ۵۴۶ سفرنامہ ص ۲۱۱ ۔

یہ دیکھنا ہے کہ "شبلی بحیثیت مصنف" کیا کچھ تھا؛ اِس سوال کا جواب اُس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک ہم اُس کی تصنیفات کو جو سات ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہیں پسِ پشت ڈال کر یہ نہ سوچیں کہ "شبلی بحیثیت انسان" کیا کچھ تھا؟ شبلی اُس وقت ہندوستان میں پیدا ہُوا جب یہاں کے مسلمان قعرِ ذلّت میں گرا دیئے گئے تھے، جب حکومتِ جہانبانی کے ساتھ اُن کی شجاعت وہمت اور ایثار و خودداری بھی رخصت ہو چکی تھیں - وہ ایک ایسی فضا میں پیدا ہُوا جس میں مغربیت کی مخالفت قدامت و تعصب کی بجلی بن کر مضمر تھی - لیکن حسنِ اتفاق سے زمانہ اُسے ایک ایسے اصلاح یافتہ اسلامی ماحول میں لے گیا جہاں مشرقیت و مغربیت کے صحیح امتزاج نے ظلمتِ زوال میں نورِ کمال کا عالم پیدا کر دیا تھا - اُس کی طبیعت کے جوہر اِس نئی روشنی میں چمکے، اُس کی جودتِ طبع کی کرنیں دور و نزدیک پڑنے لگیں اور آخر اِس تابش میں اُس نے اپنے لئے ایک نیا جادۂ علم و اعتقاد وضع کر لیا + وہ اس امر کا متمنی ہُوا کہ علماء کی تہذیب و تنظیم کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو پھر قرونِ اولیٰ کی شاندار زندگی کی طرف لے جائے لیکن مواد تیار نہ تھا کہ اس سے یہ عالی شان قصر تعمیر ہو - مجبوراً شبلی کو اِس سودمند کام سے ہاتھ اٹھانا پڑا - وہ اپنے وطن کو واپس چلا گیا لیکن اُس کی فطرت اُسے نچلا نہ بیٹھنے دیتی تھی - اُس نے تنظیم کی نئی راہیں تلاش کیں اور پایانِ کار ایک خود ساختہ راہ پر ایک علمی گروہ کو لئے ہوئے چل نکلا تھا کہ داعیٔ اجل نے پروانۂ رحلت لا پیش کیا!

اِس راہ کا پہلا چلنے والا نہ رہا لیکن راہ قائم ہے اور روز بروز خس و خاشاک سے پاک و صاف ہو رہی ہے اور اسلامی روش پر چلنے والوں کو ہر لحظہ خیر مقدم کہنے کے لئے تیار ہے +

شبلی ایک بڑا مصنّف تھا لیکن اس کے ساتھ وہ ایک پکّا مسلمان بھی تھا، وہی اُس کے اوصاف ہیں جو ایک پکّے راست باز مسلمان کے ہو سکتے ہیں اور وہی اُس کی کمیاں ہیں جو ایک پکّے راست باز مسلمان میں عموماً پائی جائیں گی!

کون سا پیغام تھا جو شبلی لے کر آیا؟ اہلِ اسلام کا اسلام مکدّر ہو رہا تھا - نوجوان مسلمان مذہب سے منحرف ہو رہے تھے - یورپ آزاد خیالی اور عقل پسندی کا نعرہ بلند کر رہا تھا - شبلی نے اِس کے مقابل میں اسلامی حُریّت و معقولیت کا آوازہ لگایا، بھٹکے ہوؤں کو واپس بلایا کہ جس عقل کے جوہر کو تم غیروں کے ہاں ڈھونڈنے جاتے ہو وہ یہیں تمہاری قومی خس و خاشاک میں چھپا پڑا ہے آؤ اور اسے علم و تنقید کے ہاتھوں سے کھود نکالو!

شبلی دربارِ رسول کا عقیدت مند ہے وہ اسلام کا علم بردار ہے - وہ جو کچھ دیکھتا ہے اسلام کی آنکھوں سے جو کچھ کہتا ہے اسلام کی زبان سے اور جو کچھ سنتا ہے اسلام کے کانوں سے - اسلام اُس کی روح ہے اور اِسی سے اُس

کی دیکھنے اور بولنے اور سننے کی قوتیں برقرار ہیں۔ اس لئے اگر ایک غیر مسلم اعتراض کرے کہ شبلی چیزوں اور باتوں کو محض ایک مسلم بن کر دیکھ سکتا ہے تو اعتراض بجا ہے لیکن پھر اگر شبلی دُنیا و مافیہا کو ایک مسلم کی نظر سے نہ دیکھے تو دقت یہ ہے کہ وہ اِس کو مطلق دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اُس کی بینائی کو سرمۂ اسلام لازم ہے۔ کیا اب ہم کہیں کہ وہ اس سے مدد نہ لے؟ اِس کے معنی ہونگے کہ اُس جسم سے روح نکل جائے اُس جوہر سے چمک جاتی رہے اُس شخصیت سے اُس کی انفرادیت چھین لی جائے!

کارلائل نے خوب کہا ہے کہ ایمان بڑی چیز ہے ایمان زندگی بخش ہے! یہ ایمان ہی تھا جس نے عرب کو اِدھر دہلی اور اُدھر غرناطہ تک پہنچا دیا!

شبلی کا ایمان اسلام ہے اس لئے شبلی کی زندگی اسلام سے ہے اور اُس کا جو پیغام ہے وہ فی الحقیقت اسلام کا پیغام ہے! سچ یہ ہے کہ اسلام کا احیا اگر دنیا میں پھر ہو سکتا ہے، اہلِ اسلام کے مردہ جسم کی یہ روح اگر پھر زندہ ہو سکتی ہے تو محض ایسے ہی پُر خلوص و پُرجوش نفوس کی ہمت و کارپردازی سے!

کیا ہم شبلی سے امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ فاروقِ اعظم اور پیغمبرِ اسلام کی شخصیتوں کے متعلق نکتہ چینی کا قلم اُٹھائے؟ یہ امید ایسی ہی ہے جیسی ایک یہ امید کہ ایک ننھا بچہ اپنی ہی ماں سے محبت نہ کرے لپٹ نہ جائے اُس کی نگاہوں میں اپنی خوشیوں کی جنت نہ ڈھونڈا کرے بلکہ غیروں سے اُس کی برائی سنے یا کسی کے سامنے بلکہ اپنے آگے اپنے دل میں بھی اُس کو اک ذرا سا برا بھلا ہی کہہ سکے۔

اردو کے دوسرے بڑے مصنفین سے شبلی کا مقابلہ نہ صرف غلط ہوگا بلکہ لا حاصل۔ شبلی میں اپنی خوبیاں تھیں اُن میں اپنی۔ ہر شخص اور ہر شے کو اپنی جگہ دیکھو کہ

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ہاں خالص تصنیفی حیثیت سے الگ ہو کر محض انسانی و تمدنی حیثیت سے دیکھیں تو ظاہر ہے کہ اردو مصنفین میں شبلی ہی تنہا وہ مصنف ہے جس نے اک دار المصنفین اپنی یادگار چھوڑا!

بشیر احمد

عکسِ تحریرِ مولانا شبلی مرحوم

غزل

آن شوخ بسکہ پایۂ جنبش بلند ست
ہر شیوہ اش بپایۂ دل دردمند ست

آخر در شوق پاسِ گرانیِ ناز ہم بجا نماند
با آن کہ کار ما بہ صنمی خود پسند ست

بنگر تطاولِ خمِ گیسوی او کہ دل
صد بار رم نمود و ہمان در کمند ست

ہرگز حدیثِ شوق بہ پایان نمی رسد
یارب کدام جا سرِ این رشتہ بند ست

نسبت ہم فتنہ گستری بہ تماشایش
کلکِ نیزہ قد فتنہ طرازش بلند ست

ای دستِ شوق زحمتِ بی صرفہ می بری
دانستہ کہ دامنِ نازش بلند ست

می بینم این کہ تیرِ دل تا کی فرو کشد
پرسد ز من کہ زخمِ نگاہِ تو چند ست

تو بی نگاہ ناز زبان گردی و مرا
سرمایہ کہ بود ہمہ دل مستمند ست

شبلی بجوی ذوقِ تو در فراقِ دوست
شکر است نیم بہ زبان نوشخند ست

۱۵ اکتوبر

راز و نیاز

تم کہاں ہو میرے جیون دھن (سرمایۂ زندگی)؟ کیا نہ ملو گے؟ سچ مچ نہ ملو گے؟ اِس زندگی میں تمہیں ڈھونڈھتے ڈھونڈتے امید کی جوانی تھک کر چراغِ سحری کی طرح ہو چلی ہے۔

دیکھو زیادہ نہیں صرف ایک مرتبہ۔ صرف ایک بار تم مجھے اتنا بتا دو کہ تم میرے ہو۔ مجھے چاہتے ہو پھر میں فرہاد کی طرح، مجنوں کی طرح تمہیں ڈھونڈوں گا۔ جنگل جنگل پتّے پتّے میں ڈھونڈوں گا اور تمہیں تلاش کر لوں گا۔

آہ! تم بولتے کیوں نہیں۔ دیکھو تمہارے ہاتھ کا کھلونا یہ چندرماں ہنس ہنس کر کیسی پریم رس کی بارش کر رہا ہے۔ —— لیکن تم چپ ہو۔

لوگ تم کو منصف اور رحمدل کہتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے بالکل جھوٹ ہے۔ تم کیا ہو یہ میرے دل سے پوچھو۔ تم بے رحم ہو، سنگ دل ہو —— ہاں پتھر ہو —— بالکل پتھر۔

میں دیکھتا ہوں تم مجھ سے ناراض سے رہتے ہو۔ اور ناراض ہی نہیں بلکہ میرے خیال میں تم مجھ سے دشمنی بھی رکھتے ہو۔

میں جتنا تمہارے نزدیک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں تم اُتنا ہی مجھ سے دور ہو جاتے ہو۔ میں تمہارے درشن کا پیاسا ہوں اور تم مجھ سے چھپتے پھرتے ہو۔ میں تمہیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اور تم میرے لئے معمّا بن جاتے ہو۔

کیا کہا؟ میں بُرا ہوں! واقعی میں بُرا ہوں بہت بُرا ہوں۔ اچھا تو میرے اچھے ساجن! تم مجھ کو بھی اچھا کیوں نہیں بنا دیتے۔ تم نے مجھے بُرا بننے ہی کیوں دیا۔

اگر تم مجھ سے بولو! مجھے اپنا درشن دو، مجھے اپنے چرنوں کے پاس بیٹھنے دو، تو کیا میں کبھی اچھا نہ بن جاؤں گا؟

میں دیکھتا ہوں اے میرے سرِ دلشیور! تم روزِ ازل سے مجھے اچھا بنانے کی فکر میں ہو۔

ہائے تم نے کتنی خوشامدیں کیں۔ کتنا ڈرایا اور دھمکایا لیکن تمہارا یہ غلام تمہارے قابو میں نہ آیا۔

تمہاری خوشی کے سامنے مجھے جنت کی نعمت اور دنیا کی دولت کی کچھ پروا نہیں۔

جنّت اور نجات! آہ یہ تو تھکے ہوئے بچوں کو بہلانے کے کھلونے ہیں۔

میں تو تمہیں چھیڑ چھیڑ کر تمہاری توجہ ہمیشہ اپنے ہی اوپر مبذول رکھنا چاہتا ہوں۔ میری دلی خواہش یہی ہے کہ میں تم میں کھپ جاؤں تم مجھ میں سما جاؤ۔

اور دیکھو پریتم! میرے اِن بے شمار گناہوں کو اپنی رحم دلی سے کہیں معاف نہ کرنے لگنا!

(ترجمہ از گجراتی) — اعظم کریوی

رباعیاتِ امجد

ہر محفل سے یہ جانِ خستہ نکلا — اللہ اکبر اللہ اکبر
ہر بزمِ طرب سے اور آہستہ نکلا
منزل ہی نہیں یہاں مسافر کے لیے
سمجھا تھا جسے مقام رستہ نکلا

شش جہت تمام ہے اپنی خودنمائی کے لیے
آئینے کیے ہیں جمع آرائش کے لیے
کیا کیا نہ کیا جتن جاتا ہے
پیدا یہ بھی ہے اسی نمائش کے لیے

ہستی میں ہے جب تک کہ مساواتِ صفات — ہے جسم کو عدم سمجھو
رخ منتشا ہے کمال ہے
اظہارِ کمال میں ہے اس کو قدم سمجھو
سب کی ہی جو اتش ہے اس کو عدم سمجھو

ہم محفلِ عیش میں بھی مغموم ہے
ہم اہلِ وجود میں بھی معدوم ہے
ہم ایک ہے جدا کا ایک ہے
ہم کیا ہیں یہ جاننا ہے کہ محکوم ہے

امجد

۱ قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی

رباعیاتِ فراق

(۱)

ذروں کی نظر ہے ماہ تاباں کی طرف
پروانے کی آنکھ ہے چراغاں کی طرف
اے محو جمال دوست تیری ہستی فدا
میری بھی نظر ہے روئے جاناں کی طرف

(۲)

سونے والوں کو ہے جگاتی دنیا
افسانے سے [illegible] سناتی دنیا
دنیا کا بھید [illegible] نہ پوچھو
جب آنکھ کھلی تو سوتی پائی دنیا

(۳)

کتنوں کو مٹا چکی محبت تیری
کتنوں کو اٹھا چکی محبت تیری
نشیمن میں بھی آگ اے شمع حرم [illegible]
افسانہ بنا چکی محبت تیری

(۴)

دل کیا تھا کوئی شمع شبستان حیات
اندھیر ہوا بجھتے ہی [illegible]
دل ہی تھا کہ جس کے ساتھ دنیا کے لیے
بیٹھے ہوئے رو دیا کیے ہم رات کی رات

فراق

چوکیدار

غضب کی سردی تھی اور ہوا نے طوفان مچا رکھا تھا۔ کئی دنوں سے ایسا اندھیرا چھا رہا تھا کہ لوگ بھول گئے تھے کہ انہوں نے دن کی روشنی، دُھوپ اور صاف شفاف آسمان آخری بار کب دیکھا تھا۔

ہوا بے طرح چل رہی تھی! اُس کی ہائے وہُو میں ایسی دہشت وہیبت ملی ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ موت کے شہر سے آ رہی ہے۔ وہ برف کے ساتھ کھیل رہی تھی اور اپنے ہلاکت آفرین سانس کے ساتھ ہر چیز کو چاٹ رہی تھی۔

سرد ہوا نے انسانوں ہی پر لرزہ طاری نہ کر رکھا تھا بلکہ گاؤں کے تمام جھونپڑے گھاس کے تودے اور لکڑی کے ڈھیر بھی کانپ رہے تھے اور تاریک سایوں میں دبکے جا رہے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سردی سے ٹھٹھر رہے تھے یا خوف سے لرز رہے تھے؟ گاؤں کا گاؤں خوف کے پنجے میں اسیر تھا۔

یہ بادل، یہ بجلی، یہ آندھی اور یہ طوفان گاؤں والوں کے نزدیک عناصر کا کوئی بے معنی اور بے ہودہ کھیل نہ تھا بلکہ ایک آسمانی تازیانہ تھا جو کسی خاص مقصد کو لے کر نازل ہوا تھا۔ اور انہیں اس کا یقین تھا۔ پھر کیوں وہ اس سے نہ کانپتے؟ خدا کا خیال بجلی کے خوف کو دور کر سکتا ہے۔ لیکن جب باہر برفانی ہوا چل رہی ہو تو قہوہ خانے کی گرم فضا ہی میں گھستے بنتی ہے۔

بار بار ہوا میں سے "ہُو۔ ہُو۔ ہُو" کی آوازیں نکلتیں، اور اس مہیب آواز کے اعادے پر ملک شاہاں کے قہوہ خانے میں دیواروں کے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ اپنی گفتگو بند کر دیتے اور حقے چھوڑ کر ایک دوسرے کے چہروں کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگتے پھر ایک دوسرے سے اور قریب ہو جاتے۔

کوئی پکار اٹھتا "یا الٰہی! برف تو ہوئی اور سردی بھی اپنی جگہ پر درست ہے لیکن یہ تیز و تند ہوا ہمیں کیا پیغام دینا چاہتی ہے؟" مگر عناصر کے اس المناک گیت کے معنی بیان کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ مگر ہر شخص جانتا تھا کہ یہ ایک ماتمی راگ ہے جسے ہوا نے دنیا کے غموم وہموم، کمزوروں کی آہ و بکا، مصیبت زدوں کی ہائے وہُو، غریبوں کے آنسوؤں اور حاجت مندوں کی التجاؤں سے ترتیب دیا ہے۔

درد سے بھرا ہوا ایک سانس بھی فضا میں ضائع نہیں ہوتا۔ ایک دبی ہوئی بے آواز آہ سے لے کر دل کو چیر کے گزر جانے والی چیخ تک فریاد کی ہر لَے کو ہوا اکٹھا کر کے اپنے سینے میں رکھ لیتی ہو کہ اِس سے دنیا کے رنج و محن کی ایک لازوال شہادت تیار کرے۔ وہ ان آہوں اور زاریوں کو پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر لے جاتی ہے اور تاریک غاروں کی عمیق گہرائیوں میں ٹھونس دیتی ہے تاکہ کسی وقت یک لخت کھول کر انہیں پھر زمین پر نازل کرے اور لوگ خوف و مصیبت کی چیخوں کو اور نہ ٹلنے والی تقدیر کی سرگوشیوں اور دھمکیوں کو سنیں۔

یہ تھا اُن دیہاتیوں کا خیال جو اِس وقت قہوہ خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اِس ماتمی راگ کو سن رہے تھے جس کے الفاظ مرے ہوؤں کی آہیں، شیطانوں کی چیخیں اور گیدڑوں کے نعرے تھے۔ کیا طوفان اور جھکڑ ہی یہ سب آوازیں اپنے اپنے مسکنوں سے نکل نہیں آتیں اور اپنے غیر زمینی شور و غل سے فطرت کو اور زیادہ ہیبت ناک نہیں بنا دیتیں؟ ان کو سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، زبان خشک ہو جاتی ہے، گلا گھٹنے لگتا ہے۔

"ہُو۔ ہُو۔ ہُو!" طوفان اور تندی سے چلنے لگا۔ قہوہ خانے کی چھت کڑکڑانے لگی جیسے اس پر کوئی بھاری قدموں سے چل رہا ہو۔

ایک شخص نے یوں ہی بات کرنے کے لئے کہا "اوہ! باہر تو جہنم ہے! میرا دشمن کہیں پہاڑوں پر ٹھٹھر رہا ہو!"

دوسرے نے کہا "پہاڑوں کو چھوڑو، ذرا جرأت ہے تو تاکستان تک جا کر دکھاؤ۔"

کسی نے کہا "آسمان اور زمین کشتی لڑ رہے ہیں۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔ یہ غور و فکر کا موقع تھا۔

باہر کا دروازہ کھلا۔ تمام نگاہیں اُس طرف اُٹھ گئیں۔ دھندلی سی روشنی میں ایک آدمی کی شکل نظر آئی جس کا لمبا کوٹ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ گھنٹوں باہر طوفان میں رہا تھا۔

نووارد نے برف کو جھاڑتے ہوئے سلام کیا۔

ایک شخص نے سلام کا جواب دے کر کہا "حی! آؤ آؤ، اندر آ جاؤ۔ اوہو تم تو سردی سے جم گئے ہو گے!" اور دوسرے نے نہایت ہمدردی سے کہا "اسے بیٹھنے کے لئے جگہ دو۔"

نووارد نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "ہاں، واللہ، میں تو جم گیا! مجھ سے تو اب باہر ٹھیرا نہیں گیا۔ آسمان ٹوٹ ٹوٹ پڑتا ہے۔ انسان اُس کے نیچے دبا جا رہا ہے۔ کتنا طوفان ہے! کیسا جھکڑ ہے! مجھے گرم ہونے کے لئے قہوہ خانے میں آنا ہی پڑا۔ میں ابھی پھر باہر چلا جاؤں گا۔"

انگیٹھی کے اوپر ایک چھوٹے سے مٹی کے دیئے میں جو زیتون کے تیل سے بھرا ہؤا تھا ایک باریک سی بتی جل رہی تھی اور اس کا بے نور سا شعلہ ہوا میں لہرا رہا تھا اور ٹمٹما رہا تھا۔ یہ بھی طوفان کے خوف سے دبکا جاتا تھا لیکن پھر بھی اِس سے ایک دھیمی دھیمی روشنی نکل کر اُن چہروں کو نمایاں کر رہی تھی جو بوجھل استراخان ٹوپیوں کے نیچے سے جھانک رہے تھے، اور چند باریک اور زرد کرنیں نو وارد کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ یہ چہرہ ایک کسان کا چہرہ تھا جس پر محنت اور مشقت نے اپنے گہرے نقوش ثبت کر رکھے تھے۔ عمر کے لحاظ سے وہ جوان تھا لیکن تجربے کے لحاظ سے وہ بوڑھا نظر آتا تھا۔ اُس کی گھنی موچھوں کے نیچے اُس کے مضبوطی سے ملے ہوئے ہونٹ ظاہر کرتے تھے کہ وہ ایک زبردست ارادے کا مالک ہے۔ اُس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی لیکن بے قرار اور شرر ریز تھیں۔ وہ گاؤں میں رات کو پہرہ دیا کرتا تھا۔

اُس کا نام کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ سب اُسے حی کہتے تھے جو ارمنی کے لئے ایک دوسرا لفظ ہے۔ گو کہنے والے بھی ارمنی تھے لیکن وہ چونکہ ایک دوسرے گاؤں سے آیا تھا اس لئے اُسے حی کہ لینا آسان تھا۔ یہی حی تھا جو اَب ایک کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہؤا تھا۔ گاؤں میں اُس کے بہت سے ساتھی آئے تھے لیکن اب وہ تمام اُس سے جدا ہو چکے تھے اور وہ ایک بچھڑی ہوئی کونج کی طرح باقی رہ گیا تھا۔ اُسے بھیک مانگنے سے نفرت تھی اسی لئے وہ گاؤں کا چوکیدار بن گیا تھا۔

قہوہ خانے میں کیسا امن تھا! باہر طوفان تھمنے میں نہ آتا تھا۔ ہوا ایک زخمی درندے کی طرح شور مچا رہی تھی۔ رئیس کیوان نے کہا "بس ایسی ہی رات تھی جب وہ بیچارا موت کے منہ میں جا پڑا!" اُس کا اشارہ اِسی گاؤں کے ایک شخص کی طرف تھا جو تھوڑے ہی دن ہوئے طوفان کے چنگل میں پھنس کر اپنی جان کھو بیٹھا تھا۔

ایک اَور شخص بولا "کتنی دفعہ ہم نے اُس سے کہا باہر نہ جاؤ، اِس برف و باد میں آوارہ نہ پھرو، اپنے بیوی بچوں کا خیال کرو۔"

ملک نے کہا "کیسی جاہلوں کی سی باتیں کرتے ہو! یہ تو اُس کی پیشانی پر لکھا تھا کہ وہ باہر نکلے اور مر جائے۔ تقدیر سے اُسے کون بچا سکتا تھا؟"

ایک نے کہا "ملک تم نے سچ کہا" دوسرا بولا "تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے؟"

تقدیر، قادرِ مطلق تقدیر! ایسی مہیب رات میں اور اِس زمیں دوز قہوہ خانے کے اندر جب کہ باہر طوفان کے تھپیڑے دل میں غم انگیز کہانیوں کی یاد تازہ کر رہے ہوں گفتگو کے لئے اِس اندھی طاقت کے سوا کون سا موضوع زیادہ موزون ہو سکتا ہے؟

ہر شخص نے تقدیر کے متعلق کچھ نہ کچھ کہا اور سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ تمام انسانی اسباب اور کوششیں تقدیر کے سامنے عاجز ہیں۔

کمرے کے ایک کونے سے آواز آئی "میں تقدیر کا ذرا بھی قائل نہیں ہوں"

تمام نگاہیں اُس طرف اُٹھ گئیں۔

ملک نے ہجویہ انداز میں کہا "یہ اژدہا کہاں سے بولا؟"

اسی آواز نے ذرا اور مضبوط لہجے میں جواب دیا "یہ میں ہوں، ملک، تمہارا خادم۔ میں تقدیر کا قائل نہیں ہوں"

لوگ نہ جانتے تھے کہ اُس پر ہنسیں یا ناراض ہوں۔ یہ جو تقدیر کی زبردست طاقت کا قائل نہ تھا رات کو گاؤں میں پہرہ دینے والا مفلوک الحال چوکیدار تھا۔

چوکیدار کے اِس زعم نے سب کے دلوں کو سخت تکلیف پہنچائی۔ امیر اور طاقتور ملک تقدیر کا قائل تھا اور اُس سے ڈرتا تھا۔ رئیس کیوان جس کے ڈنڈے کے سامنے سب سوکھے پتّے کی طرح کانپتے تھے، وہ بھی تقدیر سے سخت خائف تھا۔ امام اپنے ہر وعظ میں تقدیر کی طاقت کا ذکر کیا کرتا تھا۔ غرض کہ سب پر تقدیر نے اپنی ہیبت بٹھا رکھی تھی، لیکن یہ بے برگ و نوا انسان نہ اس کا قائل تھا اور نہ اس سے ڈرتا تھا۔

اُس نے دیکھا کہ وہ سب اُس کی طرف حقارت آمیز نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اُس نے پھر ایک دفعہ ذرا اور قوی آواز سے کہا "میں تقدیر کا قائل نہیں ہوں۔ اور میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں درست کہہ رہا ہوں لیکن افسوس ہے کہ مجھے اب گاؤں کے گرد ایک چکّر لگانا ہے" وہ اٹھ کر جانے لگا۔

کئی پرشوق آوازیں یک دم بلند ہوئیں "ٹھیرو، ٹھیرو، حی ٹھیرو! رئیس اِس سے کہو کہ ٹھیر جائے، گاؤں کو آج رات کوئی خطرہ نہیں"

رئیس کے کہنے پر حی پھر بیٹھ گیا۔ سب لوگ منتظر نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگے کہ یہ شخص جو تقدیر کا اِس سختی سے انکار کرتا ہے اپنی کہانی کب شروع کرے گا۔

اُس نے اپنی سرگزشت شروع کی "اُس سال ہماری ٹولی میں دس آدمی تھے —— دس دلیر اور جری آدمی۔ ہم کئی کئی مہینے ایک ریگستان سے دوسرے ریگستان، ایک وادی سے دوسری وادی اور ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ میں پھرا کرتے تھے۔ جہاں سانپ پانی پیتے تھے وہیں ہم بھی پیتے تھے، جن پتھروں کے نیچے سانپ چھپے ہوتے تھے اُن کے اُوپر ہم سوتے تھے۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟ ہم نے اپنے وقار کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ ہم نے

اپنے صبر کی کوئی انتہا نہ رکھی تھی لیکن ہمارے دشمنوں کے ظلم کی بھی کوئی انتہا نہ تھی —— اُن کے سنگدلانہ ظلم کی بہ ہمارے پاس کھانے کو روٹی تک نہ تھی اور جو تھی تو کھانے کے قابل نہ تھی۔ وہ زہر کی طرح ترش ہوگئی تھی۔ اس لئے ہم نے اپنے گھربار، بیوی بچوں کو چھوڑ دیا تھا اور اپنی بندوقیں کندھوں پر رکھ کر ہم اپنی عزت کے دامن سے دھبے چھڑانے کے لئے نکل پڑے تھے۔

"ہم نے یہ اچھا کیا تھا۔ اب ہم آزاد تھے۔ آہ! جب کسی کو ہماری طرح مصیبتیں پیش آئیں، جب اُس کی بہن، اُس کی بیوی، اُس کی ماں کی توہین کی جائے، جب اُس کے بیٹے کو مار دیا جائے اور اُس کے باپ کو گالیاں دی جائیں تو اُس کے پاس کچھ باقی نہیں رہتا —— بندوق کے سوائے کچھ نہیں۔

"ترک اور کُرد ہمیں فتاوی (واجب القتل) کہتے تھے، لیکن ارمنی ہمیں منتقم شیاطین کے نام سے پکارتے تھے۔ ہمارا خوف ہمارے آگے آگے چلتا تھا اور اپنے پیچھے ہم موت کو چھوڑتے جاتے تھے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر عقابوں کے گھونسلوں کے پاس ہمارا مسکن ہوتا تھا۔ آہ، ہم نے کہاں کہاں کا سفر کیا! کتنے ترک اور کُرد ہم نے مار ڈالے! اور اُن کے ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملا دیا! انہوں نے ہر جگہ ہمیں تلاش کیا مگر ہماری ہستیاں غیر مرئی ہستیاں تھیں۔ ہم ہر کہیں موجود تھے اور پھر کہیں بھی نہ تھے۔ کسی فتاوی کا سراغ نکالنا آسان کام نہیں اور اُس سے دوچار ہونا تو خطرۂ عظیم کے مرادف ہے۔ یہ ہمارا حال تھا اور ہم اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے کے منتظر تھے۔ تقدیر پر ہمارا پورا ایمان تھا۔

"ہم کوہ وسیم پر رہا کرتے تھے جب ایک دن ہمارے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ رہا۔ خوراک مہیا کرنے کے لئے قرعہ میرے نام نکلا۔ میں اس علاقے کے دیہات سے واقف تھا۔ دن دہاڑے بغیر کسی ہتھیار کے میں نے اپنی کمین گاہ سے نکل کر پہاڑ سے نیچے اُترنا شروع کر دیا۔ میں نے خیال کیا اول تو میں دشمن کی نظر بچا کر نکل جاؤں گا اور کسی کا سامنا ہو بھی گیا تو میرا خالی ہاتھ ہونا ہی میری نجات کے لئے کافی ہوگا۔ لیکن اگر میں مارا گیا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میری قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا۔ چنانچہ میں گیا۔

"کچھ عرصے تک مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ مجھے وادی تک پہنچنے کے لئے ایک پہاڑ کو عبور کرنا تھا۔ جب میں اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو وہاں میں نے ایک کُرد سپاہی کو دیکھا جو پُورے طور پر مسلّح تھا۔

"میں نے بے پروائی سے کہا "سلام کرو! (آغا)"۔

"کرد نے جواب میں کہا "سلام فلاّ (پرستار زادے)" لیکن وہ گزر نہ گیا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

"مگر میں نہ ٹھیرا۔ میں اُسی طرح چلتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ وہیں کھڑا میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے

اپنی رفتار ذرا بھی تیز نہ کی تاکہ اُس کے دل میں میری طرف سے کسی قسم کا شک پیدا نہ ہو۔

"اتنے میں اُس نے آواز دی "او فلا ٹھہر جاؤ"۔ میں ٹھہر گیا اور پیچھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "میری تقدیر آ پہنچی"۔ مجھے پہلے ہی امید تھی کہ میری تقدیر مجھے ایک ایسے ہی کُرد کی صُورت میں آ ملے گی۔ اُس کی بندوق اُس کے کندھے پر تھی، اُس کی تلوار اُس کے پہلو میں لٹک رہی تھی اور اُس کا ہاتھی دانت کے دستے والا خنجر اُس کے کمر بند میں آویزاں تھا۔ اُس کے چہرے سے شیطنت برس رہی تھی اور اُس کی آنکھیں ایک بھُوکے بھیڑیے کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ وہ میرے پاس آ گیا۔۔

"کرد نے کہا" آج کل اِن علاقوں میں کسی فلا کو آنے کی جرات نہیں۔ تم مجھے شریف آدمی معلوم نہیں ہوتے۔ تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟

"میں نے کہا، "اے کرد، ہم پر بڑا بُرا وقت آ پڑا ہے۔ مگر ہم تمہارے ہمسائے ہیں۔ میں خوط سے آیا ہوں۔ ہمارے علاقے میں قحط پڑ گیا ہے، جیسا کہ تمہیں معلوم ہے۔ میں طرشان میں اپنے بچوں کے لئے روٹی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ مجھے اپنے راستے پر جانے دو"۔

"نہیں فلا تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ تم مجھے شریف آدمی معلوم نہیں ہوتے"۔

"کُرد، خدا کو مانو۔ تم دیکھتے ہو میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ میرے پاس چاقو تک نہیں۔ دو خالی ہاتھوں کے ساتھ میں کیا کر سکتا ہوں؟ مجھے گزر جانے دو"۔

"میرے آگے آگے چلو میں تمہیں گورنر کے پاس لے جاؤں گا"۔

"گورنر کے پاس! گورنر کے پاس جانا مجھے بھلا معلوم نہ ہوا۔

"کُرد، مجھے گورنر کے پاس نہ لے جاؤ۔ وہ مجھے کچھ کہے گا تو نہیں لیکن مجھے دیر ہو جائے گی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچوں پر رحم کرو۔ وہ بھوک سے مر جائیں گے۔ کُرد، خدا کے لئے مجھے جانے دو"۔

"مگر کُرد کو ذرا رحم نہ آیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا یہ میری تقدیر ہے، اور سر جھکا کر اُس کے آگے آگے چل پڑا۔ میں کیا کر سکتا تھا؟ میں اُس کے قبضے میں تھا۔ بندوق اُس کے کندھے پر تھی، تلوار اُس کے پہلو میں اور خنجر اُس کے کمر بند میں۔ ہم چلتے رہے۔

"ہمارے آس پاس ہر چیز پر حُسن چھایا ہوا تھا۔ آفتاب روشن تھا۔ آسمان صاف تھا۔ پہاڑیاں سرسبز تھیں۔ پھُول مہک رہے تھے۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔ ہر طرف زندگی اور مسرت کا دور دورہ تھا۔ دُور

آسمان پر ایک کلنگ آزاد اور بے کھٹکے اُڑ رہا تھا۔ میں اُس کے دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ کچھ دیر کے لئے اپنے متعلق مجھے کسی قسم کا خوف نہ رہا۔ کیا اُس کی آزادی پر مجھے رشک آرہا تھا یا کوئی اَور بات تھی جس نے میری توجہ کو یوں اپنی طرف منعطف کر رکھا تھا؟ مجھے معلوم نہیں کیوں میں اُس میں کھو گیا تھا۔ جب کلنگ عین ہمارے سر کے اوپر پہنچ گیا تو یکایک اُس نے نیچے کی طرف رُخ کیا اور ایک قریب کے ٹیلے پر اتر گیا۔ مَیں نے قیافے سے معلوم کر لیا کہ وہاں سانپ ہے جسے کلنگ نے اوپر سے دیکھا ہے۔ اُس کے پروں کی آواز سُن کر سانپ نے اپنا منہ اپنے لچھوں میں چھپا لیا۔ اس کے بعد خوب لڑائی شروع ہوئی۔ ہم دونوں دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔

"گُرد نے کہا، "دیکھتے ہو؟ سانپ ایک فتنہ ہے اور اسی طرح اُس کا غارت کر دینا لازم ہے"۔

"مَیں نے کچھ جواب نہ دیا۔ مَیں دیکھ رہا تھا۔ کلنگ ایک طرف ہٹ گیا۔ اُس نے اپنی چونچ سانپ کے جسم میں گھونپ دی اور پھر ایک طرف ہٹ گیا۔ سانپ نے بھاگنے کی کوشش کی، لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے پیچوں کو کھولتا اُس کے مہیب دشمن نے اُس پر حملہ کیا۔ سانپ پھر اکٹھا ہو گیا اور اُس نے اپنا سر چھپا لیا۔ میرا خیال غلط تھا کہ اب اُس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ میری کچھ ڈھارس بندھی۔ رفتہ رفتہ کلنگ زیادہ دلیر ہوتا گیا وہ اب زیادہ سرعت اور زیادہ شدت سے حملے کرنے لگا۔ آخر جب اُس نے سمجھا کہ سانپ کی سب طاقت زائل ہو چکی ہے تو وہ اُس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تاکہ ایک آخری حملہ کر کے اُس کا کام تمام کر دے۔ سانپ نے اب تک اپنا سر باہر نہ نکالا تھا اور نہ مدافعت کی کوشش کی تھی۔ اب کلنگ اُس کے بالکل قریب تھا۔ یکایک ایک حیرت انگیز بات ظہور پذیر ہوئی۔ قریب المرگ سانپ نے آخری بار اپنی قوت کو مجتمع کیا، سر اٹھایا، جسم کو کھول دیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک ہی دفعہ اُس نے کلنگ کی لمبی گردن کو اپنے پیچوں میں جکڑ لیا۔ کلنگ نے بہت کوشش کی مگر وہ اپنے آپ کو اس موت انگیز ہم آغوشی سے جدا نہ کر سکا۔ اُس کے پر لٹک کر زمین پر آ لگے۔ اُس کی چونچ مٹی سے آلودہ ہو گئی۔ وہ بہت سٹپٹایا۔ اُس نے اُڑنے کی کوشش کی، لیکن اُس کی تمام کوششیں بے کار گئیں۔ سانپ کا بے اندیشانہ غصہ خطرناک تھا۔ اُس کے پیچ اَور سخت ہوتے گئے، اور آخر کار کلنگ بے جان ہو کر زمین پر آرہا۔ سانپ نے اپنی گرفت چھوڑ دی اور چلا گیا۔

"گُرد نے کچھ نہ کہا۔ اُس نے صرف میری طرف دیکھا اور ایک طویل لمحے کے لئے ہماری نگاہیں ایک دوسرے پر جمی رہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے خیالات معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم دونوں کے دل

میں ایک دوسرے کے لئے خطرناک خیالات گزر رہے تھے۔ اور ہماری آنکھوں سے صاف اُن خیالات کا اظہار ہوتا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کلنگ پر سانپ کی غیر متوقع فتح نے کُرد کو ہوشیار کر دیا ہے اور وہ میرے قتل کا فیصلہ کر چکا ہے۔ لیکن میں بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ سانپ اور کلنگ کی اِس لڑائی نے مجھ میں بھی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ میں نے یہ کبھی نہ سنا تھا کہ سانپ نے کلنگ کو زیر کیا ہو۔ کلنگ سانپ کا جانی دشمن ہے، اُس کی تقدیر کا مالک۔ مگر آج یہ کیسے ممکن ہو گیا کہ اُس کی تقدیر اُس پر غلبہ نہ پاسکی؟ کیا وہ خدا جس نے اِس بے بس سانپ کو کلنگ کا ناحق شکار نہ ہونے دیا میری تقدیر کا فیصلہ اِس کُرد کے ہاتھوں دیکھنا گوارا کرے گا؟ نہیں، میں نے کہا، میں غلطی پر تھا۔ انسان کو نجات کی راہ ڈھونڈنی چاہئے۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ کوئی راہ نکل آئے۔ مگر وہ راہ کون سی ہوسکتی ہے؟ میرے پاس تو ایک چاقو بھی نہیں تھا۔ اُسی وقت میری نظر اُس خنجر پر پڑی جو کُرد کے کمر بند میں اٹکا ہوا تھا۔ آہ! کاش میرے پاس یہ خنجر ہوتا ——— صرف یہ خنجر!

"کُرد نے گرج کر کہا، چلے چلو! تم کھڑے کیوں ہو گئے؟

"میں چلتا رہا۔ ہم ایک تنہا اور تاریک وادی میں داخل ہو رہے تھے کہ کُرد نے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ اُس نے بندوق اپنے کندھے سے نیچے اتاری لیکن پھر وہیں رکھ دی۔ میں نے خیال کیا کہ اب انجام نزدیک ہے۔ لیکن میں ابھی مرنا نہ چاہتا تھا۔ اگر ایک سانپ زندہ رہنے کا حق رکھتا ہے تو انسان کو یہ حق اُس سے بہت زیادہ ملنا چاہئے! میری رفتار سست ہو گئی۔ مجھے خیال آیا کہ کُرد کے آگے آگے چلنا یقیناً میرے لئے خطرے کا باعث ہے۔

"کُرد نے کہا "تیز چلو، تیز!" وہ مجھے اپنے سامنے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں اُس کے پہلو بہ پہلو چلنا چاہتا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا اور ہمارے درمیان ایک خاموش جنگ جاری ہو گئی ——— ایک ہلاکت آفریں جنگ، جس کے پوشیدہ منصوبے دہشت انگیز طور پر خطرناک تھے۔

"یکایک میں کھڑا ہو گیا۔ میری کھڑاؤں کے تسمے ڈھیلے ہو گئے تھے۔ کُرد میرے پاس آپہنچا اور وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ میری داہنی طرف کھڑا تھا اور اُس کے خنجر کا سفید دستہ اُس کے کمر بند میں آگے کو نکلا ہوا تھا۔

"مجھے سست دیکھ کر وہ غصے سے پکارا "جلدی کرو فلاں! جلدی کرو!"

"میں بجلی کی طرح اٹھا اور قبل اس کے کہ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے کوئی حرکت کرے میں نے اُس

کا خنجر نکال کر اُس کے سینے میں گھونپ دیا۔ اُس نے ایک دفعہ ہائے کیا اور زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ میں بچ گیا تھا۔ دیکھو جس خنجر نے مجھے بچایا تھا وہ یہ ہے!"

چوکیدار نے ہاتھی دانت کے دستے والا ایک خنجر اپنے کمر بند سے نکالا اور سامعین کو دکھایا۔ سب نے جھک جھک کر اُس بھیانک ہتھیار کو دیکھنا شروع کیا جس نے ایک شخص کو تقدیر کے پیچ در پیچ دام سے آزاد کرایا تھا۔ حی، وہ معمولی سا آدمی اب حقیقت میں سب کی نظروں میں ایک اژدہا بن گیا تھا۔ اُس نے تقدیر پر غلبہ پالیا تھا۔ تقدیر اُس کے آگے ہیچ تھی۔ وہ حق بجانب تھا۔

حی نے پھر کہا "میں تقدیر کا قائل نہیں ہوں"۔ مگر اس دفعہ کسی نے اُس کی ہنسی نہیں اُڑائی۔ بلکہ سب نے اُس کی بات احترام آمیز خاموشی کے ساتھ سن لی۔

اُس نے خنجر اٹھا کر اپنے کمر بند میں رکھا اور باہر کی طرف چل دیا۔ کوئی اُسے روک نہ سکا۔

باہر اُسی طرح ہوا چل رہی تھی، مگر اب اُس میں تقدیر کی دل ہلا دینے والی دہشت موجود نہ تھی۔ ہوا کی کثیر التعداد آوازوں میں اب ایک آواز یہ بھی آرہی تھی "آزادی کے لئے لڑو"۔

(ترجمہ) منصور احمد

انسان کے لئے صرف ایک ہی صراط المستقیم ہے اور وہ یہ کہ ہستیٔ مطلق سے بغاوت پیدا کرے اور بھولے بھالے ایٹم (Atom) سے راہ و رسم پیدا کرے یعنی اگر وہ اس قدر بدقسمت ہو کہ اس کو کسی کی آنکھوں، کسی کے بالوں کے تصوّر سے فرصت ہو

فلک پیما

ذرا اُن گھومتی ہوئی نگاہوں کی زبان تو پڑھو۔ بس دل ہی جانتا ہے!

صرف ستارہ ہی ٹھیک چمکتا ہے سیارے کی کرن ہوتی ہے تو محض ہلکی ہلکی مدھم سی!

گلچیں

غزل

چہرہ مئے شباب سے گلنار ہو چلا
فتنہ جو سو رہا تھا سو بیدار ہو چلا

دل آرزو کے نام سے بیزار ہو چلا
دیوانہ اپنے کام میں ہشیار ہو چلا

مدت کی مشق میں دلِ رنگیں کا خونِ شوق
سب رفتہ رفتہ رنگِ رخِ یار ہو چلا

کچھ اس ادا سے عشق نے چھیڑا ربابِ غم
جس نے سنا وہ غم کا طلب گار ہو چلا

اس عقلِ ہرزہ کار کو ٹھکرا کے آج میں
پھر دامِ رنگ و بو میں گرفتار ہو چلا

اتنی اٹھائی ہیں غمِ حرماں کی لذتیں
اب عرضِ مدعا بھی مجھے عار ہو چلا

پھونکا وہ چشمِ شوخ نے افسونِ التفات
کمبخت دل بھی اُن کا طرفدار ہو چلا

ذوقی یہ شانِ حُسنِ تلوّن نہیں تو کیا؟
انکار کر دیا کبھی اقرار ہو چلا

ذوقی

لاعلمی

علم اور واقفیت ایک نعمت ہے، اس کے بغیر انسانیت کی تکمیل نہیں ہوتی لیکن اگر غور کرکے دیکھو تو لاعلمی اور عدم واقفیت اس سے بھی بڑی نعمت ہے اور اس کے بغیر زندگی کی تکمیل نہیں ہوتی، جو کچھ ہم جانتے ہیں اور جن چیزوں سے ہمیں واقفیت ہے اس سے کہیں زیادہ اہمیت اُن چیزوں کو حاصل ہے جن کا ہمیں مطلق علم نہیں،

زندگی صد ہا رازوں کا مخزن ہے، خود زندگی ایک راز ہے جتنا علم بڑھتا جاتا ہے واقفیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اتنا ہی زندگی کا لطف کم ہوتا جاتا ہے، عدم واقفیت اور لاعلمی زندگی کا سہارا ہے، جب ہمیں کسی چیز سے واقفیت ہو جاتی ہے تو اس چیز کے اندر پھر ہمارے لیے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی، اپنے بچپن کا زمانہ یاد کرو، تمہیں بارہا ایسا اتفاق ہوا ہو گا کہ رات کے وقت گھر واپس آتے ہوئے اندھیرے میں کچھ سفید سفید چیز متحرک نظر آرہی ہے، جب تک تمہیں یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ کیا چیز ہے دل میں کیسے عجیب و غریب دھڑکے محسوس ہوئے ہوں گے ممکن ہے کوئی بھوت ہو ممکن ہے کوئی آدمی چھپا کھڑا ہو لیکن جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ درخت کی ایک نیچی شاخ پر کسی نے دھوتی سوکھنے کے لیے لٹکا دی ہے جو ہوا سے ہل رہی ہے تو تمہاری ساری دلچسپی زائل ہو گئی،

تم ایک شعبدہ باز کا تماشا دیکھتے ہو وہ ٹوکری میں کبوتر بند کر دیتا ہے اور جب ٹوکری اٹھاتا ہے تو کبوتر غائب ہوتا ہے مٹھی میں تمہارے سامنے ایک روپیہ رکھتا ہے اور جب مٹھی کھولتا ہے روپیہ نہیں ہوتا، تمہیں ان حرکتوں میں صرف اس لیے لطف آتا ہے کہ تم نہیں جانتے کہ وہ یہ سب کیونکر کرتا ہے، اگر تمہیں ان شعبدوں کی ترکیب معلوم ہو جائے تو پھر کوئی دلچسپی باقی نہ رہے اور تم اس کے حیرت انگیز کارنامے دیکھنے کے لیے روپیہ صرف نہ کرو،

زندگی کے ہر دور میں جن چیزوں سے ہم واقف نہیں ان کی اہمیت ان چیزوں سے کہیں زیادہ ہے جن سے ہم واقف ہیں کوئی نہیں جانتا کہ خدا جانے کل کیا واقع ہونے والا ہے، کاروبار میں تجارت میں کسی بڑے سے بڑے ماہر کو بھی معلوم نہیں کہ کل بازار کا کیا رنگ ہو گا، کون جانتا ہے کہ موسم کی کیفیت اگلے دن کیا ہو گی۔ کسے معلوم ہے کہ آب و ہوا کا کل کیا حال رہے گا ہم دوست بناتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ وہ کیسے ثابت ہوں گے ہم اُن سے نباہ بھی سکیں گے یا نہیں ہم شادی کرتے ہیں لیکن نہیں کہہ سکتے کہ وہ خانہ آبادی کا سبب ہو گی یا خانہ بربادی کا زندگی کا اعتبار نہیں، موت کا راز کسی کو معلوم نہیں موت کے بعد کون جانتا ہے کیا ہو گا، بس ایک غیر محدود سلسلہ ان اشیا کا ہمیشہ ہمیں گھیرے ہوئے ہے جن سے ہم بالکل واقف نہیں،

نامعلوم اشیا سے لوگ ڈرتے ہیں، کہتے ہیں کہ پردۂ غیب سے خدا جانے کیا ظہور میں آئے لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ خداوند کریم نے دنیا میں "معلوم" اشیا کی بہ نسبت "نامعلوم" اشیا زیادہ پیدا کی ہیں پس ہو نہیں سکتا کہ وہ انسان کی بہتری کے لیے

نہ ہوں، اگر ذرا غور کرو تو معلوم ہوگا کہ زندگی میں جس قدر بہتر اور راحت بخشنے والی چیزیں ہیں ان سب کی بنا عدم واقفیت پر ہے اور وہ سب پردۂ غیب سے ظہور میں آئی ہیں، صحیح معنوں میں عقلمند اور دانا وہی شخص ہے جو نامعلوم اشیا کی اہمیت سے آگاہ ہے نہ وہ جو اپنے علم اور واقفیت پر نازاں ہو، اس کا سبب یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنا علم ہمیں ہے جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں جو ہم نہیں جانتے تو اس میں عجز و انکسار پیدا ہو جاتا ہے اور یہی علم اور عرفان کی طرف پہلا قدم ہے،

عدم واقفیت کا احساس عقل و دانائی کی ابتدا ہے بالکل ایسے ہی جیسے واقفیت پر غرور دماغی ترقی کے لئے آخری حد ہے، تم نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ سطحی ہوتے ہیں اور جن کا دماغی سرمایہ جہالت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا وہی سب سے زیادہ اپنے علم و عقل پر غرور کرتے ہیں اور بہ بانگ دہل اس کا اعلان کرتے ہیں اور جنہیں خدا نے صحیح معنوں میں علم حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے اور جو اس دولت سے مالامال ہیں وہی سب سے پہلے اپنی تنک سامانی اپنی تہی دستی اور اپنی محدود واقفیت کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نظر آئیں گے،

شاید دنیا میں سب سے بڑا عقلمند سقراط تھا اور جانتے ہو اس کا تکیہ کلام کیا تھا "میں تو کچھ بھی نہیں جانتا"

کبھی تم نے "کشش ثقل" کے مسئلہ پر عالمانہ غور سے جدا رہ کر غور کیا ہے، مادہ کے ہر ذرہ میں کوئی ایسی چیز ہے جو مادہ کے ہر دوسرے ذرہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے، یہی چیز یہی قوت اجرام فلکی کو ایک نظام میں وابستہ کئے ہوئے ہے اور خدا کی زمین کے ہر جزو پر اپنا تسلط اور قبضہ جمائے ہوئے ہے، لیکن نیوٹن بھی جس نے ہمیں بتایا کہ سیب زمین پر اس لئے گرتا ہے کہ ہر مادی چیز دوسری مادی چیز کو اپنے حجم اپنے وزن اور فاصلے کی نسبت سے اپنی طرف کھینچتی ہے اس امر سے واقف نہیں ہے کہ یہ قوت اصل میں ہے کیا؟ بالکل اسی طرح جس طرح وہ بچہ اس قوت سے آگاہ نہیں جو کہتا ہے کہ سیب اس لئے زمین پر گرتا ہے کہ وہ بھاری ہے اور شاخ اس کا بار نہیں سنبھال سکتی،

آج کل گھر گھر بجلی سے کام لیا جاتا ہے، ہم اس سے گاڑیاں چلاتے ہیں، پنکھے چلاتے ہیں روشنی حاصل کرتے ہیں، ایک منزل سے دوسری منزل پر دوسری منزل سے تیسری پر اور ایسی بیس بیس منزلوں تک پہنچ جاتے ہیں، ایک تار لگا کر صدہا کوس کے فاصلے پر گھر بیٹھے بات چیت کرتے ہیں، یہی نہیں بلکہ بے تار لگائے بھی گفتگو کرتے ہیں، ہزارہا کوس کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے تقریر سنتے ہیں، موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں، غرض بجلی "حیات جاوید" کی روح رواں ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ بجلی ہے کیا چیز،

زندگی ایک قوت ہے، ایک طاقت ہے اور ایسی چیز ہے جس سے زیادہ اور کوئی چیز ہم سے قریب نہیں لیکن کون جانتا ہے کہ زندگی ہے کیا چیز، وہ کہاں سے آتی ہے اور پھر کہاں کو چلی جاتی ہے، آج تک کوئی سائنس داں زندگی کو ظہور میں نہیں لا سکا کسی نے ایک حقیر سے حقیر کیڑا بھی پیدا کر کے نہیں دکھایا، اور نہ کبھی دکھا سکے گا،

زندگی سربستہ رازوں والی قوت کا وہ سرچشمہ ہے جو عدم واقفیت اور لاعلمی کی نامعلوم وسعت سے ہم تک پہنچتا ہے، جب تک وہ ہمارے جسم میں ہے ہم بڑھتے رہتے ہیں جس وقت وہ ہمارے جسم کو چھوڑ دیتی ہے وہ سڑ جاتا ہے، ہم اُسے اپنے جسم سے ایک چاقو یا زہر کے ذریعہ خارج کر سکتے ہیں۔ فرض کیجئے ہم اُسے بڑھا گھٹا بھی سکتے ہیں، لیکن ہم زندگی کو پیدا نہیں کر سکتے"

پس یہ سب چیزیں جن پر دنیا کی مشین چل رہی ہے "کشش ثقل"، بجلی، زندگی ہمارے لئے ایک معما ہیں ہم ان کی بابت کچھ نہیں جانتے لیکن اس کے باوجود یہی دنیا کی اہم ترین چیزیں ہیں انہیں پر نسل انسانی کا دار و مدار ہے، جن چیزوں کا ہمیں پورا علم ہے وہ نہایت غیر اہم معمولی اور سطحی ہیں، مثلاً ہم جانتے ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اس کا جاننا مفید سہی لیکن بے اثر ہے اگر نہ جانیں تو بھی زندہ رہ سکتے ہیں، تم یہ جانتے ہو کہ اس مضمون میں کل کتنے الفاظ ہیں لیکن کس کو غرض پڑی ہے جو ان باتوں کی طرف توجہ کرے اور اگر توجہ کرے بھی تو کیا حاصل ہے؟

زندگی کی ساری دلچسپیاں سارے دل نشین دھڑکے لاعلمی اور عدم واقفیت سے حاصل ہوتے ہیں، آنے والی کل ایک نامعلوم اور غیر دریافت شدہ ملک ہے جو خدا جانے کتنی مہمات کی سرمایہ دار ہے اور ہم سب کولمبس کی طرح "آج" کے جہاز پر کھڑے ہیں اور مستقبل کے نامعلوم اور تاریک سمندر کے سفر پر کمربستہ ہیں،

جوانی میں کیف ہے دلچسپی ہے بڑھاپے میں کوئی لطف نہیں کوئی دلچسپی نہیں صرف اس لئے کہ جوان کے سامنے مستقبل کی ایک نامعلوم وسعت ہے، اس لئے کہ بوڑھے آدمیوں کی معلومات زیادہ ہے وہ بہت سی چیزوں سے واقف ہیں یا کم سے کم وہ سمجھتے ہیں کہ واقف ہیں۔ اسی لئے وہ نامعلوم اشیا میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں، اور اسی لئے زندگی کا سارا لطف غارت ہو جاتا ہے،

موت بھی نامعلوم وسعتوں کا ایک دروازہ ہے کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس دروازہ کے اُس طرف کیا ہے؟ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ موت ہمارے متعلق ہمارے لئے تمام چیزوں کا خاتمہ ہے یا فرض کرو ہمارے لئے ڈنٹے کا بہشت یا گوتم کا نروان ہے تو موت کے سربستہ رازوں اور اس کی پوشیدہ قوتوں کا ہم پر کوئی اثر نہ رہے اور ہم اسے ایک معمولی چیز سمجھنے لگیں صرف اس لئے کہ ہم موت کے متعلق کچھ نہیں جانتے اس سے بالکل واقف نہیں ہیں صرف اس لئے کہ ہم موت کے دروازہ سے نامعلوم وسعتوں کی سرزمین میں داخل ہوتے ہیں ہمارے لئے وہ ایک زبردست مہم ہے، کسی قدیم یونانی حکیم کا مقولہ ہے "کسے معلوم ہے کہ یہ زندگی اصل میں موت ہی ہو اور جسے ہم موت کہتے ہیں وہ زندگی ہو"

حامد اللہ افسر

نغمۂ ناہید

کسی وفا نا آشنا کے حضور میں

میری خاموش التجاؤں کی سماعت ہو نہ ہو   تیرے اندازِ تغافل کی نہایت ہو نہ ہو
میرے حالِ زار پر چشمِ عنایت ہو نہ ہو   اے وفا نا آشنا تجھ کو محبت ہو نہ ہو

عشق میرا سر بسر رنگینیٔ امید ہے
آنکھ محوِ جستجو ہے دل میں ذوقِ دید ہے

عشق تیرا ہے بہشتِ جاوداں میرے لئے   یاد تیری ہے نشاطِ کامراں میرے لئے
رنج تیرا ہے سرورِ بیکراں میرے لئے   تیرے جلوے حاصلِ کون و مکاں میرے لئے

باوجودِ نامرادی عشرتِ جاوید ہے
میرے ارمانوں کی دنیا میں ہمیشہ عید ہے

مجھ کو تجھ سے خواہشِ لطف و کرم کوئی نہیں   یہ ترا جور و ستم جور و ستم کوئی نہیں
شوق میں تیرے مجھے رنج و الم کوئی نہیں   مجھ کو تیری بے وفائی کی قسم کوئی نہیں

جامِ غم واللہ مجھ کو ساغرِ خورشید ہے
نالۂ حسرت سرود و نغمۂ ناہید ہے

جلال الدین اکبر

محفلِ ادب

نغمۂ چین

چینیوں کی عشقیہ شاعری اُن کی متاعِ ذہنی کا نہایت اہم جزو ہے چینی لوگ اپنے پچھلے شاعروں کے عشقیہ کلام سے عام طور پر واقف ہوتے ہیں۔ آج بھی لی، تائی، پو کے اشعار جو ہزار سال سے اوپر ہوئے لکھے گئے تھے ہر طبقے کے لوگوں میں پڑھے اور گائے جاتے ہیں۔ آپ چین میں بدمست عشاق کی زبان سے بھی انہیں سُن سکتے ہیں اور شام کو اپنے کھیت پر کسان بھی اب تک انہیں گاتا ہے۔

چین کے سب بڑے بڑے شاعر عشقیہ شاعری کرتے تھے۔ ڈراما یا بیانیہ نظمیں چینیوں کی نظر میں دوسرے درجے کی چیزہ ہیں۔

چینی شاعری کے سب سے قدیم نمونے کوئی ۳ ہزار سال پرانے ہیں اور اس طرح چینی شاعری ہندوستانی اور عربی شاعری کے ساتھ ساتھ دنیا کی سب سے قدیم شاعری کہی جاسکتی ہے۔ قوم میں اس کا عام رواج اب تک اس لئے ہے کہ اِس طویل زمانے میں چین میں تقریبًا کوئی تغیر نہیں ہوُا۔

چینی شاعری کے عروج کا زمانہ وہ ہے جسے اُس وقت کے حکمران خاندان کے نام پر عہدِ تھانگ کہتے ہیں یعنی ولادتِ مسیح کے بعد کی ساتویں سے نویں صدی تک کا زمانہ۔

اس عہد کے دو سب سے مشہور شاعر لی، تائی، پو اور تھو، فو ہیں۔ لی عرصہ تک شاہ منگ ہوانگ تی کے دربار میں رہا۔ بادشاہ نے ہر طرح اس کا اعزاز واحترام کیا لیکن اس کی طبیعت بے چین تھی۔ نچلا بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ دربار کو چھوڑ چل کھڑا ہوُا اور سارے ملک میں پھر پھر کر لوگوں کو اپنے اشعار سے مسحور کرتا رہا۔ ۶۱ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ چینیوں نے اس کی موت کا ایک افسانہ بنالیا ہے جس سے تقریبًا ہر چینی واقف ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ لی ایک دفعہ کشتی میں بیٹھا تھا۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ اور یہ اپنے شعر گا رہا تھا کہ یکایک ایک عجیب سی موسیقی سنائی دی جس کا تعلق اس دنیا سے نہ تھا۔ اس موسیقی کو سن کر پانی سے پریوں کی ایک فوج نکل آئی اور آسمان سے دو فرشتے

اُترے۔ ان دونوں نے لی کو ساتھ چلنے کی دعوت دی اور یہ ایک پری کے کندھے پر بیٹھ کر دونوں فرشتوں کے پیچھے پیچھے چلا۔ اور افق تک پہنچ کر سنہری فضا میں غائب ہوگیا۔

تھو فو جو لی کے بعد اس عہد کا سب سے مشہور شاعر ہے، لی سے کوئی ۱۲ سال چھوٹا تھا۔ یہ دونوں بڑے دوست تھے۔ پہلے اس کا تعلق بھی دربار سے تھا لیکن پھر اسے جلاوطن کردیا گیا۔ جلاوطنی میں اس نے درد اور شوق سے بھری ہوئی نظمیں لکھی ہیں۔ ۵۹ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

پچھلے ہزار سال میں بھی چینی شاعروں نے خوب خوب چیزیں لکھی ہیں، لیکن آٹھویں صدی کی سی خوبی پھر پیدا نہیں ہوئی۔ پندرھویں اور سترھویں صدی میں بھی چین میں بڑا ادبی چرچا رہا۔ لیکن زیادہ تر کام نثر میں ہوا۔ آخری زمانے میں چینی شاعروں پر علمی رنگ زیادہ غالب ہوگیا لیکن اب بھی عشقیہ شاعری کے اچھے نمونے کچھ بہت کمیاب نہیں ہیں۔

تقدیرِ آدم

(کانگ۔ فو۔ سے) (۱۵۵ تا ۷۸ ق م)

خزاں کی خنکی کے بعد موسم گرما کی حدت آتی ہے۔
برف سے ڈھکے ہوئے میدانوں پر بہار کے پھول سج سجاتے ہیں۔
سورج جب صبح کو سو کر اٹھتا ہے تو سرخرو۔
جب شام کو سونے جاتا ہے تو سرخرو۔
چھوٹے چھوٹے چشمے سمندر سے جا ملتے ہیں۔
زمانہ ہر گھڑی اپنی تجدید میں مصروف ہے۔

ہر روز نئی دھوپ نکلتی ہے، ہر آن دریا کا پانی بدلتا ہے۔
مگر آدمی! اسے بس ایک مرتبہ زندگی عطا ہوتی ہے۔
نہ یہ مڑ کر دیکھتا ہے نہ لوٹ کر آتا ہے۔
اس کی ہستی ایک حباب ہے۔ ٹوٹا اور ختم ہوگیا۔
اس کی زندگی کا حاصل؟ لاچار و بے بس مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیر جس پر گھاس اُگتی ہے!

دیوتاؤں کا رقص

(لی۔ تائی۔ پو) (۷۰۲ء تا ۷۶۳ء)

دل میں درد کا ایک طوفان اُٹھا،
مَیں نے اپنی زمردین بانسری سے انسانوں کو ایک گیت سنایا!
وہ ہنسے اور کسی نے میرے دکھ کو نہ سمجھا۔

درد کی شدت سے میں نے اپنی زمردین بانسری کا رخ آسمان کی طرف کردیا۔
اور اپنے گیت کا تحفہ دیوتاؤں کو پیش کردیا۔
دیوتا مست ہوگئے اور روشنی سے دمکتے ہوئے

بادلوں پر میرا گیت سن سن کر ناچنے لگے۔
اب کیا ہے، اب میں آدمیوں کا دل بہلانے کے
لئے بھی اپنا گیت سناتا ہوں۔
اور جب میں اپنی زمردین بانسری سے گاتا ہوں تو
یہ میرا گیت سمجھتے بھی ہیں۔

آتشزدہ مکان

(تو۔فو) (۷۱۲ء تا ۷۷۰ء)

میرا پیارا مکان، جس میں میں پیدا ہوا تھا، شعلوں
کی نذر ہو چکا۔
جہاں یہ مکان تھا، آج کچھ راکھ ہے کچھ کوئلے۔
غمگین تھکا ماندہ، میں ایک سنہری کشتی میں بیٹھ گیا۔
کہ شاید دنیا کی رنگینی دیکھ کر اپنا غم غلط کر سکوں۔
رات کا وقت تھا میں نے اپنی بانسری پر ایک
گیت گایا ایسا کہ چاند تک پہنچ جائے۔
ایک شوق و تمنا سے لبریز گیت۔
آہ۔ میرا گیت سن کر چاند بھی غمگین ہو گیا
اور اس نے بھی اپنے بوڑھے چہرہ کو ایک بڑے سے
بادل سے ڈھانپ لیا۔
ناچار، میں پہاڑوں کے پاس گیا۔
ان کے پاس بھی میرے درد کا درماں نہ تھا۔
میں نے اپنی ساری داستان ان سے کہی مگر بے کار
اب تو میں سمجھا کہ میری خوشی، میرا چین،
میرے بچپن کی ساری یاد، راکھ کے اس انبار میں
مدفون ہے جہاں پہلے کبھی میرا مکان تھا!
میں نے موت کی دعا مانگی۔ میرا چہرہ زرد تھا۔
سمندر کے کنارے بس اپنے کو موجوں کے سپرد
کرنے کے لئے تیار تھا کہ میرے پاس سے ایک ننھی
سی کشتی گذری!
پہلے تو میں سمجھا کہ یہ کشتی نہیں، پانی میں چاند کا عکس ہے،
لیکن نہیں، یہ ایک ننھی سی سفید کشتی ہی تھی۔
جسے ایک عورت چلا رہی تھی!
اے تو، اے تو، کیا قسمت تھی کہ اس وقت میری
آنکھ نے تجھے دیکھا اس وقت اپنی زندگی کی سب سے
پُر درد و پُر یاس گھڑی میں۔
اب میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں، کہ میرے
درد کا درماں کہاں ملے گا۔
اب میرا ایک مقصد ہے: تجھے پانا!
اے میری بچانے والی، مجھے پناہ دینے والی!
اب میں تیرے دل میں اپنا مکان بناؤں گا۔

"جامعہ"

مطبوعاتِ جدیدہ

کتب

قرآن اور پردہ - مصنفہ مرزا عظیم بیگ صاحب بی اے، ایل ایل بی (علیگ) اس کتاب میں پردے کے مسئلہ کو اسلامی نقطۂ نظر سے حل کیا گیا ہے اور استدلال صرف قرآن مجید کی آیات سے کیا گیا ہے ہاں تفسیر کے طور پر احادیث بھی شامل کی ہیں اور اُن کی شرح کے لئے مسلّم اور مستند محدثین ومفسرین کی کتب کے حوالے دیئے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس میں ثابت کیا ہے کہ پردہ ایامِ جہالت کی یادگار ہے اور اسلام پردے کا مخالف ہے۔ پھر دکھایا ہے کہ رسول کریم صلعم نے اور صحابہ کرام نے پردے کی سخت مخالفت کی ہے اور مسلمانوں نے پردہ کفار سے لے لیا ہے۔ پھر ائمہ اور مفسرین کے وہ اقوال درج کئے ہیں جو پردے کی مخالفت میں ہیں۔ جو لوگ موجودہ رواجی پردے کی خرابیوں سے آگاہ ہونا چاہیں اُن کے لئے یہ بہترین کتاب ہے۔ ابتدا میں شاہ محمد سلیمان صاحب ایل ایل ڈی چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ حجم ۱۳۴ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ پتہ، اظہر حسین صاحب عثمانی، آنریری سکرٹری انجمنِ اصلاحِ پردہ کھانڈا پالسہ جودھ پور، ریاست مارواڑ (راجپوتانہ)

زاد السبیل - محترمہ راحیل شروانیہ صاحبہ بنت حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی کا دلچسپ وسبق آموز سفرنامہ حجاز وشام وعراق ہے، جس میں جابجا نظمیں اور سفر کے متعلق دوسرے مفید تاریخی ومعاشرتی مضامین درج ہیں حجم ۳۳۸ صفحے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ان تینوں پتوں سے مل سکتی ہے (۱) مشرف منزل علی گڑھ (۲) دفترِ "تہذیبِ نسواں"، لاہور (۳) دفتر رسالہ "نورجہاں"، لاہور۔

مقالات - ۴۴ صفحے کے اس رسالے میں جناب احمد الدین احمد صاحب مارہروی ایم اے کے مندرجۂ ذیل پانچ محققانہ مضامین ہیں:- (۱) کیا اورنگ زیب سلطنتِ مغلیہ کے زوال کا باعث تھا؟ (۲) کیا فیروز تغلق غاصب تھا؟ (۳) نورجہاں اور جہانگیر کے تعلقات پر ایک نظر۔ (۴) علاؤالدین اور پدمنی (۵) کیا محمد تغلق درحقیقت پاگل تھا؟ قیمت چھ آنے مقرر کی گئی ہے۔ طلبا سے نصف قیمت لی جاتی ہے۔ سفیر بک ایجنسی الہ آباد سے طلب فرمایئے۔

سادھوا اور بیسوا - مصنفہ پنڈت کشن پرشاد صاحب کول ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی لکھنؤ۔ ایک دلچسپ ناول ہے جس میں دو حرماں نصیبوں کی سرگزشت بیان کی ہے۔ زبان صاف اور ستھری ہے۔ اندازِ بیان شگفتہ ہے۔ حجم ۲۰۳ صفحے

قیمت بارہ آنے۔ انڈین پریس لمیٹڈ، الہ آباد سے طلب فرمایئے۔

غلط فہمی ۔ جناب بصیر ایم اے کا ڈراما ہے۔ حجم ۸۴ صفحے۔ قیمت آٹھ آنے۔ پتہ شمس الاسلام بک ڈپو دہلی۔

کشکول سخن ۔ اس میں بزم ادب شملہ کے مشاعرے کی غزلیں اور نظمیں ہیں۔ شروع میں ان پر تنقید اور تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ قیمت چھ آنے۔ سکرٹری بزم ادب شملہ سے منگائیے۔

انگلش ٹرانسلیشن اینڈ کمپوزیشن ۔ از ایم۔ ایچ غازی صاحب۔ اس کتاب میں انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی ترجمہ کرنے کے طریقے اور صحیح اور بامحاورہ انگریزی لکھنے کے قاعدے بتائے گئے ہیں۔ حجم ۲۷۰ صفحے قیمت چودہ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ جی آر دیوی چند مہندر اینڈ سنز، بک سیلرز، پکّا ڈنگہ، جموں

رسائل

"**چاند**" یہ ماہوار رسالہ منشی کنہیا لال صاحب ایم اے، ایل ایل بی کی ادارت میں دہلی سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ چونکہ حجم ڈیڑھ سو صفحے کے قریب ہے اس لئے مضامین میں خوب تنوع ہوتا ہے۔ تصویریں بھی غالباً سب اردو رسالوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔ اپریل کے پرچے میں سترہ تصاویر ہیں۔ سالانہ چندہ آٹھ روپے مقرر ہے۔ مینیجر رسالہ چاند، ۲۸ ایڈمنسٹن روڈ، چندرلوک، الہ آباد سے طلب فرمایئے۔

"**ساقی**" یہ علمی و ادبی رسالہ سید شاہد احمد صاحب بی اے آنرز کی ادارت میں دہلی سے نکلا ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ ادبِ اردو کی نشر و اشاعت میں قابلِ قدر خدمات انجام دیگا حجم ۷۲ صفحے اور قیمت تین روپے چھ آنے سالانہ مقرر ہے۔ پتہ، مہتمم رسالہ "ساقی"، کھاری باولی، دہلی۔

"**اعجاز**" یہ ماہوار رسالہ لسان الملک حضرتِ ریاض کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے۔ مضامین کے انتخاب سے حسنِ مذاق کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرتِ ریاض کا کلام اس کے اوراق کی زینت ہے۔ حجم ۴۶ صفحے اور سالانہ قیمت چار روپے مقرر ہے۔ دفتر "اعجاز" بارہ بنکی سے طلب کیجئے۔

"**ادب**" سید اعظم حسین صاحب کی ادارت میں ہر ماہ لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں بہت اچھے ادبی تنقیدی مضامین درج ہوتے ہیں۔ زبان بھی خوب ہوتی ہے۔ حجم ۴۶ صفحے۔ سالانہ چندہ چار روپے۔ ملنے کا پتہ، دفتر "ادب"، چوراہا گنیج، لکھنؤ۔

"**عورتوں کا اخبار**" یہ ہفتہ وار اخبار خواجہ حسن نظامی صاحب نے ہندوستانی عورتوں کے لئے دہلی سے جاری کیا ہے۔ اس میں عموماً تاریخی اور تمدنی و معاشرتی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ عورتوں میں آزادی خیال پیدا کرنے کے لئے یہ اخبار ضرور مفید ثابت ہوگا۔ سالانہ چندہ چار روپے۔ پتہ، دفتر "عورتوں کا اخبار"، دہلی۔

آج تقریباً پچاس برس کے بعد بھی وہی قد اور صورت اور اوصاف ہیں

جو پیدائش کے روز تھے

آپ خیال نہ کریں کہ یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ یوم پیدائش اور آج کی صورت میں کوئی فرق کیوں نہ ہوگا۔ آپ خود قبول کر لیں گے۔ جام نگر کاٹھیاواڑ میں پیدا ہو کر تمام مذاہب اور فرقوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور معروف ہونے کے ساتھ ہر فرد بشر کی حفاظت کرنا اپنا فرض بنا لیا ہے خواہ مسلمان ہو یا عیسائی ہندو براہمن ہو یا چمار حتیٰ کہ ہر انسان کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا اس کا خواص ہے۔ دوستوں کو بہرہ اندوز کرنے میں لاثانی لیکن دشمن کو ذرا بھی اذیت نہ دینا اسکی عادت ہے، **اسلئے** یہ ہیں مقویات سرتاج عالم آننگ نگرہ گولیاں! جنکو جام نگر کاٹھیاواڑ کے ویدشاستری منی شنکر گوندجی نے آج سے پچاس برس قبل ایجاد کر کے تہلکہ پیدا کر دیا یہ گولیاں **اس طرح مقبول ہوئیں** کہ ہندوستان اور ممالک غیر سے انکی مانگ روز افزوں ترقی پر ہے یہ گولیاں قبض بدہضمی دل و دماغ معدہ کی کمزوری خون کی خرابی اور جملہ **امراض مخصوصہ** کے دور کرنے میں پوری فتح حاصل کر چکی ہیں آپ ایک دفعہ استعمال کریں گے تو تعریف کئے بغیر نہ رہیں گے ایسی خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی قیمت اس لئے کم رکھی گئی ہے کہ ہر امیر غریب مستفید ہو سکیں ۳۲ گولیوں کی ڈبیا ایک روپیہ۔ پانچ ڈبیہ چار روپیہ۔

بال منتر گولیاں (ہمدرد اطفال) بچوں کی ناساز طبیعت سے والدین کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور گھر بے رونق ہو جاتا ہے اسلئے بیمار بچوں کو تندرست اور تندرست کو طاقتور بنانے کیلئے بال منتر گولیوں کا استعمال کراویں گولیاں بچوں کی جملہ شکایتوں دست کا زیادہ آنا قے کا ہونا، شکم کا بڑھنا جسم کا زرد پڑ جانا تلی سستی کاہلی دبلا پن وغیرہ دور ہو کر پوری صحت حاصل ہوتی ہے قیمت ۳۰ گولی کے ڈبہ کی ایک روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ ویدشاستری منی شنکر جی گووند رام جی جام نگر (کاٹھیاواڑ)

مردہ عزیزوں سے

ملاقات اور بات چیت گھر بیٹھے کر لو

یہ نو ایجاد آلہ سپرٹس ورکنگ پلانچٹ جس کے ذریعہ ہم خود اکیلے ہر ایک سوال کا جواب لے سکتے ہیں ایک امریکن دماغ کی اختراع ہے آلہ کے استعمال میں کسی دوسرے آدمی کی ضرورت نہیں۔ جونسی روح آپ چاہیں آلہ میں حاضر ہو کر آپ کے سوالوں کا درست جواب دے گی معمولی لکھا پڑھا ہر عمر اور ہر مذہب کا آدمی کام لے سکتا ہے نہ کچھ پڑھنا پڑتا ہے اور نہ ہی چلہ کشی کی ضرورت ہے، عالم بالا کے حالات معلوم کرنا گمشدہ کا پتہ لگانا چوری کا سراغ نکالنا، دشمن سے بدلہ لینا مقدمات میں فتح پانا سخت سے سخت حاکم سے حسب دلخواہ کام نکلوانا اور دراز فاصلہ پر ایک سیکنڈ میں خبر بھیجنا حسب دلخواہ نوکری یا روزگار حاصل کرنا۔ بند لفافوں کی عبارت پڑھنا مقفل صندوق یا مکان کے اندر کی اشیا معلوم کرنا وغیرہ ہزاروں کام ہو سکتے ہیں اس نایاب چیز کا ہر گھر میں ہونا لازمی ہے اصلی قیمت پانچ روپیہ لیکن تھوڑے عرصہ کے لئے معہ محصول ڈاک صرف تین روپیہ آٹھ آنے لئے جاویں گے ہدایات مفت ارسال ہونگی۔ اپنا پتہ صاف انگریزی یا اردو میں لکھیں۔

کیمیکلز سنڈیکیٹ (H) جالندھر شہر (پنجاب)

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے

یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے،

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ساڑھے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸؍ نمونہ ۶؍

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجیئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

سید عبداللطیف مینیجر رسالہ ہمایوں نے مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامۂ فضیلے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد

جامعہ　　فہرستِ مضامین　　نمبر ۶

بابت ماہِ جون سنہ ۱۹۳۰ء

تصویر:- ننھا تیر انداز

کالی گوری چڑیا

کالی گوری چڑیا
پیاری موری چڑیا
پھر کر گلشن گلشن بھایا تجھ کو "ارجن"
چمپا پر جب چہکی چمپا تجھ سے مہکی
کالی گوری چڑیا
پیاری موری چڑیا

اُڑتی اُڑتی مُڑکر مُڑتی مُڑتی اُڑکر
پھولوں میں تُو آئی پتّوں پر تُو چھائی
ٹہنی ٹہنی کودی ٹہنی ٹہنی اُچھلی
ٹہنی ٹہنی کھیلی ٹہنی ٹہنی ناچی
کالی گوری چڑیا
پیاری موری چڑیا

آنا جانا تیرا تانا بانا تیرا
اِس جا اُس جا کس جا تُو ہی دیکھا جس جا
اونچے اُڑکر پھرنا نیچے مڑکر گرنا
ننھی مُنّی چنچل واہ ری تیری چھل بل
کالی گوری چڑیا
پیاری موری چڑیا

پیاری موری چڑیا کالی گوری چڑیا
جگ کا رہنا سہنا دو دن کا ہے گہنا
جینا کوئی دم ہے فرصت تجھ کو کم ہے
کرنا ہے جو کر لے دامن اپنا بھر لے
لے چل کلیاں چُن کر گانا گا سر دُھن کر
اپنی دُھن میں گا لے
حق کو کھو کر پا لے

ب ل

جہاںؔ نما

اشتراکیت اور مذہب کی جنگ

"مذہب انسان کے لئے بمنزلہ افیون کے ہے" یہ وہ فقرہ ہے جو نہایت کثرت کے ساتھ سوویٹ روس کی سرکاری عمارات پر لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ روس میں اِس قول کو لینن سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ قول کارل مارکس کا ہے، لینن نے اُس کی دوسری بہت سی تعلیمات کی طرح اسے بھی اپنے عقائد میں شامل کر لیا۔ اُس مضمون میں جہاں سے یہ فقرہ اخذ کیا گیا ہے مارکس یہ بھی کہتا ہے کہ "اُس تمدّن و معاشرت کو مٹا ڈالو جس کی روحانی مہک مذہب ہے، مذہب خود مٹ جائے گا۔ ..... مذہب وہ پھول ہے جو زنجیروں کو چھپائے ہوئے ہے، پھولوں کو مسل کر پھینک دو، زنجیریں ظاہر ہو جائیں گی"۔

ڈاکٹر جان ڈیوئی نے جو کولمبیا یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر اور امریکہ کے ایک بہت بڑے مفکر ہیں اشتراکیت پر ایک مذہب کی حیثیت سے بحث کی ہے۔ انہوں نے کوئی ایک پہلو اختیار نہیں کیا بلکہ ایک فلسفی کی طرح ممکن الحصول شہادتوں سے نتیجہ نکالا ہے کہ اشتراکیت اور مسیحیت کیوں برسرِ جنگ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مارکس کی ان سطور میں دو خیال ادا کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ موجودہ معاشی سیاسی نظام کی تخریب یقیناً مذہب کے زوال کا باعث ہوگی۔ اور دوسرا خیال یہ ہے کہ خود مذہب کی تخریب کا نتیجہ یہ ہوگا کہ موجودہ نظام کی "زنجیریں" نمایاں ہو جائیں گی، اور اس سے ایک نیا نظام معرضِ وجود میں آجائے گا۔ روس اس دونوں قسم کی تخریب میں بڑی شدت سے مصروف ہے۔

"ایک طرف تو روسی اس عقیدے پر عمل پیرا ہیں کہ ایک اشتراکی تمدّن کی تخلیق خود بخود مذہبی عقیدوں اور فرقوں کا شیرازہ بکھیر دے گی اور اُن قوتوں کو جو بالشویکی نقطۂ نظر سے فوق فطرتی اور غیر معاشرتی جادوں پر پڑ کر سیدھی راہ سے بھٹک گئی ہیں ایک صحیح معاشرتی اور انسانی راہ پر لا ڈالے گی۔ دوسری طرف لینن نے محسوس کیا اور بلاشبہ اپنے مقاصد کے پیشِ نظر صحیح محسوس کیا کہ موجودہ مذہب نئے نظام کا جس کی وہ طرح ڈال رہا تھا ایک رقیب ہے۔

"سابق معاشی حکومت اور سیاسی زاریت کا مذہب کے ساتھ ایسا قریب کا رشتہ تھا کہ لینن کی تجاویز کے پورا ہونے کے لئے اس کا وجود ایک بڑا خطرہ تھا۔ خیال کے اِن دونوں پہلوؤں کا خلاصہ یہ ہے کہ اشتراکیت

خود ایک مذہب بن گئی ہے جو کسی دوسرے رقیب مذہب کو برداشت نہیں کر سکتی اور اشتراکیوں کو کسی ادارتی مذہب کا اپنے پیرووں کے معاشرتی معاملات میں حکومت جتانا ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے اُن کے مقابلے میں ایک اَور سیاسی نظام تیار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

جب میں اشتراکیت کی مذہبیت کا ذکر کرتا ہوں تو میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے پیرووں میں اس کی نسبت وہی جذبہ اور جوش جاری وساری ہے جو ایک مذہب کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اشتراکیت ذہنی طور پر بھی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ کوئی خیال کوئی عمل ایسا نہیں جس پر اس کا اثر نہ ہو جس طرح ایک مذہب کے مقررہ اور معینہ اصول وعقائد ہوتے ہیں اسی طرح اس کے بھی اصول وعقائد ہیں۔ جو شخص اسے خاص سیاسی طاقت کا ایک دباؤ سمجھتا ہے وہ کبھی اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہو سکے گا۔ اس کے حقیقی معنی سمجھنے کے لئے ہمیں اس کو اُن مذاہب کی صف میں کھڑا کرنا پڑے گا جن کی حریفانہ کش مکش نے انہیں تاریخ میں نمایاں جگہ دی ہے۔

موجودہ روس کے حاکموں نے کبھی اپنی مذہب دشمنی کو جس کی بنیاد خدا کا انکار ہے نہیں چھپایا، نہ انہوں نے اُن ذرائع کو پوشیدہ رکھا ہے جنہیں وہ خدا اور تمام فوق الانسانی طاقتوں کے عقیدے کو بیخ وبن سے اکھاڑنے میں استعمال کر رہے ہیں، مثلاً مدارس، مطابع، تصاویر وغیرہ۔

"یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ سائنس اور مذہب کی جنگ ضروری ہے اور مذہب کی فتح اُسی وقت ہو سکتی ہے جب جہالت، سادہ لوحی اور اسی قسم کی دوسری معاشرتی کمیاں قوم پر مسلّط ہوں ہر قسم کے تمثیلی ذرائع کام میں لائے جاتے ہیں۔ اپنے مخصوص سیاسی مقصد کے قطع نظر اس میں شک نہیں کہ روس کے حاکم روسی کسانوں کی پستی کے لئے یونانی کلیسا کو ذمہ وار گردانتے ہیں، اور روس میں کسانوں کا طبقہ ہی ایک ایسا طبقہ ہے جو وہاں کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہے۔

"اشتراکیوں کو معلوم ہوگیا ہے یا وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں معلوم ہوگیا ہے کہ مذہبی عقیدہ جب وہ اشتراکی گروہ کے کسی رکن میں پایا جائے تو ایک بڑی رکاوٹ ہوتا ہے، جو مذہبِ اشتراکیت کی تبلیغ میں اُن کی کوششوں کو پوری شدت سے عمل میں نہیں آنے دیتا۔ ایسے لوگوں کو بے دریغ گروہ میں سے نکال دیا جاتا ہے۔ ذاتی اور غیر ادارتی مذہب کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ روس کی تعمیر کے عظیم کام سے لوگوں کے خیال اور عمل کا رخ موڑ لیتا ہے۔

"لینن کی اپنی شخصیت اور تعلیمات بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اُس کے نزدیک منطقی مادیت کا

فلسفہ، فلسفہ نہ تھا بلکہ سائنس ہی کی ایک دوسری شکل تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ سائنس نے مذہب کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی، اور دنیا کی دوبارہ تعمیر اُس کے نزدیک صرف انسانی قلب کو سائنس کے ذریعے سے فتح کرنے پر ہوسکتی تھی۔ مارکو جس نے لینن کی سوانح عمری لکھی ہے کہتا ہے کہ "لینن کے لئے خیال یا چاہت کے معاملہ میں تحمل اور رواداری سے بڑھ کر نا قابلِ فہم کوئی چیز نہ تھی۔ وہ اسے رہنما یانہ قابلیت کا فقدان سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اُس کے نزدیک یہ قابلِ نفرت شکست کا آغاز تھی"۔ لینن کے متبعین نے بھی یہی طبیعت ورثے میں پائی۔ جب وہ ایک نیا معاشرتی نظام قائم کرنے میں جان توڑ کوششیں کر رہے تھے تو مذہب اور منطقی مادیت کا وہ مسلک جسے ایک علمی صداقت کا نام دیا جاتا تھا دو تسکین ناپذیر اور موافقت نہ کرنے والے دشمن تھے۔ ایک کے غالب آنے کے لئے دوسرے کی قطعی شکست ضروری تھی"

ڈاکٹر ڈیوئی کہتے ہیں کہ "ایک بات پر میں اپنی ذاتی رائے بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتا وہ یہ کہ روس کی جانب سے سب خبریں اس پر مشتمل ہوتی ہیں کہ تمام اشتراکی اربابِ اختیار کی متفقہ رائے میں سوویٹ کے خلاف "مذہبی" احتجاج محض اشتراکی حکومت کو تہ و بالا کرنے کی ایک نئی کوشش ہے جو سرمایہ دار ملک اُس کے خلاف کر رہے ہیں۔ جس کسی کو بھی روس کا کچھ علم ہے وہ پہلے ہی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا تھا۔ اگرچہ بہت لوگوں نے خالص مذہبی بنا پر احتجاج کیا ہے لیکن یہ احتجاج بعد کو باقاعدہ جنگ کی صُورت اختیار کر گیا۔ سو جب تک سوویٹ روس میں کچھ مذہبی اثر باقی ہے مذہب کی مخالفت بڑھتی ہی جائے گی اور یہ عقیدہ پختہ ہوتا جائے گا کہ مذہب کے پردے میں ایک سیاسی اور معاشی مقصد کام کر رہا ہے۔ یہ صورتِ حالات اُن احساسات کو بھی بیدار کرے گی جو ایسے وقت ہم میں بھی پیدا ہو جاتے ہیں جب ہمیں اپنے اندرونی معاملات میں کسی بیرونی مداخلت کے نشانات نظر آتے ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ بیرونی احتجاج روس کے اس آزاد گروہ کو تقویت پہنچائے گا اور اس کی نوجیانہ سرگرمیوں میں اور شدت پیدا کرے گا۔ اس سے اُن کے پاس اس امر کی ایک اور شہادت موجود ہو جائے گی کہ دوسری قومیں ہر اُس ذریعہ سے جو ان کے ہاتھ میں ہے اشتراکی حکومت کو مٹانے کے لئے تیار ہو رہی ہیں۔ روسی حکومت نے کلیسا کے خالص مذہبی اعمال اور اُس کے معاشرتی نظام اور مقاصد کے درمیان ایک واضح خط کھینچ دیا ہے۔ یہ امتیاز کل سوویٹ نظام کا ایک لازمی نتیجہ ہے اور سوویٹ حکومت پر اُس کی مخالفتِ مذہب کے لئے حملے کرنا اِس گمان کو بڑھائے گا کہ ذاتی مذہب اُن سیاسی، تعلیمی اور معاشی کارروائیوں کا ایک پردہ ہے جو اُس معاشرہ کو شکست دینے کے لئے کی جاتی ہیں جسے وہ تعمیر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ترکی میں گراں بہا کتب کا ذخیرہ

امید کی جاتی ہے کہ قسطنطنیہ کی وہ گراں بہا قلمی کتب جو آج کل شہر کی بیس یا بیس سے بھی زائد مساجد میں منتشر ہیں۔ مسجد سلطان احمد میں ایک لائبریری کی صورت میں جمع کر دی جائیں گی۔ ہر سال تمام اطراف عالم سے شائقین علم فتوحات ترکی کے ان ثمرات سے استفادہ کرنے کے لئے آتے ہیں۔ ان کتب کا مطالعہ صرف مساجد کی چھوٹی سی لائبریری میں کیا جا سکتا ہے جس کا منتظم مسجد کا امام ہوتا ہے۔ ان علمی ذخائر کا کچھ حصہ سلطنت ترکیہ کے فیاض امرا نے ان مساجد کو عطا کیا تھا، کچھ شاہی محلات سے لیا گیا اور کچھ ترکی کی فتح مند افواج نے بغداد، دمشق قاہرہ اور تبریز کی لائبریریوں سے مال غنیمت کے طور پر حاصل کیا تھا۔ ہر کتاب ایک شاہکار ہے جسے کسی پیشہ ور خطاط نے کسی امیر کے لئے یا خود مصنف کے لئے لکھا ہے۔ ہر کتاب کے معطی کا نام کتاب پر درج ہے اور اس طرح خود کتابیں اپنی تاریخ بتا رہی ہیں۔ ان کتب کے نقل کرنے والے بھی امرا تھے جن کی سرپرستی سلطان یا امیر کرتے تھے۔

قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں کتابیں عاریۃً دینے کا رواج نہیں ہے، کیونکہ بیشتر کتب اس قدر قیمتی ہیں کہ ان کا عجائب خانے کی نادرات کی طرح مقفل رہنا ہی بہتر ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ منتظم کو بہلا پھسلا کر رات کے لئے کتاب عاریۃً لی گئی اور جب واپس کی گئی تو منتظم نے بظاہر کوئی تبدیلی نہ پا کر کتاب رکھ لی، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ کتاب کے کئی اوراق اڑا لئے گئے ہیں اور ان کی بجائے نہایت چالاکی سے مصنوعی اوراق لگا دیئے گئے ہیں اور اس طرح صناعی کے کئی بیش قیمت نمونے ضائع ہو گئے۔ چنانچہ بوسٹن کے عجائب خانے میں ایک ورق موجود ہے جو آج سے پچیس سال قبل تیرھویں صدی کی ایک صنعتی کتاب میں سے چرایا گیا تھا۔

ان کتب کی مکمل فہرست صرف انگورہ میں موجود ہے جسے حکومت نے مرتب کرایا ہے کیونکہ اب تمام کتب خانے تعلیمی وزارت کی تحویل میں ہیں۔ یہ فہرست بھی کتب خانوں کی فہرست کے اصول پر نہیں ہے کیونکہ اس میں بلالحاظ ان کے نفس مضمون کے صرف کتابوں کے نام درج ہیں۔

ترکی کی تمام کتابیں بہت قدیم ہیں اور ان میں سے اکثر ایسی ہیں جن کی دوسری کاپی کہیں بھی موجود نہیں۔ ان میں جغرافیہ، نجوم، ہیئت، قانون، حکمت، مذہب اور مذہبی شاعری کی کتابیں ہیں۔ بعض ممتاز افراد کے خطوط کے مجموعے بھی ہیں۔

ان میں طبی کتب بھی ہیں جنہیں کافی اہمیت دی جا سکتی ہے۔ طبی کتب میں پودوں اور بوٹیوں کی تصویریں دی گئی ہیں۔ بعض میں جسم انسانی کے خاکے ہیں جن میں دوران خون دکھایا گیا ہے۔ ان کتب کی تصنیف کے

وقت میسوپوٹیمیا میں سائنس نے یورپ کی بہ نسبت کافی ترقی کر لی تھی۔ یہ لوگ اُن دنوں نہایت کامیابی سے عملِ جراحی کر لیا کرتے تھے جب کہ شمالی ممالک میں ابھی اس کی ابتدا بھی نہ ہوئی تھی۔

دماغی مریضوں کے علاج میں مسلمانوں نے ہی سبقت کی۔ شمالی علاقے میں ایسے مریضوں کو مغضوبِ غضبِ الٰہی سمجھا جاتا تھا حالانکہ اسلامی ممالک میں ایسے مریضوں کے ہسپتال موجود تھے اور موسیقی کے ذریعہ سے اُن کا کامیاب علاج کیا جاتا تھا۔

ابتدائی زمانے میں ترکی میں جغرافیہ دانوں کی بھی کمی نہ تھی۔ دنیا کا سب سے پہلا نقشہ ایک عرب ادریسی نامی نے ۱۱۵۴ء میں تیار کیا تھا۔ یہ نقشہ ایک چاندی کی چوکی پر ایک نارمن بادشاہ کے لئے بنایا گیا تھا جس نے عربوں سے سسلی کو فتح کیا تھا۔ اس بادشاہ کے دربار میں کچھ عرب تھے جنہیں اُس نے اس کام کے لئے روپیہ اور سامان مہیا کیا تھا۔ ادریسی نے اپنے کام کے متعلق ایک کتاب بھی لکھی جس میں زمین کو چپٹا اور سمندر کو اُس کے اطراف پر محیط بنایا ہے۔ قسطنطنیہ کی کتب میں ادریسی کی اس کتاب کے چند نسخے موجود ہیں۔

ایک اور مشہور ترک جغرافیہ دان نے ساتویں صدی میں اپنی سیاحتِ یورپ کے متعلق ایک کتاب بارہ جلدوں میں لکھی۔ چند سال ہوئے ہیمر نامی ایک جرمن نے اس کی پہلی جلد کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ یہ نہایت حیرت انگیز کتاب سمجھی جاتی ہے۔

مختلف سلاطین کے تین نادرِ روزگار کتب خانے ٹاپ کیپو کے محل میں جمع کئے گئے ہیں۔ کلدیز محل کا کتب خانہ استنبول کی یونیورسٹی لائبریری کو دے دیا گیا ہے۔ یہ ذخیرہ نہایت اہم ہے۔ گذشتہ پانچ سال کے عرصہ میں درویشوں کی خانقاہوں میں سے قریباً دس کتب خانے مسجدِ سلیمانیہ میں منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ عجائب خانہ ابوگاگ کا کتب خانہ سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے جہاں کے ابھرے ہوئے طلا کار کام کو دیکھ کر بڑے بڑے گھاگ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

بعض حلقوں میں افواہ ہے کہ حکومت ان ذخائر کو انگورہ میں منتقل کرنے والی ہے لیکن بیرونی مستشرقین چاہتے ہیں کہ انہیں موجودہ جگہ پر ہی رہنے دیا جائے۔ ان مسجدی کتب خانوں نے علومِ قدیمہ کے دلدادوں کو اس قدر مسحور کر رکھا ہے کہ اکثر نے مستقل طور پر استنبول میں اقامت اختیار کر لی ہے اور اپنی بقایا زندگی وہیں گذارنے کا تہیّہ کر لیا ہے۔

آفرینشِ عالم

بقولِ اہلِ بابل

ہر بچّے کی زندگی میں ایسا زمانہ آتا ہے جب کہ وہ نہ صرف دنیا بلکہ کل کائنات کے وجود پر نظر ڈال کر متحیّر ہوتا ہے اور پریشان ہو کر سوال کرتا ہے کہ اس کائنات کا صانع کون ہے؟ آخر آسمان، زمین سورج، چاند اور ستاروں کا بنانے والا کون ہے؟ سمندر، پہاڑ، درخت، پھول وغیرہ عالمِ وجود میں کس طرح آئے؟

اُس کے بزرگ جواب دیتے ہیں کہ قادرِ مطلق اِن کا صانع ہے اور اُس کے ہی حکم سے کل کائنات عالمِ ہستی میں آئی۔ اس کے بعد جب بچّہ دوسرا سوال کرتا ہے کہ کس طرح خالق ان کو عالمِ ہستی میں لایا تو اس کے جواب میں پیدائش عالم کی مختصر کیفیت بیان کی جاتی ہے اور ساتھ ہی سمجھا دیا جاتا ہے کہ اس کے سمجھنے کے واسطے ایک زمانہ درکار ہے اور مختلف علوم پر کافی عبور ہونا لازمی ہے۔

الغرض اسی قسم کے سوال و جواب ہر خورد و بزرگ ہر زمانہ میں کرتے چلے آئے ہیں اور ہر قوم اور ہر فرقہ نے اپنی قابلیت اور مبلغ علم کے موافق اُن کے جواب دیئے ہیں جن کا نفسِ مطلب قریب قریب ایک ہی ہے۔

اس مسئلہ پر سب متفق ہیں کہ صانعِ عالم، موجدِ قانونِ قدرت اور زمین سے ہستی میں لانے والی کوئی بڑی زبردست قوت ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ جو مذاہب ترقی کر کے طبقۂ اعلیٰ پر پہنچے ہیں وہ اِس قوت کو خالق اور قادرِ مطلق وحدہٗ لاشریک کہتے ہیں اور جو مذاہب جہالت کی تاریکی سے باہر نہیں ہوئے اور جنہوں نے رسالت کی روشنی سے نفع نہیں اُٹھایا اُنہوں نے اس قوت کو مختلف خداؤں پر تقسیم اور دنیا اور کائنات کے وجود کو ان کی متفقہ قوتوں پر مبنی کیا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو مختلف خداؤں کے کارناموں کے قصص اور افسانوں کا آغاز ان ہی عقائد کی بنا پر ہے اور ہر فرقہ و ملت نے اپنی فکر و مبلغ علم کے موافق پیدائش عالم کے واقعات بیان کئے ہیں۔

اہلِ بابل کا اعتقاد آفرینشِ عالم کے متعلق عجب دلچسپ گو لایعنی ہے بہر حال اختصار کو مدِ نظر رکھ کر ہدیۂ ناظرین ہے۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ملکِ بابل کے قدیم شہروں سے جو کتابے برآمد ہوتے ہیں اُن کی قدامت پر سب متفق

ہیں ۔ یورپ اور امریکہ کے اساتذہ کی کوشش سے شہر نپر[۵۱]، اگید[۵۲]، سپر[۵۳]، کوتہا[۵۴] وغیرہ کے آثارِ قدیم سے علاوہ دیگر عجائبات کے نہایت قدیم زمانہ کے ہزار ہا کتابے برآمد ہوئے ہیں ۔ بعض قدیم تر کتابوں کی نقول ہیں اور بعض ان میں سے چار ہزار سال قبل مسیح کے سمجھے جاتے ہیں ۔

قدیم کتابے دستیاب ہونے سے پہلے بابل اور اہلِ بابل کے متعلق جو کچھ ہم کو علم تھا وہ بروسس بابلی پوجاری مندر بعل کی بدولت تھا تین سو برس قبلِ مسیح اس شخص نے مشرح تاریخ ملکِ بابل من ابتدائے آفرینش تا فتح سکندر اعظم زبانِ یونانی میں تصنیف کر کے سکندرِ اعظم کی نذر کی تھی ۔ افسوس ہے کہ تاریخ مذکور نابود ہو گئی ۔ دیگر یونانی مصنفوں نے جن کے زمانہ تک اس تاریخ کا وجود تھا اپنی تصانیف میں اس کے حوالے دئیے ہیں ۔

الگزنڈر پالی ہسٹر نے بحوالہ بروسس آفرینشِ عالم کا حال قلمبند کیا ہے جس کی نقل یوسی بیس نے اپنی کتاب کرونی کان کی پہلی جلد میں کی ہے ۔ فی زماننا بروسس کی تاریخ بابل کی چنداں پروا نہیں رہی کیونکہ ممالک بابل اور اسیریا کے آثارِ قدیم سے ہزار ہا کتابے برآمد ہو کر لندن، پیرس امریکہ اور قسطنطنیہ پہنچ گئے ہیں نیز اہلِ بابل اور اولاد اشر (اسیرین) کی زبانوں پر کافی عبور ہو جانے سے قدیم حالاتِ بابل پر کافی روشنی پڑ گئی ہے ۔

ساتویں صدی قبل مسیح کے وسط میں شہر نینوہ میں آفرینشِ عالم کا منظوم قصّہ محفوظ تھا ۔ بارہ باب پر اُس کو منقسم کیا گیا تھا ہر باب ایک خشت سے متعلق تھا گویا بارہ باب بارہ اینٹوں پر کندہ تھے ۔ کامل نظم ای نوما ایلش کے نام سے مشہور تھی ۔ افسوس ہے کہ نظم مذکور کے بیت کے بیت اور مصرعے کے مصرعے، کتبوں کے شکست ہو جانے سے فنا ہو گئے تاہم دیگر کتابوں کی امداد سے قصّہ کا سلسلہ ملتا ہے اور بروسس بابلی کے اقوال کی تائید ہوتی ہے ۔

آفرینشِ عالم موافق اعتقادِ اولادِ سام

آفرینش کے متعلق اولادِ سام کا عقیدہ ذیل کے مضمون سے جو حقیقتاً مختلف کتبوں کا ترجمہ ہے ظاہر ہو گا ۔ اُن کے اعتقاد کے موافق ایک زمانہ ایسا تھا جب کہ آسمان و زمین ہستی میں آئے نہ تھے اور سوائے اپسو (بحر) پیدا

---

۵۱ نپر کو اب نفر کہتے ہیں ۔

۵۲ اگید کو اب ابو صبّا کہتے ہیں ۔

۵۳ سپر اور اگید ایک ہی شہر کے دو حصے ہیں ۔

۵۴ کوتہا کو اب تل ابراہیم کہتے ہیں ۔

کرنے والا ہر شے کا) اور تیامت (سمندر موجزن جس سے ہر شے پیدا ہوئی) کسی چیز کا وجود نہ تھا۔ صرف انہی دونوں کی موجیں آپس میں مل مل کر ایک جان ہوتی تھیں۔ اُس وقت نہ زمین کا نشان نہ دلدل کا وجود اور نہ آسمان کا پتہ تھا۔ حتیٰ کہ دیوتا بھی پیدا نہیں ہوئے تھے نہ لوح محفوظ مرتّب ہوئی تھی اور نہ مستقبل کا کچھ فیصلہ ہوا تھا۔ اِس ہیولیٰ یا ہیئتِ اولیٰ کے بعد جلیل القدر خداؤں کا وجود ہوا اور سب سے پہلے دو دیوتا عالمِ ہستی میں آئے جو لحمو اور لخامو کے ناموں سے منسوب ہوئے۔ پھر مدت مدید کے بعد انشار[1] اور کشار[2] کا وجود ہوا۔ ایک زمانہ کثیر کے بعد ان کی تین اولادیں ہوئیں۔ انو[3]۔ انلیل[4]۔ ئیا[5]۔

ئیا اور اس کی زوجہ دام کنیا سے بعل مردوخ پیدا ہوا اور اُس کو صانعِ عالم و خلّاقِ جہاں مانا گیا۔ بعد ازاں نودمد کا وجود ہوا جو مالک و حاکمِ تحت الثریٰ سمجھا گیا۔

ہر خدا نے اپنی ذاتِ پاک یا نفسِ قدسی یا جوہر سے ایک دیوی وضع کر کے اپنی زوجیت[6] میں لی اور ان سے دیگر دیوتا مثلاً سن (قمر) شمس (آفتاب) رم من (ہوا) پیدا ہوئے[7]۔ اس روز افزوں نسل سے تیامت کی حکومت صرف محدود ہی نہیں ہوئی بلکہ اُس کے مدعا کے خلاف اُس کی اولاد نے عالم کو قبضہ میں لا کر باقاعدہ کرنا چاہا۔ اس سوءِ ادبی کو دیکھ کر اپسو سے نہ رہا گیا۔ اپنے خلف الرشید و مشیر ممو سے کہا کہ اے میرے لختِ جگر میرے ہمراہ تیامت کے حضور میں حاضر ہو کر لحمو اور لخامو کی اولاد کے ارادوں سے جو خدائے افلاک بن بیٹھے ہیں مطلع کر۔ چنانچہ دونوں حاضر ہو کر سربسجود ہوئے اور اپسو نے عرض کیا کہ اے قادرِ علی الاطلاق، ملاءِ اعلیٰ کے ارادوں کی جب سے مجھے اطلاع ہوئی ہے شب کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ رخنہ اندازی کر کے ملاءِ اعلیٰ کے منسوبوں کو تباہ اور آفت و مصیبت نازل کر کے پریشان و سرگرداں کر دوں گا۔

---

[1] انشار بمعنی ساکنِ عرش۔

[2] کشار بمعنی ساکنِ زمین۔

[3] انو۔ خدائے افلاک۔

[4] انلیل کو ایلی لا اور انلیل بعل بھی کہتے تھے اور وہ تمام خوبیوں کا خدا سمجھا جاتا تھا۔

[5] ئیا کو آ بھی کہتے تھے اور وہ عقل و فہم کا خدا تصور ہوتا تھا نیز پانی کا خدا سمجھا جاتا تھا۔

[6] انو کی زوجہ انات۔ بعل کی لعلیت۔ ئیا کی دام کنیا۔

[7] یہ سب مرتبہ میں برابر تھے۔ ان کے بعد خود سیارے یا ملائکِ سیارگاں کا شمار تھا۔

تیامت اِس خبرِ بد کو سن کر غرائے اور تباہ کُن طوفان اٹھانے لگی اور غصہ میں کوسنا شروع کیا۔ بعدازاں اپسو سے دریافت کیا کہ ایسی کون سی تدبیر عمل میں لائی جائے جو جلیل القدر خداؤں کو اُن کے ارادوں سے باز رکھے اور ہم بلا کسی مداخلت کے زندگی بسر کرتے رہیں۔ فتنہ انگیز ممّو بولا کہ گو ملاء اعلیٰ جلیل القدر اور اُن کے ارادے بلند ہیں تاہم آپ اُن کو زیر اور اُن کے عزم کو پست کر سکتی ہیں۔ ممّو کی رائے سُن کر اپسو شاد شاد ہوا لیکن خداؤں کے عزم کے خیال سے لرزاں تھا۔

ئیا خدا نے جو دانا و بینا ہے تیامت وغیرہ کے مشورہ سے واقف ہو کر منتر پڑھا جس کے اثر سے اپسو اور ممّو مسخ یا مقید ہو گئے۔ کنگو نے جو آخر الذکر کا ہم خیال تھا تیامت سے عرض کیا کہ اپسو اور ممّو کے مفتوح ہو جانے سے ہم سب نہایت بے چین ہیں۔ اے قہار اُن کا بدلہ لے۔ تیامت نے جواب دیا کہ اے میرے حامی تو بھروسے کے قابل ہے اعلانِ جنگ کر۔ اولوالعزم خداؤں کے معزول کرنے کی فکر میں بڑے پیمانہ پر انتظام شروع ہوا غضب و قہر کا دریا جوش میں آیا۔ قوتِ اسفل نے ہجوم کیا اور تیامت نے (جس کو اس موقع پر ام خوبر یعنی مادر خوبر سے خطاب کیا ہے) عجائب الخلقت مخلوق پیدا کر کے خوفناک اسلحہ سے مسلح کیا۔ اور اس جرار لشکر کو کنگو کے زیر حکومت کر کے لوحِ محفوظ حوالے کی۔

انشار، تیامت اور اس کے تابعین کی سازش اور افلاک کے خداؤں کو تباہ کرنے کے ارادہ سے مطلع ہو کر نہایت چراغ پا ہوا۔ اپنے وزیر گاگا کو یاد کر کے فرمایا "اے میرے روح افزا وزیر میرے والدین کی خدمت میں حاضر ہو کر میری طرف سے عرض کر کہ خداوند کے صاحبزادہ انشار نے بندہ کو خداوند کی حضور میں بھیج کر گذارش کیا ہے کہ ماما تیامت ہم سے بلاوجہ ناراض ہو کر شب و روز غصہ میں پیچ و تاب کھاتی ہے۔ تمام دیوتا اُس کے معاون و مددگار ہو گئے ہیں حتیٰ کہ وہ بھی جن کو خداوند نے پیدا کیا تھا۔ وہ برہمی و آشفتگی کی وجہ سے شب و روز ہم کو گزند و مضرت پہنچانے کی تدبیروں میں منہمک اور دل کا بخار نکالنے کی فکر میں ہیں۔ نہایت جوش و خروش سے جنگ کی تیاری کی ہے اور لشکر جمع کر کے برسرِ پرخاش ہیں۔ ماما خوبر (تیامت) نے عجیب الخلقت اور انواع و اقسام کی خوفناک مخلوق کو پیدا کر کے کاری اسلحہ سے مسلح کیا ہے مثلاً مار ہیئت عفاریت کو تیز دانتوں اور بڑے بڑے ناخنوں سے مسلح کر کے بجائے خون کے اُن کے جسم میں زہر بھرا ہے۔ عفریت جسم برق دم اژدھے جن کے پھونکاروں سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں، غضبناک کتّے، کژدم نما اور ماہی صورت حیوان سانڈ جیسے انس (یعنی جسم ثور کا اور سر انسان کا) نیز ایسی مخلوق جس کا جسم گھوڑے کا اور منھ خونخوار کتے کی، خشمناک کتے

جن کے چار جسم آپس میں ملے ہوئے اور دُم ایک وہ بھی مچھلی جیسی بعض کا جسم انسان کا اور منہ عقاب اور شکرے کی مثال، بعض کے دو منہ اور چار پیر ہیں، بعض کی ٹانگیں اور سینگ بکرے کے اور چہرہ آدمی کا سا اور بعض کا نیچے کا دھڑ گھوڑے کا اور اوپر کا جسم انسان کی طرح - قصہ مختصر ایسے گیارہ عفریت پیکر راکشس پیدا کئے ہیں اور جاہ و جلال عطا فرما کر فلک پر چڑھایا ہے - ان کی صورت دیکھتے ہی ہر متنفس کا دل دہل جاتا ہے آندھی اور طوفان کو وجود میں لاکر حشر بپا کیا ہے - کسی میں تابِ مقاومت اور نافرمانی کی مجال نہیں ہے - کنگو کو اِس ہیبت ناک اور جرار لشکر کی سپہ سالاری سے سرفراز فرما کر ہدایت کی ہے کہ کوچ کے وقت لشکر کے پیش پیش چل کر رہنمائی کرے - نواختنِ طبلِ جنگ کا حکم دے - سپاہ کا پرا باندھ کر اور صفیں آراستہ کرکے دشمن پر حملہ آور ہو نیز جنگ و پیکار میں شیرانِ اوژن و سپاہِ جنگجو کے شیرازہ کو منتشر ہونے دے - نہایت گراں بہا پوشاک پہنا کر کنگو کو دیوتاؤں کی مجلس میں مسند نشین کیا اور منتر پڑھ کر فرمایا کہ تجھ کو ہم نے ربوبیت کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا کر تمام دیوتاؤں کو تیرے تابع فرمان کیا ہے - اے میرے پسندیدہ شوہر میری خواہش ہے کہ تیرا عروج، افتخار اور بول بالا ہمیشہ رہے لوحِ محفوظ حوالے کرکے فرمایا کہ تیری عدول حکمی کی کسی کو مجال نہیں ہوگی - زبان سے لفظ نکلتے ہی تعمیل ہوگی - تیری صرف لب کشائی سے آگ کا دیوتا ٹھنڈا ہو جائے گا - جس کو اپنی قدرت اور قوت پر زعم ہو وہ تجھ سے نبرد آزما ہوکر تماشا دیکھے - چنانچہ کنگو نے فلک پر پہنچ کر انو خدا کی قدرت حاصل کی اور تیامت نژاد دیوتاؤں کی قسمت کا فیصلہ کرنے لگا ہے - تیامت اور اُس کے تابعین کی غداری اور دغا بازی کا علم ہوتے ہی میں نے اپنے بہادر لڑکے انو کو اژدہے کے پاس (تیامت نے خود اژدہے کی صورت اختیار کرلی تھی) بھیجا تھا تاکہ سمجھا بجھا کر اُس کا غصہ فرو کرے اور صلح و آشتی سے اگر کام نکل آئے تو فبہا ورنہ بنفسِ نفیس مقابلہ کرکے زیر کرے لیکن جونہی اژدہے پر انو کی نظر پڑی اور اُس نے پھنکاروں اور غرانے کی آواز سنی بدحواس ہوکر باقاعدہ واپسی کو مقابلہ پر ترجیح دی - اُس کے بعد تودم مد کو تجویز کیا گیا مگر وہ بھی اس ہولناک صورت کو دیکھتے ہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا - آخر کار مردوخ نے تیامت کے زیر کرنے اور ہم سب خداؤں کو پناہ دینے پر کمرِ ہمت باندھی ہے - بشرطیکہ اس کی مندرجہ ذیل معروضات کو قبولیت کا شرف بخشا جائے!

(۱) سب جلیل القدر خدا مقام اپ شک کن ناکو (مقام کرسی) میں جمع ہوں،

(۲) جلیل القدر خداؤں کی مجلس میں اس کو صدر نشین کرکے اعزاز کا اعلان کیا جائے،

(۳) مستقل حکومت سے سرفراز فرمایا جائے،

(۴) مثل ہمارے وہ قسمتوں کا فیصلہ کرے،
(۵) اُس کے ہر فعل کو دوام حاصل ہو،
(۶) کن فیکون کی قدرت عطا ہو،
(۷) اُس کے احکام میں کوئی تغیر یا مداخلت نہ کی جائے۔

اے میرے وزیر گاگا جلد میرے والدین کی خدمت میں حاضر ہو کر میرا پیغام پہنچا اور دست بستہ عرض کر کہ قضا و قدر کی قدرت خداوندہی کو حاصل ہے شفقتِ بزرگانہ سے جلد مردوخ کی معروضات کو منظور فرمایا جائے تاکہ وہ ہمارے دشمنوں کا مقابلہ شیر دل ہو کر کر سکے۔"

گاگا لحمو اور لحامو کی حضور میں پہنچ کر آداب بجالایا۔ آستاں بوس ہو کر دست بستہ کھڑا ہوا اور انشار کا پیغام نہایت مودبانہ پہنچایا۔ (تیامت کی غدّاری اور جنگ کی تیاری کا حال بیان کیا) دونوں نے بغور سنا ایگیگی (ملائک) اس واقعہ کو سُن کر اشکبار کہتے تھے کہ آخر کس وجہ سے اس قدر خشونت پیدا ہو گئی۔ تیامت کی حرکت ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ اس ولئے ویلا کے بعد تمام جلیل القدر خدا جو قسمتوں کا فیصلہ کرنے والے تھے جمع ہو کر روانہ ہوئے اور یہ جمِ غفیر انشار کے پاس پہنچا۔ اُس کی اقامت گاہ خداؤں سے بھر گئی۔ دعوت کی تیاری کی گئی۔ دستر خوان بچھا۔ خاصہ چنا گیا۔ خداؤں نے نان خطائی تناول کی اور خنک شہد کا شربت نوش فرمایا۔ شرابِ کُنجد کا دور چلا۔ آنکھوں میں سرسوں پھولی۔ اپنے آپے کا ہوش نہ رہا۔ ہاتھ پاؤں نے جواب دیا لیکن ہمت بلند ہو گئی اور انتقام لینے والے مردوخ کی قسمت کا فیصلہ کیا۔ مردوخ کے واسطے قصرِ شاہی تیار کر کے اُسے مشیرِ خاص کی جگہ بٹھایا اور مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے مردوخ تو تمام جلیل القدر خداؤں کا سردار ہے اور تیری قسمت لاثانی ہے۔ تیرا کلمہ وہی قوت رکھتا ہے جو انو کا۔ آج سے تیرا حکم رائگاں نہیں جائے گا۔ عزت و ذلت دینا تیری قدرت میں ہے تیرے منہ سے نکلی بات کو استحکامِ دوامی ہو گا۔ تیری حکم عدولی کی کسی کو مجال نہیں ہو گی۔ کوئی خدا تیری قلمرو میں مداخلت نہیں کرے گا۔ نذرانوں کی افراط جو خداؤں کی دلی تمنا ہے تیری پناہ گاہ (مندر) میں ہو گی خواہ کتنی ہی قلت دیگر خداؤں کے منادر میں ہو۔ اے مردوخ تو منتقمِ حقیقی ہے۔ ہم کل کائنات کی حکومت تیری تفویض میں دیتے ہیں۔ تو عظمت و جلال سے دربار کر۔ تیرا حکم بالاتر ہو گا۔ تیرے اسلحہ ہمیشہ کاری اور دشمن کو زیر کرنے والے ہونگے۔ اے شاہنشاہ اُس کو تو اپنی پناہ میں لے جو تیرا معتقد ہو اور اُس خدا کو جس نے غدر کیا ہے نیست و نابود کر دے۔ اے نگہبان ہماری دلی خواہش ہے

کہ تیرا مرتبہ سب خداؤں سے افضل اور بالاتر ہو۔ ہست و نیست کی طاقت اور کن فیکون کی قدرت تجھ کو عطا کی جاتی ہے اس کا تجربہ اس پوشاک پر کر جو تیرے سامنے ہے۔ تیرے حکم کے ساتھ غائب اور تیرے فرمانے ہی حاضر و موجود ہو جائے گی۔

خداؤں کے ارشاد کی تعمیل میں مرودخ نے نیست کہا وہ صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔ اور ہست کہتے ہی دوبارہ عالم وجود میں آ گئی۔ اس معجزہ کو دیکھتے ہی سب خدا مسرت سے ایک زبان ہو کر بولے " مرودخ شاہنشاہ ہے " سب آداب بجا لائے اور تاج و تخت، خاتم و چتر شاہی اس کی نذر کئے گئے۔ نیز ایک کاری ہتھیار جس سے وہ دشمنوں کو مغلوب کر سکے عنایت کر کے فرمایا " جاؤ تیامت کی حیات کا خاتمہ کرو اور اُس کے خون کو مخفی مقامات پر ہوا پہنچائے گی۔" جب بزرگ خداؤں نے مرودخ کو مختلف قوتوں اور قدرتوں سے مسلح کر کے کامیابی و فیروزمندی کی شاہراہ پر کھڑا کیا تو اُس نے کمان اور نیزے کا اختراع کر کے نیزے کو بغل میں دبایا۔ گرز سیدھے ہاتھ میں لیا۔ تیر و کمان پہلو میں آویزاں کئے۔ آتش شعلہ زن اپنے جسم میں داخل کی اور اپنے جلو میں بجلی کو کوندنے کا حکم دیا۔ ایک جال بنایا نیز مشرقی مغربی، شمالی اور جنوبی ہواؤں کو وجود میں لایا تاکہ تیامت کے جسم کا کوئی حصّہ بچ کر نہ جائے۔ بادِ ادبار، آندھی، بے مثل بگولا (گرد باد) نیز چوبائی اور بادِ ہفت تند و طوفان کو ہستی میں لا کر مشرقی، مغربی، شمالی و جنوبی ہواؤں کو اپنے بزرگ انو کی عطا کردہ کمند کے قریب استادہ کیا۔ اپنے مخترع جال کو چاروں سمت پھیلایا۔ بادِ ہفت اقسام کو اپنے پیچھے پیچھے آنے کا حکم دیا اور ابوبو (صاعقہ) سے مسلح ہو کر اپنی لاثانی خوفناک جنگی چوکڑی پر سوار ہوا جس میں بے نظیر بادرفتار چار گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ اُن کے دانت سمِّ قاتل سے بجھے ہوئے۔ وہ بھاگ دوڑ میں مشاق اور دشمن کو ٹاپوں سے روندنے میں ماہر تھے۔ القصہ ان تیاریوں کے بعد اور اسلحے سے مسلح ہو کر اپنے بزرگوں کے سایۂ عاطفت میں تیامت کے مقابلہ کے واسطے روانہ ہوا جونہی مرودخ کی نظر تیامت پر پڑی کچھ ہیبت طاری ہوئی مگر سنبھلا۔ کنگو پر نظر پڑی تو دیکھا کہ نہایت حقارت سے مرودخ کو گھور رہا ہے لیکن چار آنکھیں ہوتے ہی کنگو پر رعب غالب ہوا۔ اُس کے ارادے پست ہو گئے اور انتظام میں خلل پڑا۔ اپنے ناخدا کی پریشانی دیکھ کر مددگار خداؤں کے قدم اکھڑ گئے مگر تیامت قدم جمائے اور سربلند کئے مرودخ اور دیگر خداؤں سے جو مرودخ کی پناہ میں کھڑے تھے طعنہ زنی کرنے لگی۔ مرودخ نے اس کی غداری پر لعنت ملامت کی اور کہا کہ اپنی فوج کو آراستہ اور اپنے اسلحہ کو درست کر۔ بہتر یہ ہے کہ میرا اور تیرا مقابلہ ہو۔ تیامت اِن الفاظ کو سنتے ہی غصہ سے بے خود ہو گئی۔ چیخنے اور چنگھاڑنے لگی سارا

بدن تھرانے لگا۔ غیر معمولی حرکات سے بھوت کے اثر کا شبہ ہوتا تھا۔ بہرحال اپنے آپ کو سنبھال کر تیامت منتر پڑھنے اور جادو کرنے لگی۔ خداؤں نے اپنے اپنے اسلحہ طلب کئے۔ جنگ و پیکار پر آمادہ ہوئے۔ مرودخ اور تیامت ایک دوسرے کے مقابلہ میں آگے بڑھے۔ جونہی تیامت زد میں آئی مرودخ نے اپنی کمند پھینکی۔ بادِ ادبار کو تیامت کے چہرہ پر چلنے کا حکم دیا۔ تیامت کے منہ پھاڑتے ہی بادِ ادبار نے اُس کے شکم میں داخل ہو کر اُس کی ہمت و جرأت کو سلب کر لیا اور بیچاری کا منہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ مرودخ نے موقع پا کر نیزے کا ایسا کاری وار کیا کہ انی پیٹ میں گھستی جگر کو چیرتی دل کے پار ہو گئی۔ ایک ہی وار میں تیامت کا کام تمام ہوا اور نعش پر چڑھ کر مرودخ اُس پر کھڑا ہو گیا۔[1]

تیامت کے مرتے ہی اُس کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مددگار دیوتا جو اس کی کمک پر آئے تھے ہیبت سے لرزنے لگے۔ بیچارے نفس افگندہ جان کے خوف سے سر پاؤں پر رکھ کر بھاگے لیکن بعض محصور ہو کر گرفتار اور بعض اسیرِ کمندِ مرودخ ہوئے۔ اُن کے اسلحہ توڑے گئے اور قدرتیں سلب کی گئیں۔ گریہ وزاری سے محبوس دیوتاؤں نے ایک عالم کو سر پر اٹھا لیا تھا۔ گیارہ عجیب الخلقت راکشس اور فوجِ عفاریت جن کو تیامت نے مخصوص اس معرکہ کے لئے پیدا کیا تھا نیست و نابود کئے گئے۔ کنگو شوہرِ ثانی و سپہ سالارِ افواجِ تیامت کو آسمان پر اٹھا کر اوگ گا (عزرائیل) کے حوالہ کیا گیا۔ مرودخ نے لوحِ محفوظ اُس کے قبضہ سے نکال کر (جو حقیقتاً اُس کی ملکیت نہ تھی) اور اپنی مہر ثبت کر کے اپنے سینہ میں رکھ لی۔ تمام قدرتیں جو تیامت نے ضبط کر لی تھیں انشا کو واپس دی گئیں۔ اسی طرح ندم مد متمتع ہوا۔

جب شجاع مرودخ اپنے دشمنوں کو غارت اور تباہ کر چکا تو تیامت کی نعش کی طرف متوجہ ہوا اُس کے پاؤں کی طرف کھڑے ہو کر اپنے زبردست گرز سے اُس کی کھوپڑی پاش پاش کی[2] اُس کے جسم کی شریانوں کو کاٹ کر

---

[1] زبور کی عبارت سے اژدہے پر قدرے روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ ہو زبور باب ۷۴ آیات ۱۳ و ۱۴۔ تو نے اپنی قدرت سے دریا کو چیرا۔ تو نے پانیوں میں اژدہوں کے سر کچلے۔ تو نے لویتان (Leviathan) کے سر کے ٹکڑے کئے۔ ملاحظہ ہو یسعیاہ باب ۵۱۔ آیت ۹ کیا تو وہی نہیں جس نے رہب کو کاٹا اور اژدہے کو قتل کیا۔ ملاحظہ ہو یسعیاہ باب ۲۷ آیت ۱۔ اس دن خدا وند اپنی سخت اور بڑی مضبوط تلوار سے لویتان اس تیز رو سانپ کو اور لویتان اس پیچ دار سانپ کو اور دریائی اژدہے کو قتل کرے گا۔

[2] مُردے کی کھوپڑی پھوڑنے کی رسم ہندوستان کے ہنود میں اب بھی جاری ہے نعش کے جلنے کے بعد قریب سے قریب رشتہ دار مُردہ کی کھوپڑی کو بانس یا لٹھ سے پھوڑتا ہے۔

بادِ شمالی کو حکم دیا کہ خون کو مخفی مقامات میں پوشیدہ کرے۔ مردوخ کے بزرگوں نے اس کارستانی سے شاد ہو کر تحفے تحائف پیش کئے۔

مخدوم مردوخ نے قدرے آرام کیا لیکن نعش کو بغور دیکھتا رہا اور عجیب منصوبہ گانٹھ کر اٹھا اور نعش کو سنگھاڑا[۵۱] مچھلی کی طرح پہلو کی طرف سے چیرا۔ ایک حصہ سے افلاک کا گھٹا ٹوپ بنایا[۵۲] اور چٹخنیوں سے مستحکم کر کے نگران مقرر کئے اور حکم دیا کہ پانی کو نیچے نہ اُترنے دیں[۵۲]۔ خود مردوخ نے دورہ کر کے آسمانوں کا معائنہ کیا۔ ندم مد کی آرام گاہ تحت الثریٰ میں بنائی گئی۔ نیز محل اشارہ[۵۳] بنا کر انو، بعل اور ئیا میں تقسیم کر دیا جو جداگانہ آسمان زمین اور پانی کے حاکم تھے۔ اُس نے خداؤں کے قیام کے واسطے مختلف مقامات بنائے[۵۴]۔ دیوتا شمس کو روزانہ دورہ کرنے

---

۵۱ اہلِ بابل کے اعتقاد کے موافق زمین پر آسمان اس طرح قائم ہے جس طرح محراب یا قوس پایوں پر۔ اس قوس کو مردوخ نے جنوب کی طرف سے بالکل ٹھوس رکھا لیکن شمال کی طرف سے سرنگ لگا کر مشرق و مغرب کی طرف راستہ نکالا اور یہاں یعنی مشرق و مغرب میں ایک ایک دروازہ قائم کیا۔ آفتاب جس کو شمس دیوتا سے خطاب کیا ہے۔ مغربی دروازہ سے سرنگ میں داخل ہوتا ہے۔ شب کو محلِ کیرب شامی میں جو سرنگ کے وسط میں واقع ہے آرام کرتا ہے۔

۵۲ قیامت کے وجود کو پانی تصور کیا گیا تھا۔ فلک الافلاک کے گھٹا ٹوپ بنانے سے مدعا ہے کہ پانی سب آسمانوں سے اوپر ہے۔ یہی اعتقاد یہود کا ہے۔

۵۳ ڈاکٹر جنسن کا قول ہے کہ یہاں اشارہ سے مدعا زمین سے ہے لہذا اس قول کے موافق مردوخ نے تیامت کے جسم سے قبۂ فلک الافلاک اور کرۂ ارض بنایا اور پانی زیرِ زمین کو بھی قید کیا۔ لیکن دیگر اساتذہ کا قول ہے کہ اشارہ بھی ایک آسمان یا اُس کے ایک حصہ کا نام ہے۔

۵۴ افلاک کلیہ نو ہیں اور مع افلاکِ جزئیہ ۲۴ ہیں۔ فلکِ کلی قمر کا چار افلاک پر مشتمل ہے (۱) مائل (۲) حامل (۳) تدویر (۴) جوزہر جو کہ تینوں پر محیط ہے۔ فلکِ عطارد کے بھی چار افلاک ہیں (۱) ممثل (۲) مدیر (۳) حامل (۴) تدویر۔ فلکِ شمس کے دو افلاک ہیں (۱) ممثل (۲) خارج المرکز۔ تدویر نہیں ہے کیونکہ شمس تحت خارج المرکز میں خود بجائے تدویر مرکوز ہے اور افلاکِ جزئیہ علویات یعنی زحل، مشتری اور مریخ کے الفاظ بعینہٖ مثل افلاکِ زہرہ کے تین ہیں (۱) ممثل (۲) حامل (۳) تدویر یہ سب ملا کر ۲۲ افلاک ہوئے اور عرش و کرسی سمیت ۲۴ ہوئے۔ اِن نو افلاکِ کلیہ میں سے پہلے فلک پر قمر، دوسرے پر عطارد، تیسرے پر زہرہ، چوتھے پر آفتاب، پانچویں پر مریخ، چھٹے پر مشتری، ساتویں پر زحل ہے۔ ان ساتوں سیاروں کو سبع سیارہ کہتے ہیں۔ آٹھویں آسمان پر سیارگانِ ثوابت ہیں اُس کو فلک البروج کہتے ہیں اور تاسع

کا حکم دیا۔ کل کائنات کا وجود اور دارومدار شمس کے روزانہ دورہ پر منحصر کیا۔ سال کا حساب معین کر کے دقیقوں پر تقسیم کر دیا اور بارہ ماہ کا سال تجویز کیا۔ ہر مہینے کے تین حصے کئے اور ہر حصے کو دس روز کی حکومت بخشی اور سال کے تمام دنوں کو اُس نے نبرو[۵۱] یعنی مشتری کی زیر نگرانی کیا تاکہ اُن میں سے کوئی منتشر ہو کر لاپتہ نہ ہو جائے۔ اُس نے قمر کو روشن کر کے شب کی حکومت عطا کی۔ لیل و نہار میں تمیز کرنے کی غرض سے شب کا سیارہ بنایا۔ ہمیشہ ہر ماہ کے آغاز میں سر پر آگو رکھنے کا حکم دیا (تاج جو دو سینگوں سے آراستہ ہو یعنی ہلال) اور ہدایت کی کہ ہر ماہ کے شروع میں اپنے سینگوں کو شب افروز کرے تاکہ آسمان آنکھ سے اوجھل نہ ہو۔ ساتویں روز مجھے (مردوخ) اپنا تاج دکھا اور چودھویں شب سباٹو[۵۲] (بدر کی صورت) لے کر شمس کے مقابلہ میں کھڑا ہو[۵۳] (کتبہ شکست ہو جانے سے پڑھا نہیں جاتا لیکن جہاں جہاں عبارت پڑھی جاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مردوخ نے سن دیوتا (قمر) کو اور بھی ہدایات کی نیز اُس کے منازل[۵۴] اور ہر منزل پر شمس دیوتا سے اُس کے تعلقات کو بیان کیا ہے) اُس نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۶) نے اُس کا نام کرسی رکھا ہے۔ نویں فلک پر کوئی ستارہ نہیں ہے۔ اُس کو فلکِ اعظم، فلکِ اطلس، فلک الافلاک، فلکِ محیط، فلکِ اعلیٰ، فلکِ اقصیٰ اور محدد الجہات کہتے ہیں۔ اور شارع نے اس کا نام عرش لکھا ہے۔ عرش کے اوپر نہ خلا ہے نہ ملا بلکہ لامکان ہے۔

۵۱ حکما نے مشتری کو عہدۂ قاضیِ فلک، صاحبِ فتوی، وزیر، صدر امین اور مجتہد کا عطا کیا ہے۔ یہ سیارہ مالکِ فلکِ ششم و عاملِ روز پنجشنبہ ہے۔ معزز اور افسر جملہ سیارگان سمجھا جاتا ہے۔ نہایت بطی السیر ہے۔ ایک سال میں ایک برج طے کرتا ہے آڑی ترچھی چال کی وجہ سے اہلِ بابل سمجھتے تھے کہ دیگر سیاروں اور ستاروں کو جمع کرتا پھرتا ہے اور منتشر نہیں ہونے دیتا۔

۵۲ سباٹو بمعنی تعطیل یا آرام۔ اسی لفظ سے یہود نے لفظ سبتہ (Sabath) بنایا ہے جس کے معنی روزِ آرام کے ہیں۔

۵۳ اس فقرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ بابل کو علم تھا کہ قمر اپنی روشنی آفتاب سے حاصل کرتا ہے۔

۵۴ واضح ہو کہ حکما نے فلکِ ثوابت یعنی منطقۃ البروج کے ۳۶۰ درجے مقرر کئے ہیں۔ اِن درجات کے ۱۲ حصے کر کے ان کا نام برج رکھا ہے۔ اگر ایک سیارہ دوسرے سے ۱۸۰ درجہ پر ہو تو مقابلہ کہتے ہیں اور یہ نظر عین دشمنی کی ہے، ۱۲۰ درجہ پر تثلیث نظر دوستی کی ہے، ۹۰ درجہ پر تربیع نیم دشمنی کی ہے، ۶۰ درجہ پر تسدیس کہتے ہیں یہ نظر نیم دوستی کی ہے اگر دو سیارے ایک برج میں ایک درجہ اور دقیقہ پر جمع ہوں تو قران کہتے ہیں اور اگر کوئی سیارہ آفتاب سے قران کرے تو اجتماع نیّرین اور اگر آفتاب و قمر ۱۸۰ درجہ کے فاصلہ پر ہوں تو بدر کہتے ہیں۔ انتباہِ ناظرین کے لئے نقشۂ منازلِ سبعہ سیارہ ذیل میں درج ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر دیکھئے)

سیاروں کے واسطے راستہ صاف کیا اور ان میں سے چار سیاروں کو چار دیوتاؤں[۱] کے متعلق کیا اور پانچواں سیارہ نبرو (مشتری) اپنی ذات سے منسوب کرکے سماوی امّت کا پیشوا اور محافظ مقرر کیا۔

دیوتاؤں کی ہستی اور شبیہ کو ظاہر کرنے کے لئے مردوخ نے قبۂ فلک پر ستاروں کو اس طرح آراستہ کیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۷)

منازل سبعہ سیارہ

نام کوکب	زحل	مشتری	مریخ	آفتاب	زہرہ	عطارد	قمر
نام منزل	ذراع	شرطین	ثریا	ہقعہ	بطین	زبانا	ہنفعہ
؍؍	سماک	طرفہ	اکلیل	صرفہ	دبران	نعایم	نثرہ
؍؍	بلدہ	مقدم	جبہ	قلب	عواد	سعود	زبرہ
؍؍	ذابح	شولہ	بلغ	مؤخر	اخبیہ	غفرہ	رشا

منازل قمر

حمل			ثور			جوزا			سرطان			اسد			سنبلہ		
شرطین	بطین	ثریا	ثریا	دبران	ہقعہ	ہقعہ	ہنفعہ	ذراعہ	نثرہ	طرفہ	جبہ	جبہ	زبرہ	صرفہ	صرفہ	عوا	سماک
۱۳	۱۳	۴	۹	۱۳	۴	۹	۱۳	۱۳	۱۳	۱۳	۴	۹	۱۳	۴	۹	۱۳	۱۳
میزان			عقرب			قوس			جدی			دلو			حوت		
غفرہ	زبانا	اکلیل	اکلیل	قلب	شولہ	شولہ	نعایم	بلدہ	ذابح	بلغ	سعود	سعود	اخبیہ	مقدم	مقدم	موخر	رشا
۱۳	۱۳	۴	۹	۱۳	۴	۹	۱۳	۱۳	۱۳	۱۳	۴	۹	۱۳	۴	۹	۱۳	۱۳

[۱] نرگ یعنی زحل (سنیچر) مقام فلک ہفتم
نرگال یعنی مریخ (منگل) ؍؍ ؍؍ پنجم
اشطر یعنی زہرہ (جمعہ) ؍؍ ؍؍ سوم
نبو ؍ عطارد (بدھ) ؍؍ ؍؍ دوم
نبرو یا مردوخ، مشتری (برہسپت / پنجشنبہ) ؍؍ ؍؍ ششم

بقول صاحب مخزن الادویہ روحانیہ کو لسان شرع میں ملائکہ کہتے ہیں مثلاً
روحانیہ زحل کو عزرائیل
؍؍ مشتری کو میکائیل
؍؍ مریخ کو اسرافیل
؍؍ شمس کو جبرائیل

کہ بروج[۵۷] کی صورت بن گئی اور اُن کو دیوتاؤں پر تقسیم کردیا۔

---

۵۷ واضح ہو کہ اہلِ بابل نے جن کی پیروی ہر ملک کے منجم آج تک کررہے ہیں فلکِ ثوابت کو باعتبارِ شکلِ ستارگان بارہ حصّوں پر تقسیم کرکے بارہ بروج قرار دیتے ہیں۔ ہر برج کا ستارگان کے اجتماع سے جیسی شکل موضوع ہوتی ویسا نام رکھا گیا۔ مثلاً

(۱) برج نسان جس کی صورت مینڈھے کی ہے اور اہلِ عرب اس کو الحمل اور اہلِ ہند میکھ کہتے ہیں۔
(۲) ” ل ملا ” ” سانڈ (نر بیل) ” ” ” ثور ” ” برکھ ” ”
(۳) ” سبزی انا ” ” جڑواں بچوں ” ” ” جوزا ” ” متھن ”
(۴) ” علل یا نگر ” ” کیکڑے ” ” ” سرطان ” ” کرک ”
(۵) ” اب ” ” شیر ” ” ” اسد ” ” سنگھ ”
(۶) ” نسابہ ” ” حسین عورت کی ہے جس کے ہاتھ میں گیہوں کی بال ہے ” ” سنبلہ ” ” کنیاں ”
(۷) ” تصری ” ” ترازو ” ” ” میزان ” ” تولا ”
(۸) ” اشارہ ” ” بچھو ” ” ” عقرب ” ” برچھک ”
(۹) ” پابل سگ ” ” گھوڑے جیسا آدمی ” ” قوس ” ” دھن ”
(۱۰) ” سحرماس ” ” مچھلی حلوان نما بصورت مگرمچھ ” ” جدی ” ” مکر ”
(۱۱) ” گولا ” ” {ایک آدمی جو کھڑا ہوا ایک ڈول سے اپنے پیر کے قریب پانی ڈالتا ہے اور وہ پانی مچھلی کے منہ تک پہنچتا ہے} ” دلو ” ” کنبھ ”
(۱۲) ” ادار ” ” پانی کی نہر اور دو مچھلیاں ” ” حوت ” ” مین ”

معوج الطلوع اور کوتاہ مطالع چھ برج یہ ہیں:- جدی، دلو، حوت، حمل، ثور، جوزا،

مستقیم الطلوع اور دراز مطالع چھ برج یہ ہیں:- سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس،

سمتِ بروج:- مشرق میں بروجِ حمل، اسد، قوس

مغرب میں ” جوزا، میزان، دلو،

(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحے پر دیکھئے)

نیابت کے نصف جسم سے زمین بنائی۔ کرۂ ارض کو نیم مدوّر مثل الٹی ہوئی گُفا[۵۱] کے بنایا۔ کناروں کی طرف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۹) شمال میں بروج سرطان، عقرب، حوت

جنوب ،، ،، ثور، سنبلہ، جدی،

حکمائِ فلاسفہ نے بارہ برجوں کو عناصر اربعہ پر تقسیم کیا ہے۔

آتش :۔ حمل، اسد، قوس

خاک :۔ ثور، سنبلہ، جدی،

باد :۔ جوزا، میزان، دلو

آب :۔ سرطان، عقرب، حوت۔

حکماء نے دورِ فلک یعنی منطقۃ البروج کو ۲۸ برابر حصوں پر منقسم کیا ہے

پہلی سات منزل بروج ربعہ سے منسوب ہیں اور شمالی صاعد ہیں۔ درمیان مغرب و شمال کے ہیں

دوسری ،، ،، صیفیہ ،، ،، شمالی بابط ،، ،، شمال و مشرق ،،

تیسری ،، ،، حریفیہ ،، ،، جنوبی بابط ،، ،، مغرب و جنوب ،،

چوتھی ،، ،، شتویہ ،، ،، جنوبی صاعد ،، ،، جنوب و مشرق ،،

بروج کے رنگ بھی قائم کئے ہیں مثلاً حمل برنگِ سرخ، ثور برنگِ سفید، جوزا برنگِ سبز، سرطان برنگِ سرخ مختلط بہ سفیدی، اسد برنگِ زرد و سفید آمیختہ، سنبلہ برنگ گوناگوں یعنی چتکبرا، میزان برنگِ سیاہ، عقرب برنگِ سیاہ سرخی آمیختہ، قوس برنگِ فاختہ، جدی برنگِ سیاہ و سفید، دلو برنگِ نیولا، حوت سفید مائل بہ سرخی۔

۵۲ بزگال یعنی مریخ کو بروج حمل اور عقرب عطا کئے

اشطر ،، زہرہ ،، ثور اور میزان ،،

نبو ،، عطارد ،، جوزا اور سنبلہ ،،

نرگ ،، زحل ،، جدی اور دلو ،،

سن ،، قمر ،، سرطان ،،

شمس ،، آفتاب ،، اسد ،،

خود مروخ نے نبرد ،، مشتری ،، قوس و حوت لئے

نام کوکب	جنس	رنگ	مقام	حاکم روز	وقت قوت	عنصر	مزاج	خطوط کواکب
زحل	مذکر	سیاہ	فلک ہفتم	شنبہ	نہاری	خاکی	جاہل و چغلخور	⊢
مشتری	،،	زرد	،، ششم	پنجشنبہ	،،	آتشی	بلغمی	□
مریخ	،،	سرخ	،، پنجم	سہ شنبہ	لیلی	،،	خونی	+
شمس	،،	طلائی	،، چہارم	یک شنبہ	نہاری	،،	صفراوی	⊙
زہرہ	مونث	سفید	،، سوم	جمعہ	لیلی	بادی	بلغمی	×
عطارد	خنثیٰ	فیروزی	،، دوم	چہار شنبہ	نہاری یا لیلی	،،	صفراوی بلغمی	⊢⊣
قمر	مذکر یا مونث	سبز	،، اول	دوشنبہ	لیلی	آبی	بلغمی بادی	6

۵۱ گُفا یعنی گول کشتی بغداد میں اب بھی اس قسم کی کشتیاں رائج ہیں۔ بڑے بڑے گول بید کے ٹوکروں کو (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

سے زمین کو بتدریج بلند کرتا چلا گیا حتّٰی کہ وسط میں پہنچ کر مثل پہاڑ کی چوٹی کے بلند کر دیا۔ اور اُس کو برف سے ڈھک کر دریائے فرات وہیں سے جاری کیا۔ کفانما کرۂ ارض کے کنارے اونچے لیکن یکساں بلند مثل دیوار کے زمین کے گرداگرد بنائے تاکہ پانی زیرِ زمین اوپر نہ آسکے۔ کنارے اونچے ہو جانے سے درمیانی حصّہ میں خلا پیدا ہو گیا۔ اُس خلا کو پُر از آب کرنے سے ایک تنگ سمندر بن گیا جس کو دیوتاؤں کی اجازت بغیر کوئی فردِ بشر پار نہیں کر سکتا تھا اور اس سمندر کو رازِ الٰہی سمجھا جاتا تھا۔

مرودخ نے اپنی کمان اور کمند آسمان پر محفوظ کیں۔ ہواؤں کو بھی مقیّد کر کے اپنی اپنی جگہ پر قائم کیا۔ (دیگر انتظاماتِ فلک و ارض کو بھی بیان کیا گیا تھا لیکن کتبہ کے حروف مٹ جانے سے کچھ پڑھا نہیں جاتا)

جب مرودخ آسمانؔ و زمین کی ساخت اور ترتیبِ عالم سے فارغ ہوا تو دیگر خداؤں کی امداد اور مجموعی کوشش سے وحوش و مواشیٔ صحرائی اور حشرات الارض کو ہستی میں لایا۔ بعد ازاں مرودخ نے تاریکی کو روشنی سے، آسمان کو زمین سے جدا اور تمام عالم کو باقاعدہ کیا لیکن جاندار روشنی کی تاب نہ لا کر بے جان ہو گئے لہٰذا دوبارہ اس طرح پیدا کئے گئے کہ مرودخ نے اپنے والد ئیا کو ہدایت کی کہ اُس کے سر کو تن سے جدا کرے اور اُس کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۰ ؎ چرم سے منڈھ کر اور قیر آلود کر کے دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ اس صورت اور ساخت کی کشتیاں کفا کہلاتی ہیں۔ اس نیم مدور کشتی کو زمین پر الٹا رکھ کر دیکھنے سے اہلِ بابل کا خیال زمین کی صورت کے متعلق سمجھ میں آجائے گا۔

؎ توریت کے باب ۱ سے اگر مقابلہ کیا جائے تو بہت کم فرق پایا جائے گا۔ توریت شاہد ہے کہ ابتدا میں خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔ زمین ویران اور سنسان تھی اور خلا پر اندھیرا تھا۔ خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔

پہلا روز۔ خدا نے اجالا کیا اور اجالے کو اندھیرے سے جدا کیا۔ اجالے کو دن اور اندھیرے کو رات کہا۔

دوسرا روز۔ خدا نے پانیوں کو پانیوں سے جدا کیا اور فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے کے پانیوں کو فضا کے اوپر کے پانیوں سے جدا کیا اور خدا نے فضا کو آسمان کہا۔

تیسرا روز۔ خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے پانی ایک جگہ جمع ہوں کہ خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہو گیا۔ خدا نے خشکی کو زمین کہا اور جمع شدہ پانی کو سمندر کہا اور خدا نے نباتات و جمادات اور مختلف میوہ دار درختوں کو اگایا۔

چوتھا روز۔ خدا نے کہا کہ آسمان کی فضا میں نیّر ہوں تاکہ دن اور رات میں فرق کریں اور زمانوں، دنوں اور سالوں کا شمار ہو سکے لہٰذا خدا نے دو بڑے نیّر بنائے ایک نیّرِ اعظم جو دن پر حکومت کرے اور نیّرِ اصغر جو رات پر حکومت کرے اور ستاروں

خُون میں مٹی کو گوندھ کر اُس سے حیوان اور بشر بنائے جائیں تاکہ مقدس خون کی برکت سے جان دار ہوا اور روشنی کو برداشت کر سکیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور سب زندہ رہے۔[۵]

ابوالبشر کو عالمِ ہستی میں لانے کے بعد اُس کی رہنمائی کے لئے مرودخ نے مندرجہ ذیل ہدایات کیں:-

(۱) اپنے خدا کی طرف سے اپنے دل کو پاک رکھ کیونکہ یہی حمد پروردگار ہے۔

(۲) اے بندے تجھ کو لازم ہے کہ تو علی الصباح نماز پڑھے، دعا مانگے، گریہ وزاری کرے اور سجدہ اس طرح کرے کہ تیری پیشانی زمین پر لگ جائے۔

(۳) خوفِ خدا رحم پیدا کرتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۱) کو بھی بنایا اور خدا نے ان کو آسمان کی فضا میں رکھا کہ زمین کو روشنی بخشیں اور اجالے کو اندھیرے سے جدا کریں۔

پانچواں روز۔ خدا نے دریائی جانوروں اور ہر قسم کے پرندوں کو پیدا کیا۔

چھٹا روز۔ خدا نے وحوش و مواشئ صحرائی اور حشرات الارض کو بنایا۔ پھر خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت اور اپنی مانند بنائیں کہ وہ سب پر حکومت کرے۔

ساتواں روز۔ آرام کیا اور اُس کا نام سبتھ Sabath رکھا۔

[۵] چند کتبوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں منجملہ ان کے ایک میں پیدائشِ وحوش اور مواشئ صحرائی نیز حشرات الارض کا ذکر ہے۔ اس ریزۂ کتبہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ تنہا مرودخ کی نہیں بلکہ مختلف خداؤں کی مجموعی کوشش سے اُن کو پیدا کیا گیا تھا اور شاید مرودخ نے سب سے اہم حصہ اس کام میں لیا تھا۔ ریزۂ مذکور کی عبارت بھی اکثر جگہ سے مٹ گئی ہے لیکن ایک جگہ نن اگی آزگ درج ہے جو دیوتا ئیا کا خطاب ہے اور جس کے معنی دانا و بینا کے ہیں۔ بعض الفاظ سے قیاس ہوتا ہے کہ پیدائشِ بشر کا حال درج تھا۔

ایک اور کتبہ کے ٹکڑے میں درج ہے کہ خدا ئیا کے دل میں بشر کے پیدا کرنے کا خیال آیا۔ مرودخ نے علمِ غیب سے دل کا حال دریافت کر کے اپنے خون سے بشر کو پیدا کیا تاکہ زمین پر آباد ہو کر دیوتاؤں کی پرستش اور منادر کی تعمیر کرے اس کتبہ سے بروسس بابلی کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ مرودخ نے اپنے خون سے ابوالبشر کو نیز مختلف حیوانات کو بنایا تھا۔

جارج دی سن سیلس اور یوسی بیس مورخوں کا بحوالہ بروسس بیان ہے کہ تمام دیوتاؤں کی مجموعی کوشش سے حیوانِ ناطق و مطلق و حشرات الارض پیدا کئے گئے لیکن تاریکی کو روشنی سے جدا کرتے ہی تمام جان دار فنا ہو گئے لہذا مرودخ نے اپنے خون میں مٹی کو گوندھ کر بشر اور دیگر حیوانات وغیرہ کو بنایا اور وہ سب روشنی میں زندہ رہے۔ اس قول کی کتبوں سے تائید ہوتی ہے۔

(۴) صدقہ زندگی کو بڑھاتا ہے۔

(۵) نماز گناہوں کو دھوتی ہے۔

(۶) وہ شخص جو خداؤں سے ڈرتا ہے کبھی غم میں مبتلا نہیں ہوتا۔

(۷) وہ شخص جو انوناکی (زمین کی ارواح یعنی ارواح جو زمین پر موجود ہیں) سے ڈرے گا بڑی عمر پائے گا۔

(۸) اپنے دوست اور ہمسایہ کی کبھی برائی نہ کر۔

(۹) غیب کا حال کبھی بیان نہ کر اور رحم سے کام لے۔

(۱۰) جب کبھی کسی چیز کے دینے کا وعدہ کرے تو ضرور دے اور کبھی ہاتھ نہ روکے۔

افسوس ہے کتبہ شکست ہوگیا اور باقی کی عبارت فنا ہوگئی۔

آخر میں مروذخ کے اکیاون نام درج ہیں۔ ان میں لفظ توتو مروذخ کی شان میں آیا ہے جس کے معنی خالق و آفریدگار کے ہیں۔ اسی سلسلہ میں بشر کی پیدائش کے وجوہ درج ہیں۔ کتبہ مذکور کی عبارت کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

سطر ۲۵ - توتو اگازاگا یعنی خالق، فخر تاج، تاج کو عظمت عطا کیجیو۔

" ۲۶ - مالک مجرب منتر کا، مردہ کو زندہ کرنے والا۔

" ۲۷ - وہ ذات جس نے مفتوح دیوتاؤں پر رحم کیا۔

" ۲۸ - (وہ ذات) جس نے مخالف دیوتاؤں کے کندھوں پر جوا بھاری کیا۔

" ۲۹ - اور اُن کی شفاعت کے واسطے بشر کو پیدا کیا۔

" ۳۰ - وہ رحیم جس کی متابعت میں نجات ہے۔

اہل بابل کے اعتقاد کے موافق بشر کو دیوتاؤں کی پرستش اور پوجا کی غرض سے پیدا کیا گیا تھا نیز اس لئے کہ اُن کی بندگی و عبادت، نیکوکاری و راست بازی ذریعہ اُن دیوتاؤں کی شفاعت کا ہو جو افلاک کے خداؤں سے منحرف ہوکر عذاب میں گرفتار تھے۔ کتبہ مذکور شاہد ہے کہ تمام خداؤں نے اپنی مختلف قدرتیں مروذخ پر منتقل کردی تھیں اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اہل بابل کا مذہب وحدانیت کا رنگ لئے ہوئے تھا۔

کتبہ مذکور کے آخر میں ہدایت درج ہے کہ عقلا ہمیشہ آفرینش کے واقعات پر غور کریں اور لازم ہے کہ پدر اپنے پسر کو تعلیم دے، اور بادشاہ کو چاہیئے کہ اس واقعہ کو سنا کرے۔

محمد حامد (دہلوی)

آخری دُعا

شرمِ عصیاں سے جُھک گئی ہے گردن
اَللّٰھُمَّ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا

اب، بندہ ترے حضور میں آیا ہے
عاصی، دربارِ نُور میں آیا ہے

اِس مورِ ضعیف کی صدا بھی سُن لے
اِس بندے کی آخری دُعا بھی سُن لے

تو میری دعا کا مدّعا ہو جائے
بیمارِ وجود کو شفا ہو جائے

اِس طولِ اَمل کا رشتہ کٹ کر رہ جائے
پھیلی ہوئی زندگی سمٹ کر رہ جائے

پیری سے بدل جائے جوانی میری
وقفِ مُردن ہو زندگانی میری

یہ خشک نہال بارور ہو جائے
ہر جزوِ بدن تارِ نظر ہو جائے

دیکھوں جس سمت، ایک جلوہ نظر آئے
یہ آئینہ بال آکے، دو ہونے نہ پائے

نقشِ کون و فساد فاسد ہو جائے
محسوسِ حواسِ خمسہ واحد ہو جائے

ہو جائے ادائے عجز جوہر میرا
قدموں میں ترے پڑا رہے سر میرا

تلوے ترے مَلتی رہیں میری آنکھیں
ان پھُولوں سے پھلتی رہیں میری آنکھیں

سو جاؤں، تو تیرا ہاتھ ہو سر کے تلے
جب آنکھ کھلے تیرے تبسّم میں کھُلے

دنیا کے عمل میں دین پیدا کر دے
تشکّی دل میں یقین پیدا کر دے

سچّے دل سے کروں عبادت تیری
واپس کر دوں تجھے امانت تیری

یہ کہہ کے، بدن سے نکلے جانِ آگاہ
سَمْعِیْ، بَصَرِیْ، دَمِیْ، عِظَامِیْ لِلّٰہ

"مَیں مُوں" کی صدا ہو منتہی "یا ہُو" پر
ہو خاتمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوْ پر

امجد

پھول والوں کی سیر

"اے ہے گرمی تو پہلے بھی ہوتی تھی مگر اب کے برس تو ایسی تڑاقے کی گرمی پڑی ہے کہ توبہ بھلی ہے۔ پسینے کے مارے شرابور، پنکھا کسی وقت تو ہاتھ سے چھوٹتا نہیں۔ دم ہلکان ہوا جاتا ہے۔ ان دنوں ہیں پھول والوں کی سیر ہوئی۔ لو بیوی اور تماشا دیکھو نہ ابر ہے نہ پھیاں پھیاں مینہ برس رہا ہے بلا سے پھول والوں کی سیر تو ہو گئی۔ اے سیر تو گئی بادشاہی وقت کے ساتھ اب تو نقل ہے۔" دوا مبارک مہتابی پر بیٹھی منوا تر یہ زٹر لگا رہی تھیں۔ میں صبح سے اس فکر میں تھی کہ پھول والوں کی سیر کی اصلیت کیا ہے کسی سے معلوم کروں۔ اس وقت گرمی سے جو دم بولایا تو کوٹھے پر چڑھ گئی۔ دوا مبارک کی یہ زٹر سن کر خیال آیا کہ ان سے ہی دریافت کروں۔ دوا اگلے وقتوں کی آدمی اسی برس کے پیٹے میں ہیں۔ اب سے دو تین برس پہلے اُن کے پان کھانے اور پلپلانے کی نقل میں بھی اتارتی تھی۔

دوا مبارک اس عمر میں اس بلا کی شوقین طبیعت ہیں کہ آندھی جائے مینہ جائے مگر اُن کی کنگھی چوٹی میں فرق نہیں آتا۔ کاجل اور وہ بھی خوب دھواں دھار دونوں وقت لگنا روزانہ سر گوندھنا اُن کا معمول ہے۔ پھر کیا مجال کہ اُن کے پان دان یا صراحی کو کوئی ہاتھ لگائے تو حشر تک اُس کا پیچھا نہ چھوڑیں۔ اگر کوئی پلنگ پر بھی بیٹھ جاتا ہے تو گھنٹوں بڑبڑاتی ہیں۔ مجھ پر تو خاص عنایت ہے کہ مجھ کو ان کی ہر چیز میں دخل ہے۔ باتوں کی ایسی شوقین ہیں کہ صبح سے شام کر دیں افسانہ ختم نہ ہو۔ میں نے دریافت کیا اچھی دوا پھول والوں کی سیر کیوں ہوتی ہے میرے اس سوال پر پہلے دوا نے ایک لمبا ٹھنڈا سانس کھینچا اور پھر کھانس کر آواز صاف کی اور اس طرح سلسلۂ کلام شروع کیا۔

"میری چاند جب بادشاہی وخت (وقت) تھا تو اس اجڑی دلی شاہجہان آباد میں سب کچھ تھا جب بادشاہ سلامت موجود تھے قلعے آباد تھے خدا بخشے بڑے نواب صاحب تمہارے نانی اماں کے والد خدا اُن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہم نے اُن کے وخت میں ایسے عیش کر لئے کہ اب اُن کے بچوں کو نصیب نہیں،" یہ کہتے کہتے دوا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کانپتے ہاتھوں سے دوا نے آنسو دوپٹے کے آنچل سے پونچھے۔ کھنکار کر گلا صاف کیا، اور یوں گویا ہوئیں، "ہاں تو بڑے نواب صاحب بھی بادشاہ سلامت کے ساتھ جاتے تھے ہائے کیسے کیسے گبرو جوان مغلیہ کے تھے۔ خدا بخشے تمہارے نانا تو چودہ پندرہ برس کے تھے تمہاری نانی اماں ٹوپی اوڑھے پھرتی تھیں میں اُن

سے ایک دو برس بڑی ہوں۔ اُن کے ہی ساتھ کھیلتی تھی۔ تمہاری قطب کی کوٹھی ایسی سجی ہوئی تھی کہ منہ سے بولتی تھی۔ سیر میں بیگماتیں نہیں جاتی تھیں، کیونکہ امیر، رئیس، شہزادے سب ہوتے تھے، مگر تمہاری نانی اماں کا پردہ نہ تھا وہ نواب صاحب کے ساتھ جاتی تھیں۔ میں اور اُن کی اور ماماؤں کی لڑکیاں ساتھ ہوتی تھیں۔ ہائے کیا وخت تھے۔ نہ نگوڑے یہ زمانے تھے کہ ہولوں میں دم جاتا ہے۔ نہ یہ باتیں تھیں، جس کو دیکھو آپے سے باہر، مردوں نے ڈاڑھیاں منڈوالیں، عورتوں نے چُٹیاں کٹوالیں، کیسا سخت منہ لگتا ہے"۔

میں دوا کی اِس تقریرِ بے ہنگام سے اکتا گئی تو دوبارہ کہا سیر کا بیان کرو۔ دوا نے کہا "بیٹی اُس کی اصلیت یہ ہے اکبر شاہ ثانی کو یہاں کی آب و ہوا پسند تھی، اس لئے یہاں آکر رہتے تھے جس زمانے میں مرزا جہانگیر اکبر شاہ کے چہیتے بیٹے نظر بند الہ آباد میں ہوئے تو اُن کی والدہ نواب ممتاز محل نے منت مانی تھی کہ مرزا جہانگیر چھوٹ کر آئیں گے تو خواجہ صاحب کے مزار پر پھولوں کا غلاف اور چھپر کھٹ چڑھاؤں گی بیٹی اگلے زمانے بھولے تھے، اُن کی دعا قبول ہوئی، مرزا جہانگیر چھوٹ آئے تو ممتاز محل نے بہت دھوم دھام سے پھولوں کا غلاف اور چھپر کھٹ چڑھایا۔ پھول والوں نے چھپر کھٹ میں ایک پنکھا بھی بنا کر لٹکا دیا۔ بہت سا کھانا دانا نواب ممتاز محل نے فقیروں کو بانٹا۔ بادشاہ کی خوشی سے قلعہ کے لوگ اور شہر کی سب خلقت جمع ہوگئی۔ ایک بڑا بھاری میلہ ہوگیا۔ بادشاہ کو یہ میلہ پسند آیا۔ ہر برس بھادوں کے مہینے میں مقرر کر دیا۔ بادشاہ ڈھائی سو روپیہ انعام پنکھے کی تیاری کے لئے جیبِ خاص سے مرحمت فرماتے تھے۔ ہر برس یہ میلہ ہوتا تھا مہینوں پہلے بادشاہ کے ہاں پنکھے کی تیاری ہوتی تھی۔ رنگ برنگ کے جوڑے طرح طرح کے مصالے اُن پر ٹانکے جاتے ہیں۔ فراش، سپاہی سب کارخانوں کے لوگ خواجہ صاحب روانہ ہوئے۔ دیوانِ خاص بادشاہی محل جھاڑ جھوڑ فرش فروش پردے لگا آراستہ کیا۔ ایک دن پہلے محل کا تانتا روانہ ہوا۔ خاصگی رتھوں میں نورے دار میں تصرفی میں سب کارخانے والیاں نوکریں چاکریں لونڈیاں باندیاں۔ دوسرے دن صبح کو بادشاہ سوار ہوئے بڑھی چڑھی بیگمات شہزادے خواجہ صاحب پہنچے۔ بادشاہی محل سے لے کر جھرنا امریوں، ناظر کے باغ، شمسی تالاب تک لے کر پردہ ہی پردہ ہوگیا۔ سپاہی اور فوجوں کے پہرے لگ گئے۔ کیا مقدور کہ غیر مرد کا پشتہ بھی دکھائی دے محل کی جنگلی ڈیوڑھی سے بادشاہ ہوادار میں اور بادشاہ بیگم تام جھام میں اور سب ساتھ ساتھ جھولے پر آئے۔ بادشاہ اور ملکہ زمانی بارہ دری میں بیٹھے۔ اور سب سیر کر رہے ہیں۔ کڑاہیاں چڑھ گئیں۔ پکوان ہونے لگے امریوں میں جھولے پڑ گئے۔ سودے والیاں آ بیٹھیں "جھولا کن ڈالو رے امریاں" کی سریلی تانیں لگنے لگیں۔ جھوم جھوم کے بادل آ رہے ہیں۔ مینہ کی جھما جھمی مور کی جھنگار گانے کی للکار عجب بہار دکھا رہی ہے۔ منہ سے رنگ کٹ کٹ کر بہ رہا ہے، کپڑوں سے لالۂ نافرمان کھل رہا ہے، آم کا ٹپکا لگ رہا ہے، جامنیں ٹپا ٹپ گر رہی ہیں، دوڑ دوڑ کر سب اُٹھا رہی ہیں۔ شام ہوئی جسولنی نے آواز دی خبردار ہو بادشاہ سوار ہوئے۔

سب پھنک پھانک سواری کے ساتھ ہولیں تو کر جا کر گٹھڑی مٹھڑی سنبھال للّو پتّو کرتی دوڑیں۔ پندرہ دن اسی طرح چہل پہل میں گزر گئے۔ تین دن سیر کے باقی رہے پھول والوں نے بادشاہ کو عرضی دی، ڈھائی سو روپے اُن کو پنکھے کی تیاری کے لئے مل گئے، تاریخ ٹھیر گئی۔ شہر میں نفیری بج گئی جھرنے کا زمانہ موقوف ہوا۔ شہر کی خلقت آنی شروع ہوئی۔ امیر امرا اپنے اپنے مکان میں آئے، کوٹھے والیوں نے کوٹھے سجائے۔ لو اب پنکھے کا دن آ پہنچا۔ ساری مخلوق امنڈ آئی۔ تیسرا پہر ہوا ادھر شہزادوں کی سواری اُدھر پنکھے کی تیاری ہونے لگی۔ شہر کے رئیس امیر غریب رنگ برنگ کے کپڑے پہن کے سج بن کے اپنے کوٹھوں پر چھجوں پر ہو بیٹھے۔ پہلے آتشباز قلعی گرز روزوں کے ہاں سے پنکھے نفیری بجتی ہوئی امیروں کے مکانوں کے نیچے ٹھہرتے ٹھہراتے لیتے لواتے چلے گئے، پھول والوں کے پنکھے کس دُھوم سے اُٹھے کہ نظر نہیں ٹھیرتی۔ آگے آگے پھولوں کی چھڑیاں، ہزارے چھوٹتے پیچھے شاہزادے ہاتھیوں پر سوار، آگے سپاہیوں کی قطار تاشہ مرفہ بجاتے پیچھے خواصی میں مختار بیٹھے مورچھل کرتے ہوئے نقیب چوبدار پکارتے صاحبِ عالم پناہ چلے آتے ہیں۔ ان کے پیچھے امیر امرا کے ہاتھی چلے آتے ہیں۔ مخلوق کے مارے کھوے سے کھوا چھلتا ہے میٹھی میٹھی پھوار، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں نفیری کی بھینی بھینی آواز قہر توڑ رہی ہے۔ آدمیوں کی بھیڑ بھاڑ، کیا گلزار ہے، اِسی دھوم دھام سے پنکھے شاہی محلوں کے نیچے آئے۔ شاہزادہ ہاتھی پر سے اُتر اپنے کمروں پر آ بیٹھے۔ اور سب پیدل ہوتے حضور چلونوں میں آ بیٹھے۔ پنکھے درگاہ میں جا کر چڑھا دیئے گئے۔ حضور نے نفیری والوں کو انعام دلوایا۔ اب تمام رات قوالی رہی صبح سب نے ہار، انگوٹھیاں، پنکھیاں، ربڑی، تندوری پراٹھے، یہاں کی سوغاتیں لے لوا چلنا شروع کیا شام تک میلہ بھسولی ہو گیا بادشاہ ساری برسات خواجہ صاحب میں ہی گذارتے تھے۔ اب نہ وہ بادشاہی تخت رہے نہ سیر رہی۔ نگوڑے فرنگیوں کے آتے ہی سب ملیامیٹ ہو گیا۔ اب تو یہ سیر رہ گئی ہے کہ کئے برس بعد اب کے بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تو یہ تڑاقے کی گرمی گرتے پڑتے مصیبت بھرتے خواجہ صاحب گئے نگوڑے دھوپ میں جلتے رہے اور الا بلا کھانے سے موا ناواں ہیضہ بہتوں کو ہو گیا۔ جان سے ہاتھ دھوئے، اچھی سیر ہوئی۔ الیو بیر ابھاگا گیا تھا وہ تو کہو دھر کی پوری تھی ورنہ خالہ بندی ہیں کیا رکھا تھا نگوڑا تندوری پراٹھا نام کا، کچّا گندوڑا کھا کے پیٹ منہ چلنے لگا نگوڑی میّا پیٹ پکڑے میرے پاس آئی میرے تو سُن کے چھکّے چھوٹ گئے۔ آخر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کہا نادِ علی گھول کر پلاؤ اُسی سے ذری دل تو ٹھیرا۔ اللہ بھلا کرے ہمسائی کا ہیں بولائی بولائی پھر رہی تھی انھوں نے کہا کہ توکّل شاہ درویش بہت اچھے ہیں، خدا نے شفا دی ہے اُن کے ہاتھ میں لکڑی ٹیکتی وہاں پہنچی۔ قربان جاؤں اُن کے کیسی نورانی صورت، جیسے فرشتہ، ایک تعویذ دیا جامائی پلا بھلا ہو گا رب وہ پلایا تو چین پڑا اُدھر اُس کے ایک دوست نے ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا اُس کی دوا پلائی مگر سچ کہوں مجھے ان نگوڑی دواؤں کا اعتبار نہیں سب میں تھو تھو شراب ملی ہوتی ہے۔ ان نگوڑے فرنگیوں کی بدولت نہ دین رہا نہ ایمان —— "دوا مبارک کا سلسلۂ تقریر ابھی جاری تھا اور میں بھی محویت سے اُن کی باتوں کو سُن رہی تھی کہ کرمن نے آ کر کہا بیوی کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے تب خیال آیا اور میں دوا کو بولتا ہی چھوڑ نیچے آ گئی۔

حمیدہ

مشاہدات وارادات

(۱)

ختم سمجھا تونے غافل شمع کا دورِ حیات
وہ ہوئی، مہرِ مبیں ہیں جذب ہوکر جلوہ گر
طالبِ غور و تامّل ہیں، اصولِ کائنات
سطح کے جلووں میں ہی اُلجھی ہوئی تیری نظر

ہستیِ ہر قطرہ دریا سے جدا ہوتی نہیں
شمع بجھ جاتی تو ہے لیکن فنا ہوتی نہیں

(۲)

سرودِ خیر سے کم دل نشیں نہیں ہمدم
نوائے بربطِ شر یا ترانۂ عصیاں
عجیب مجمعِ اضداد ہیں اصولِ حیات
فضائے عیش کے سینہ میں جوئے غم ہے رواں
ملی ہوئی ہیں حدیں اس قدر کہ کیا کہئے
یہ ایک ساز کے نغمے ہیں دو یقین و گماں

اُسی طرح سے نظر آزما ہے ظلمتِ شب
شعاعِ مہر بصارت پہ جس طرح ہو گراں!!

(۳)

گرچہ ہے انسان، یوں بننے بگڑنے کے لئے
راستہ پر جس طرح بکھرے ہوئے آثارِ پا
صبح دم یا شام کے رقصِ مہ و پرویں کے بعد
سطحِ گردوں جیسے بن جاتی ہے اک نیلی ردا
ایک ہو کر گونجتی ہے اِس فضا میں ہم نشیں!
نالۂ بیتاب یا شیریں تبسم کی صدا

آہ اِس دنیا کا ہر جلوہ ہے کتنا ناتمام
پھر بھی کی جاتی ہے ہم سے خواہشِ نقشِ دوام

سیّد علی اختر

مصری کورٹ شپ

"مَیں نے جو پیرس سے لکھا تھا وہی اب بھی کہتا ہوں کہ میں ہرگز ہرگز اس بات کے لئے تیار نہیں کہ بغیر دیکھے بھالے شادی کرلوں۔ اگر آپ میری شادی کرنا چاہتی ہیں تو مجھ کو اپنی منسوبہ بیوی کو نہ صرف دیکھ لینے دیجیے بلکہ اُس سے دو چار منٹ باتیں کرلینے دیجیئے"

یہ وہ الفاظ تھے جو نوری نے اپنی بہن سے پُرزور لہجہ میں کہے۔

"مگر یہ تو بتاؤ کہ آخر اس سے کیا فائدہ۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اگر لڑکی کی صورت شکل اچھی نہ ہوئی تو تم انکار کردوگے؟ ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا! جب سب معاملات طے ہوچکے ہیں اور شادی کرنا ہی ہے تو پھر تم کو دیکھنے سے کیا فائدہ؟" بہن نے یہ تقریر ختم ہی کی تھی کہ ماں بھی آگئی اور اب نوری کو بجائے ایک کے دو سے بحث کرنا پڑی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تین سال فرانس میں رہ کر تم نے اپنی قومیّت اور مذہب کو بھی خیرباد کہہ دیا" یہ الفاظ ماں نے اُسی سلسلۂ گفتگو میں کہے۔

"جی نہیں یہ ناممکن ہے میں پکّا مسلمان ہوں اور مصری ہوں نہ میں نے مذہب کو چھوڑا ہے اور نہ قومیت کو۔ میں تو اپنے حق پر لڑتا ہوں کہ جس سے میری شادی ہونے والی ہے اُس کو میں دیکھ لوں ...."

"اور اگر لڑکی ناپسند ہو تو شادی نہ کروں" ماں نے گویا جملہ پورا کیا۔

نوری نے برجستہ جواب دیا "اور کیا"۔

ماں نے تیز ہوکر کہا "تم کو معلوم بھی ہے کہ تمہاری منسوبہ بیوی کس کی لڑکی ہے؟ وہ جامعۂ ازہر کے نائب الشیخ کی لڑکی ہے اور شرافت امارت اور تمول میں وہ لوگ ہم سے کہیں زیادہ ہیں۔ ذرا اُن لوگوں کو دیکھو اور اپنے کو دیکھو۔ گورنمنٹ کے روپیہ پر یورپ جاکر تعلیم حاصل کرکے آئے اور انجنیر ہوگئے تو اب تم کسی کو شمار ہی میں نہیں لاتے"

"یہ سب کچھ آپ صحیح کہتی ہیں جو مجھ کو لفظ بلفظ تسلیم ہے مگر اس کے یہ تو معنی نہیں ہوسکتے کہ میں محض ان وجوہ کی بنا پر اپنا پیدائشی حق کھو بیٹھوں"

"مگر میں تو شادی پختہ کر چکی ہوں اور شادی کے تمام ابتدائی مراحل طے ہو چکے ہیں اور اب مَیں یہ نسبت نہیں توڑ سکتی" ماں نے نوری سے یہ الفاظ ایک مجبوری کا لہجہ لئے ہوئے کہے۔

"میں کب کہتا ہوں کہ آپ یہ نسبت توڑ دیں مجھ کو تو یہ رشتہ خود بسر و چشم منظور ہے"

یہ الفاظ سنتے ہی بہن چمک کر بولی "پھر آخر کیوں الٹی سیدھی باتیں کرتے ہو۔یہی تم نے پیرس سے لکھا تھا ورنہ ہم لوگ کیوں یہ غلطی کرتے"

غرض اسی قسم کی بحث بہت دیر تک ہوتی رہی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ماں نے بہت کوشش کی کہ نوری اپنی ضد سے باز آئے مگر بے سود اور اُدھر نوری نے بے حد کوشش کی کہ ماں اُس کی منسوبہ بیوی کے گھر کہلا بھیجے کہ لڑکا لڑکی سے ملنا چاہتا ہے مگر بے کار۔ماں کو اپنی بات کا پاس تھا وہ اپنی ہمچشموں میں ذلیل ہونا گوارا نہ کر سکتی تھی۔وہ پرانی رسموں کی قیود کو توڑنا نہیں چاہتی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ ایسا ناشائستہ پیغام لڑکی والوں کے یہاں کہلا بھیجے جس کو وہ ان لوگوں کی کھلی توہین خیال کرتی تھی۔نتیجہ ماں بیٹے کی ضد کا یہ ہوا کہ ماں خفا ہو گئی گھنٹوں بیٹھ کر روئی۔نوری نے بہت خوشامد کی مگر بے کار۔نوری کو ماں کو رنجیدہ کرنے کا بہت افسوس تھا مگر مجبور تھا۔کھانے کا وقت آیا اور ماں نے کھانا نہ کھایا نوری نے بھی نہ کھایا مگر مصالحت کی کوئی صورت نہ بن پڑی۔بحث کا سلسلہ پھر چھڑ گیا اور نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ماں خوب روئی پیٹی مگر سنگ دل بیٹے نے اپنے اصول سے جنبش نہ کی۔اب گھر گویا غمکدہ بنا ہوا تھا۔ماں نے کھانا نہ کھایا اور بیٹی اور بیٹے نے بھی کھانا نہ کھایا۔یہی حالت دوسری شام تک رہی اور چوبیس گھنٹے سے زیادہ گذر گئے۔نوری اپنے کمرے میں بیٹھا تھا ماں کی تکلیف کا خیال تھا۔ماں کی ستیہ اگرہ آخر کو کامیاب ہو گئی اور نوری نے ماں کی شرائط منظور کر لیں تاکہ ماں کھانا کھا لے۔

(۲)

یہ بھی دراصل نوری کی چال تھی تاکہ ماں کھانا کھا لے چنانچہ ماں کو اُس نے راضی کر لیا۔لیکن وہ اب اس سوچ میں تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔صبح کا وقت تھا اور اس واقعہ کو دو روز گذر چکے تھے۔نوری اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ اُس نے اخبار رکھ دیا اور اُٹھ کر الماری سے اخبار اور احادیث کی دو کتابیں اُٹھا لایا۔ان کتابوں کا مطالعہ وہ پیشتر بھی کر چکا تھا اور اکثر کرتا رہتا تھا۔

وہ اسی سوچ میں تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے کہ معاً اُس نے دل میں نئی بات ٹھان لی۔نوکر کو حکم دیا کہ گاڑی لاؤ۔کپڑے پہن کر تیار ہوا اور کہا کہ نائب الشیخ کے یہاں چلو۔

گاڑی ایک عالی شان مکان پر رُکی۔ مکان کا ظاہری ٹھاٹھ کہہ رہا تھا کہ کسی امیر کبیر کا مکان ہے۔ ایک نوکر دوڑ کر گاڑی کے قریب آیا۔ نوری نے اپنا کارڈ دیا اور اطلاع کی گئی۔

نائب الشیخ اپنے منسوبہ داماد کی آمد کی خبر سُن کر باہر استقبال کے لئے آئے۔ نوری نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور قابلِ احترام شیخ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ شیخ نے نوری کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لا بٹھایا۔

کمرہ مغربی سامانِ آرائش سے سجا ہوُا تھا۔ جگہ جگہ خوبصورت کام ہو رہا تھا اور تمام فرنیچر اور دیگر سامان اعلیٰ قسم کا تھا۔ اس ہال کے ایک حصّہ میں بہترین رومی غالیچوں کا فرش بھی تھا اور مشرقی فیشن کا بہترین سامان سجا ہوُا تھا۔ نیچے نیچے زمین سے ملے ہوئے خوبصورت صوفے پڑے ہوئے تھے جن پر لوگ اطمینان سے پالتی مارے تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ نائب الشیخ نے نوری کا اپنے ملنے والوں سے تعارف کرایا اور ملنے والوں نے شیخ کو داماد کے انتخاب پر مبارکباد دی۔ تھوڑی دیر بعد قہوہ کا دور چلنے لگا اور شیخ نوری سے بہ سلسلۂ گفتگو فرانس کی باتیں پوچھتے رہے۔ قہوہ کا دور ختم ہوُا اور تھوڑی دیر کے بعد شیخ کے دوست اُٹھ کر چلے گئے اور نوری اور شیخ رہ گئے۔ بڑی مشکل سے اور بڑی دیر کے سوچ کے بعد نوری نے شیخ سے نہایت مودبانہ طریقہ سے کہا:۔

"میں جناب کی خدمت میں ایک خاص مقصد سے آیا تھا"

"وہ کیا؟"

"اگر جناب اجازت دیں تو کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں؟"

"بسر و چشم بسم اللہ۔ کہو کیا کہتے ہو"

نوری نے کچھ تامل کیا اور شاید وہ الفاظ ڈھونڈ رہا تھا کہ اپنا مدعا کن مناسب الفاظ میں ادا کرے کہ شیخ نے پھر کہا "تم ضرور اپنے دل کی بات کہو کوئی وجہ نہیں کہ تامل کرو"

نوری نے ہمت کر کے نیچی نظر کر کے دبی زبان سے کہا "میں جناب سے اپنا حق مانگتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں اپنی منسوبہ سے پانچ منٹ کے لئے مل لوں؟"

نوری نے نظر اُٹھا کر جو دیکھا تو نائب الشیخ کو ہکّا بکّا پایا۔ وہ اس کے لئے بالکل تیار نہ تھے اور اُن کی خودداری کو کچھ اس سے ٹھیس سی لگی۔ شیخ نے اپنے کو عجیب کشمکش و پیچ میں پایا۔ وہ نوری کو بے حد پسند کرتے تھے مگر اُس کی اس بات سے وہ اس وقت حواس باختہ تھے۔ اپنے کو سنبھال کر شیخ نے کہا "میں اس حق کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہوں"

"کیا جناب کو اس بارے میں کسی قسم کا خاص اعتراض ہے؟"

"بے شک مجھ کو اعتراض ہے"

"مذہبی نقطۂ نظر سے یا دنیاوی نقطۂ نظر سے"

شیخ چونکہ پھر شیخ تھے وہ بولے "مذہبی نقطۂ نظر سے اور نیز دنیادی نقطۂ نظر سے کیونکہ ہمارا دین اور دنیا الگ الگ نہیں"

نوری نے خوش ہوکر کہا مگر دین کو دنیا پر سبقت ہے۔ سب سے پہلے ہمارا مذہب ہے اور پھر دنیا"

"شیخ نے بھی خوش ہوکر کہا "بیشک، بیشک تم صحیح کہتے ہو"

"پھر جب خداوند تعالےٰ نے مسلمانوں کو مخاطب ہوکر قرآنِ پاک میں کہہ دیا کہ اُن عورتوں سے نکاح کرو جو تم کو بھلی معلوم ہوتی ہوں تو پھر کون سا اعتراض رہ گیا" یہ کہتے ہوئے نوری نے آیتِ نکاح پڑھ کر سنائی۔

شیخ صاحب اِس رنگ میں بحث کرنے کو خصوصًا نوری کے سے نئی تہذیب کے دلدادہ نوجوان سے قطعی تیار نہ تھے اور نہ ہی اُن کو امید تھی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہیں مگر جواب دینے کے لئے کہا کہ ہاں یہ مذہبًا جائز توہوسکتا ہے مگر میں اس کو پسند نہیں کرتا، اور خصوصًا آج کل کے زمانہ میں"

نوری نے فورًا شیخ کی کمزوری کو محسوس کیا اور کہا "آپ کا کیا خیال ہے اگر آج کل ہم لوگ سنتِ رسول اللہ کی پیروی کریں؟ کیا یہ مستحسن نہیں ہے؟"

شیخ نے فورًا کہا "خدا ہم کو رسول اللہ کی پیروی کی توفیق دے"

نوری نے فورًا جیب میں سے ایک پرچہ نکال کر شیخ کے ہاتھ میں دے دیا۔ شیخ کی آنکھوں کے سامنے حسبِ ذیل عبارت تھی:-

(۱) "جابر سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے نکاح کا پیغام کسی عورت کی طرف بھیجنا چاہے تو ہوسکے تو اُس کو دیکھ لے جس سے نکاح کا ارادہ ہو پھر نکاح کرے"

(ابی داؤد)

(۲) مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے پیام کیا میں نے نکاح کا ایک عورت کے ساتھ زمانے میں رسول اللہ کے آپ نے فرمایا کہ تو نے دیکھ بھی لیا ہے اُس کو؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا کہ دیکھ لے اُس کو، اس سے الفت زیادہ ہوگی تم دونوں میں۔ (النسائی)

(۳) ابوہریرہ سے روایت ہے پیغام بھیجا ایک آدمی نے مدینہ والوں کے یہاں۔ فرمایا اُس کو رسول اللہ نے تو نے اُس کو دیکھ بھی لیا ہے یا نہیں اُس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا اُس عورت کو دیکھ لے۔ یعنی بغیر دیکھے نکاح کرنا اچھا نہیں۔ (النسائی)

شیخ نے اِن احادیث کو پڑھا - وہ ان احادیث کو کبھی پہلے بھی پڑھ چکے ہونگے مگر اُن کے لئے گویا اس وقت یہ بالکل نئی تھیں - وہ خاموش تھے اور کچھ بولنے میں ان کو تامل تھا کہ نوری نے اُن سے کہا کہ "کیا آپ مجھ کو ان احادیث پر عمل نہ کرنے دیں گے ؟ کیا واقعی ہم اس زمانہ میں رسول اللہ کی نصیحتوں سے بے نیاز ہیں اور وہ ہمارے لئے بےکار ہیں ؟"

شیخ نے کہا "ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ گفتۂ رسول سر آنکھوں پر مگر میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آخر تمہارا اس درخواست سے مطلب کیا ہے۔ اگر فرض کرو تمہاری منسوبہ بیوی تم کو ناپسند ہوئی تو کیا تم اس نسبت کو توڑ دوگے اور نکاح نہ کروگے ؟"

نوری نے جواب دیا "اس سے تو شاید آپ بھی اتفاق کریں گے کہ اُس صورت میں مجبوری ہوگی"

"تو اس شرط پر تو تمہاری شادی صرف یورپ ہی میں ہوسکتی ہے" شیخ نے کچھ ترشرو ہوکر کہا "مجھ کو یہ ہرگز گوارا نہیں ہے کہ میری لڑکی سے نسبت کرنے کے لئے لوگ گاہک بن کر آئیں اور ناپسند کرکے چلے جائیں۔ کیا تم نے میری عزت و آبرو کا اندازہ غلط لگایا ہے ؟ کیا تم نہیں خیال کرتے کہ نائب الشیخ کی توہین ہوگی - معاف کیجئے میں اِس قسم کی گفتگو پسند نہیں کرتا جس میں میری عزت و آبرو کا سوال ہو"

نوری بھی پختہ ارادہ کرکے آیا تھا اور اُس نے بھی کچھ تیز ہوکر کہا "بیشک آپ مصر میں وہ عزت رکھتے ہیں جو دوسروں کو نہیں مگر مجھ کو اجازت دیجئے کہ عرض کروں کہ پھر بھی آپ کو وہ عزت نہیں حاصل ہے جو امیر المومنین عمر ابن الخطاب کو مدینہ میں حاصل تھی اور آج ساری دنیا میں حاصل ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ حضرت عمر نے اپنی بیٹی ام المومنین حفصہ کو حضرتِ عثمان کے سامنے پیش کیا اور نکاح کی خواہش ظاہر کی اور جب حسب خواہش جواب نہ ملا تو پھر اُن کو حضرتِ ابوبکر رضؓ کے سامنے پیش کیا اور وہاں بھی ناکامی ہوئی۔ کیا اِس سے اُن کی عزت میں خدانخواستہ بٹہ لگ گیا ؟"

شیخ کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا اور وہ لاجواب ہوکر بولے کہ "وہ دونوں حضرات تو اُن کے دوست تھے"

"مگر میں بھی تو آپ کے عزیز ترین دوست مرحوم کی نشانی ہوں"

شیخ نے نظر نیچی کر لی اور کچھ تامل کے بعد کہا "مجھ کو کوئی انکار نہیں ہے" یہ کہتے ہوئے شیخ گھر میں چلے گئے۔

(۳)

نوری کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریشمی سیاہ پردہ اٹھایا اور اندر داخل ہؤا۔ حالانکہ دن تھا مگر کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے بجلی کا لیمپ روشن تھا۔ سامنے کرسی پر سیاہ گاؤن پہنے ایک سولہ یا سترہ سال کی نہایت ہی حسین لڑکی بیٹھی تھی۔ نوری کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوری نے سلام کیا کچھ جواب نہ ملا اُس نے دوبارہ سلام کیا تو لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔ لڑکی کی نظریں نیچی تھیں صرف داخل ہوتے وقت اُس نے ایک لمحے کے لئے نظر اٹھا کر نوری کو ضرور دیکھا تھا۔ وہ ساکت کھڑی تھی اور اُس نے نوری سے بیٹھنے تک کو نہ کہا۔ نوری اجازت طلب کرتے ہوئے بیٹھ گیا مگر لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا اور کھڑی ہی رہی۔ نوری پھر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ بیٹھ جائیے۔ نوری نے اپنی کرسی قریب کر لی اور کہا "مجھ کو فخر ہے کہ میں اس وقت اپنی منسوبہ بیوی نازلی خانم کے سامنے بیٹھا ہوں اور اُن سے کچھ گفتگو کرنے کا مجھ کو موقع ملا ہے۔ کیا مجھ کو اجازت ہے؟"

نازلی نے دبی زبان سے کہا "فرمائیے"

"آپ میرے نام سے تو واقف ہی ہونگی کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کو یہ مجوّزہ رشتہ پسند ہے؟"

اس کا نازلی نے کوئی جواب نہ دیا اُس کے چہرہ پر ایک خفیف سا رنگ آیا اور چلا گیا۔ وہ زمین کی طرف دیکھ رہی تھی اور اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی داہنے ہاتھ سے کرید رہی تھی۔

"انداز سے نوری نے معلوم کر کے کہا "میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں" اسی سلسلہ میں نوری نے پوچھا "کیا آپ میری اس ملاقات کو ناپسند کرتی ہیں؟"

"جی نہیں"

"تو پھر آپ نے اپنے والد صاحب سے اس بارے میں غیر آمادگی کا اظہار کیوں کیا تھا؟"

نازلی کے لبوں پر کچھ مسکراہٹ آئی لیکن شرم کی وجہ سے شاید کچھ نہ کہہ سکی۔ نوری نے فوراً کہا "آپ کو اس بات کا جواب ضرور دینا پڑے گا اور میں بے پوچھے نہ مانوں گا"

نازلی نے کچھ تامل سے کہا "میں نے یونہی کہہ دیا تھا"

نوری نے برجستہ کہا "تو اس سے یہ مطلب میں نکال سکتا ہوں کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں"۔ نوری نے یہ کہتے ہوئے نازلی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پھر کہا "سچ سچ بتائیے کیا آپ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں میں آپ کی

دل کی بات معلوم کرنا چاہتا ہوں "

نازلی کی نظریں نیچی تھیں اُس کے سرخ اونی شال پر بجلی کی روشنی چمک رہی تھی جس کا عکس اُس کے چہرہ پر پڑ کر سیاہ گاؤں کے ساتھ ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہا تھا - اُس نے ذرا تامل سے کہا " میں آپ کو دیکھنا چاہتی تھی ملنے کا تو مجھ کو خیال بھی نہ آسکتا تھا "

" کیا آپ مجھ کو بتا سکتی ہیں کہ آپ مجھ کو کیوں دیکھنا چاہتی تھیں " یہ سوال کرنے میں نوری کو خود ہنسی آگئی

نازلی نے بھی اب ہمت کر کے کہا " پہلے آپ بتائیے کہ آپ آخر کیوں مجھ سے ملنا چاہتے تھے جس لئے آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے اُسی لئے میں بھی چاہتی تھی کہ آپ کو دیکھ لوں "

نوری نے کہا کہ " میں تو آپ کو اس لئے دیکھنا چاہتا تھا کہ جو کچھ بھی میں نے اپنی بہن اور رماں سے آپ کے بارے میں سنا ہے اُس کی تصدیق کرلوں مگر یہ بتلایئے کہ آپ کیوں مجھ کو دیکھنا چاہتی تھیں "

نازلی نے اب نظریں اوپر کرلی تھیں اور وہ اب روبرو ہو کر باتیں سن رہی تھی - اُس کو ان سوالات پر کچھ ہنسی سی بھی آرہی تھی اور اُس نے جواب دیا کہ " میں تو یونہی دیکھنا چاہتی تھی "

" مگر میں آپ سے بغیر اس کی وجہ پوچھے نہ مانوں گا "

" نازلی نے کہا " مجھ کو معلوم ہی نہیں تو پھر بھلا آپ کو کیا بتاؤں "

نوری کو اس جواب سے اطمینان ہوگیا لیکن اُس نے اب دوسرا سوال پیش کردیا -

" میں جب پیرس میں بیمار پڑ گیا تھا تو آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے دو مرتبہ اپنے خطوط میں میری بہن کو یہ لکھا تھا کہ تمہارے بھائی اب کیسے ہیں - یہ آخر آپ نے کیوں لکھا تھا "

نازلی کو اس بات پر ہنسی آگئی اور وہ کہنے لگی " معاف کیجئے گا آپ کیسے سوالات کر رہے ہیں - کیا کسی کی خیریت دریافت کرنا گناہ ہے ؟ "

نوری نے کہا " اچھا آپ صرف یہ بتایئے کہ کیا آپ میری بیماری کا حال سُن کر کچھ متفکر ہوئی تھیں اور کیا آپ کو میرا کچھ خیال آتا تھا "

نازلی نے سمجھ لیا تھا کہ ایسے سوالوں سے نوری کا کیا مطلب ہے اور اُس کو بھی ان سوالات میں دلچسپی آرہی تھی اُس نے بجائے جواب دینے کے ہنستے ہوئے کہا " اچھا پہلے آپ بتایئے کہ اگر اُسی زمانہ میں میں بیمار پڑتی اور آپ کو اس کا علم ہوتا تو آپ میری خیریت دریافت کرتے یا کچھ متفکر ہوتے یا آپ کو میرا کچھ خیال آتا "

نوری نے کچھ لاجواب ہو کر کہا "میرا خیال ہے کہ ضرور مجھ کو بہت خیال آتا اور فکر بھی ہوتی اور میں خیریت بھی دریافت کراتا"۔

نازلی کامیابی کی خوشی کے لہجہ میں تیزی سے بولی "آخر کیوں، آخر کیوں۔ نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا تھا اور نہ ہی آپ نے مجھ کو دیکھا تھا"۔

نوری اس مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ نازلی کا ہاتھ بدستور اُس کے ہاتھوں میں تھا۔ اُس نے اس کے ہاتھ کو نرمی سے دباتے ہوئے عجیب پیرایہ میں کہا "میری جو باتیں خود سمجھ میں نہیں آتی تھیں اُن کو میں دریافت کرنا چاہتا تھا لیکن دراصل میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ کی طرف سے جو خیالات میرے دل میں تھے کیا ویسے ہی میری طرف سے آپ کے دل میں بھی ہیں"۔

"پھر آپ نے کیا پایا؟"

"آپ کی اور اپنی حالت کو یکساں پایا۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم دونوں میں محبت کی بنیاد دراصل اُس وقت سے ہی استوار ہو گئی جب ہم دونوں کو اس کا علم ہوا کہ یہ رشتہ قائم ہو گا"۔

اس کا جواب نازلی نے کچھ نہ دیا صرف اس کے نرم ہاتھ کو ایک جنبش سی ہوئی جو نوری کے ہاتھ میں تھا اور یہی جواب تھا جو اُس کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہا تھا۔

نوری نے متاثر ہو کر کہا "ایک سوال اور کروں گا اور اُس کا جواب خدا کے واسطے ضرور دینا۔ وہ یہ کہ آپ نے جو اپنے ہاتھ سے ایک جنگل کے سین کی رنگ برنگی تصویر بنا کر میری بہن کو بھیجی تھی وہ کیوں بھیجی تھی؟"

"وہ میں نے اس لئے بھیجی تھی کہ انہوں نے مجھ کو تصویروں کا ایک البم بھیجا تھا۔ تبادلۂ تحفہ جات تو ایک پرانی رسم ہے"۔

نوری نے کچھ بیتاب ہو کر کہا "خدا کے واسطے ذرا اپنے دل کو ٹٹولئے اور اچھی طرح ٹٹولئے۔ ہر معاملہ میں میرا اور آپ کا حال ایک سا نکلتا ہے۔ بخدا مجھ کو تو ایسا معلوم ہوا کہ تصویر آپ نے میری بہن کے لئے نہیں بلکہ میرے لئے بھیجی تھی۔ تاکہ میں دیکھوں اور خوش ہوں۔ اُس وقت جس وقت تصویر آئی تو میرے دل میں یہی خیال تھا اور اب بھی یہی خیال ہے۔ سچ سچ کہئے گا کہ جس وقت آپ تصویر بھیج رہی تھیں کیا آپ کے دل میں کچھ میرا خیال آیا تھا"۔

نازلی کچھ حیران سی رہ گئی کیونکہ اس وقت نوری نے اُس کے دل کی گہرائی کا اس طرح پتہ لگا لیا کہ اُس

کو وہم و گمان بھی ہونا ناممکن تھا۔ وہ کچھ جواب نہ دے سکی اور حیرت میں تھی۔ ساتھ ہی حقیقی جذبات بھی اُس کو بولنے نہ دیتے تھے۔ نوری نے اصل کیفیت کو سمجھ لیا اور اصرار کے ساتھ کہا "اِس بات کا میں آپ سے ضرور جواب لوں گا۔ یہ میرا آخری سوال ہے اور میں اس وقت آپ کے جواب، صحیح جواب کا بیتابانہ انتظار کر رہا ہوں۔ بتائیے تو سہی کہ وہ تصویر آپ نے کس کے لئے بھیجی تھی؟"

"آپ کے لئے"، یہ کہہ کر نازلی نے آنکھیں نیچی کرلیں۔

نوری کی آنکھیں چمکنے لگیں اُس کا دل اس جواب کو سُن کر دھڑکنے لگا۔ اُس نے زور سے نازلی کا ہاتھ گویا لاعلمی میں دبایا اور خوش ہو کر اُس کے منہ سے نکلا "بخدا"!

"بخدا" نازلی کی بھی زبان سے نکلا۔

دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ نازلی نیچی نظریں کئے ہوئے بیٹھی تھی۔ نوری نے گھڑی دیکھی اور چاروں طرف دیکھ کر نازلی کا ہاتھ آہستہ سے چھوڑ دیا۔ اپنی جیب سے اُس نے ہیرے کی ایک انگوٹھی نکالی جس کی دمک سے بجلی کی روشنی میں آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ نازلی نے آنکھ کے گوشہ سے انگوٹھی کو دیکھا تو اُس نے مسکرا کر کہا "یہ آپ کے لئے ہے"، ہاتھ پکڑ کر کہا "کیا آپ اجازت دیتی ہیں" اور یہ کہتے ہوئے نازلی کی انگلی میں انگوٹھی پہنا کر اُس کے ہاتھوں کو لبوں سے لگا کر آہستہ سے چھوڑ دیا۔ "خدا حافظ۔ خدا حافظ" کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک طویل مصافحہ کیا۔ اور پھر خدا حافظ کہہ کر اجازت چاہی "خدا حافظ" نازلی نے آہستہ سے کہا۔ چلتے چلتے دروازہ سے مڑ کر اُس نے نازلی کی طرف دیکھا جو خود اُس کو جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی

اگر تم کسی سے نہایت پاک نفسی اور دلجمعی سے محبت کرتے ہو تو عنقریب تم تمام بنی نوعِ انسان کو محبت کی نگاہ سے دیکھو گے۔ اس آسمان میں آسمان گرد آفتاب کی طرح دل بھی قطرۂ شبنم سے لے کر سمندر تک ایک آئینہ کے سوا کسی پر نظر نہیں کرتا۔ وہ آئینہ جسے یہ اپنی شعاعوں سے گرم کرتا اور زریں و سیمیں بناتا ہے ——— رچر

امین

غزل

جہان جلوے سے تیرے اگر نہیں معمور ۔۔۔ تو ماہ و انجم و خورشید میں ہے کس کا نور

بنا دو تم مرے دل کو جلا کے وہ اکسیر ۔۔۔ کہ جس سے سارے زمانے کا ہو سکے غم دور

یہ کم ہے کیا صلۂ عشق ناصحِ مشفق ۔۔۔ خیالِ راحتِ ہر دو جہاں ہے دل سے دور

بنا دیا غمِ پنہاں کو برقِ ہستی سوز ۔۔۔ نثار ہوں ترے فیضِ کرم کے طبعِ غیور

زہے کرامتِ صبر و زہے تحمّلِ عشق ۔۔۔ وہ دل جو پہلے تھا پروانہ اب ہے شمعِ نور

ترے سبب سے ہمیں خلدِ عشق حاصل ہے ۔۔۔ تجھی کو ہم کہیں ظالم یہ عقل کا ہے فتور

میں اور موت کا طالب ہوں اے غمِ دوراں ۔۔۔ حیاتِ عشق میں فردوس کیا نہیں مستور

مثالِ مردہ چل امواج کے اشاروں پر ۔۔۔ جو بحرِ زیست میں ہے تجھ کو عافیت منظور

صلائے عام ہے جور آزمائیں اہلِ جفا ۔۔۔ کہ ہم سا کوئی نہیں بے زبان اور مجبور

فروغِ گلشنِ ہستی فقط تماشا ہے ۔۔۔ گل و گہر سے سجانا انہیں نہیں منظور

جگر دیا تمہیں ناکامیوں نے کچھ نہ سبق

ذرا امید نے چھیڑا کہ ہو گئے مسرور

جگر بریلوی

میزبانؔ نوازی

انصاف اس امر کا مقتضی ہے کہ تحریر کرنے سے پہلے میں اپنی غلطی کا اعتراف کروں کہ میرا ہی قصور تھا..... محض میرا..... اپنا..... قصور! مجھ کو ہرگز یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ مجھ کو معلوم تھا۔ خوب معلوم تھا میں ہمیشہ سے جانتا ہوں کہ دوسرے لوگوں کے گھروں پر جانا اور وہاں رہنا سراسر دیوانگی ہے! تاہم مجھ سے دانستہ یہ غلطی سرزد ہوئی ـــــ ایسی غلطی جس کا کفارہ تازیست ادا ہونا محال ہے۔ نہ معلوم مجھ پر کیا سودا سوار ہوا کہ یہاں چلا آیا۔ اب تو کوئی امید باقی نہیں۔ ۱۱ نومبر سے پہلے نجات ملنا مشکل ہے۔ مفر کا کوئی راستہ نہیں۔

یہ تحریر میں ایسی عافیت کی جگہ بیٹھا لکھ رہا ہوں جہاں انسانی آنکھ مجھ کو نہیں دیکھ سکتی ہیں ہمت قلی خاں کے باغ میں حوض کے کنارے بیٹھا ہوں۔ وہ لوگ اس کو تیرنے کا تالاب کہتے ہیں۔ صبح ہی صبح برف جیسے ٹھنڈے پانی میں مینڈک کی طرح اچھلتے ہیں۔ خدا ان کو سمجھے! صبح چھ بجے کا وقت ہے۔ مشکل سے ایک گھنٹہ باقی ہے جو میں سکون کی زندگی گذار سکوں ورنہ دوسرا ذریعۂ نجات میرے لئے موت کے سوا اور کوئی نہیں! کیونکہ ابھی ذرا دیر میں مس اسرائیل صاحبہ (آپ ایک یہودن ہیں اور فلسطین سے تشریف لائی ہیں) اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر چلائیں گی: "آہا! کیسی زوردار صبح ہے! کیا سب لڑکے ابھی سو رہے ہیں! (ان لڑکوں میں سے دو ایک کے داڑھیاں بھی ہیں جن کی سیاہی پر سفیدی کا حملہ ہو چکا ہے) مس صاحبہ کا جواب جوشیلے نوجوان مرزا صاحب شبنم آلود جھاڑیوں میں سے فاختہ کی آواز میں دیں گے۔ "کو ـــــ ای!" اگر مسئلۂ تناسخ میں کوئی حقیقت ہے تو ضرور ایک دن وہ فاختہ کا جسم اختیار کر لیں گے۔ کچھ دیر بعد خان بہادر ہمت قلی خاں صاحب خود منہ میں ڈیڑھ گز لمبا سگار لگائے شانوں پر بڑے بڑے تولیے ڈالے باہر نکل آئیں گے اور چلائیں گے۔ "ارے بھئی! کوئی صاحب ہیں تیار غوطہ لگانے کے لئے؟" غور کیجئے عین طلوعِ آفتاب کے وقت نہار منہ غوطہ!!

خدا بچائے تمام مسلمانوں کو ہر ایسے عذاب سے! ہائے ہائے! مجھ کو تو اس خیال سے ہی لرزہ چڑھتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ناشتے کے لئے سب اس طرح جمع ہونگے جیسے مذبح پر چیلیں منڈلاتی ہیں۔ کوئی کھڑا کھڑا گرم چائے کے گھونٹ مزے کے ساتھ حلق سے اتار رہا ہے۔ کوئی کرسی کے ڈنڈے پر بیٹھا ہے۔ کوئی صاحب کسی کے سامنے سے روٹی

لے بھاگے۔ لطف یہ ہے کہ تمام اس قسم کے مہمان جن کے لئے "مس صاحبہ" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے آرام سے کرسیوں پر ڈٹ جائیں گے۔ بغیر اس بات کی پروا کئے ہوئے کہ باقی ماندہ معقول صورت اور معقول وضع اشخاص کو جگہ ملے گی یا نہ ملے گی! اُن کی بلا سے!

میں جانتا ہوں اس میں کسی دوسرے کا ذرا بھی قصور نہیں! اپنے ہی گناہ کی سزا بھگت رہا ہوں! خود کردہ را علاجے نیست! میری زندگی کا ہمیشہ یہ اصول رہا ہے کہ میں نہ کسی کے یہاں مہمان کی حیثیت سے جاتا ہوں نہ کسی کو اپنے یہاں بلاتا ہوں۔ اگر مجھ کو کوئی اس قسم کی تحریر موصول ہوتی کہ "موٹر اسٹیشن پر ملے گی وغیرہ وغیرہ" تو میں لکھ بھیجتا ہوں "کوئی وجہ نہیں کہ موٹر اسٹیشن پر ہو۔ اُس کے کھڑا کرنے کے لئے بہت جگہ ہے۔ بلکہ بہتر ہو اگر آپ اس کو اپنے مکان کی چھت پر رکھیں!" اگر کسی فیشن ایبل خاتون نے اپنے گلاب کی راکھ سے بنے ہوئے کاغذ پر لکھا "کیا آپ ۱۲ ستمبر کے ساڑھے تین بجے سہ پہر سے ۱۴ کے چارتک کا وقت دے سکتے ہیں" تو میں نے لکھ بھیجا "خاتون آپ ایک مہینہ لے لیجئے یا پورا سال لے لیجئے مگر مجھ کو یہاں ہی رہنے دیجئے" اس قسم کے تمام اصول میں خاص طور پر فائدہ مند پاتا ہوں۔

لیکن اس دفعہ میں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری۔ واقعہ یہ ہے کہ کم نصیبی سے کہئے یا شامتِ اعمال کے زور سے یا محض اتفاق سے ایک دن مجھ پر وہ دماغی کیفیت طاری ہوگئی جس کو لوگ جولانی طبع سے موسوم کرتے ہیں، جب دماغی عناصر سے گرانی دور ہو جاتی ہے اور انتشار کے بدلے یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے، جب انسان اپنے آپ کو اپنی حقیقی شخصیت سے مختلف پاتا ہے اور اپنے کو ملنسار، ظرافت پسند، خوش مزاج اور ہنسنے ہنسانے والا تصور کرنے لگتا ہے۔ ایسی کیفیت وقتاً فوقتاً ہم میں سے اکثر پر طاری ہو جاتی ہے بعض لوگ ایسی کیفیت کے لئے ایک عامیانہ محاورہ "مخمور ہو جانا" استعمال کرتے ہیں! اس سے کیا بحث کہ وہ کیا کہتے ہیں یا کیا نہیں کہتے بہر حال ایک دن میری حالت ایسی ہی تھی کہ اتفاق سے لکھنؤ کے کلب میں اپنے ایک پرانے واقف خان بہادر ہمت قلی خاں سے ملاقات ہوئی۔ خوب اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے طرح طرح کے پُرلطف قصے اُن کو سنائے رہیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھ کو صرف چار قصے یاد ہیں، اور پانچواں ایسا ہی ادھورا سا یاد ہے لیکن ایسی خاص کیفیت کے طاری ہو جانے کے بعد میں اِن ہی قصوں کو مختلف طرح سے سنا دیتا ہوں۔ طرزِ بیان کا ایک خاص رنگ ہوتا ہے جو عموماً ایسی حالت میں ہو جاتا ہے۔ شاید چلتے وقت میرے مصافحہ کرنے کی گرمجوشی دیکھ کر ان کو یہ خیال پیدا ہوا یا کیا سبب تھا انہوں نے بہت اصرار سے کہا "ارے بھئی تم ضرور بالضرور اکتوبر میرے پاس آ جیو

گذارو۔ میں نے چند اور لوگوں کو بھی بلایا ہے، مگر تمہاری موجودگی سے بہت زیادہ لطف رہے گا۔ تم جیسا زندہ دل آدمی تو ہم جیسے سوتے ہوئے لوگوں کو جگا سکتا ہے!" میں نے جہاں تک مجھ سے ہو سکا ایک قہقہے اور چیخ کو ایک ساتھ ادا کرتے ہوئے کہا۔" واللہ! اچھی تجویز ہے! ضرور لیجیئے! آؤں گا!"

لیکن ایک گھنٹہ بعد میں کفِ افسوس مل رہا تھا اور رہ رہ کر اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا کہ کیوں وعدہ کیا کیوں از خود رفتہ ہو گیا!........ سوتے ہوئے لوگوں کو جگا دوں! کیا کہا؟ میں اور ایسے فرائض؟ استغفر اللہ!........!

میں نے سوچا ممکن ہے وہ بھول جائیں، لیکن نہیں صاحب! ستمبر کے آخری ہفتہ میں میرے پاس بیگم ہمت قلی خاں کی مجبور کر دینے والی چٹھی آ پہنچی کہ"........ مہمانوں کی ایک چھوٹی سی پارٹی ہوگی۔ لیکن بغیر آپ کے کچھ لطف نہ رہے گا۔ ہم سب کو جگانے کے لئے آپ کی سخت ضرورت ہے!" میرے خدا! میں کس قسم کی الارم گھڑی ہوں جو میری اتنی سخت ضرورت ہے!

جہاں زندگی کی اور مصیبتیں ہیں وہاں میرے لئے استقبال بھی ایک بڑی مصیبت ہے۔ اگر کوئی میرا استقبال کرتا ہے تو مجھ سے عداوت خریدتا ہے۔ انتقام کی آگ سینے میں بھڑکا دیتا ہے۔ میں ڈیرہ دون کے اسٹیشن پر اترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہمت قلی خاں مع اپنی بیگم صاحبہ اور آٹھ دس مہمانوں کے موجود ہیں۔ میری روح فنا ہو گئی! یکایک کسی نے مجھے اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ پھر کسی نے پوری طاقت سے چار پانچ ہاتھ میری کمر پر رسید کئے۔ ایک صاحب اتنے تیز تھے کہ میری انگلیاں پکڑ کر اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ قریب تھا کہ میرا ہاتھ شانہ سے علیحدہ ہو جائے کہیں اس عالمِ بدحواسی میں میرے منہ سے نکل گیا کہ" خان بہادر مع آفت کے تشریف لائے ہیں۔" بس بیگم ہمت قلی کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور ان کے ساتھ ہی سب لوگوں نے ایک ہیبت ناک قہقہہ لگایا۔ میرا دم اور خشک ہو گیا۔ یا مسبب الاسباب! اس میں کون سی ہنسی کی بات تھی؟ بیگم ہمت قلی نے کہا" جب ہی تو میں کہتی تھی کہ آپ کی سخت ضرورت ہے! ہمت قلی صاحب بولے سب لوگ یہاں نہیں آئے ہیں کئی ایک گھر پر ہی رہ گئے۔" گھر پہنچا تو پھاٹک پر آٹھ دس مرد عورت لڑکی لڑکوں کا مجمع اور تھا۔ دور سے ہی کسی نے بندوق دکھائی کسی نے ٹینس کے بلے سے دھمکایا۔ ایک صاحب نے کتا ہی چھوڑ دیا۔ اور کتوں سے میرا دم فنا ہوتا ہے!........ اسی کو بیگم ہمت قلی نے چھوٹی سی پارٹی لکھا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میرا اپنا قصور تھا! نوشتۂ تقدیر کو کس نے مٹایا ہے! میرا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ تین چار

آدمی اور میری ہی طرح کے دبلے پتلے، خاموش زندگی پسند کرنے والے، کم سخن، تنہائی پسند وہاں ہونگے، جن سے کبھی نہ بات کرنے کی نوبت آئے گی نہ اُن کے نام پُوچھنے کی مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس نکلا!

لیکن بہت جلد مجھ کو احساس ہونے لگا کہ میرے میزبان کو میری طرف سے سخت مایُوسی اور ناامیدی ہُوئی انہوں نے کہا تو نہیں لیکن تب بھی میں جانتا تھا! مجھ کو اندازہ ہُوا کہ میری حاصل کردہ تعلیم بالکل نامکمل اور ادھوری تھی۔ علم کے چند نہایت ضروری شعبوں سے مجھ کو بالکل بے بہرہ رکھا گیا تھا۔ مجھ کو ذرا بھی معلوم نہ تھا کہ اگر کوئی اپنا مکان اور اُس کے متعلق دوسری چیزیں دکھائے تو کن الفاظ کا استعمال مناسب اور موزوں ہوگا۔ میں نہ جانتا تھا کہ اگر کوئی اپنا مکان، زمین، درخت یا جھاڑیاں دکھائے تو کیا کہنا چاہیئے۔ حالانکہ میں اسی قسم کی چیزیں تمام عمر دیکھتا رہا ہوں۔

ہمت قلی خاں نے کہا "دیکھیئے یہ ہمارا نیا بڑا پھاٹک ہے ہم نے اسی سال لگایا ہے!

میں "ہواں!" بس میں نے اس سے زیادہ نہ کہا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ پھاٹک کو اِس سال نہ لگاتے اور اگر انہوں نے نہ بھی لگایا ہوتا تو مجھ کو ذرا بُرا نہ لگتا! اور اگر وہ ایک ہزار برس بیشتر اس کو لگا چکے ہوتے تب بھی میرا کیا بگڑتا تھا!

"اس کے لگاتے وقت اچھا خاصا جھگڑا ہُوا تھا۔ بالآخر یہی طے پایا کہ چونے کا پلاستر ہونا چاہیئے"

میں "واقعی" اس سے زیادہ میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ کیونکہ مجھ کو یہ معلوم نہ تھا کہ کس کا جھگڑا کس سے ہوا اور کون کس پر غالب آیا یا کس نے کس کو ہرایا۔ اُدھر خواہ چونے کا پلاستر ہو یا کنکھے کا پلاستر ہو میرے لئے سب یکساں ہے۔

"یہ گھاس کا خطہ ہم نے اُس سال تیار کیا تھا جب ہم پہلے پہل یہاں آئے تھے" میں چپ رہا۔

انہوں نے چبھتی ہوئی نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی ایک خلوص کی نظر سے اُن کو دیکھا۔ کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی تھی کہ میں اُن کا یقین نہ کروں!

یہ کنارے پر جو مٹر کے پھول لگے ہیں یہ تجربہ کے طور پر لگائے ہیں۔ ان کا بیج بلخ سے منگایا تھا۔ میں نے گہری نظر سے پھولوں کی طرف دیکھا مگر زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔ بیج اگر بلخ سے آیا تھا تو بہت اچھا ہُوا میں کہتا ہوں کہ اگر سمرقند سے آتا تو کیا بُرا تھا۔ اور نہ آیا تو کیا نقصان ہُوا؟ تجربہ کے لئے لگائے۔ خوب کیا! اگر مٹر نہ لگاتے اور آلو بخارا لگاتے تو میرا کون ہرج تھا! مجھ کو خیال ہُوا کہ ہمت قلی صاحب مجھ سے بالکل مایوس ہو گئے ہیں۔ مجھ کو

اُن کی حالت پر اپنے دل میں ترس آرہا تھا۔ مگر میں مجبور تھا۔ میرا ذرا قصور نہ تھا۔ کیونکہ میرے سرپرستوں نے مجھے صحیح، اصلی اور ضروری تعلیم نہ دی تھی۔ مجھ کو کسی استاد نے نہ سکھایا تھا کہ ایسے مواقع پر کیا کہنا چاہئے۔

مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر دوسرے لوگ کس خوبی سے گفتگو کر لیتے ہیں۔ میرے دوست نوجوان مرزا میری ہی طرح معمولی قابلیت رکھتے ہیں، اُن میں کوئی خاص خصوصیّت نہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بڑے باتون ہیں اور خواہ مخواہ غل مچاتے ہیں۔ غرض کہ وہ مجھ سے ہر طرح کم ہیں لیکن مجھ کو ماننا پڑے گا کہ سفید فلالین کی پتلون اور نیلی فلالین کا کوٹ پہن کر اس خاص فن میں انہوں نے مجھ کو ہرا دیا ہے۔

ہمت قلی جب اُن کو مکان دکھانے لے چلے تو میں اُن کے ساتھ ہولیا۔ ہمت قلی نے کہا یہ پھاٹک ہم نے اِس سال لگایا ہے۔" مرزا نے ایک معترضانہ انداز سے اُس کی طرف دیکھا۔" آپ کو معلوم ہے یہ اگر میرا پھاٹک ہوتا تو میں کیا کرتا۔

وہ" نہیں"

مرزا" میں بہت چوڑا بناتا۔ اس میں تو نکلنے کی جگہ ہی نہیں۔ اور انہوں نے افسوس کے ساتھ سر ہلایا۔

"اس کی تعمیر کے وقت بڑا جھگڑا ہوا مگر آخر ہم نے چونے کے پلاستر کا فیصلہ کیا۔"

مرزا" افوہ! آپ نے کیسی غلطی کی"۔ یہ کہہ کر انہوں نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر زور زور سے پھاٹک کے ایک ستون پر مارنا شروع کیا جس سے پلاستر کے بڑے بڑے ٹکڑے ٹوٹ کر گرنے لگے۔ دو ایک اینٹیں بھی گریں "دیکھئے کتنا کمزور ہے" ہمت قلی نے کچھ نہ کہا۔ اُنہوں نے پھر اپنا گھاس کا خطّہ دکھایا

مرزا" ارے صاحب! یہ تو بہت خراب لگا ہے۔ دیکھئے میں اس میں اپنی ایڑی سے گڑھے کھود سکتا ہوں! یہ کہہ کر مرزا نے حیرت انگیز طاقت سے تین چار لاتیں اس زور سے چلائیں کہ آس پاس کی سب گھاس غائب ہو گئی! "دیکھا آپ نے!"

ہمت قلی" یہ کنارے پر مٹر جو لگے ہیں تجربہ کے طور پر لگائے گئے ہیں، بیج بلخ سے منگایا تھا"

مرزا" مگر صاحب یہ تو آپ نے بالکل غلط لگائے ہیں۔ ان کا رخ سورج کی طرف سے زمین کی طرف ہونا چاہئے تھا نہ کہ زمین کی طرف سے سورج کی طرف۔ ذرا ٹھہرئیے" یہ کہہ کر انہوں نے قریب پڑا ہوا ایک پھاوڑا اٹھا لیا اور دس بارہ پودے اکھاڑ ڈالے۔" آپ نے دیکھا میں ان کو کتنی آسانی سے اکھاڑ سکتا ہوں۔ بالکل غلط لگے ہیں۔"

اب تو میں مطلوب سبق سیکھ چکا تھا۔ مجھ کو معلوم ہو گیا تھا کہ کامیابی کا راز اسی میں ہے کہ پہلے تو دوسرے کی چیزوں کو اپنا سمجھ لینا چاہئے اور پھر اُن کو توڑ دینا چاہئے۔ چنانچہ جب ہمت قلی اپنے ملاقات کے کمرے کی تصویریں دکھانے اور اُن کی خوبیاں بیان کرنے لگے تو میں نے کہا "آپ کو معلوم ہے کہ اگر یہ تصویریں میری ہوتیں تو میں کیا کرتا؟"

وہ "نہیں"

میں "یکلخت ان سب کو توڑ ڈالتا اور پھاڑ ڈالتا"

یہ کہہ کر میں نے ارد گرد لکڑی یا ہتھوڑی کی تلاش میں دیکھا مگر مایوسی ہوئی۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ہمت قلی ایک عجیب انداز سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مگر میں اندازہ نہ کر سکا کہ یہ تجویز اُن کو پسند آئی یا نہیں۔

چائے کے وقت بیگم ہمت قلی اپنے لڑکوں کی باتوں اور تعلیم کا ذکر کرنے لگیں۔ بڑے لڑکے کے گیند پھینکنے کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے اپنا ایک ہاتھ اوپر اٹھایا اور دوسرے سے گرم چائے سے بھری ہوئی آدھی چائے دانی میرے کوٹ کے کالر کے اندر خالی کر دی! پھر انہوں نے بتایا کہ کس طرح چھوٹے لڑکے نے جماعت میں چوہے کی قسموں پر سب سے عمدہ مضمون لکھ کر انعام حاصل کیا۔

وہ "آپ چائے اَور لیں گے؟"

میں "جی نہیں۔ معاف کیجئے" اور میں اُس کرسی سے اٹھ کر دوسری پر جا بیٹھا۔

اگلے دن صبح کی چائے اور ناشتا غائب! ارے بھئی یہ کیا! معلوم ہوا بیگم ہمت قلی کا نیا چینی کتا طلوعِ آفتاب سے بہت قبل اور سپیدہ نمودار ہونے سے بھی پہلے انتقال کر گیا! ناشتے کے بجائے سب بیگم صاحبہ سے تعزیت کرنے گئے۔

ایک "واللہ کیا صدمہ ہوا ہے! لیکن مشیتِ ایزدی میں کسی کا کیا چارہ!

دوسرا "ہائے ہائے! بہت خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

"بس اب تو یہ دعا ہے کہ پس ماندگان کو صبر آ جائے"

"میری تجویز ہے کہ سب لوگ سیاہ ریشم کا ایک ایک خوبصورت پھول پہنیں"

بہرحال "برسرِ فرزندِ آدم ہرچہ آید بگذرد" اب میں سمجھتا ہوں کہ جلد میری مصیبتوں کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ درحقیقت اس غیر مناسب وقت میرے یہاں آنے اور اس تنہائی کی جگہ بیٹھنے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ میں بہت جلد اپنی تکلیف کا خاتمہ کردوں۔ بس حد ہو چکی! رات کھانے کے بعد ہمت قلی صاحب مجھ کو علیحدہ لے گئے اور کہنے لگے کہ ہم لوگ "سیرِ پرستان" کا ڈراما کرنے والے ہیں۔ میں نے سب سے آپ کے اُن پُرلطف قصّوں کا حال کہا تھا جو آپ نے لکھنؤ میں سنائے تھے اس پر سب لڑکیوں نے (جن میں بیگم ہمت قلی بھی شامل تھیں) خوب تالیاں بجائیں۔ سب کا اصرار ہے کہ آپ بھی ڈرامے میں حصّہ لیں۔ آپ کے لئے تجویز پایا ہے کہ آپ سیاہ دیو کا پارٹ کریں۔ تمام باتوں کو سوچتے ہوئے خیال ہے کہ اس پارٹ کو صرف آپ ہی نہایت خوبی سے کرسکتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کرکے رخصت ہو گئے +

رات مجھ کو مطلق نیند نہ آئی۔ میں تمام رات جاگتا رہا! میں سوچ رہا تھا کہ تمام زندگی میں صرف ایک مرتبہ ایسا اتفاق پیش آیا تھا جب میں نے پبلک کے سامنے کسی قسم کی تقریر کی تھی جب میرے کلب کے وائس چیئرمین صاحب سیرِ یورپ کے عزم سے ہم سب کو خیرباد کہہ رہے تھے اور میں نے اُن کو سائیکل کی ایک ایسی لالٹین جس میں مٹی کا تیل بآسانی جل سکتا ہے تحفہ میں دی تھی۔ لیکن اس موقع پر بھی میں نے کئی رات جاگ جاگ کر یہ کہنے کی مشق کی تھی کہ "حضرات! یہ لالٹین عام قسم کی لالٹینوں سے بہت مختلف ہے اس میں مٹی کا تیل نہایت آسانی کے ساتھ جلایا جاسکتا ہے اور اس کو محض ایک معمولی قسم کی دیاسلائی کے شعلہ سے مشتعل کرسکتے ہیں۔" اور اب یہاں یہ لوگ مجھ سے امید رکھتے ہیں کہ میں سیاہ دیو کا پارٹ کروں؟ لیکن کیا پروا ہے! اس کی نوبت ہرگز نہ آئے گی! اب جینے کی کوئی خواہش باقی نہیں! تھوڑی دیر بعد میرا مردہ جسم تیرنے کے تالاب میں تیر رہا ہوگا! ہائیں! یہ کیا بات! میں اپنی نظر کاغذ سے اٹھاتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ مکان کی طرف سے ہمت قلی خاں لپکتے ہوئے چلے آرہے ہیں! خیریت تو ہے؟ ہمت قلی کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور وہ یوں ہی کمبل لپیٹے بھاگے چلے آرہے ہیں۔ کیا کوئی قتل ہوگیا؟ یا کسی مہمان نے زہر کھا لیا؟ ضرور کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ ممکن ہے ڈراما ملتوی ہو جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! شکر ہے!

ذیل کی چند سطور میں ڈیرہ اکسپریس کے ایک بہت عمدہ درجہ میں بیٹھا تحریر کررہا ہوں جو مجھ کو نہایت تیزی کے ساتھ اور آرام سے لکھنؤ واپس لئے جارہی ہے۔ گاؤں، جھونپڑیاں، باغ، کھیت تیزی کے ساتھ اُڑے

چلے جارہے ہیں۔ اُڑنے دو ابھی بھی تو امن و عافیت کی طرف اُڑا چلا جا رہا ہوں! ہمت قلی نے اُس وقت کہا تھا کہ "بھئی لکھنؤ سے ٹیلیفون پر خبر آئی ہے . . . . . ." اور یہ کہہ کر انہوں نے بہت شفقت کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میرا دل چاہتا تھا اُن کو گلے لگالوں!

میں "کیا؟" اور میں نے ششدر نظر آنے کی کوشش کی۔

وہ "بہت افسوسناک خبر ہے۔ دوست! لکھنؤ میں تمہارے دفتر میں آگ لگ گئی اور تمام ضروری کاغذات جل گئے . . . . . . کل شام۔ شاکر ——— کیا تمہارے منشی کا یہی نام ہے نا؟ ——— موقع پر موجود تھے۔ اُن کے سر چہرے اور ہاتھوں کے بال جل گئے! مجھ کو افسوس ہے کہ تم کو اسی وقت جانا پڑے گا"

میں "اسی وقت۔ فوراً!"

وہ "میں جانتا تھا اسی لیے میں موٹر کے لئے کہہ آیا ہوں۔ تم ساڑھے سات والی گاڑی سے جاسکو گے اندر چلو"

میں "اچھی بات ہے" میں نے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا تھا تاکہ وہ میرے چہرہ پر مسرت کے آثار نہ دیکھ سکیں۔ دفتر میں آگ لگ گئی؟ خدا کا شکر ہے! شاکر کے بال جل گئے! کیا مضائقہ ہے! تمام زندگی میں اتنی بڑی خوشی مجھے نہ حاصل ہوئی ہوگی۔ ایسی اندوہناک خبر سننے کے بعد میرا اس قدر ہمت آمیز اور بہادرانہ برتاؤ دیکھ کر ہمت قلی تحسین اور آفرین کی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے!

موٹر تیار ہے؟ مرحبا! خدا حافظ دوست! صد مرحبا! اچھی بات ہے ضرور ٹیلیفون کروں گا۔ خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اسٹیشن آگیا۔ قلی صرف یہی دو چیزیں ہیں اور یہ لو دو روپے تمہارا انعام ہے! یہ قلی بھی کیسے خوش مزاج انسان ہوتے ہیں! میں لکھنؤ جا رہا ہوں! خدا کا کتنا شکر ادا کروں! واہ شاکر خوب کیا! میری ہدایت پر حرف بحرف عمل کیا۔ شاباش ہے۔ ٹھیک وقت پر ٹیلیفون کیا۔ میں نے یہاں آنے کے اگلے ہی دن خط لکھ بھیجا تھا۔ مگر مجھے خوف تھا کہ کہیں بھول نہ گیا ہو۔ معلوم ہوتا ہے شاکر کا حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا ہے! ممکن ہے ہمت قلی کو کسی قسم کا شبہ ہو اس لئے میرا ارادہ ہے کہ لکھنؤ پہنچتے ہی اپنے دفتر میں آگ لگا دوں گا اور شاکر کے سر اور چہرے کے بال بھی جلا دوں گا۔ کیا پروا ہے!!

سیّد شاہد حسین

ہندی جذبات

جب سے تم پردیس سدھارے نیند مجھے کب آتی ہے
ساری رات آنکھوں میں تارے گن گن کر کٹ جاتی ہے

گھر کے بھری برسات میں جب متوالے بادل آتے ہیں
ایک اُمنگ اُٹھ اُٹھ کے جی میں آٹھ پہر تڑپاتی ہے

پیارا پیارا چاند سا مکھڑا آنکھوں میں پھرتا رہتا ہے
رات اکیلے میں جس سے باتیں کرتے کٹ جاتی ہے

ایک تمہارے کارن میں نے تج دیا تک سکھ سے رہنا
چین کسی کل جب نہ پڑے، پھر بات کوئی کب بھاتی ہے

سارا گھر سنسان پڑا ہے ایک تمہارے نہ آنے سے
رات اندھیری مجھ کو اکیلا پا کر پھاڑے کھاتی ہے

تم ہو جی جم، چاندنی مجھ کو دھوپ دکھائی دیتی ہے
سیج بچھاتی ہوں پھولوں کی تو کانٹے بن جاتی ہے

سانس بھی لینا ہوگئی دوبھر منہ کو کلیجا آتا ہے
تم کیا جانو کوئی تمہارے پیچھے یوں گھبراتی ہے

کان لگائے رہتی ہوں دن رات تمہاری آہٹ پر
اور تمہیں کچھ دھیان نہیں کیا چاہ یہی کہلاتی ہے؟

اب تو اجیرن ہوگیا جینا میرے ہدفؔ کب آؤ گے
سوچو تو کچھ چاہنے والی پر کیا بیتی جاتی ہے

ہدفؔ
اجتہادی

سیاہ نقاب

اس واقعے کو جو میں آئندہ بیان کرنے والا ہوں آج پندرہ سال گزر چکے ہیں۔ میں اُن دنوں جوان تھا ممکن ہے کہ دوسرے لوگوں کی زندگی کے اس دور کا تعلق دلچسپ معاشقانہ واقعات سے ہو لیکن میرے شباب کو اگر کوئی خصوصیت اور اہمیت ہے تو وہ صرف ایک رات میں ہے۔ سیاہ اور بھیانک رات میں جوانی آئی اور گزر گئی۔ جذبات پیدا ہوئے اور طبابت اور ڈاکٹری کے بوجھ تلے، بغیر میری زندگی میں کوئی رنگینی پیدا کئے پس کر مر گئے۔ اِس وقت میں زندگی کے اُس حصہ کو جس میں حیاتِ انسانی کی تمام دلفریبیاں مستور ہوتی ہیں کہیں پیچھے چھوڑ چکا ہوں۔ اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر "سیاہ نقاب" میری زندگی میں داخل نہ ہوتا تو میں اپنی جوانی ــــ اُس جوانی کو جس کے لئے دنیا ترستی ہے کبھی کا بھول چکا ہوتا، اور یاد کرنے کی بالکل کوشش نہ کرتا۔ اِن سطور کے پڑھنے والے مجھے مردہ تصوّر کریں گے اور کہیں گے کہ میں جذباتِ لطیف سے عاری ہوں۔ میں بغیر کسی رد و کد کے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں مردہ ہوں بے حس ہوں۔ مجھے میرے افکار نے، ڈاکٹری نے آب و دانے کی تلاش نے اس قدر فرصت ہی نہیں دی کہ شباب کے لازمات یعنی عشق و محبت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکوں۔ چنانچہ اس واقعے کے پڑھنے والے ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ میں کسی رابطۂ عشق کا ذکر کرنے والا ہوں۔ یہ ایک داستان ہے المناک، جانگداز اور پُر درد۔

دسمبر سنہ ۱۹۱۵ء کی ایک گھپ اندھیری رات کا ذکر ہے۔ بارش ہو رہی تھی اور پانی کے قطرے زور زور سے شیشوں کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔ تیز و تند ہوا دروازوں اور کھڑکیوں سے گویا دست و گریباں ہو رہی تھی۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ میرے کمرے میں ایک چھوٹا سا لمپ جل رہا تھا اور میں انگیٹھی کے قریب ایک صوفے پر لیٹا باد و باراں کے شور کو سُن رہا تھا۔ میری طبابت کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد تھوڑے ہی عرصے سے میں نے پریکٹس شروع کر رکھی تھی۔ میرا مطب شہر کی ایک بارونق سڑک پر واقع تھا لیکن باوجود چند مہینے گزر جانے کے میرا کاروبار بالکل ٹھنڈا تھا۔ بڑے بڑے جاذبِ نظر اشتہارات، بازاروں میں لگائے گئے، اخباروں میں اپنے نام کے ساتھ افلاطونِ دوراں اور مسیحِ زماں لکھ لکھ کر پبلک کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی،

منادی اور لیکچروں کے ذریعہ سے اپنے نام کو فروغ دینا چاہا۔ مگر سب کوششیں اکارت گئیں۔ یہ تمام نمائشیں ایک مریض کو بھی میرے دروازے تک نہ لاسکیں۔ میں اُس وقت بہت حد تک مایوس ہو چکا تھا اور مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ آیا کہیں ملازمت کر لی جائے یا چند ماہ اَور اس کشمکش میں صرف کر دیئے جائیں۔ میری اس حالت کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو خود اس امید و بیم کی حالت میں سے گزر چکے ہوں۔ والدین کی سالہا سال کی کمائی مجھ پر خرچ کر دی گئی تھی، اور پُورے بیس سال کے بعد مجھے فارغ التحصیل دیکھ کر وہ میرے متعلق بلند ترین اندازے لگا رہے تھے۔ دسمبر کا ابتدائی ہفتہ تھا اور کرسمس میں مَیں وطن جا رہا تھا۔ مگر اپنی موجودہ حالت کو دیکھ کر خود ہی شرمندہ ہو رہا تھا۔ اپنی بیوی کے سامنے جو ابھی سے میری چشم براہ تھی اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے کا خیال مجھے مارے ڈالتا تھا میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ مجھے نیند آگئی۔

اسی حالت میں ابھی کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ کوئی میرے شانے کو دبا رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ میرا ملازم چھوکرا مجھے جگا رہا تھا۔ میری حالت مجھے اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ ایک کمپاؤنڈر رکھ سکوں، اس لئے میں نے ایک اٹھارہ سال کے لڑکے کو جسے دن بھر سوائے پیپرمنٹ کی میٹھی گولیاں چُوسنے کے کوئی کام نہ تھا ملازم رکھ لیا تھا۔

اُس نے آہستہ سے کانپتے ہوئے خوفزدہ آواز میں کہا "جناب ایک عورت آئی ہے"۔ میں حیران ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ اس طوفانی رات میں عورت کیا کسی مرد کی بھی توقع نہ ہوسکتی تھی۔

"کیسی عورت" میں نے سوال کیا "کہاں ہے؟"

"وہ" اور لڑکے نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی سے برآمدے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دروازے کے شیشوں میں سے دیکھا۔ ایک بلند قامت عورت جس کے جسم کا اوپر کا حصہ ایک چادر میں لپٹا ہُوا تھا اور چہرہ ایک سیاہ نقاب نے چھپا رکھا تھا دروازے کے اِس قدر قریب کھڑی تھی کہ اُس کا چہرہ دروازے کو چھو رہا تھا۔ رات کے اِس غیر موزوں وقت میں اس عجیب عورت کی آمد نے میرے دل میں ایک ہلکا سا اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ میں آہستہ سے اٹھا اور دروازے کو ذرا سا کھولا۔ عورت کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ وہ بدستور بت کی مانند کھڑی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ دو بڑی بڑی آنکھیں مجھے نقاب کے پیچھے سے گھور رہی ہیں۔ "آپ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں" میں نے کہا۔

عورت نے سر کی خفیف سی جنبش سے اثبات میں جواب دیا۔ میں دروازے میں سے ہٹ گیا "تو آپ



اندر تشریف لے آئیں۔"

عورت ایک سایے کی طرح کمرے میں داخل ہوئی کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر میرے ملازم کو موجود پاکر ذرا ٹھٹکی۔ میں نے چھوکرے کو کہا "دروازے بند کردو۔ پردے گرادو اور تم دوسرے کمرے میں چلے جاؤ"۔ میں نے ایک آرام کرسی انگیٹھی کے نزدیک کردی اور اپنے مہمان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عورت چپ چاپ بیٹھ گئی۔ انگیٹھی سے آگ کا ایک شعلہ ذرا بلند ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کا سیاہ لباس پانی میں شرابور ہو رہا ہے اور اس کا زیریں حصہ کیچڑ سے بھرا ہوا ہے "آپ بھیگ رہی ہیں" میں نے کہا۔ "جی ہاں" عورت نے پہلی دفعہ جواب دیا۔ اُس کی آواز دبی ہوئی اور غمگین تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی دیرینہ مرض میں مبتلا ہے جو اُس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا ہے۔

"اور آپ بیمار ہیں" میں نے جلدی سے کہا۔

"جی ہاں میں بیمار ہوں، سخت بیمار ہوں۔ میرا جسم بے آزار اور محفوظ ہے، مگر میری روح ایک خطرناک اذیت میں مبتلا ہے۔ میں آپ کے پاس اپنے لئے نہیں بلکہ ایک اور شخص کے لئے آئی ہوں۔ اگر میں خود مریض ہوتی تو اس وقت اس تیرہ و تار دہشتناک رات میں جب کہ کائنات کی ہر جاندار شے کونے کھدروں میں دبکی پڑی ہے۔ گھر سے باہر نہ نکلتی کاش کہ میں خود اس وقت بیماری کا شکار ہو جاتی۔ یقین جانئے کہ ایک حرف تک میری زبان پر نہ آتا اور میں نہایت خوشی اور سکون سے جان دے دیتی۔ ڈاکٹر صاحب! میں آپ کی امداد ایک دوسرے شخص کے لئے حاصل کرنے آئی ہوں۔ ممکن ہے کہ میرا تحمل دیوانگی پر محمول کیا جائے۔ واقعی میں دیوانی ہوں۔ ورنہ انتظار کی طویل نہ کٹنے والی راتوں میں نوحہ و گریہ کی نہ گزرنے والی گھڑیوں میں یہ خیال ہمیشہ میرے دماغ میں رہا اور اگرچہ میں جانتی ہوں کہ انسانی امداد اس معاملے میں کس قدر بے سود اور لاحاصل ہے لیکن اُس کو اس کے بغیر سپردِ خاک کر دینے کا خیال میرا خون خشک کئے دیتا ہے۔"

عورت نے تقریر ختم کی تو اس کے تمام جسم میں ایک ایسا لرزہ دوڑ گیا جو تصنع سے کوسوں دور تھا۔ میں ابھی نوجوان تھا۔ انسانی مصائب افلاس اور فلاکت کے روزمرہ مشاہدوں نے مجھے ابھی تک بالکل بے حس نہ کر دیا تھا۔ میں جلدی سے اٹھا اور ٹوپی سر پر رکھ کر کہا "اگر مریض کی حالت اس قدر تشویشناک ہے تو ہم کو ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہئے۔ آپ نے اس سے پہلے کیوں نہ طبی امداد حاصل کی؟"

عورت بدستور بیٹھی رہی "اس لئے کہ اس سے پیشتر امداد حاصل کرنا بے سود تھا۔ آہ! اس سے کہ اب بھی

ایسا کرنا بے سود ہے،" اُس نے بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا۔ کس قدر بے معنی اور عجیب جواب تھا میں نے حیران ہو کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھا، مگر وہاں سیاہ نقاب نے سب کچھ چھپا رکھا تھا۔

"آپ بیمار ہیں" میں نے نرمی سے کہا،" اگرچہ آپ کو معلوم نہیں لیکن بخار جس کی شدّت نے آپ کو کان محسوس نہیں کرنے دی آپ کو اندر ہی اندر جلا رہا ہے۔" اور ایک پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا "یہ پانی لیجئے اور تھوڑا عرصہ آرام کرنے کے بعد تسلّی اور اطمینان سے مرض کے متعلق بتائیے، جب مجھے سب کچھ معلوم ہو جائے گا تو میں ہر طرح آپ کی امداد کروں گا۔

عورت نے بغیر نقاب اٹھائے گلاس لبوں تک اٹھایا اور پھر بن چھوئے رکھ دیا۔

"میں جانتی ہوں" اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا "کہ یہ سب کچھ بخار کا ہذیان معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اس سے پہلے کہیں زیادہ سختی سے بتایا جا چکا ہے۔ میں عمر رسیدہ ہوں اور لوگ کہتے ہیں کہ جب انسان اپنی عمر کے اختتام کے قریب پر پہنچتا ہے تو اس کی زندگی کا یہ قلیل عرصہ، خواہ دوسروں کی نظروں میں، وہ ناکارہ ہی کیوں نہ ہو گزشتہ سالوں سے جن کا تعلق زندگی کے بہترین واقعات سے ہوتا ہے کہیں زیادہ عزیز اور پیارا ہوتا ہے۔ چنانچہ مجھے یہ باقی ماندہ سال قدرتی طور پر عزیز ہونے چاہئیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب یقین جانئے کہ میں خوشی سے ان کو قربان کر دینے کے لئے تیار ہوں اگر ——— اگر جو کچھ میں بیان کر رہی ہوں صرف ہذیان اور موہوم ہو۔ میں جانتی ہوں گو اس یقین کرنے سے خوف کھاتی ہوں کہ کل صبح وہ جس کا میں ذکر کر رہی ہوں انسانی مدد سے بالکل بے نیاز ہو چکا ہوگا لیکن اس وقت اگرچہ وہ موت کے منہ میں ہے۔ آپ اُس کو نہیں دیکھ سکتے۔ اُس کا علاج نہیں کر سکتے۔"

میری پریشانی انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ مگر میں نے اس کو چھپاتے ہوئے کہا "میں آپ کے بیان پر نکتہ چینی کر کے یا اُن حالات کو جو آپ ارادتاً مجھ سے چھپا رہی ہیں کرید کرید کر پوچھنے سے آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا لیکن آپ کی اس حکایتِ غم میں ایک ایسی بے ربطی ہے جسے میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ یہ شخص مر رہا ہے اور میں جو شاید اس وقت کچھ مدد کر سکوں اس کو نہیں دیکھ سکتا۔ باوجودیکہ آپ کو معلوم ہے کہ کل صبح کسی قسم کی امداد لا حاصل ہوگی۔ آپ مجھے اُس کو دیکھنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ اگر مریض آپ کو واقعی اس قدر عزیز ہے تو آپ کو قبل اس کے مرض لاعلاج ہو جائے اُس کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔"

سیاہ پوش عورت بے اختیار ہو کر رونے لگی "آہ" اُس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا "جس چیز پر مجھے خود یقین نہیں اُس کو دوسرے لوگ کیونکر باور کریں گے،" اور پھر دفعتہ اٹھ کھڑی ہوئی "تو ڈاکٹر صاحب آپ اُس شخص کو

جس کی زندگی کے صرف چند گھنٹے باقی رہ گئے ہیں نہیں دیکھیں گے؟"

"میں نے یہ کب کہا ہے"، میں نے جواب دیا، "میرا مطلب تو یہ تھا کہ اگر آپ اس طرح تاخیر کرتی رہیں اور مریض خدانخواستہ جان بحق ہوگیا تو اُس کی موت کی بہت حد تک آپ ذمہ وار ہونگی"۔

"میں اُن ذمہ داریوں کا جو مجھ پر عائد ہیں ہر وقت جواب دینے کے لئے تیار ہوں"۔

میں نے کہا "چونکہ آپ کی ہدایت کے مطابق عمل کرنے سے مجھ پر کوئی اخلاقی یا قانونی گرفت نہیں آسکتی میں کل مریض کو دیکھوں گا بشرطیکہ آپ پتہ بتا جائیں۔ میں کل کس وقت مریض کو دیکھ سکتا ہوں؟"

"نو بجے"، عورت نے جواب دیا۔

میں نے ایک دفعہ پھر کوشش کی "مجھے بار بار اس افسوسناک موضوع پر گفتگو کرنے سے معاف فرمایئے مگر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ مریض اس وقت آپ کی زیر نگرانی ہے؟"

"نہیں"، جواب ملا۔

"تو اگر میں کچھ ہدایات عرض کروں تو اُن پر عمل کرنا آپ کے لئے ناممکن ہے؟"

"قطعاً"، اور عورت بے اختیار ہوکر رونے لگ گئی۔

بدقسمت عورت نے اس وقت تک انتہائی کوشش سے اپنے جذبات کو ضبط کئے رکھا تھا مگر اب اُن میں طوفان آگیا تھا۔ وہ ابل رہے تھے اور عورت کے سکون اور ضبط کو بہائے لئے جارہے تھے۔ چنانچہ اس خیال سے کہ مزید دریافت فضول ہوگی اور عورت کے احساسات مجروح ہوجائیں گے۔ میں نے فردا کی ملاقات کا وعدہ کرکے پُراسرار عورت کو رخصت کیا جو شہر کے ایک بیرونی محلّے کا پتہ دے کر سیاہ رات میں گم ہوگئی۔

عورت تو چلی گئی مگر میری نیند اور آرام بھی ساتھ لیتی گئی۔ میں پریشان تھا میرے حواس معطل تھے۔ عورت ایک معمّا تھی جس کو میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ ایک مسئلہ تھا جس کا حل مجھ سے کوسوں دور تھا۔ میں نے اکثر ایسے واقعات سنے تھے جن میں ایک شخص کو اپنی موت کے صحیح وقت اوروں کا غیر معلوم طریق پر احساس ہوگیا تھا، مگر یہاں پر تو ایک دوسرے شخص کی موت کا ذکر تھا۔ یہ کہنا کہ عورت کسی واہمے اور تصوّر کا شکار ہو رہی تھی فضول تھا کیونکہ اُس کی گفتگو کے زبردست وثوق اور یقین کی موجودگی میں اس قسم کے شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ میرے دل میں ایک اور خیال پیدا ہوا کہ عورت قتل کے خوفناک جرم میں شریک ہے۔ عہد و پیمان اُس کو افشائے راز کی اجازت نہیں دیتے لیکن طبیعت کی کمزوری کے باعث وہ پشیمان ہے۔ اب وہ ارتکاب جرم کو تو نہیں روک سکتی لیکن

اس بات کے درپے ہے کہ کسی صورت اُس شخص کو بچا لیا جائے۔ لیکن شہر کی گنجان آبادی میں ایسا ہونا بعید از عقل معلوم ہوتا تھا۔ میرے دماغ میں یکے بعد دیگرے کئی خیالات آئے مگر عقل نے سب کو رد کر دیا۔ اور آخر کار وہی ابتدائی اندازہ کہ عورت کا توازنِ دماغ بگڑ گیا ہے میرے دل میں مضبوط ہو گیا۔ اگرچہ میں اس میں کئی نقائص پاتا تھا مگر چونکہ اس الجھن میں سے نکلنے کا صرف یہی ایک راستہ باقی رہ گیا تھا اس لئے میں نے زبردستی یہ یقین کر لیا کہ عورت دیوانی ہے۔ میں نے سونے کی ہزار کوشش کی لیکن سیاہ نقاب کا عکس ایک منٹ کے لئے بھی آنکھ بند کرنے سے روکتا تھا۔

اگلی صبح ابھی نو نہیں بجے تھے کہ میں اُس محلے میں جس کا پتہ مجھے رات کو بتایا گیا تھا پہنچ چکا تھا۔ محلہ غیر آباد تھا۔ بہت کم لوگ پھرتے نظر آتے تھے۔ مکانات کی ساخت اور مکینوں کے لباس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس محلے میں افلاس اور غربت کی حکومت ہے۔ ایک مدت سرگرداں رہنے کے بعد اور جگہ جگہ سے اپنی منزلِ مقصود کا پتہ پوچھنے کے بعد میں ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے پہنچا جس کی ظاہری حالت دیگر مکانات سے قدرے اچھی تھی۔ دروازے کے قریب گیا مگر زنجیر ہلانے کی جرأت نہ ہوتی۔ اس محلہ کی فضا میں سے مجھے گناہ کی بُو آ رہی تھی۔ میں ہمت کر کے ایک دفعہ پھر بڑھا لیکن پھر ناکام رہا۔ تیسری مرتبہ گذشتہ رات کے واقعات اور مظلوم عورت کی قابلِ رحم حالت مجھے کھینچتی ہوئی دروازے تک لے گئی، اور میں نے زور سے زنجیر کو ہلایا۔ چند منٹ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ دروازے کی دوسری طرف ذرا فاصلے پر دو شخص سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے بعد بھاری بھر کم بوٹوں کی آواز آئی۔ زنجیر آہستہ سے اتاری گئی اور ایک دراز قامت پتلے دبلے شخص نے جس کے چہرے سے بے رونقی اور وحشت ٹپک رہی تھی دروازہ کھولا۔

"اندر تشریف لے آئیے" اُس نے کہا۔

عورت کی دردناک کیفیت اور اس شخص کی اندوہگین حالت میں اس قدر نمایاں تعلّق پایا جاتا تھا کہ میں بغیر یہ دریافت کئے کہ کس مکان میں جا رہا ہوں اندر داخل ہو گیا۔

وہ شخص مجھے ایک کمرے کے دروازے تک لے گیا۔

"میں دیر سے تو نہیں پہنچا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں جناب" اُس نے دروازہ کھولتے ہوئے جواب دیا "اگر آپ اس کمرے میں تشریف رکھیں تو

آپ کو پانچ منٹ سے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا۔"

میں کمرے میں داخل ہوگیا اور وہ شخص چپ چاپ دروازہ بند کرکے چلا گیا۔ میں ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ فرش پر ایک بوسیدہ چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف ایک پلنگ رکھا تھا۔ دوسری طرف ایک شکستہ کرسی رکھی تھی۔ کونے میں دو ایک صندوق پڑے تھے۔ ہر چیز پر گرد پڑی ہوئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کمرے کو مدت سے صاف نہیں کیا گیا۔ چاروں طرف قبر کی سی خاموشی تھی۔ مکان بالکل سنسان معلوم ہوتا تھا۔ مکان کے اندر یا باہر کوئی آواز کوئی آہٹ سنائی نہ دیتی تھی۔ میں نے ایک کرسی صاف کی اور بیٹھ کر اپنی سب سے پہلی طبی مہم کے نتیجہ کا انتظار کرنے لگ گیا۔ مجھ کو اس طرح بیٹھے زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ سڑک پر ایک گاڑی چلنے کی آواز سنائی دی گاڑی مکان کے سامنے رک گئی۔ دروازہ کھلا۔ آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز آئی اور اس کے بعد پھر سناٹا ہوگیا چند منٹ کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا کہ دو یا تین آدمی کسی بھاری اور وزنی چیز کو اٹھائے سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں تھوڑی دیر کے بعد سیڑھیاں اترنے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ دروازہ ایک دفعہ پھر کھل کر بند ہوگیا۔ اور فضا میں وہی اداسی اور پر دہشت سکون مستولی ہوگیا۔

پانچ منٹ اور گزر گئے اور عین اُس وقت جب میں نے دل میں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ خود باہر جا کر اس معمے کو حل کروں۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور گزشتہ رات والی پُر اسرار عورت اسی لباس میں اسی طرح چہرے کو نقاب میں چھپائے داخل ہوئی اور اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھ کو آگے بڑھنے کے لئے کہا۔ عورت کے غیر معمولی قد و قامت اور اُس کی مسلسل خاموشی نے ایک لمحے کے لئے میرے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ اس لباس میں عورت نہیں بلکہ کوئی مرد چھپا ہے۔ لیکن سسکیوں کی آواز سے جو نقاب کے پیچھے سے آرہی تھی اور اس کی مجنونانہ حرکات نے فوراً اس خیال کو مٹا دیا۔

مَیں عورت کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ ہم سیڑھیوں سے اور ایک برآمدے میں سے ہوتے ہوئے ایک کمرے کے دروازے تک پہنچے جہاں عورت دروازہ کھول کر ذرا رک گئی تاکہ میں پہلے داخل ہوسکوں۔ کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں۔ صرف ایک چھوٹا سا روشندان تھا جس میں سے اتنی ناکافی روشنی کمرے میں آرہی تھی کہ میں اُس چیز کو جو میرے سامنے کمرے کے وسط میں پڑی تھی اُس وقت تک نہ دیکھ سکا جب تک کہ عورت ایک چیخ کے ساتھ میرے پاس سے ہوتی ہوئی دیوانہ وار اُس کے قریب نہ جا گری۔ میں جلدی سے آگے بڑھا۔ ایک چارپائی پر سفید چادر میں جس پر گرم کمبل پھیلا ہوا تھا ایک شخص لیٹا پڑا تھا۔ بے حس اور بے حرکت چہرے پر سر کے اوپر سے اور ٹھوڑی

کے نیچے سے ایک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دایاں ہاتھ پہلو کے ساتھ پڑا تھا اور بایاں ہاتھ عورت کے ہاتھوں میں تھا۔ میں نے آہستہ سے عورت کو ایک طرف ہٹایا اور اُس شخص کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہاتھ سرد تھا اور نبض ساکن۔

"اِنا للہ" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ "یہ شخص تو مر چکا ہے"

عورت تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی "خدا کے لئے ڈاکٹر صاحب ایسا نہ کہئے مجھ میں تاب نہیں کہ اس کو برداشت کرسکوں۔ بسا اوقات ایسے لوگ جن کی جانب سے دنیا ناامید ہو چکی تھی دوبارہ زندہ کردیئے گئے اور ایسے لوگ جو آسانی سے صحتیاب ہو سکتے تھے صرف بے توجہی اور بے پروائی کی بدولت قبر کی آغوش میں پھینک دیئے گئے ڈاکٹر صاحب! اس کو بغیر علاج کے، بغیر کسی جدوجہد کے یوں کس مپرسی کی حالت میں نہ مرنے دیجئے۔ شاید اس وقت اس لمحے اسی لحظہ جسم میں سے جان نکل رہی ہو۔ للہ کوشش کیجئے۔ ڈاکٹر صاحب اس کو مرنے نہ دیجئے"

اور یہ کہتے ہوئے اُس نے لاش کے ہاتھ پاؤں اور سینے کو ملنا شروع کردیا۔

"یہ سب کچھ بے سود ہے" میں نے اپنا ہاتھ سینے پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ مگر آنکھوں کی حالت دیکھ کر معاً میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔

"ٹھہرو" میں نے کہا "کھڑکیاں کھول دو"

ان الفاظ نے عورت پر بجلی کا سا اثر کیا۔ اس طرح گویا اس کو تیر آ لگا ہے۔

"کیوں" اُس نے دفعتہً چونک کر کہا

"میں کہتا ہوں کھڑکیاں کھول دو" میں نے پہلے سے ذرا زیادہ سخت آواز میں کہا۔

عورت روتی ہوئی میرے پاؤں پر گر پڑی "میں نے ارادتاً کمرہ تاریک کیا تھا" اُس نے کہا "ڈاکٹر صاحب مجھ پر رحم کیجئے۔ اگر وہ واقعی مرچکا ہے اور اس کو زندہ کرنے کی کوشش فضول ہے تو خدارا اس شرمناک اور دلخراش منظر کو جسے اب تک میری آنکھیں دیکھ سکی ہیں دوسری آنکھوں کو دیکھنے کی اجازت نہ دیجئے"

"اس شخص کی موت طبعی بواعث سے واقع نہیں ہوئی" میں نے کہا "میں لاش کو ضرور دیکھوں گا" اور یہ کہہ کر ایک ہی جست کے ساتھ پیشتر اس کے کہ عورت کو معلوم ہوتا میں کھڑکی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے کواڑ کھول دیئے اور پھر لاش کے قریب آگیا۔ لاش کے چہرہ کا نیلگوں رنگ، آنکھیں ابھری ہوئی صاف بتا رہی تھیں کہ موت کا باعث تشدد ہے۔

"اُس پر تشدد کیا گیا ہے" میں نے عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور عورت کے چہرے کی طرف جس

سے اب نقاب ہٹ چکا تھا دیکھتے ہوئے کہا۔

عورت نے پریشانی میں نقاب اتار دیا تھا اور اب حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ خدوخال سے اُس کی عمر ۵۰ سال کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ غم و اندوہ نے اُس کے چہرہ پر ایک دردناک کیفیت پیدا کر دی تھی۔ مسلسل رونے سے اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو صرف دیوانگی ہی پیدا کر سکتی ہے۔

"اس پر تشدد کیا گیا ہے" میں نے پھر کہا۔

"جی ہاں"

"یہ شخص قتل کیا گیا ہے"۔

"خدا گواہ ہے" عورت نے جواب دیا "کس سفاکانہ اور خوفناک طریق پر قتل کیا گیا ہے"۔

میں نے اضطراری طور پر عورت کا بازو پکڑ لیا اور اُس کو دباتے ہوئے کہا "کس نے قتل کیا ہے"۔

"یہ دیکھو" عورت نے لاش کے گلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں لاش پر جھک گیا۔ گلا متورم تھا اور اس کے گرد ایک نیلگوں حلقے کا نشان تھا۔

تمام واقعات ایک لمحے میں میرے دماغ میں پھر گئے اور حقیقت بجلی کی طرح میری آنکھوں کے آگے کوند گئی۔ "اس شخص کو آج صبح پھانسی دی گئی ہے" میں نے جلدی سے کہا۔

"جی ہاں" عورت نے خلا میں بے معنی طور پر دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے بہتے ہوئے آنسو اب منجمد ہو گئے تھے۔ انتہائی غم نے اُس کے احساسات کو شل کر دیا تھا۔

"یہ کون تھا" میں نے پوچھا۔

"میرا لختِ جگر۔ میرا بیٹا" یہ کہا اور عورت بے ہوش ہو کر میرے پاؤں میں گر گئی۔

یہ صحیح تھا۔ اِس قدر طویل عرصہ گزر جانے کے بعد واقعات کا اعادہ فضول اور محض درد انگیز ہوگا۔ یہ بدقسمت شخص اس بیوہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بدنصیب عورت نے اپنا تمام اندوختۂ حیات اُس کی پرورش پر صرف کر دیا، مگر جب وہ جوان ہوا تو گناہ کی رنگینیاں اُس کو اپنی سرکش موجوں میں بہا لے گئیں۔ بدبخت ماں نے خوشامدوں سے التجاؤں سے اُس کو باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر نوجوان بغیر سنے بغیر دیکھے بغیر سوچے ذلت کے عمیق ترین گڑھوں میں گرتا گیا نیچے ــــ نیچے ــــ اور نیچے یہاں تک کہ قانون نے ایک سنگین جرم میں اُسے سزائے

موت کا حکم سنایا۔ ایک شریک مجرم بوجہ عدم ثبوت رہا ہوگیا اور یہ جانہار پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔

یہ سب کچھ ہوا مگر ماں کی بے پایاں محبت نے اُس کو یہ یقین نہ کرنے دیا کہ اُس کا بیٹا بھی مر سکتا ہے۔ اِس خیال سے کہ شاید پھانسی پر لٹک جانے کے بعد بھی اُس میں زندگی کا کوئی شائبہ رہ جائے، یا شاید وہ کہنہ مشق ڈاکٹر جو اس بات کے ذمہ دار ہوتے ہیں کہ کوئی شخص پھانسی کے تختے سے زندہ نہ جائے دھوکا کھا جائیں وہ تاریک اور سرد رات میں بھیگتی ہوئی میرے دروازے تک آئی اور اس دلخراش حقیقت کو چھپاتے ہوئے مجھے قدرت کے اُس اٹل قانون "موت" کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے مردہ بیٹے کے بستر تک لے گئی۔

آہ! بدنصیب فریب خوردہ محبت ماں! ..

خادم بٹالوی

محبّت

ہماری حیاتِ مستعار کا پاکیزہ ترین وہ لمحہ ہے جب ہم نے پہلے پہل محبت کو محسوس کیا، جب گوشِ دل سے اُس کے ریشمیں پردوں کی پھڑپھڑاہٹ سنی، جب ہم نے سنی بڑھتی ہوئی سانس اور صدا اُس ہوائے تیز کی جو ہماری روح پر تسلط کرنے کو تھی، اُس کو پاکیزہ بنانے کے لئے یا تباہ و برباد کرنے کے لئے ——— لانگ فیلو

محبت کے مسرور اثر کی قوت سے ہم طعن و تشنیع اور زجر و توبیخ کے دلخراش حملات سہار سکتے ہیں، خواہشات کی گرم جولانی کو روک سکتے ہیں، جامِ مصائب کے کڑوے گھونٹ کو شیریں بنا سکتے ہیں اور اُن راحت کے لطیف و حسین ترین پھولوں کو جو ہماری زندگی کی کٹھن اور کانٹوں بھری راہوں پر بکھرے پڑے ہیں چن سکتے ہیں ——— زمرین

محبت دل کو پراگندہ اور آلودہ خیالات سے خالی کرتے ہوئے پُر تقدیس و پُر تنویر بناتی ہے، لائحۂ حیات کو قوت و شرف بخشتی ہے، زندگی کی ہر ہر حرکت کو عالی ہمتی اور شرافت و نجابت سے درخشاں کرتی ہے، ہر عورت اور مرد پر احترام جرات اور قوت کے پھول نثار کرتی ہے! وہ بہترین تحفہ جس سے بنی نوعِ انسان مشرف ہوا صدقِ دل اور جاں نثاری سے محبت کرنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں! محبت مقدس آگ ہے اسے بتوں کے سامنے روشن کرنا اس کی تحقیر کرنا ہے! ———

مس جیوسبری

امین

تجلّیات

عشق وجنوں پرست ہوں بادہ کشِ الست ہوں
میکدۂ ازل کا ایک رندِ سیاہ مست ہوں

سجدے کے واسطے مرے، گردنِ آسماں ہے خم
تیری رہِ نیاز میں ایک گدائے پست ہوں

زاہدِ کم نظر نہ کچھ اس کے سوا سمجھ سکا
کافر و بت پرست ہوں جام و سبو بدست ہوں

تجھ کو خیالِ حور ہے مجھ کو خیالِ طور ہے
ہاں! تُو خدا پرست ہے! ہاں، میں صنم پرست ہوں

چشمِ نجوم میں اثرؔ کوئی نہیں ہے امتیاز
مَیں ہی اسیرِ حلقۂ دامِ بلند و پست ہوں

اثر صہبائی

کشتِ لالہ وگل

یہ داغہائے جگر ہیں کہ کشتِ لالہ وگل
کھلا ہے دامنِ دل پر بہشتِ لالہ وگل

ہر ایک غنچہ وگل چاک در گریباں ہے
خرابِ دستِ جنوں ہے سرشتِ لالہ وگل

نہ محو خونِ شہیداں کی یاد ہو جائے
لگا دو گورِ شہیداں پہ خشتِ لالہ وگل

مراد جو ہے اسرار دانِ فطرتِ حسن
میری نظر میں ہے زیبا و زشتِ لالہ وگل

فسانۂ دلِ خوں گشتہ صفا ہے ظفرؔ
سرِ صحیفۂ قدرت، نوشتِ لالہ وگل

سراج الدین ظفر

کولمبس سے پہلے امریکہ میں عربیت

یہ حقیقت تاریخ کی بالکل واضح حقیقت ہے کہ داخلہ کولمبس سے پہلے امریکہ میں انسانوں کی باقاعدہ آبادی تھی حتی کہ ان میں متعدد فرمانروا بھی تھے، جو اپنی اپنی حدودِ مملکت میں مستقل طور پر فرمانروائی کرتے تھے۔ اور اُن کا عمران و تمدن بھی زمانہ کے لحاظ سے بہترین تمدن تھا۔ لیکن یہ حقیقت کہ کولمبس سے پہلے عربی لوگ بھی امریکہ میں پہنچے تھے یا نہیں البتہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی عقدہ کشائی میں بہتیرے ناخنِ فکر بے کار ہو چکے ہیں۔ "جامعہ ہارورڈ" کے مشہور عالم لیو وینر نے صرف اتنا ثابت کیا ہے کہ ہنودِ امریکہ (جو وہاں کے قدیمی باشندے ہیں) کی زبان میں بعض عربی کلمات پائے جاتے ہیں۔

علامہ موصوف ۲۶ زبانوں کے ماہر ہیں، آپ نے کئی برسوں میں اُن مسیحی مبلغوں کی کتابوں سے جو اسپین کے مشہور قائدِ اعظم کورٹز فاتح مکسیک کے زمانہ میں وہاں مصروفِ تبلیغ تھے، ہنودِ امریکہ کی زبان سیکھی، اور اس کاوش کا منشا صرف یہ تھا کہ اس زبان کے اُن کلمات و تعابیر کا پتہ لگایا جائے جو ازمنۂ غابرہ میں وہاں کے اصلی باشندوں کے ساتھ اجنبی اقوام کے مل جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ تحقیقات کے بعد موصوف کو معلوم ہوا کہ امریکہ کی زبان میں انگریزی اور سپینی، فرانسیسی اور پرتگالی زبان کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ لیکن مزید تفحص کے بعد یہ حقیقت بھی عالم آشکارا ہوئی کہ ان تمام زبانوں کے علاوہ امریکہ کی اصلی زبان عربی کی بھی بہت کچھ ممنونِ احسان ہے۔ اور سب سے پہلے عربی زبان نے ہی لغتِ امریکہ کو الفاظ کا قرضہ دیا تھا۔ موصوف کا خیال ہے کہ اس زبان میں عربی کلمات سنہ ۱۲۹۰ء میں یعنی کولمبس کی آمد سے دو صدی پہلے داخل ہو چکے تھے اور جن لوگوں کی وساطت سے یہ کلمات وہاں تک پہنچے وہ دو صدی اور پہلے سے وہاں پہنچ چکے تھے۔

علماءِ فن نے سجلاتِ قدیمہ کے متعلق جو جدید بحثیں کی ہیں، اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ گذشتہ زمانوں میں تجار سفینے تجارت کی غرض سے اوقیانوس اٹلنٹکی میں بھی برابر جاتے تھے۔ لیکن ان کی یہ آمد و رفت غیروں سے بالکل پوشیدہ اور مخفی ہوتی تھی۔ اسی انداز پر فرانس کے مشہور مقام دیب و ردان والے تاجر بھی اپنے اپنے جہاز افریقہ کے مغربی ساحل غانہ پر کولمبس سے ۱۰۰ برس پہلے تک بھیجا کرتے تھے، جو وہاں سے مخفی طور پر سونا، ہاتھی دانت، خوشبوئیں، اور قیمتی پتھر وغیرہ لاتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہیں کے تاجر اپنے اپنے جہازوں کو جنوبی امریکہ میں بھی بھیجتے تھے۔

"دیب" کے متعلق علماءِ آثار کی کوششوں سے محقق طور پر یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ شہر ولادتِ کولمبس سے چند صدی پہلے بھی اسی قسم کی مخفی تجارت کا مرکز تھا۔ اور دیب کی یہ چال سنہ ۱۶۹۴ء تک جاری رہی۔ لیکن اسی سن میں جب فرانس

اور انگلینڈ کے درمیان جنگ چھڑ گئی، تو انگریزوں نے "دیب" پر توپوں کے اتنے گولے برسائے کہ ساری دیب تاجروں کے تمام مکانات، اُن کی ساری کائنات کے ساتھ بھسم ہو گئی۔

مذکراتِ کولمبس میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب کولمبس انکشافِ امریکہ کی مہم سر کرنے کے لئے جا رہا تھا تو اثنائے راہ میں اسپین کے نامور بہادر نبزون سے ملاقات ہو گئی، جس کو کولمبس نے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر اپنا رفیقِ سفر بلکہ رہنما بنا لیا۔ لیکن آگے چل کر دونوں تعینِ سمت میں مختلف ہو گئے۔ نبزون جنوب کی سمت چلنا چاہتا تھا اور کولمبس اس کے خلاف تھا۔ ناچار نبزون نے کولمبس کا ساتھ چھوڑ دیا اور خود تنِ تنہا جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ تین ہفتہ کے بعد جنوبی ساحل کو پا کر دفعتہً دونوں سیاحوں کی ملاقات ہو گئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبزون کولمبس سے پہلے امریکہ جا چکا تھا، اور کولمبس بھی اس کو اچھی طرح جانتا تھا چنانچہ اسی لئے اُس نے نبزون کو اپنے ہمراہ ایک مرشد اور رہنما کی حیثیت سے لیا بھی تھا۔

کولمبس اپنے تیسرے سفر سے پلٹنے کے بعد بیان کرتا ہے کہ میں نے امریکہ کے شہروں میں بہت سے زنگی دیکھے، اور جن ہنود (سکانِ امریکہ) سے میں پہلے سفر میں ملا تھا۔ انہوں نے مجھ کو "جوانین" کا ہدیہ بھی دیا تھا ("جوانین" اس زمانہ میں تانبا ملے ہوئے سونے کو کہتے تھے جو افریقہ سے لایا جاتا تھا) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کولمبس نے امریکہ میں افریقی سونا اور زنگیوں کو دیکھا تھا۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہاں پہلے کچھ لوگ ایسے گئے ہوں جن کے ساتھ زنگی زادے اور افریقہ کا خاص سونا بھی رہا ہو۔ کولمبس اپنے ساتھ ترجمانی کے لئے بہت سے ایسے افریقی زنگیوں کو لے گیا تھا جو امریکہ کی زبان سے خوب واقف تھے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ افریقہ کے زنگی کولمبس کے پہلے امریکہ کو جانتے تھے۔ مزید برآں بعض ماہرینِ فن کا یہ بھی خیال ہے کہ "ازدومایہ" کا قدیم تمدن خالص عربی تمدن تھا۔ اور خود ازدومایہ عربی مستعمرات تھے۔ عربی تمدن نویں صدی عیسوی کے اندر افریقہ میں پورے طور سے پھیل چکا تھا۔ اور مغربی افریقہ سے ہوتا ہوا خلیج مکسیک کے کناروں پر "مشواکان" وغیرہ میں بھی اس کا گہرا اثر پڑ چکا تھا۔ اس لئے امریکہ کی قدیم زبان میں جو عربی آثار موجود ہیں، وہ ان تمام مقامات کو واضح طور سے بیان کرتے ہیں۔ ماہرینِ فن کے خیال میں امریکہ کے اندر عربی کلمات پہنچانے والے بربر کے باشندے یا عربی دان افریقی ہیں۔

ابن بطوطہ مشہور اسلامی سیاح ۱۳۲۴ء مطابق ۷۲۵ھ کے سفر میں لکھتا ہے کہ میں نے سارے افریقہ میں عام طور سے عربی زبان کو رائج دیکھا۔" ابنِ بطوطہ کا یہ سفر کولمبس کے پہلے سفر سے ۱۵۰ برس قبل کا ہے۔ ان تمام واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ امریکہ میں کولمبس کے بہت پہلے سے عربیت موجود تھی۔

بدر اصلاحی

مُسلم خاتون کی حالتِ زار

کیا چین ملا بزمِ جہاں میں ہمیں آ کے
بس ہم تو ہدف ہو گئے مردوں کی جفا کے

لب پر کبھی آیا ہی نہیں حرفِ تمنّا
بے عقل رہے واقعی حق اپنے گنوا کے

تو جان سے اپنی گئی اے پیکرِ الفت
قائل نہ ہوئے مرد مگر تیری وفا کے

سینے میں لگی کھانا پکانے میں لگی تو
فرصت جو بزرگوں کے ملی پاؤں دبا کے

گھر بھر کی مصیبت کبھی بیمار کی پرسش
کیا چین تو لائی ہے مقدّر میں لکھا کے

کس شوق سے کھاتی ہے تو پس خوردہ سب کا
بچ جائے مقدر سے جو گھر بھر کو کھلا کے

جاہل بھی ہے کم عقل بھی ہے مرد کے نزدیک
کب اس کو پسند آتے ہیں آئین حیا کے

اک جانِ حزیں پر تری دنیا کے مصائب
تو اس پہ بجا لاتی ہے سو شکر خدا کے

اک بیوہ کم عمر کی دیکھو گے جو حالت
دل تھام کے رہ جاؤ گے گردن کو جھکا کے!

مِسّی ہے نہ سرمہ ہے نہ زیور ہے نہ کپڑا
یہ عمر تو قابل نہ تھی اس سخت سزا کے

یہ طرفہ تماشا ہے کہ فرزند بھی زن بھی
دنیا میں جئیں گر تو جئیں اشک بہا کے

پر صاحبِ خانہ کی حمیّت کو تو دیکھو
فرعون بنے بیٹھے ہیں بندے یہ خدا کے

اسلاف کی عظمت تو ہوئی ایک فسانہ
محجوب ہوئے یہ نہ شرافت کو گنوا کے!

اقوامِ جہاں میں یہ گرے سب کی نگہ سے
کیا مرتبہ پائیں گے یہ عورت کو ستا کے

عورت بھی وہ عورت کہ جو ہے پیکرِ عصمت
چلتی ہے ہوا سے بھی جو دامن کو بچا کے

اب خواب سے بیدار ہو اے مسلمہ للّٰہ
اور چاروں طرف دیکھ ذرا آنکھ اٹھا کے

کب تک ہدفِ تیرِ ملامت تو رہے گی
کر حضرتِ باری میں دعا ہاتھ اٹھا کے

اے مردِ مسلماں ہے اگر دل میں ترے درد
سُن لے مرے نالے کہ یہ نالے ہیں بلا کے

میدانِ ترقی میں نکل اپنی جگہ سے
ہو تیغ بکف جوہرِ اسلام دکھا کے

فاطمہ بیگم

مہماں نوازی

"جے رام جی کی، جے رام جی کی، بھائی صاحب کیسے آنا ہوا؟ کہاں اترے ہو؟ کتنے دن قیام رہے گا؟"

"بھائی صاحب آڑہت کا حساب کرنا ہے۔ دیکھئے کتنے دن لگتے ہیں۔ آپ کے ہاں ٹکوں گا۔ اگر گنجائش ہو تو آدمی کو کہہ دیں کہ اسباب ٹانگے سے اتار لے۔"

کیا کیفیت میزبان پر گذری کون جان سکتا ہے۔ چہرہ سے تو نمایاں نہ تھی ظرف بڑا تھا دل کی اندرونی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ خندہ پیشانی سے کہا۔ ارے بدھو (ملازم) لالہ جی کا اسباب اتار پاس والے کوٹھے میں رکھ دے۔ اندر کہہ دینا کہ ایک پراہونا آیا ہے۔ کھانے کا انتظام کریں۔ ایک دو چیزیں اور پکالیں۔ تو بازار سے انبہ خربوزے لے آئیو مگر یاد رکھنا، مہنگی دوکان سے نہ لانا۔ مارکیٹ نہ جانا خبردار۔ پیسے منیم جی سے لے لینا۔ آٹھ آنے سے زیادہ کا مال نہ ہو۔

مہمان نے اشنان دھیان کیا۔ دھیان لچھمی کا تھا۔ سرستی کی اپاسنا اُن کا شیوہ نہیں تھا۔ تھالی میں کھانا آیا سبزی ترکاریاں سواد وار بنی ہوئی، اجوائن اور ادرک کی آمیزش تھی۔ دہی میٹھا اور نمکین، دال پتلی اور کڑھی دو قسم کی، پوری کچوری نمکین، چاول اچار مربہ غرض مکلّف و بیشنو غذا پروسی گئی۔ مہمان نے ذوق سے کھانا کھایا۔ یاد کیا کہ جب میزبان ہمارے ہاں اترا تھا یہی چیزیں ہمارے ہاں بھی اُس کو ملی تھیں۔ موسم کا میوہ البتہ زیادہ ہے۔

مہمان کھانا کھا کر بازار تشریف لے لئے۔ حساب کتاب ہوتا رہا۔ اب سنئے کہ میزبان کے ہاں وہ ایک دن سے اس خیال سے زیادہ نہ ٹھہرے کہ جب وہ اتفاق سے پھر اُن کے ہاں آئے گا تو دو دن رہ کر ایک دن کے عوض میں حساب پورا کرے گا۔

ایک اور لالہ صاحب اُن کے واقف اسی شہر میں رہتے تھے۔ ایک دن اُن کے ہاں قیام کیا۔ کیونکہ وہ اُن کے شہر میں ایک دن اُن کے ہاں کھانا کھا گئے تھے۔ گویا انہوں نے اس طریق سے حساب بیباق کر لیا۔

مہماں نوازی کی یہی تاریخ ہے۔ دیہات میں تو کہاں، بڑے بڑے شہروں میں بھی انگریزوں کے آنے سے قبل ہوٹل نہ ہوتے تھے۔ شہروں میں سرائیں ہوتی تھیں۔ ان میں مسلمانوں کے لئے تو نان بائی ہوا کرتے تھے۔ ہندوؤں کو بازار سے پوری کھانی ہوتی تھی یا کہاروں کے تنور ہوتے تھے مگر وہاں کا کھانا اعلیٰ ذات

سے لوگ نہیں کھاتے تھے اس لئے مہماں نوازی شرفا کے واسطے ضروری ہوگئی تھی۔ البتہ کشمیر میں اب تک بھی رواج ہے کہ کشمیری پنڈت جس گاؤں میں چلا جائے نمسکار کرکے جس کشمیری پنڈت کے گھر ٹھہرنا چاہے خواہ واقف ہو یا نہ ہو اُس کو کھانا اور بسیرا مل جائے گا۔ مسلمانوں میں بسم اللہ کہئے اور دستر خوان پر بیٹھ جائیے محض مومن ہونا کافی ہے۔

بعض ہندو قوموں میں مہماں نوازی بھی حساب کے قاعدہ پر ہے۔ میزبان اور مہمان بعض اوقات اصل کے ساتھ سود وصول کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہے لین دین کی بیباقی کے مانند دعوت کی بیباقی بھی ہوتی رہتی ہے۔

انگریز لوگ مہمان نوازی ۲۴ گھنٹے تک روا رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ گھر میں کمرہ فالتو ہو۔ مفہوم ہے کہ ۲۴ گھنٹے کے بعد مہمان کو کسی اور جگہ قیام اور طعام کا انتظام کرنا ہوگا۔ اب انگریزی زمانہ میں ہندوستان میں جگہ جگہ ہوٹل بن گئے ہیں۔ لفظ ہوٹل کی پوری ماہیت سے ابھی دیسی لوگ واقف نہیں۔ اکثر نام کے ہوٹل ہیں۔ جب جائیے تو قیام کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ صرف آپ کو بنچ پر بٹھا کر رکابی یا تھالی میں کھانا مل جائے گا ہم کو حیدرآباد میں ایک دفعہ ایسا ہی اتفاق ہوا تھا۔ ہوٹل کے لفظ سے ہم گمراہ ہوگئے تھے۔ حال میں کہیں کہیں ہندو اور مسلم ہوٹل بھی کھلے ہیں، جن میں شب باشی کا انتظام ہوا ہے۔ مگر ہم اُن کے تجربہ کی بھی سفارش نہ کریں گے۔ امید رکھنی چاہئے کہ انگریزی ہوٹلوں کی کبھی نہ کبھی پوری تقلید ہوگی اور عوام کو شکایت نہیں رہے گی ضروریاتِ زمانہ خود سکھا دیں گے۔ روز بروز تجارتی کاروبار بڑھتے جاتے ہیں۔ ہوٹلوں کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ مہمان نوازی کی ضرورت کم ہو رہی ہے۔

شمیم

غزلیات

(۱)

اک جلوۂ حق نما کو دیکھا — تم کو دیکھا۔ خدا کو دیکھا
محشر کی بھی راہ دیکھ لیں گے — تجھ سے صبر آزما کو دیکھا
ہستیٔ عدم نما کے صدقے — چھپتے ہوئے برملا کو دیکھا
دام اُٹھے نہ کیمیائے دل کے — اس جنسِ گراں بہا کو دیکھا
ہم نے بھی خدا سے موت مانگی — ہم نے بھی تری جفا کو دیکھا
ہستی میں بھی شانِ نیستی ہے — موجودِ عدم نما کو دیکھا!
تیری وہی سرگرانیاں ہیں — ہم نے اپنی وفا کو دیکھا

"ہم نے بھی فراقؔ دل بچا کے
اُس ناوکِ بے خطا کو دیکھا

فراقؔ
گورکھپوری

(۲)

ہم آغوشی کو ابھرے ہیں زمیں سے — ترے نقشِ قدم میری جبیں سے
ٹپکتا ہے محبت کی بدولت — ہمارا خوں ہماری آستیں سے
تڑپ پڑ ہی گئی قلبِ حزیں کی — شکن مٹتی گئی اُن کی جبیں سے
دیارِ عشق میں ہے ہُو کا عالم — بڑی رونق تھی اک صحرا نشیں سے
ذرا سا لفظ کہہ دیتے تو کیا تھا — یہ سُنتے جی نہ اٹھتے آفریں سے
وہیں سے کوچۂ قاتل کی حد ہے — فغاں ہوتی ہے پیدا اس زمیں سے
اب اُس لیلائے بے محمل کا ہو رو — بدل جا لیلیٰ محمل نشیں سے

جفائیں دیکھ لیں زیبا دکن کی
فلک کیا بڑھ سکے گا اس زمیں سے

زیبا
ردولوی

(۳)

جو نہی سر یہ تن سے جدا ہو گیا — حقِ بندگی بھی ادا ہو گیا
فلک کا ستم یہ نیا ہو گیا — میں پابندِ جور و جفا ہو گیا
دوائے دلِ دردمنداں فلک — کرے کیا جو اُن کا کہا ہو گیا
پرستش ہے در اصل وجہِ کمال — پرستش سے بت بھی خدا ہو گیا

تبسم میں پنہاں ہے رازِ بقا
ہنسی گل کو آئی فنا ہو گیا

صوفیہ

(۴)

آپ کی پردہ داریاں نہ گئیں — میری امیدواریاں نہ گئیں
اُس کے ادراک کی تمنا ہے — عقل کی ہرزہ کاریاں نہ گئیں
دلِ مجروح کو محبت میں!! — چھوڑ کر دل فگاریاں نہ گئیں
چھین لوں گا میں چارہ گر کا قرار — جو مری بے قراریاں نہ گئیں
شبِ غم ہو گئی وداع مگر — درد کی غمگساریاں نہ گئیں
میرے ماتم میں صبحِ محشر تک — رات کی سوگواریاں نہ گئیں

کوششیں کیں ہزار صحرائی
تھیں جو قسمت میں خواریاں نہ گئیں

[illegible]

محفلِ ادب

پشتو ادب

جیساکہ دانتے وغیرہ نے اطالیہ کی ادبیات کو جب کہ وہ ملک معرضِ زوال میں تھا چار چاند لگادیئے تھے افغانوں کے شعروسخن نے مغلوں کے زمانے میں بڑی آب وتاب دکھائی - واضح رہے کہ جتنی قوت مغلوں کی جنوبی محاربات میں صرف ہوئی اُس سے زیادہ شمال میں کام آئی - صرف اکبر کے عہد میں زین خاں اور ٹوڈرمل کے سمیت میں ہزار سپاہ کو افغانوں نے تلف کیا - اورنگ زیب کے وقت افغان ہارے ہارے گویا آرام سے بیٹھے کہ فعل سے قوت اور قول کی طرف راغب ہوں -

ارسطو نے قفس میں پرندوں کی نغمہ سرائی کو غمگینی پر مبنی نہیں سمجھا جیسا عام خیال تھا اور اس دلیل پر اس کی تردید کی کہ اگر مرغ کے زخم لگا ہو تو چھپانے سے قاصر ہوتا ہے - ابنِ عربی نے عذاب الیم کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ بندگانِ خاص کو مصیبت میں ایک عذوبت یعنی شیرینی حاصل ہوتی ہے جس میں درد ہوتا ہے اور وہ ایک لذت لئے ہوتا ہے - ہمارے ایک دہقان نے کہا کہ مزہ جب ہے کہ آدمی کھیت میں بیٹھا ہو نم نم مینہ برستا ہو اور نرم نرم تپ بھی چڑھی ہو - مجددِالفِ ثانی محی الدین عربی کی ذات کو مقبول اور اُن کے کلام کو مردود کہتے ہیں اگر کوئی اس دہقان کی بات کو فضول سمجھے تو تعجب نہیں

ع فکرِ ہرکس بقدرِ ہمتِ اوست -

عاشق کو فراق میں رنج کے ساتھ البتہ ایک لطف بھی حاصل ہوتا ہے اور جدائی کا غم تو لازمۂ شاعری ہے جو وصل میں بھی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتا - ایک افغان کہتا ہے :-

د وصال پہ چینی مرمہ وچی شونڈی	د فراق لہ اندیشنے لہ تاب وتب
وصال کے چشمے پر خشک لب مر رہا ہوں	فراق کے اندیشے کی تب وتاب سے

ایک افغان فارسی میں کہتا ہے :-

ماتم وسوزِ جہاں بس کہ بہم آمیز ست	خندۂ قہقہہ ہم اشکِ ندامت ریز است

مرج البحرین ھذا عذب فرات وھذا ملح اجاج وبینھما برزخ دو بحر میٹھے اور تازہ اور کھاری اور کڑوے مل رہے ہیں اور اُن کے درمیان فاصلہ ہے - اس کی ایک تفسیر یہی دکھ اور سکھ ہے بلکہ الٓمٓ کے حروفِ مقطعہ بھی الم کی

تائید و تشدید میں شاید علیحدہ علیحدہ پڑھے جاتے ہوں۔ غرض یہ ہے کہ جیسے خنسا نے غم و ہم کے محرم میں مرثیے کہہ کر نابغہ کا مقابلہ کیا بعض قومیں بھی آزادی کھو کر اس کی تعزیت میں سرور سے گاتی ہیں۔

ہندوستان کے افغانوں نے بہت سے دیوان پشتو میں لکھے۔ عجائب اللغات یہیں تالیف ہوئی جو پشتو کی بڑی ضخیم کتاب ہے۔ سرحد میں تفسیر معالم کا ترجمہ ہوا یہاں تک کہ انجیل بھی پشتو میں منتقل ہوئی۔ مغلوں کی سلطنت میں رشید البیان وغیرہ فقہ کی کتابیں لکھی گئیں جو پشتون عورتیں تک پڑھتی ہیں اور بڑے بڑے افغانی شعرا تو تقریباً سب اسی عہد میں ہوئے۔ خوشحال خاں جو خٹک افغانوں کا سردار تھا ایک عمدہ گھوڑا اورنگ زیب کو نہ دینے کی وجہ سے قید میں ڈال دیا گیا، جہاں اس کو اذیت پہنچائی گئی مگر اس نے گھوڑا دینا منظور نہ کیا آخر ایک تند خو اور کج طبع آدمی کو اس کا رفیق قید بنایا تو ناچار ہو کر بادشاہی خواہش کو پورا کیا۔ اس مصیبت میں اس نے ایک قصیدہ لکھا جس میں اپنے مختلف خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

ما وچہ د مغل پہ نوکرئ کښ ۔۔۔ رکیبونہ کړم د سرو د سپینو نال

ناحق زنځیرونہ را پہ پښو کړل ۔۔۔ واہ واہ هسے نوازش هسے آمال

(میں نے کہا کہ مغل کی نوکری میں رکابیں سونے کی اور نعلیں چاندی کی بناؤں گا۔ ناحق زنجیریں میرے پاؤں میں ڈال دیں۔ واہ واہ ایسی نوازش اور ایسی امیدیں) پھر اپنی قوم کو مغلوں سے استغنا برتنے کی ہدایت کرتا ہے۔

پښتانہ لرہ شړئ اندېرې بس دئ ۔۔۔ نہ غواړو د مغلو مجری شال

(افغانوں کے لئے اُن کے اپنے دیسی کپڑے کافی ہیں مغلوں کی مجری شال ہم نہیں چاہتے، پھر اپنے رنج کے خاتمے کی دلیل پیدا کرتا ہے۔

پس لہ ژمی راځی پسکال

(جاڑوں کے بعد بہار آتی ہے) اپنے وطن میں پہنچ کر ہمیشہ افغانوں کو متحد کرنے کی کوشش کرنے، ضمناً مغلوں سے آزاد رہنے کی ترغیب دیتا رہا۔

تر منصب پورے خوشحال خټک نوکر ؤ ۔۔۔ چہ منصب ورڅخہ لاړ نو اُس بادشاہ دئ

(منصب تک خوشحال خٹک نوکر تھا۔ جب منصب اُس سے جاتا رہا تو اب بادشاہ ہے)

چہ تنخواہ مد مغل خوړہ یو ملک وم ۔۔۔ چہ تنخواہ اُس نشتہ ملک یم

(جب مغل کی تنخواہ کھاتا تھا تو ایک ملک تھا، جب تنخواہ نہیں ہے تو اب ملک ہوں)

خوشحال خاں نے مختلف اقسام کی نظموں کے علاوہ نثر میں بھی فضیلت دکھائی ہے۔ تاریخ مرصع میں جو پشتو کی ایک عمدہ تصنیف ہے ایسے واقعات درج ہیں جو معاصر فارسی اور انگریزی کتابوں میں نہیں پائے جاتے۔ اس کی اولاد میں مدتوں شعرا ہوتے رہے جن میں سے ایک شیدا ہے جو اقارب کے عقارب ہونے کی ضرب المثل کو یوں بیان کرتا ہے۔

د دریاب له سرد جوشی دحباب زړه چوي شیدا قطع د امید بویه له خپلو

(دریا کی سرد جوشی سے حباب کا دل پھٹا جاتا ہے۔ شیدا اپنوں سے قطع امید کر لینی چاہیئے) اس کی ایک دو بیتیں لکھی جاتی ہیں جو مجھے یاد رہ گئیں کیونکہ سب مضمون حافظے ہی کی مدد سے تحریر کر رہا ہوں۔ ورنہ اس سے بہتر مثالیں موجود ہیں:-

ستا په سپین تندي اے جانان د اشین خال دئی یا د سحر و اذان ته ولاړ بلال دئی

(تیری سفید پیشانی پر اے جاناں یہ سبز خال ہے یا فجر کی اذان کے لئے بلال کھڑا ہے؟)

که چا په دنیا کښ جنت نه وی لیدلے بلا تشبیه دا یو خوند ستا د وصال دئی

اگر دنیا میں کسی نے بہشت نہیں دیکھا بلا تشبیہ یہ تیرے وصال کا ایک مزہ ہے)

خوشحال خاں کو بجا طور پر پشتو کا شیکسپیئر رحمٰن کو حافظ اور حمید کو سعدی کہتے ہیں اور تینوں فی الحقیقت بہت بلند رتبہ رکھتے ہیں۔ حمید نے گلستاں، بوستاں اور انوارِ سہیلی وغیرہ کا پشتو میں نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں ترجمہ کیا اس کا دیوان بھی اخلاقی نصائح اور نفائس سے مملو ہے ایک جگہ کہتا ہے۔

ناز ولے زوے نه اخلی ادب او د سورے نخل نه نیسی رطب

(نازنین بچہ ادب حاصل نہیں کرتا اور سائے کی کھجور میں پھل نہیں لگتا)

رحمٰن روحانی امور کے علاوہ اپنے زمانے کے وقائع کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے:-

اورنگ زیب هم یو فقیر وو یو ټوپی لے وو په سر

(اورنگ زیب بھی ایک فقیر تھا جس کے سر پر ٹوپی تھی) چه لاس لے ورسید د خوابِ کړ د خودم ټول ټبر جب ہاتھ پہنچا تو خورم کا سارا گھرانہ برباد کر دیا) باوجود اس کے عالمگیر کی وفات کو غروب آفتاب سے تشبیہ دے کر اندیشہ ظاہر کرتا ہے کہ اس اندھیرے میں دیکھیئے کیا حوادث پیش آتے ہیں۔ حافظ کے دیوان کی طرح افغان اس میں فال دیکھتے ہیں۔ جب کابل کے محبس میں پڑا تو ایک معزز آدمی کسی خاندانی لڑائی کے سبب قید میں

آیا۔ جب امیر حبیب اللہ مقتول نے اسے دربار میں بلایا تو جانے سے پہلے اُس نے مجھ سے دیوانِ رحمٰن سے فال دیکھنے کی فرمائش کی جو عجیب برمحل نکلی۔

فال به څه گورے رحمٰن — دهر سړی اعمال خپل فال شی

(رحمٰن فال کیا دیکھتے ہو ہر شخص کے اعمال اُس کی فال ہو گئے) چنانچہ اس کے کردار کے مطابق فیصلہ ہوا۔

یہ تو مجمل حال ہے کابل اور پشاور کے درمیان کے شعرا کا۔ قندھار میں بھی لطیف الطبع شاعر اور ادیب گذرے ہیں۔ ایک ہبد آفند بڑا عالم تھا جس نے اصولِ فقہ پر کتاب لکھی اور مقاماتِ حریری کی شرح تالیف کی۔ اپنے پوتے پر معمّا کہا ہے:۔

که لاس یوزے مخ به گلبدن کښی — له غیرت خال پریوزی به سمن کښی

(اگر گلبدن کے منہ پر ہاتھ پھیریں تو غیرت سے خال دامن میں گر پڑے) افغان بچوں کے منہ پر خال سرمے سے بناتے تھے جو سیاہی کا نقطہ معلوم ہوتا تھا۔ مخ منہ کو کہتے ہیں اگر اس کو ہاتھ یعنی ید لگایا جائے تو مخید ہو جاتا ہے اگر خال یعنی نقطہ دامن میں نیچے آپڑے تو مجید ہو جاتا ہے جو اس کا نام تھا)

امیر عبدالرحمٰن خاں کا سپہ سالار سدو خاں جوتک کہتا ہے:۔

دعاشقی په کوډ کښی لږ څه دسترس لرم — چه جان په خپل جانان قربان کړم دهغه وس لرم

(عاشقی کے گھر میں تھوڑی سی دسترس رکھتا ہوں کہ جان اپنے جاناں پر قربان کروں یہ میرے بس میں ہے)

تیغِ ابرو کو کس طرح نباہا ہے:۔

ستاد سترگی او به دا هسے نه دی — چه غیر له سر به سر لری حباب

(تیری آنکھوں کا پانی ایسا نہیں ہے کہ سر کے سوا اس کے سر پر یعنی سطح پر اور کوئی حباب ہو)

شرقِ قدیم کی بلندیٔ مضمون ملاحظہ ہو۔

ستا دمخ مگرم لمر نه دیٔ ناجوړ — چه مسیحی وعلاج ته سفری ولاړ

(تیرے منہ کی وجہ سے کہیں سورج بیمار تو نہیں کہ مسیحا علاج کے لئے سفر پر گیا ہے)

چه تاسئے له تا سره دیوسف حسن — ترازو پسے واسمان ته مشتری ولاړ

(تا کہ تیرے ساتھ یوسف کے حسن کو تولے — ترازو کے پیچھے آسمان پر مشتری گیا ہے)

افغانوں کے ملّی اشعار جنہیں بدلی یا لنڈی کہتے ہیں یعنی چھوٹی ابیات اکثر جوانوں کو ہزاروں یاد ہوتے ہیں۔

اور ایسی آواز سے گاتے ہیں جو اونچے پہاڑوں سے ٹکرا کر دور تک گونجتی ہے۔

پہ تورتوپک وشتلے شہ سپے   د نامردی احوال دمرازہ مسینہ

(سیاہ بندوق سے تیرا مارا جانا بہتر ہے اے محبوب تیری نامردی کی خبر مجھے نہ پہنچے)

جدت طرازی بھی اکثر پائی جاتی ہے۔

سترگی دڈ کے تپانچے دی   غریب سڑی پہ لار تلم ودوشتمہ

(تیری آنکھیں بھرے پستول ہیں۔ مجھ غریب آدمی کو راہ جاتے مار دیا)

دکافرگل پہ شان کازہ سوے   چہ راسیدہ شے روزبہ نیمہ تیروی نہ

(کافرگل کی شان پر ٹیڑھی ہوگئی ہو۔ جب سیدھی ہوگی تو آدھا دن گذرا ہوگا) شان مانند کو بھی کہتے ہیں اور آدھا دن گذرنا پشتو میں آدھی عمر بسر ہونے کے مساوی ہے۔ کافرگل سورج مکھی کو کہتے ہیں کیونکہ ایک بڑی چیز کو قلبِ موضوع سے کافر سے تعبیر کرتے ہیں حتیٰ کہ ایک نیک شخص دعا کرتا ہے کہ خدا مجھے اتنا مال واختیار دے کہ ایک کافر مسجد بناؤں اور ایک کافر ملا کو وہاں رکھوں۔ اسی طرح محاورہ ہے زشت یا بدشہ سڑہ دئی۔ زشت یا بد اچھا آدمی ہے یعنی نہایت خوب آدمی ہے۔ یہ انگریزی کے آفل وغیرہ الفاظ سے مشابہ ہے)

تجنیس کے علاوہ اس فرد میں عالی دماغی قابل داد ہے

سر خما سر کوزی نہ منی د تاج   بارے تاج دی خما وسرونہ محتاج

میرا سر تاج کی سرنگونی کو نہیں مانتا   بارے تاج میرے سر کا محتاج ہے

تاج پہننے کے وقت جو سر جھکتا ہے یا اُس کو پہن کر جو سر خم رکھنا پڑتا ہے میرا سر اسے قبول نہیں کرتا۔ میرے سروِقد کا خود تاج محتاج ہے۔

"اردو"

مجنوں کا نعرۂ مستانہ

محبت کی فسوں کاری سے کلیاں مسکراتی ہیں   فضا میں جگمگاتی ہیں ہوائیں گیت گاتی ہیں

محبت دامنِ کہسار کو گلشن بناتی ہے   محبت پتھروں سے دودھ کے دریا بہاتی ہے

یہ شعلہ موجزن ہے میرے دل میں آرزو بن کر   رگوں میں دوڑتی پھرتی ہے یہ صہبا لہو بن کر

مری فریاد سے پھول اور غنچے تھرتھراتے ہیں
مرے نغمے دلوں میں شمع بن کر جگمگاتے ہیں
چلے آتے ہیں وحشی جانور آرام گاہوں سے
پلنگ و شیر و آہو جمع ہیں باغِ محبت میں
جہاں مَیں ہوں وہاں قانونِ فطرت ٹوٹ جاتا ہے

مری فریاد سے پتھر لرز کر ٹوٹ جاتے ہیں
حرم سے وہ غزالانِ حرم کو کھینچ لاتے ہیں
عیاں ہے ایک رنگِ بیخودی جن کی نگاہوں سے
محبّت کا تصرف دیکھ لو اسرارِ فطرت میں
یہاں وحشی درندہ آہوؤں سے خوف کھاتا ہے

یہاں ذرّوں میں روحِ زندگی بیدار ہوتی ہے
یہاں ہر چیز کیفِ عشق سے سرشار ہوتی ہے

عابدؔ

"ادبی دنیا"

بیوہ کا گیت

شروع شروع زندگی میں ایک مزہ تھا،
ایک امنگ تھی، ایک ڈھارس تھی۔
یہ کہ جوانی میں یونہی ہوتا ہے۔
ان دنوں کیا معلوم ہوتا۔
نہ معلوم تھا کہ زندگی کیا چیز ہے،
اور دفعتاً زندگی یہ ہوگئی۔
کہ سال آیا اور سال گیا۔
نہ اس میں مزا رہا، نہ تغیرّ نہ تحیرّ،
جیسے کوئی بیچ سے دو ٹکڑے کر دے۔
اس میں نہ اُس کی خطا تھی نہ میری،
ہم دونوں صابر تھے اور صبر بھی کرتے رہے،
لیکن موت کو صبر نہیں۔
میں نے اُس کو آتے دیکھا (کیا ہی برا آنا تھا اُس کا آنا)
اور میں اُس کو تکتی رہی اور وہ سمیٹتی گئی، سمیٹتی گئی

کچھ میری تھوڑی ہی تھی، میری!
پھر تھا کیا میرا؟ میری، میرا؟
کیا میرا سوگ تک مانگے کا نہ تھا،
قسمت کا دیا قرض؟
تقدیر نصیب ہی نہیں لیتی
دل کا رنج اور جگر کے نالے تک لوٹ لیتی ہے۔
اور پھر ایڑے کھنڈل کو گدڑی کے داموں خرید لیتی ہے۔
ہاں! تقدیر آئی اور ایک نہیں کے بدلے سب کچھ لے گئی
میرے چہرے کی ہر ہر بات،
میری چال، ڈھال،
سب،
جیسے روز کے روز کا نیلام،
اور جب کچھ نہ رہا تب اپنے حالوں چھوڑ دیا .....
خالی ہاتھ کھڑی ہوں۔

"جامعہ"

نئی کتابیں

مصطفائی کمال مولفہ حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڈھ۔ اس میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے ۵ ہجری تک کے حالات میں سے ایسے واقعات کی خوشہ چینی کی گئی ہے جن کا تعلق انسان کی مذہبی اخلاقی اور انتظامی اصلاح سے ہے اور آپ کے ایسے بعض اقوال اور افعال پر روشنی ڈالی گئی ہے جس سے اسلامی خلافت کی جھلک نمودار ہو جاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کے احکام کس درجہ مکمل اور مستحکم ہیں۔ حجم ۵۰۳ صفحات سے زائد، کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

یادگارِ عشق حضرت شاہ رکن الدین صاحب عشق دہلوی ابوالعلائی عظیم آبادی کے حالات زندگی خصوصیات شاعری اور انتخابِ کلام کا ایک دلنواز مجموعہ ہے جسے مولوی سید حسن رضا صاحب ثاقب عظیم آبادی نے مرتب کیا ہے۔ عشق گزشتہ صدی کے ایک بلند پایہ نغز گو شاعر اور درویش تھے اور اُن کا کلام خواجہ میر درد کی طرح تصوف اور معرفت سے پُر ہے۔ حجم ۱۶۰ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ پتہ: مولوی سید حسن رضا صاحب مدرسِ عربی، پٹنہ سٹی سکول، پٹنہ

تابشِ خیال ۔ حضرتِ افسر صدیقی امروہوی کی اُن غزلیات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک لکھیں۔ ابتدا میں مولوی اسرار احمد صاحب کریوی فاضلِ ادب و الہیات کا مفصل و مبسوط مقدمہ ہے۔ جناب افسر کے کلام کے متعلق ہمیں صاحبِ مقدمہ کی رائے سے اتفاق ہے کہ وہ دلکش سادہ تصنع اور آورد سے بری اور ایک حد تک قدیم ایشیائی شاعری کا نمونہ ہے۔ حجم ۱۲۷ صفحات۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت ایک روپیہ۔ جنابِ مصنف سے رام سوامی، کراچی کے پتہ سے منگائیے۔

شہریت ۔ مصنفہ شیخ عطاء اللہ صاحب پروفیسر مرے کالج، سیالکوٹ۔ یہ کتاب شہریوں کے حقوق اور اُن کی ذمہ داریوں کے متعلق لکھی گئی ہے، اور اس میں حکومت کے نظام اور اُس کے طریقِ کار کو نہایت آسان اور جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستان کو اچھے شہری پیدا کرنے کے لئے ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے اور ہمارا خیال ہے کہ شہریت سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے اس سے بہتر کتاب اب تک اردو میں شائع نہیں ہوئی حجم ۲۱۶ صفحات قیمت درج نہیں۔ میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز تاجران کتب انارکلی لاہور سے طلب فرمائیے۔

ریل ایگزسٹنس ـ مصنفہ ایس ایم یونس صاحب جوہر عظیم آبادی ـ چالیس صفحے کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں ایک صوفیانہ نظم کوئل اور اس کا انگریزی ترجمہ دیا ہے اور دوسرے حصے میں فاضل مصنف کے ۳۰۷ اقوال درج ہیں ـ قیمت ایک روپیہ مقرر کی ہے ـ ایم کے جعفری صاحب، لینگویج بیورو، نمبر ا جبلی روڈ، انٹالی کلکتہ سے طلب فرمائیے ـ

النجمۃ السائرہ ـ یہ عروض کی عربی کتاب محیط الدائرہ کا اردو ترجمہ ہے ـ اصل کتاب کی عربی عبارت بھی ساتھ دی گئی ہے ـ ترجمہ بہت اچھا ہے حجم ۱۴۸ صفحات قیمت ایک روپیہ ـ پتہ ـ انجمن موید الاسلام، مدرسۃ الواعظین لکھنؤ ـ

سلطانہ ڈائری ـ خواتین کے لئے حساب خانہ داری کی کتاب ہے جس میں ریل اور ڈاک کے معلومات، اوزان اور پیمانوں کے نقشے، اور خانہ داری کے متعلق مفید اور کارآمد باتیں بھی درج ہیں ـ قیمت مجلد ۸؍ بے جلد دو روپے ـ ملنے کا پتہ سلطانہ بیگم صاحبہ مالکہ خاتون وی بی سٹورز، چاندنی چوک، نزد فتح پوری، دہلی ـ

محمود اور فردوسی مصنفہ قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم ـ اس میں شاہنامہ کے متعلق محمود اور فردوسی کے مشہور معاملے کی تردید کی گئی ہے ـ حجم ۴۰ صفحے، قیمت چار آنے ـ پتہ، مولوی فیض الدین صاحب وکیل محلہ عابد شاپ حیدرآباد (دکن)

اردو انقلابی قاعدہ، مرتبہ منشی اکبر علی صاحب بی اے، بی ٹی سابق ایجوکیشنل سکرٹری ریاست منگرول قیمت چھ پیسے پتہ، نمبر ۲۴ لیک سکوائر، نئی دہلی ـ

اسلامی محمدی تقویم ـ بڑی تقطیع کے ۸۰ صفحات پر ۱۳۴۹ ہجری کی جنتری ہے جو بہت سے مفید معلومات سے پر ہے نہایت خوبصورت چھپی ہے ـ پتہ، علی بھائی و شرف علی صاحبان تاجران کتب بھنڈی بازار، بمبئی نمبر ۹

"**خیالستان**" یہ ماہوار رسالہ حضرت اختر شیرانی اور جناب لطیفی بی اے کی ادارت میں ماہ اپریل سے شائع ہونا شروع ہوا ہے ـ ہمارے سامنے اس کا دوسرا نمبر ہے جو ظاہری و معنوی محاسن سے مالا مال ہے ـ لکھائی چھپائی عمدہ ہے، کاغذ انٹیک استعمال کیا گیا ہے تصویریں سات ہیں اور مضامین ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہیں ـ "خیالستان" کی بزم میں ہندوستان کے بڑے بڑے ادبا جمع نظر آتے ہیں ـ پروفیسر محمد اقبال صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی کا مضمون "تاریخ رزمیات ایران"، سید غلام بھیک صاحب نیرنگ کی نظم "نازنین مغرب"، سید سلطان حیدر صاحب جوش کا افسانہ "خوبصورت دھوکا" اور اختر صاحب کے تقریباً تمام مضامین نظم و نثر خاص طور پر قابل ذکر ہیں ـ ہمیں مسرت ہے کہ لاہور سے ایک ایسے اچھے پرچے کا اجرا عمل میں آیا، اور ہم قابل مدیروں کو اس کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں ـ سالانہ چندہ پانچ روپے ہے ـ پتہ، دفتر "خیالستان" ۸ فلیمنگ روڈ، لاہور